جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

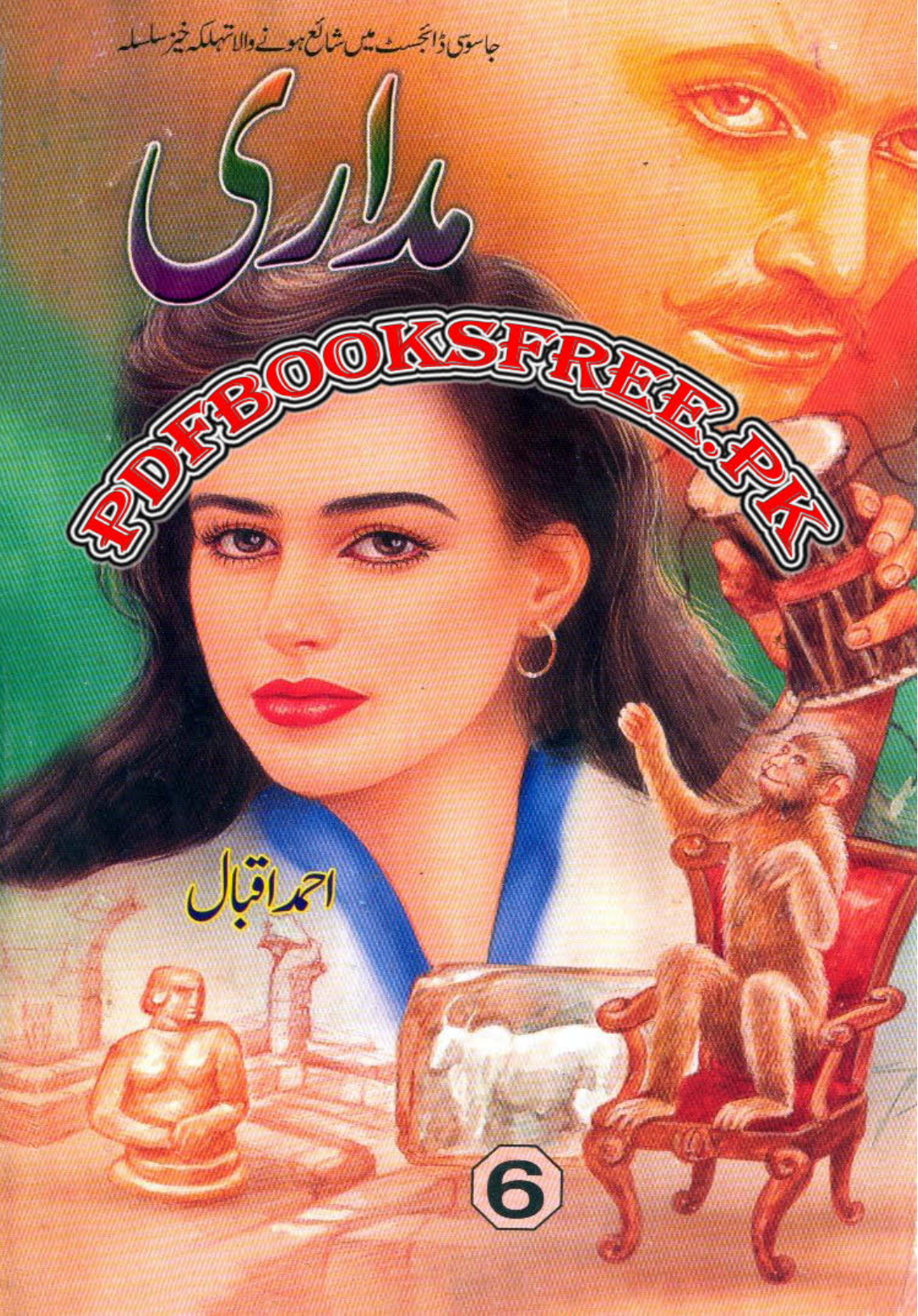

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

چھٹا حصہ

احمد اقبال

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل ——— ۲۰۰۳ء
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور

ISBن 969-517-085-4

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

شادو کی طبیعت شام کے بعد سنبھل گئی۔ اسے ڈاکٹر کے آنے اور انجکشن لگانے کی خبر بھی نہ تھی مگر کلائی پر ایک رگ سرخ ہو چکی تھی اور درد کر رہی تھی۔ میں نے اسے ڈاکٹر نوید کے بارے میں بتایا تو وہ متفکر ہو گئی۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"وہی جو تم کہہ رہی تھیں۔ معمولی بخار ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "پھر یہ انجکشن اور گولیاں؟"

میں نے کہا "اب کیا میں ڈاکٹر سے بحث کرتا' یہ بتاؤ بھوک لگی؟"

"ہاں۔ کمزوری محسوس ہو رہی ہے کچھ" وہ اٹھ بیٹھی۔

"پھر اٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ناصر۔ مجھے جانا ہے" وہ بولی۔

"دماغ خراب ہے تمہارا' کہاں جانا اتنا ضروری ہے؟"

"آفس۔ میں نے فون کر کے سب کو بلایا تھا" وہ بولی۔

"شادو جی۔ ہم کل بھی جا سکتے ہیں۔"

اس نے انکار کر دیا "نہیں۔ اس معاملے کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ میں نہا کے کپڑے بدلتی ہوں۔ ابھی کافی کے ساتھ کچھ کھالوں گی تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم بالکل فکر مت کرو ناصر۔"

"مگر کیا؟"

"تمہارے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کوئی اچھا سا سوٹ پہن لو۔ ٹائی لگا کے چلو میرے ساتھ۔"

میں نے احتجاج کیا "شادو۔۔۔!"

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم انکار نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کی کلائی تھام کے ایک گہری سانس لی "اوکے!"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور مسکرائی۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا "اپنا وعدہ مت بھولنا۔ تم وہی کرو گے جو میں چاہوں گی۔"

میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا "ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہو گا شادو جی مگر ہاشمی صاحب کا کوئی سوٹ نہیں پہنوں گا میں۔"

وہ ہنسی "تمہیں آئے گا بھی نہیں۔ ہم گھر جائیں گے پہلے۔ وہاں تم کپڑے بدلنا۔ ذرا علی نواز سے کہو گاڑی لائے' نئی والی۔"

میں نے کہا "میں کہتا ہوں۔۔۔ لیکن ڈرائیونگ میں کروں گا۔"

ایک گھنٹے بعد ہم نئی چمکتی دمکتی گہرے نیلے رنگ کی ہنڈا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکارڈ میں نکلے تو شادو بہت EXCITED تھی۔ اس کی طبیعت کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ٹھیک ہوگئی تھی۔ شاید اس نے اپنی قوت ارادی سے کمزوری پر قابو پالیا تھا۔ اس نے بہت شاندار ساڑی بہت خوب صورتی سے باندھی تھی اور اس کا میک اپ بھی کمال کا تھا۔ وہ ایک انتہائی حسین اور باوقار' سنجیدہ اور ہوشیار قانون داں نظر آرہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ تیاری آفس میں ایک بااختیار مالکن کا رول نبھانے کے لیے تھی۔ وہ کسی کے سامنے ہلکی اور کمزور' ناسمجھ اور بے اعتماد نظر آنا نہیں چاہتی تھی۔

جب شادو کی تیاری کا مقصد سمجھ میں آگیا تو میں نے اپنے آپ کو بھی اس رول کے لیے تیار کرلیا جس میں میری اداکاری کی آزمائش تھی۔ مجھے صرف شادو کو ہی سپورٹ نہیں کرنا تھا۔ مجھے اپنی اتھارٹی بھی ESTABLISH کرنی تھی اور اپنے سے زیادہ عمر' تجربہ اور تعلیم رکھنے والے چالاک اور زبان کے تیز مگر محنتی وکیلوں کے جارحانہ رویے سے جارحیت کے ساتھ نمٹنا تھا۔ مجھے عملاً یہ ثابت کرنا تھا کہ باس ہمیشہ باس ہوتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ناتجربہ کار ہو یا کم عمر۔ اصل طاقت ہوتی ہے اختیار کی اور اعتماد کی اور پوزیشن کی جس کی بنا پر اَن پڑھ باس ایک پی ایچ ڈی کو اپنے نقصان کی پروا کیے بغیر گھڑے گھڑے برطرف کرسکتا ہے۔

اسی قسم کی صورتِ حال میں شادو جیسی عورت کی مشکلات کیا ہوسکتی ہیں۔ اس کا میں بخوبی اندازہ کرسکتا تھا۔ ہاشمی اینڈ کمپنی عدالتی اور قانونی معاملات میں لوگوں کی مدد کرتی تھی۔ خواہ معاملات دیوانی ہوں یا فوج داری۔ لوگوں میں ایک عام آدمی بھی شامل تھا جو کمپنی کے فراہم کردہ وکیل کی فیس ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں اور ادارے بھی جو آپس کے لین دین میں معاہدے کی خلاف ورزی یا حکومت کے محکموں کے خلاف رٹ پر ہاشمی اینڈ کمپنی کی خدمات حاصل کرتے تھے اور کمپنی کیس کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے فیس وصول کرتی تھی اور ایک وکیل یا وکیلوں کے پینل کو کیس کی پیروی پر مامور کردیتی تھی۔ کمپنیوں کے مقدمات میں لیبر لاز' انکم ٹیکس' یونین کے جھگڑے ہوتے تھے۔ سیاسی اور آئینی نوعیت کے مقدمات عموماً وکیلوں' شہری تنظیموں یا سیاسی جماعتوں کی طرف سے دائر کیے جاتے تھے اور ان کی پیروی عام طور پر خود مرحوم ہاشمی صاحب کرتے تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ گڈول کا سارا دارومدار ایسے ہی مقدمات پر تھا جن کی رپورٹنگ اخبارات میں سیاسی اور آئینی تجزیہ نگاروں کے کالم میں بھی موضوعِ سخن بن جاتی تھی اور رائے عامہ کی

دلچسپی سے جتنا فائدہ مقدمہ کرنے والے کو یا اخبار کو ہوتا تھا اتنا ہی ہاشمی صاحب کو بھی پہنچتا تھا۔

کوئی لیگل کمپنی کی خدمات نجی نوعیت کے چھوٹے موٹے مقدمات کے لیے حاصل نہیں کرتا۔ بڑے مقدمات کا معاوضہ بھی بڑا ہوتا تھا اور اعلیٰ عدالتوں میں کیس لڑنے والے وکیل بھی بڑے ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کسی معمولی وکیل کی نہیں چلتی تھی تو شادو کی کیسے چل سکتی تھی جو میٹرک پاس انٹرفیل اور بقول بیگم ڈاکٹر مشہود' دودھ کی فقیر زادی تھی۔ بیگم ہاشمی بن جانے سے اس کا معاشرتی درجہ شرعی اور قانونی طور پر بلند ہوگیا تھا مگر اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہاشمی صاحب کے دوست احباب' ہم پیشہ افراد اور دوسرے قریبی لوگوں کی نظر میں شادو کو وہ عزت نہیں ملی تھی جس کی حق دار ان کی پہلی خاندانی بیوی تھی۔ حقیقی مسز ہاشمی داستانِ ماضی ہوگئی تھیں مگر شادو کی حیثیت ڈپلی کیٹ یا قائم مقام بیوی جیسی تھی۔ اگر وہ پہلی بیوی کے مقابلے میں زیادہ عالی نسب ہوتی تو شاید ایسا نہ ہوتا۔

ہاشمی صاحب کا سابق دستِ راست ایک پٹھان تھا جس کا صحیح نام گلباز خان یا کچھ ایسا ہی تھا۔ بلاشبہ وہ ایک راست گو اور اچھا آدمی تھا۔ ہاشمی صاحب کے بعد لیگل فرم کی سربراہی خود بخود اسے تفویض ہوگئی تھی۔ کمپنی کے قانونی اور مالی معاملات حسبِ سابق چل رہے تھے مگر ان میں شادو کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ عدت کے زمانے میں وہ مجبور تھی لیکن اس کے بعد بھی کمپنی کے طریقۂ کار کو سمجھنا اور کسی سے انتظامی امور پر بات کرنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں عملاً ناممکن تھا۔

میرے لیے اب شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ شادو نے جب مجھ سے کہا تھا کہ "جو میرا ہے وہ تمہارا ہے" تو اس کی مراد اس کمپنی سے بھی تھی جس کی وہ مالک تھی۔ پورے کی پورے آدھے کی۔ اس نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری جذباتی کمزوری کو EXPLOIT کیا تھا اور مجھے قسموں اور وعدوں کی زنجیر سے باندھ کے اپنی ہر بات ماننے کا پابند کردیا تھا۔

بات صرف EXPLOITATION کی نہیں تھی۔ اگر مجھے یہ احساس ہوتا کہ شادو میرا جذباتی استحصال کررہی ہے اور مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے تو میں اس کی قسموں اور اپنے وعدوں کی پروا ہی نہ کرتا مگر جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں

؎ خیال فرقت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ
غرض دوگونہ عذاب است جاں مجنوں را

یعنی بے چارے مجنوں کے لیے دہرا عذاب ہے۔ ایک تو لیلیٰ کی جدائی اور پھر اس جدائی کا غم۔ تو ایسا ہی میرے لیے بھی ہوگیا تھا۔ قسمیں وعدے اپنی جگہ تھے اور ہر حال میں ہر قیمت پر شادو کو خوش اور پُرسکون رکھنے کی ذمے داری الگ تھی۔ اس کی رفاقت کا ہر بچا ہوا لمحہ میرے لیے جتنا پُرازیت تھا اتنا ہی بیش قیمت تھا۔ میں اسے شادو کی ناراضی یا بدگمانی کے سائے سے بھی بچا کے رکھنا چاہتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ ہاشمی صاحب کی کوٹھی میں گیا۔ میں نے وہاں رہنا منظور کیا' ان کی گاڑی ڈرائیو کی اور اب شادو یہ چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ جاکے کمپنی کے معاملات سنبھالوں تو میرے لیے انکار ناممکن تھا۔

آہستہ آہستہ یہ بات بھی میری سمجھ میں آنے لگی تھی کہ شادو کو مجھ سے شادی کی اتنی جلدی کیوں تھی اور وہ کیوں ہر ایک کو یہ بتادینا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ قانونی طور پر میں اس کا شوہر بن جاؤں اور یہ بات سارے زمانے کو معلوم ہوجائے اور تسلیم کرلی جائے۔ اس سے میرے دل میں ایک شک یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے اپنے انجام کی خبر تھی۔ یہ خبر اسے کس نے دی۔ اس پر تحقیق لاحاصل تھی۔ یہ بات میں شادو سے نہیں پوچھ سکتا تھا اور لندن جاکے معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ ہاشمی صاحب سمجھ دار آدمی تھے اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے یہ دہشت ناک خبر اپنی نئی نویلی دلہن کو سنانے میں جلدی کی ہوگی۔ وہ شادو کے ساتھ ہنی مون پر گئے تھے اور ہرگز اس تفریح کے پُرمسرت دور کا خاتمہ خود نہیں کرسکتے تھے۔ ویسے بھی قبل ازوقت کسی کو یہ کون بتاتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن گنے جاچکے ہیں۔

تاہم لندن میں دیگر ذرائع تھے۔ اگر شادو نے اڑتی خبر بھی سن لی ہوگی یا کسی بات نے اسے شک میں مبتلا کیا ہوگا تو ہاشمی صاحب کو بتائے بغیر وہ اسپتال سے سب معلوم کرسکتی تھی جہاں کیس نمبر اور دیگر تفصیلات کا کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ موجود تھا۔ شادو کے رویے سے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سفر آخرت پر روانگی کی تاریخ سے واقف ہے اور جانے سے پہلے تمام انتظامات کرلینا چاہتی ہے تاکہ اس کی عدم موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑے۔

یہ ایک فطری ردِعمل کہا جاسکتا تھا۔ اس شخص کا جسے سب کچھ یہاں چھوڑ کے جانا ہو۔ دوسرے ملک یا دوسری دنیا' اور واپس نہ آنا ہو۔

لیکن اس سے بڑھ کے ایک اور خیال تھا جو میرے ذہن میں اپنی جگہ بنا رہا تھا اور اس یقین کی جڑیں اس طرح پھیل رہی تھیں جیسے کینسر کے ٹیومر کی جڑیں پھیلتی ہیں۔ پرائمری یعنی اصل رسولی دماغ یا پیٹ میں ہو تو سیکنڈری علامات جسم کے دوسرے حصوں میں نمودار ہوجاتی ہیں۔ زمین کے اندر پھیلنے والی بیل کی طرح جس کو اوپر سے کاٹ دیا جائے تو اس کی کونپل کہیں دور نکل آتی ہے۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے شادو نے محبت میں اپنے آپ کو مجھ پر قربان کردیا تھا۔ صرف جذباتی طور پر نہیں۔ جسمانی طور پر بھی۔ اس نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی تھی اور نہ دولت کی حرص میں اپنے آپ کو ہاشمی صاحب کے سپرد کیا تھا۔ اس نے میری امانت میں خیانت نہیں کی تھی۔ اس نے جانتے بوجھتے خود کو میری راہ سے ہٹالیا تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ میری محبت کی دیوانگی میرے مستقبل کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ اگر وہ مجھ سے شادی کرلیتی تو میری ترقی کے راستے مسدود ہوجاتے۔ میں ازدواجی زندگی اور بچوں کی پرورش کی ذمے داریوں کے پہاڑ تلے دب جاتا اور وہ سب نہ کرپاتا جو میں چاہتا تھا۔ جو شادو چاہتی تھی کہ میں کروں۔

اس نے یہ سوچا کہ ہاشمی صاحب کی بیوی بن کے وہ مجھے زیادہ فائدہ پہنچاسکتی ہے۔ بے شک اس کی بے وفائی اور "جسم فروشی" پر میں کچھ دن بہت آنسو بہاؤں گا اور اسے بہت گالیاں دوں گا مگر بالآخر وقت کی چارہ گری میرے زخمی دل کو قرار عطا کردے گی اور میں اسے بھول کے پھر اپنی زندگی کی ان عظیم خواہشات اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہوجاؤں گا جن کی اہمیت شادو جیسی لڑکی کی محبت اور اس کے حصول کی خواہش کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔

شادو نے جیسا سوچا تھا وہی ہوا بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوا۔ قدرت نے اس کی نیت کے خلوص اور اس کی محبت کے لیے قربانی کے بے مثل مظاہرے کو شرفِ قبولیت بخشا۔ شادو نے تو صرف اس حد تک کیا تھا کہ پہلے ہاشمی صاحب کا ایک چھوٹا سا مکان میرے نام کرادیا تھا مگر بعد میں اس نے مجھے لندن بلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے ایک تار ارسال کیا تھا جو مجھے بہت دیر سے ملا تھا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے لندن کیوں بلا رہی تھی مگر یقیناً اس نے وہاں میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا اور تعلیم کے ساتھ میرے خوش حال مستقبل کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے کوئی انتظام ضرور کیا ہوگا۔

میں لندن نہیں گیا اور جو فیصلے شادو نے کیے تھے ان سے زیادہ اہم فیصلے دستِ غیب نے کردیے۔ معلوم نہیں قدرت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو شادو کی کون سی ادا پسند آگئی کہ ہاتفِ غیب نے کہا "تیری قربانی کو اس قادرِ مطلق نے شرفِ قبولیت بخشا اور تیری خواہش پوری ہوئی۔ اس سے کہیں زیادہ اسے مل جائے جتنا تو نے سوچا تھا۔"

یہ واقعہ تاریخ کا حصہ ہے کہ اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر کے شہنشاہ بابر نے خدا سے دعا مانگی کہ اس کے لختِ جگر کو مرض الموت سے شفا ہو جائے اور یہ دعا قبول ہو گئی تھی۔ شاہزادہ۔۔۔ جو بعد میں ہمایوں ہوا۔ جسے شاہی اطبا نے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ شفایاب ہونے لگا اور بابر بسترِ مرگ پر لیٹ گیا۔

شادو نے میرے لیے اپنے جسم و جاں کی قربانی دی اور مجھے وہ سب دلوا دیا جو کامیابی کی شاہراہ پر میرے لیے منزل کے حصول کو یقینی بنا سکتا تھا اور اگرچہ اس میں شادو کی کوشش کو دخل نہ تھا مگر اس کی خواہش کی تکمیل کے اسباب کاتبِ تقدیر نے پیدا کر دیے۔ ہاشمی صاحب اچانک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے اور اپنا سب کچھ شادو کے لیے چھوڑ کے رخصت ہوئے۔ شادو کو اتنی مہلت دی گئی کہ وہ اپنی قربانی کے ثمر سے مجھے فیض یاب ہوتا دیکھ لے۔

اگر ایسا تھا تو کیا میں شادو کے بارے میں اپنی گندی سوچ اور اپنی ہرزہ سرائی سے گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ وہ جس نے اپنا آپ اس محبت پر قربان کیا' اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹا۔ اپنے حسن و شباب کو رہن کیا۔ جسم کے ساتھ روح پر مجبوری کا آزار جھیلا۔ میں نے اسے فاحشہ' ہوس پرست' دغا باز اور ذلیل کہا۔ سمجھا اور جانا۔

ایسا سوچتے ہوئے میری روح لرزنے لگتی تھی۔ خداوندا! میں اس گناہ کا کفارہ کیسے ادا کروں؟ میں شادو سے کیسے اور کن الفاظ میں معافی مانگوں؟ اب تو اس کا وقت ہی نہیں رہا۔ اچانک میں شادو کی محبت کے لیے دی گئی ناقابلِ تصور قربانی کے پہاڑ جیسے بوجھ سے دب گیا ہوں اور سانس تک نہیں لے سکتا۔ اس نے میرے ہونٹ سی دیے ہیں اور میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں۔ کچھ نہ کہو' کچھ بھی نہ کہو۔ جو میرا ہے وہ تمہارا ہے کیونکہ میں نے عدم سے وجود اور وجود سے پھر عدم کی مسافت صرف تمہارے لیے طے کی تھی اور اس کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ میں تمہاری وجہ سے تھی اور تمہارے لیے تھی۔

سارا راستہ میں نے انہی سوچوں میں گم رہتے ہوئے گزار دیا۔ جب میں نے گاڑی اپنے گھر کے سامنے روکی تو مجھے شادو کا افسردہ چہرہ نظر آیا۔

میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اتنی اُداس کیوں ہو؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم خود اتنے رنجیدہ اور سنجیدہ لگتے ہو۔" وہ بولی "ناصر۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ سب ناپسند ہے۔ تم مجبوراً میرا ساتھ دے رہے ہو۔"

"ہر بیوی کا ساتھ شوہر کو دینا پڑتا ہے لیکن تم میرے لیے بیوی سے پہلے بھی بہت کچھ تھیں۔ آج بھی ہو' ہمیشہ رہو گی" میں نے لفاظی کا سہارا لیا۔

وہ کچھ خوش ہوئی "تم ایسا تو نہیں سمجھتے کہ میں نے تمہارا جذباتی استحصال کیا ہے۔ زبردستی اپنی قسم دے کر۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں تو پہلے بھی کہتا تھا کہ تمہاری خاطر میں آسمان سے ستارے توڑ کے لا سکتا ہوں۔ پہاڑ پر سے ڈائریکٹ بحرِ الکاہل میں کود کے تمہاری مانگ میں سجانے کے لیے موتی نکال کے لا سکتا ہوں۔ یہ دنیا کے تمام سچے عاشقوں کے منشور میں لکھے ہوئے وعدے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی "بہت عرصے بعد تم اپنے اصل رنگ میں نظر آئے ہو۔"

ڈاکٹر رانجھا اپنے کلینک کا دوبارہ افتتاح کرنے کی تیاریوں میں زور و شور سے مصروف تھے۔ شوران کا تھا' زور ان کے طریقۂ علاج سے استفادہ کرنے والے چند عقیدت مندوں کا جو رضاکارانہ خدمات سرانجام دے رہے تھے اور ہیر کلینک کے بورڈ کو پرانی جگہ آویزاں کرنے کے لیے اٹھائے کھڑے تھے۔ بیس فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے بورڈ کو بازوؤں کے سہارے بلند رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

"ہاں۔ بس تھوڑا اور۔ اوئے کھبے ہاتھ والے کیا بھوکے آگئے ہیں۔ چلو تم تھوڑا اٹھاؤ' بس بس۔"

لکڑی کی سیڑھی پر چڑھے ہوئے ہتھوڑے کیل سے لیس رضاکار نے چلا کے کہا "ابھی دیکھ لو پھر مت کہنا فرق رہ گیا۔ ٹھونک دوں؟"

"اوئے ٹھونک دے یار اللہ کا نام لے کر" رانجھا نے مطمئن ہو کے اجازت نامہ جاری کیا تو دس فٹ کی بلندی پر ہتھوڑے والے نے "یا علی" کہہ کے کیل پر وار کیا۔ زاویہ غلط ہونے سے کیل اڑ گئی۔ ٹیوب لائٹ اڑتی ہوئی آئی اور نیچے گر کے ایک دھماکے سے پھٹ گئی پھر بورڈ نیچے گرا۔

رانجھا چلانے لگا "اوئے بیڑا غرق۔ عقل کے دشمن۔ میں نے کہا تھا کہ پہلے ٹیوب لائٹ ہٹا لو۔ ویسے بھی میں نے لگائی تھی اسپاٹ لائٹ۔"

بورڈ اٹھانے والے رضاکار پھر مستعد ہو گئے۔ سیڑھی کے اوپر براجمان انجینئر ہتھوڑا لہرا کے ان کا حوصلہ بڑھانے

لگا۔

کسی نے لطف لینے کے لیے کہا "اوجی ڈاکٹر صاحب۔ اسپاٹ لائٹ لگانی ہے تو اس پر تصویر بھی ایسی ہو کہ کسی ماشوق کے جلوے والی کہ نظر کو کھینچے۔"

رانجھے نے خفگی سے کہا "اوئے کوئی سینما کا پوسٹر نہیں لگا رہا ہوں میں۔ جلوے واپتر' مقصد تو یہ ہے کہ پورے بورڈ کے ایک ایک حرف کو رات کے وقت روشنی میں اندھا بھی پڑھ لے۔"

"اور اندھا اگر اَن پڑھ ہو پھر؟" شرارت پر آمادہ شخص بولا۔

ڈاکٹر رانجھا نے ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "پھر وہ گزر جائے سیدھا۔ آگے تعلیم بالغاں والا مرکز ہے۔"

پھر اس نے مجھے دیکھا اور میری طرف لپکا "اوہ واہ بھئی پتر گیا شکارے والی گاڑی ہے۔ خیر سے کتنے میں لی۔"

میں نے کہا "شادو کی ہے۔۔۔ وہ اوپر چلی گئی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا کا جوش سرد پڑ گیا "ایں۔۔۔ اس کی ہے یعنی۔۔۔ وہ جو ہاشمی صاحب تھا۔"

گاڑی کی شان و شوکت اور چکاچوند سے مرعوب کھڑے لوگ اپنا کام بھول گئے تھے۔ رانجھا پھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں اوپر چلا گیا۔ اس کی صورت کے تاثرات نے رانجھے کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اسے میرا اس گاڑی میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ جو میری نہیں تھی۔

ماسی نے بھی' جو اوپر سے "ہیر کلینک" کے سائن بورڈ کی تنصیب کے پروجیکٹ میں عملی دلچسپی لے رہی تھی۔ شادو کو اور پھر مجھے اس رئیسانہ کار سے اترتے دیکھا تھا۔ میں اوپر پہنچا تو وہ شادو کے متاثر کرنے والے لباس اور انداز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے تم دونوں۔ سارا دن کہاں رہے اور اس وقت شاہی سواری کہاں سے آ رہی ہے" اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

میں نے کہا "ہم ذرا۔۔۔ شادو کے گھر گئے تھے۔ کچھ کام نمٹانے تھے۔ اس وقت وہیں سے آ رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھئی!" اس نے طنز سے کہا "ہمیں کہا کہ یہاں آ جاؤ اور خود چلے گئے اس کوٹھی میں رہنے۔ یہاں کیا تکلیف تھی تجھے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اس وقت مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں واپس آ کے بات کروں گا۔"

شادو نے کہا "میں آپ کے کپڑے نکالتی ہوں" اور غائب ہو گئی۔

ماسی نے شادو کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف "ناصر۔ یہ اسی کی گاڑی ہے نا۔ شادو کے پہلے خصم کی۔"

مجھے ماسی کی بات سخت ناگوار لگی مگر میں پی گیا "اب تو شادو کی ہے۔"

ماسی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "نا مجھے یہ بتا۔۔۔ تیری اپنی گاڑی میں کون سے کیڑے پڑ گئے تھے۔"

میں نے کہا "کیسی باتیں کرتی ہو ماسی۔ میاں بیوی کی ہر چیز ایک دوسرے کی ہوتی ہے۔ کیا رانجھے کا حق نہیں ہے تمہاری ہر چیز پر۔"

وہ خاموش ہو گئی "ناصر۔۔۔ کیا تو نے اس کوٹھی میں رہنا ہے۔ وہ بھی اس حساب سے تیری ہو گئی۔"

"ہاں۔ ہم وہاں کیوں نہ رہیں آخر۔ آرام سے۔"

"ہم نہیں۔ اپنی بات کر۔۔۔" اس نے تیز ہو کے کہا "اور رانجھے کی مثال مت دے۔ اس کی ہر چیز پر میرا حق ضرور ہے مگر اس لیے کہ وہ رانجھے نے خود بنائی ہے۔ میرے کسی دولت مند خصم نے نہیں دی ہے اسے۔ خیرات میں۔"

مجھے سخت طیش آیا مگر اس وقت بات بڑھانا مناسب نہیں تھا۔ میں جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ مزید کوئی بات کیے بغیر میں اور شادو نیچے اتر گئے۔ رانجھے نے مجھے پھر جاتے دیکھا تو میری طرف آیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ ماسی بہت خفا ہے اور میری ایک سننے پر تیار نہیں۔ پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیا اس نے مجھے اور شادو کو۔"

رانجھے نے پھر ٹوپی اٹھا کے سر کھجایا "تو نے کیا کہا تھا ایسا۔"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ ہم سب شادو کی کوٹھی میں زیادہ آرام سے رہ سکتے ہیں۔ جو شادو کا ہے کیا وہ میرا نہیں ہے؟"

رانجھا سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھ پتر ناصر۔ تیرا ضرور ہو گا۔۔۔ مگر یہ جو تو نے کہا تھا کہ وہاں ہم آرام سے رہ سکتے ہیں۔ تو بات یہ ہے کہ۔۔۔ ہم یہاں زیادہ خوش رہ سکتے ہیں۔ اسے تو ہم سمجھتے ہیں بیٹے کا گھر۔۔۔ بیٹے کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں۔۔۔ لیکن بہو کا گھر۔۔۔ یا بیٹی کا گھر۔۔۔"

میں نے کہا "اچھا۔۔۔ اس مسئلے پر رات کو بات ہو گی۔ آپ سے بھی اور ماسی سے بھی۔ میں ماسی سے کہنا بھول گیا۔ بہت دن ہو گئے اس کے ہاتھ کے پکے ہوئے گڑ کے چاول کھائے۔۔۔ اور اس کے ساتھ ملائی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اوہ یار۔ کیا حرج ہے اگر میں تیری طرف سے ایک بات اور بھی کہہ دوں۔ قیمے اور انڈے والے پراٹھے بھی تو اچھے لگتے ہیں تجھے" وہ مجھے آنکھ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "ان کی کیا بات ہے۔"

"ساتھ دہی کا رائتہ اور آلو بخارے کی چٹنی۔" اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

شادو نے میرے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کہا "کیا معاہدہ ہوگیا۔"

میں نے کہا "بس ہوگیا۔ رات تک پتا چل جائے گا۔"

"وہ مان گئے ہمارے ساتھ رہنے پر" شادو نے پُرامید نظروں سے مجھے دیکھا "ماسی ہیر خوش نظر نہیں آتی تھی۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ یہ پرانی وضع کے لوگ ہیں۔ بیٹے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتے۔"

"بہو مالک ہو تو اس گھر کو اپنا نہیں سمجھتے" شادو نے طنز سے کہا "جہیز میں کوٹھی مانگیں تو کہیں گے کہ ہمارے بیٹے کے نام کردو۔ یہی ہے ان کی وضع داری؟"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ تلخ ہو رہی ہو۔"

"میں وہ کوٹھی تمہارے نام کردیتی ہوں۔"

میں نے کہا "کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہاں۔ ضرورت نہ ہوتی اگر وہ اس وضع داری کا معاملہ نہ اٹھاتے۔ جب مالک تم ہوجاؤ گے تو وہ کیسے انکار کریں گے۔"

"انکار میں بھی تو کرسکتا ہوں۔"

"نہیں۔ تم انکار نہیں کرسکتے۔ اب تم سارے معاملات کے مالک اور ذمے دار ہو جیسے سب شوہر ہوتے ہیں۔ تم بھی مجھے سنبھالو گے اور میرے سارے مسائل سے نمٹو گے۔" اس نے اپنے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ میرے لیے جواب میں کچھ کہنا ممکن نہ رہا۔

"ٹھیک ہے پھر سب مجھ پر چھوڑ دو۔"

"چھوڑ تو دیا ہے اور کیسے چھوڑوں۔" وہ مسکرائی "باہر کے سارے معاملات میں سب فیصلے تمہارے' اسی لیے میں تمہیں آفس لے جارہی ہوں۔ وہاں میری جگہ تم سنبھالو گے۔"

میں نے کہا "مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"تجربہ مجھے بھی نہیں تھا اور مجھے عورت ہونے کی وجہ سے کچھ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تم مرد ہو' جسمانی اور ذہنی طور پر مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ تم پوچھ سکتے ہو کہ یہ کیا ہے اور ایسا کیوں ہے؟ تمہیں کوئی ٹال نہیں سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ میڈم' یہ آپ کے سمجھنے کے معاملات نہیں جیسا کہ مجھے کہا گیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارا کیا خیال ہے۔ یہاں کوئی انتظامی یا مالی گڑبڑ ہے؟"

"امید تو نہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہاشمی صاحب کے ہوتے کوئی گڑبڑ ناممکن تھی مگر وہ چھ مہینے سے زیادہ عملی طور پر دفتر کے مسائل سے بے تعلق رہے۔ انہیں آفس کے ڈسپلن اور اپنی ٹیم پر بہت زیادہ اعتماد تھا مگر ان کے بعد ٹیم کسی کپتان کے بغیر رہ گئی ہے۔ ان کا پارٹنر' دست راست اور ان کا دوست سب کچھ ایسے ہی چلا رہا ہے' کیسے چلا رہا ہے' یہ تم دیکھو۔"

"شادو جی' یہاں سب بہت سینئر وکیل ہیں اور مجھے قانون کی اے بی سی کا پتا نہیں" میں نے کہا "اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی۔ تو میں اسے کیسے کنٹرول کرسکتا ہوں۔ اس سے معاملات میں بڑی پیچیدگی پیدا ہوگی اور میرے لیے ایسی مشکلات کھڑی ہوجائیں گی جن کو میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اس سے نقصان ہوسکتا ہے۔ کمپنی کو بھی اور مجھے بھی۔"

"اتنی کم ہمتی کا مظاہرہ کیوں کررہے ہو۔ کوشش کرکے دیکھو۔ مجھے پورا بھروسا ہے تم پر۔"

"شادو جی۔ ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری اور ہاشمی صاحب کی پوزیشن میں زمین آسمان کا فرق ہے' ہر لحاظ سے۔ اگر وہ پاس تھے تو اس کے فطری اسباب موجود تھے۔ وہ اس کا حق رکھتے تھے۔ ہر فرح سے اس کے اہل تھے۔ شاید مجھے ان کے برابر نہ سمجھا جائے۔ وہ میرے ماتحت رہنا' کہلانا اور سمجھے جانا ذہنی طور پر قبول نہ کریں' اسے اپنی بے عزتی تصور کریں۔"

"پہلے سے ایسا کیوں فرض کررہے ہو؟"

میں نے کہا "فرض نہیں کررہا ہوں۔ ایسا ایک واقعہ پیش آچکا ہے۔ تمہارے چوکیدار اور ڈرائیور کی فیملی جارہی ہے۔ وہ ہاشمی صاحب کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ انہوں نے مجھے مالک تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔"

"اچھا۔؟" اسے کچھ صدمہ ہوا "ایسا کیا ہے انہوں نے؟"

"ہاں' پہلے علی نواز نے پھر اس کے باپ رب نواز نے کہا کہ کل تک وہ چلے جائیں گے۔ تم خود سوچو' جب ایک معمولی چوکیدار اور ڈرائیور کا یہ رویہ ہے تو ان وکیلوں کا کیسا ہوگا۔ جن کے لیے میں کل کا لونڈا' بے حیثیت اور بے نام و

نسب آدمی اور جاہل آدمی ہوں۔ میں کمپنی کا مالک ہوجاؤں اور وہ میرے ملازم کہلائیں۔ اس میں ان کی ہتک ہوگی۔ وہ خود کمپنی چھوڑ کے چلے جائیں گے یا ایک الگ کمپنی بنائیں گے مل کے۔ یہاں میں اکیلا بیٹھا رہ جاؤں گا۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی "میرے ساتھ تو سب ٹھیک رہے۔"

"اس کی وجہ تھی۔ تم نے عملاً دخل اندازی نہیں کی اور جو ہاشمی صاحب کا معاون تھا وہی عملاً کمپنی کا سربراہ ہوگیا۔ پھر ان کی ہمدردیاں تھیں تمہارے ساتھ کیونکہ تم ہاشمی صاحب کی بیوہ تھیں۔ مجھ سے شادی کرکے تم نے یہ ہمدردی گنوادی ہے۔ تم نے ان کے نقطۂ نظر سے اچھا نہیں کیا۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے ناصر۔ کچھ تو کرنا ہے ہمیں؟" وہ نروس ہونے لگی۔

"ان حالات میں میرا ایک مشورہ ہے۔ یہ کمپنی اسی کے حوالے کردو۔ مکمل طور پر۔ جو اس وقت کمپنی کو چلا رہا ہے۔ اسے مالک بنادو کلی طور پر۔ اپنے حصے کا بھی۔ اس میں جتنا شیئر ہاشمی صاحب کا تھا اور جو اب تمہارا ہوگیا ہے' وہ اسی کے نام کردو۔ اس کو پروپوزل دو کہ یہ کمپنی خریدے اور چاہے تو اپنے نام سے چلائے۔ تمہیں تمہارے حصے کا معاوضہ ادا کردے کیونکہ تم یہ سمجھتی ہو کہ کمپنی کو ہاشمی صاحب مرحوم کی طرح چلانا تمہارے بس کی بات نہیں چنانچہ تم الگ ہونا چاہتی ہو۔ اگر تم ذرا ڈپلومیسی سے کام لو تو تمہیں یقیناً بہت اچھی قیمت مل سکتی ہے کیونکہ اس وقت کمپنی کی گڈول بنی ہوئی ہے جو بعد میں کم ہوسکتی ہے۔ ہاشمی اینڈ کمپنی چلتی تھی ہاشمی صاحب کے نام سے۔ اب وہ نہیں رہے تو تھوڑا بہت فرق ضرور پڑے گا لیکن یہ چلتا ہوا بزنس ابھی کوئی سنبھال لے تو یہ چلتا رہے گا اور اس کے لیے گلباز خان سے بہتر آدمی کون ہوسکتا ہے۔ جہاں تک میں نے اسے سمجھا ہے' وہ شریف آدمی ہے اور تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا۔"

گاڑی اس عمارت کے سامنے رکی ہوئی تھی جس میں ہاشمی اینڈ کمپنی کے دفاتر تھے۔ اوپر جانے سے پہلے میں شادو پر واضح کردینا چاہتا تھا کہ میں اس معاملے میں کیا نقطۂ نظر رکھتا ہوں۔ آج اس نے جس مقصد کے تحت سب کو بلایا تھا وہ کچھ اور تھا۔ وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ آئندہ سے اس کی جگہ ناصر عظیم کو کمپنی کا مالک سمجھا جائے مگر اس فیصلے کی راہ میں حائل عملی دشواریوں کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔

"YOU ARE SO ANTELLIGENT" ناصر!" اس نے کچھ دیر مجھے پُرستائش اور فخریہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ ایک PRACTICAL پرابلم ہے۔"

"میں سو فیصد اتفاق کرتی ہوں تم سے اور تسلیم کرتی ہوں کہ ان مسائل کی طرف میرا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ شاید جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ اور سوچ کے آئی تھی لیکن اب یقیناً ہمارا موقف بدل جائے گا۔ تم جیسے مناسب سمجھو بات کرلینا۔"

میں نے کہا "نہیں' میں سارے معاملات سے لاتعلق نظر آنے کی اداکاری کروں گا۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ میرا زیادہ عقلمند اور بااختیار شوہر بن کے تمہارے معاملات کو ہینڈل کرنا ٹھیک نہیں رہے گا۔ میں بالکل خاموش رہوں گا۔ تم خود براہِ راست گلباز خان سے بات کرو اور اس کے سامنے اپنی پرابلم رکھو پھر پرابلم کا حل پیش کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا ہی چاہتا ہوگا' جیسا ہے' جہاں ہے کی بنیاد پر سب اسے دے دو اور اگر اس کی آفر معقول ہو تو قبول کرلو۔ مت سوچنے کے لیے ٹائم لے لو۔"

"ٹائم کہاں ہے میرے پاس؟" اس نے بے اختیار کہہ دیا۔

عمداً میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی "تم ٹائم لوگی تو اس کے دل میں خود بخود یہ خیال آئے گا کہ شاید اب تم کسی اور سے بات کروگی اور کسی بڑے وکیل نے زیادہ آفر دے کر ہاشمی اینڈ کمپنی کو خرید لیا تو وہ فائدے میں رہے گا۔ گلباز خان کی پوزیشن پھر وہی نمبر دو۔ وہ نمبر ون پر ہونے کا یہ موقع ضائع نہیں ہونے دے گا۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ آؤ اب چلیں۔"

میں نے اسے روک لیا "کیا آج تم نے سب کی میٹنگ کال کی تھی؟"

"ہاں۔"

"میٹنگ کینسل کرو۔ گلباز خان سے اپنے کمرے میں بات کرو۔ ون ٹو ون۔ تیسرا کوئی نہ ہو تو بہتر ہے۔"

"تمہارے سوا کوئی نہیں ہوگا۔"

"میں بھی نہیں" میں نے کہا "وہ میری موجودگی پسند نہیں کرے گا اور میں خود بھی اس کی ناپسندیدگی کے جذبات رکھنے والی نظروں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔"

شادو تذبذب کا شکار ہوگئی "تم... کیا کرو گے؟"

"میں واپس گھر جاؤں گا اور انتظار کروں گا تمہارا۔ یہ گاڑی چھوڑ جاؤں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بولی "نہیں، گاڑی لے جاؤ۔"

"اوکے۔ میں گاڑی لے جاتا ہوں۔ جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا، میں آ کے تمہیں لے جاؤں گا اور اگر باز خان تمہیں COURTSEY میں خود چھوڑنا چاہے تو اس سے انکار مت کرنا، اس کے ساتھ آ جانا۔"

وہ مسکرائی "تمہارا ذہن ہر طرف سوچتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم بھول گئی ہو کہ میرا آئی کیو ایک سو بیالیس تھا۔"

"میرا شاید صرف چالیس ہوگا۔ اگر اپنے مقابلے میں تم مجھے ناقص العقل بھی کہو تو میں عورت ہونے کی وجہ سے ہیں، ویسے ہی مان لوں گی۔" وہ گاڑی سے اتر گئی۔

گاڑی میں نے سڑک کے بائیں کنارے پر کھڑی کی تھی۔ "ہاشمی اینڈ کمپنی" کا آفس جس عمارت میں تھا وہ دائیں جانب تھی۔

یہ دو رویہ سڑک تھی۔ شادو کو سڑک کے بعد درمیان کی گرین بیلٹ کو عبور کرنا تھا اور پھر دوسری سڑک کراس کر کے اس عمارت تک جانا تھا۔ اس پانچ منزلہ عمارت کے مرکزی دروازے کے سامنے چند سیڑھیاں تھیں اور اوپر کی ہر منزل کھڑکیوں کے اور دوسرے کاروباری دفاتر تھے۔ شیشے کے گھومنے والے دروازے سے بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔

شادو نے گرین بیلٹ پر رک کے پیچھے دیکھا اور میں نے سے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا۔ اس نے سڑک پر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ فائر کسی گزرتی ہوئی کار سے کیا گیا تھا یا پانچ منزلہ عمارت کی کسی کھڑکی سے۔

شادو ایک قدم آگے بڑھا کے لڑکھڑائی اور پھر سڑک پر گر گئی۔ میں کار سے اتر کے دیوانہ وار اس کی طرف بھاگا۔

دنیا میری نظر میں اندھیر ہو گئی تھی۔

○☆○

دنیا میری نظر میں اندھیر ہو گئی تھی۔ میری ساری محنت اور احتیاط اکارت گئی تھی۔ اب میں نہ بھاگ سکتا تھا اور نہ چھپ سکتا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ پولیس کی گاڑی قریب آ کے رکے گی تو لاش دیکھتے ہی ان کا جائے واردات پر پائے جانے والوں سے پہلا سوال یہی ہوگا کہ تم کون ہو؟ لیکن اس سوال کے کسی جواب کو درست تسلیم کرنے سے بات نہیں بنتی۔ اگر وہ ایسے لوگوں کے کہے پر اعتبار کرنے لگیں تو گلشن کا کاروبار کیسے چلے۔ چنانچہ وہ سب کو مشکوک بلکہ قاتل فرض کرتے ہوئے گلشن یعنی تھانے لے جاتے ہیں اور وہاں اپنے مفروضات کو درست ثابت کرنے کی بڑے زور و شور سے کوشش کرتے ہیں، زور ان کا ہوتا ہے، شور "مبینہ ملزم" کا۔

میرے پاس تو کسی سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔ فرید عباسی پہلے ایک پولیس افسر تھا چنانچہ اپنا ہی بندہ سمجھا جا سکتا تھا۔ بقول غالب۔

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

فرید کے ساتھ جو معزز خاتون تھیں انہیں ہر کوئی نہیں پہچانتا تھا اور فرید اگر رخشی کو اپنی گھر والی قرار دیتا تو یہ بیان ہی درست تسلیم کیا جاتا اور یہ بھی کہ یہاں سے گزرتے ہوئے انہوں نے لاش پڑی دیکھی اور بس انہیں احساسِ فرض نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اب خود پولیس کو اطلاع دینے کی سوچ رہے تھے۔

میری پوزیشن بہت خراب تھی۔ میں نے ریشمی لاچا باندھ رکھا تھا اور مولا جٹ ٹائپ کرتہ بھی زیب تن کر رکھا تھا۔ میرے سر پر قراقلی ٹوپی تھی اور ہاتھوں میں مہاتما بدھ کی کسی مورتی کا سر۔ اس حلیے میں کون مجھے ماہر آثارِ قدیمہ یا نوادرات جمع کرنے کا شوقین سمجھ سکتا تھا۔

یہ بات اب یقینی نظر آتی تھی کہ خادم کی لاش کے ساتھ ہی میری یعنی اس کے قاتل کی شناخت ہو جائے گی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے واپس آ کے مورتی کا سر اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت خود اپنی نظر میں دنیا کا سب سے بے وقوف آدمی میں خود تھا۔ میں اچھا بھلا ایک ناگہانی آفت سے بچ کے نکل گیا تھا اور تجسس کے باعث اس سے بڑی آفت میں گرفتار ہونے آ گیا۔

جیپ قریب آ کے رکی تو اس میں سے ایک سب انسپکٹر اترا اور ایک کانسٹیبل جو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن چھوڑی گئی تھیں اور انجن بھی بند نہیں کیا گیا تھا۔

اے ایس آئی نے ایک نظر لاش پر ڈالی اور پھر ہم سب پر۔ رخشی کو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ کانسٹیبل کی نظر تو رخشی پر جیسے جم کے رہ گئی۔

"اوئے یہ تو مر گیا ہے بندہ!" اے ایس آئی نے لپک کے لاش کا معائنہ کرتے ہوئے انکشاف کیا۔

کانسٹیبل نے چونک کے کہا "اچھا جی!"

اے ایس آئی نے اسے ڈانٹا "اوئے اچھا جی کیا؟ نظر نہیں آتا؟ گولی لگی ہے اسے۔ دیر ہو گئی اسے مرے۔"

کانسٹیبل نے پھر کہا "اچھا جی!"

اے ایس آئی نے کہا "خون کافی دور تک بہہ کر گیا ہے اور جم گیا ہے۔ اب اگر تم نے کہا اچھا جی تو میں جھانپڑ ماروں گا۔"

"اچھا جی!" کانسٹیبل نے کہا اور پھر فوراً ایک قدم پیچھے ہو گیا "میرا مطلب تھا کہ صحیح فرمایا آپ نے۔ قاتل ابھی تک موجود ہیں جائے واردات پر۔"

مگر ایس آئی اب فرید کی طرف متوجہ ہو گیا تھا "اوجی۔۔۔ آپ۔"

فرید عباسی نے اس سے ہاتھ ملایا "ہاں۔ میں سب انسپکٹر فرید عباسی ہوں۔ سابق سب انسپکٹر۔ تم پہچانتے ہو مجھے؟"

"اوجی۔۔۔ آپ کے ساتھ ہی تھا میں جب ہم گڑھی شاہو میں ایک جوئے کے اڈے پر چھاپا مارنے گئے تھے۔ صوفی ڈانگ والے کا اڈا۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ دراصل کافی نفری تھی۔۔۔" فرید عباسی نے کہا "مجھے فوراً یاد نہیں آیا۔ بڑا کامیاب چھاپا تھا۔۔۔ سب پکڑے گئے تھے۔"

"ہاں جی!" وہ مایوس لہجے میں بولا "اس وقت تو پکڑے گئے تھے بعد میں سب چھٹ گئے۔ کیا فائدہ ہوا؟ اچھا تھا آپ اسی وقت چھوڑ دیتے جب صوفی ڈانگ والا۔"

"چھوڑو وہ بات۔۔۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے اور آج جو میں پولیس میں نہیں ہوں تو اسی لیے نہیں ہوں کہ مجھے کک مکا کرنا نہیں آتا تھا۔ نالائق افسر تھا میں۔" فرید نے تلخی سے کہا۔ "چلو، اب تم آ گئے ہو تو سنبھالو اس کو۔ میں بھی گھر جا کے ہی فون کرتا۔"

اے ایس آئی نے ایک نظر لاش کی طرف دیکھا "اپنے عباسی صاحب۔ میں تو خود گھر جا رہا تھا، ڈبل ڈیوٹی دے کے آیا تھا۔۔۔ میری مانو تو آپ بھی جاؤ اپنے گھر اور میں بھی چلتا ہوں۔"

"تم ادھر ہی رہتے ہو؟"

"ادھر سے شارٹ کٹ ہے۔ اور آگے موڑ پر حلوائی کی دکان ہے۔ ایک پیالہ دودھ پیڑے والا پینے کے لیے جا رہا تھا۔ پیڑے واہ واہ ہوتے ہیں اس کے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑ سکتا۔"

"گیا۔۔۔ تم کچھ نہیں کرو گے" عباسی نے خفگی سے کہا۔

"اوجی۔ یہ میرا علاقہ نہیں؟ متعلقہ تھانے والوں کو فون کر دیں آپ ورنہ میں بتا دوں گا۔" وہ پھر جیپ میں بیٹھ گیا "ایویں آپ کو بھی دخت پڑ جائے گا۔ خواہ مخواہ بیان اور گواہی۔۔۔ دیکھو نا آپ کے ساتھ۔"

"بیوی ہے میری۔۔۔" عباسی نے کہا۔

"اور یہ دوسرا بندہ۔۔۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

"میرا بھائی ہے" عباسی نے کہا۔

ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پر سکون کا سانس لے کر اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بدھ کی مورتی کا سر تو وہیں چھوڑ دیا تھا اور خود رخشی کے اشارے پر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

"چل اوئے!" اے ایس آئی نے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

رخشی کو گھورنے والے کانسٹیبل نے آہ بھر کے کہا "اچھا جی!" اس نے یہ دو الفاظ چار مرتبہ بولے تھے مگر ہر بار لہجے سے ان کا مفہوم اور تاثر بدل دیا تھا۔

"باؤ جی۔ آپ بھی نکل جاؤ۔ آپ تو پولیس میں رہے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ بندے کو پرائے معاملات سے جان چھڑانی چاہیے۔ خواہ مخواہ کا پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

جب جیپ چلی گئی تو رخشی نے کہا "سر ایسے مت کھڑے رہیں۔ صبح مشورہ دے کر گیا ہے آپ کا سابق نائب۔۔۔"

فرید عباسی نے ناراضی سے کہا "بدنام کر دیا ہے ایسے الو کے پٹھوں نے پولیس کو۔ اسے پیڑے والے دودھ کی زیادہ فکر ہے۔ کہتا ہے علاقہ نہیں ہے میرا۔ اس کے باپ کی لاش پڑی ہوتی یہاں تو میں پوچھتا۔"

"فرید، خدا کے لیے چلو" رخشی نے منت کی۔

میں نے کہا "خدا نے بال بال بچایا۔۔۔ بس میں تلاشی

سیمافون کا ایک سنسنی خیز فراموش ناول

کوری آنکھیں

(دو جلدیں)

قیمت فی جلد -/150 روپے ڈاک خرچ -/20 روپے

● ایک نوجوان کی داستانِ الم جس نے خواب دیکھے اور انہیں اپنی کوری آنکھوں میں سجا لیا۔

● ایثار اور بے لوث محبت کی ایسی داستان جو آپ کی جذباتی دنیا میں ہلچل مچا دے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے لوں اس کی' ہے تو یہ خلاف قانون مگر قانون کہاں ہے باسی صاحب! وہ تو مر گیا۔"

خادم کی کسی جیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے جلدی ری تلاشی لی اور پھر چغلوں کی جیب میں دیکھا۔ اس کے ں ریوالور تو کیا پرس بھی نہیں تھا پھر پرس مجھے اس کے یب ہی پڑا نظر آیا۔ وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا مگر میں نے سے اٹھالیا۔

فرید نے ناگواری سے کہا "یار' یہ غلط ہے۔"

میں نے کہا "صحیح کیا ہے یہاں؟ آپ صحیح تھے۔ غلط دی قرار دے کر نکالے گئے۔ بس اب نکل چلو دوست۔"

میرے بیٹھتے ہی عباسی بھی بادلِ ناخواستہ ڈرائیونگ ٹ پر بیٹھا۔ اس کی صورت سے صاف ظاہر تھا کہ قانونیت کے اس مظاہرے سے وہ ذرا بھی خوش نہیں ہے۔ یک سب انسپکٹر اور کانسٹیبل جو وردی میں تھے' فرض شناسی ے چکر میں پڑے بغیر شاید منت کا پیڑے والا دودھ پینے چلے ئے تھے۔ میں نے جائے واردات پر واقعاتی شہادتوں کو ضائع لیا تھا اور لاش کو چھیڑا تھا۔ ایک آدمی سڑک پر قتل ہوا پڑا ا اور ہم میں سے کوئی کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ب جائے واردات سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔

"کتنی افسوس ناک بات ہے یہ" فرید عباسی نے گاڑی کو موڑتے ہوئے کہا "بے حسی کی انتہا ہے۔ آخر ایک انسان ا مرنے والا۔"

میں نے کہا "تم جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ کوئی شریف آدمی ہیں تھا۔ اس کی وجہ سے ہم سب مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ وہ یرا تعاقب کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کیا چاہتا ا اور اس کے قاتل کیا چاہتے تھے۔"

رخشی نے کہا "اور اس شخص نے ناصر کو تختہ دار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"ہاں۔ خادم اور عثمان نے مجھے اپنا قاتل بنا دیا تھا۔ یہ یک ایسے وطن دشمن گروہ کا آلۂ کار تھا جو ہمارے ملک کا تاریخی ورثہ چوری کر کے اپنے خزانے بھر رہے ہیں۔ یہ غدار ہیں اور ڈاکو ہیں۔ ہمیں اس گروہ کا سراغ لگانا ہے یا نہیں؟"

فرید نے سہلایا "سراغ تو لگانا ہے۔"

"کیسے سراغ لگائیں گے ہم؟ قانونی طریقے سے؟ تم نے تو دیکھا ہے پولیس کا طریقۂ کار۔"

رخشی نے کہا "ابھی تو یاد دلا کے گیا ہے تمہیں وہ سب انسپکٹر ایک بات۔ تم نے بڑی فرض شناسی اور ایمانداری کا مظاہرہ کیا تھا' ٹک مکا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید لاکھوں کی پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی تھی مگر انجام کیا ہوا' وہ لاکھوں کسی اور نے لے لیے۔"

"تمہارے قانون کے مقابلے میں صوفی ڈانگ والے کی طاقت زیادہ تھی۔ وہ باعزت طور پر آج بھی جوئے کا اڈا چلا رہا ہوگا۔ تم بے عزت ہو کے نکلے پولیس کے محکمے سے۔"

"خدا کے لیے گھر جا کے اپنا حلیہ بدلو۔ خون کے داغ والے کپڑے جلا دو' یہ پرس دیکھ لو اور پھر پھینک دو کسی گٹر میں۔ اس مورتی کے سر کا کیا کرو گے تم؟" فرید عباسی نے کہا۔

"اس سے کیا سراغ ملے گا؟"

"یہ بدھ کی مورتی کا سر ہے۔ ایک عظیم سر۔ اس پر ریسرچ کریں گے ہم کہ اس میں بھوسا ہے یا یہ خالی ہے اندر سے رخشی کے سر کی طرح۔"

فرید نے اچانک گاڑی روک لی "آگئی غالباً پولیس" اس نے بیک ویو مرر میں دیکھ کے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ خادم کی لاش کے پاس ایک سوزوکی پک اپ آ کے رکی تھی۔ اس میں سے دو افراد اترے اور انہوں نے بڑی پھرتی سے خادم کی لاش کو اٹھا کے پک اپ میں ڈال دیا۔ پک اپ غرا کے روانہ ہوئی اور ایک منٹ بعد ہمارے پاس سے گزری۔

میں نے کہا "یار فرید' اس کے پیچھے چل۔۔۔ ریوالور ہے؟"

فرید نے گاڑی کو ایک دم آگے بڑھایا "ان کی تو ایسی تیسی۔"

رخشی نے خوف زدہ ہو کے کہا "فرید۔۔۔ جانے دو انہیں۔"

فرید نے کہا "میں گاڑی روکتا ہوں۔ تم اترو' وہ سامنے ہے ہمارا گھر۔۔۔ کم آن۔"

فرید نے رخشی کو تقریباً باہر دھکیل دیا تھا مگر اس نے مزاحمت کی "یہ کیا کر رہے ہو؟ چلتی گاڑی سے گراؤ گے مجھے۔۔۔ میں نہیں اتروں گی۔"

"ڈونٹ بی اے فول۔"

میں نے کہا "فرید۔ اتنی دیر میں تو وہ نکل جائیں گے۔"

"او کے' او کے!" فرید نے جھلا کے کہا اور گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ ابھی تک سوزوکی پک اپ ہماری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ سوزوکی پک اپ نے موڑ کاٹا۔ شاید ایک منٹ کے فرق سے فرید اس موڑ تک پہنچا۔ جب رخشی نے چیخ ماری تو مجھے خطرے کا احساس ہوا۔

باڑھ کے فوراً بعد سڑک کا آدھا حصہ کھدا پڑا تھا۔ مٹی کے ڈھیر سے اندازہ ہوتا تھا کہ سڑک کو کم سے کم تین فٹ کی گہرائی تک ضرور کھودا گیا ہے۔

رخشی آگے تھی۔ اس کی نظر نے خطرے کو پہلے سے دیکھ لیا تھا لیکن فرید اناڑی ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ کو بائیں طرف کاٹا اور گاڑی کو بحفاظت نکال کے لے گیا۔

آگے سڑک بالکل خالی پڑی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں خاموش کھڑی ہوئی گاڑیاں بھی محوِ خواب لگتی تھیں۔ ان میں چند ٹرک تھے جو کہیں اور کھڑے نہیں کیے جا سکتے تھے۔ کچھ زیرِ مرمت گاڑیاں تھیں جو ورکشاپوں کے سامنے معذوری کی حالت میں کھڑی تھیں۔

لیکن ان میں ایک بھی سوزوکی پک اپ نہیں تھی۔

میری نظر آگے تقریباً ایک کلومیٹر تک اسٹریٹ لائٹس کو روشن دیکھ رہی تھی۔ ایک کھمبے کے پاس کوئی ہیروئن کے نشے کا عادی اور ایک کتا ساتھ ساتھ پڑے سو رہے تھے۔

"فرید۔ کہاں گئی وہ گاڑی؟" رخشی نے کہا۔

میں نے کہا "کمال ہے۔ یہی سوال میں کرنے والا تھا تم سے۔"

فرید نے شعلہ بار نظروں سے رخشی کو دیکھا "اتنی زور سے چیخ کیوں ماری تھی تم نے؟"

میں نے کہا "موڑ پر ہارن دینا چاہیے' رخشی نے ہارن دیا تھا۔"

رخشی نے خفت سے کہا "وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ مٹی کا ڈھیر آگیا تھا سامنے۔"

"اور تم چیخ نہ مارتیں تو میں سیدھا اس کے اوپر سے گزر کے نالے میں گر جاتا" فرید نے کہا "گاڑی میں چلا رہا تھا۔ نظر بھی ٹھیک ہے میری اور ڈرائیونگ بھی۔"

"چل چھوڑ یار۔ بے وجہ چیخ مارنا خواتین کے بنیادی حقوق میں شامل ہے" میں نے کہا۔

"حادثہ نہ بھی ہو تو ہو جائے۔ میں گھبرا جاتا اور دیکھتا اس کی طرف تو ہو جاتا کام تمام۔"

رخشی نے کہا "رفتار بہت زیادہ تھی تمہاری۔"

"ہم پیچھا کر رہے تھے کسی کا۔ تفریح نہیں فرما رہے تھے۔ اسی لیے کہا تھا کہ تم اتر جاؤ۔"

"او کے بابا۔ آئی ایم سوری!" رخشی جھلا کے بولی "اب کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

فرید نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ دائیں، بائیں کسی گلی میں نہ گھس گئے ہوں۔"

میں نے کہا "یہی کیا ہوگا انہوں نے۔ وہ اوپر نیچے تو غائب ہو نہیں سکتے تھے مگر اب ہم گلیوں کی خاک تو چھاننے سے رہے۔"

فرید نے گاڑی کو یو ٹرن دیا "شاید شک ہو گیا انہیں کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ پھر بھی' ایک منٹ میں چھلاوہ بن کے غائب ہو جانا کمال ہے۔ تم نے نمبر دیکھا تھا؟"

"آگے تم دونوں تھے۔"

"میں گاڑی چلا رہا تھا' رخشی فارغ تھی۔"

"تم نے کیا آنکھیں بند کر رکھی تھیں گاڑی چلاتے ہوئے" رخشی نے خفگی سے کہا۔

واپسی میں ہم پھر اس جگہ سے گزرے جہاں پانی اور سیوریج کی لائن ڈالنے کے لیے سڑک کو کھودا جا رہا تھا۔ وہ مزدور اب بیلچے سے مٹی کو واپس تین چار فٹ گہری نالی میں ڈال رہے تھے۔

رخشی نے کہا "یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ رات کے وقت سڑک کھودنا۔"

میں نے کہا "یہ کام ایسے ہی ہوتا ہے۔ جہاں دن میں ٹریفک زیادہ ہو وہاں سڑک بند کرنے سے ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کام رات کے وقت کرتے ہیں۔ آج آدھی سڑک کھود کے لائن ڈالی ہے اور سڑک کے کھدے ہوئے حصے کو صبح تک مٹی ڈال کے برابر کر دیں گے۔ صبح ٹریفک رکے گا نہیں۔ باقی کام پھر رات کو ہوگا اور باقی آدھی سڑک کے نیچے لائن بچھا دیں گے۔ تیسری رات کو کھدی ہوئی جگہ پر رولر چلا کے سڑک برابر کر دیں گے۔"

فرید نے کہا "شکریہ۔ یہ کتنی غلط بات ہے۔ ایسے موڑ پر کام ہو رہا ہے اور کوئی وارننگ سائن نہیں۔ کوئی تیزی سے آ رہا ہو بے خیالی میں تو سیدھا اندر۔"

میں نے کہا "بہت خوب۔ یعنی موڑ پر تیز بھی آ رہا ہو اور اس کا دھیان بھی کہیں اور ہو پھر تو اس کے ساتھ رخشی جیسی خاتون ضرور ہونی چاہیے جو بروقت چیخ مار کے خبردار کر دے۔"

ہم نے واپس پہنچ کے گیٹ کو آواز کیے بغیر کھولا اور فرید انجن بند کر کے گاڑی کو اندر لے گیا۔ چند فٹ کا فاصلہ گاڑی نے اپنی رفتار میں طے کر لیا۔ فرید نے اور رخشی نے پوری احتیاط کے ساتھ گاڑی کے شیشے چڑھائے اور میں نے باہر والے گیٹ کو آہستہ آہستہ کھینچ کے خاموشی سے بند کیا پھر اسی احتیاط کے ساتھ میں نے اندر والی کنڈی میں لاک لگایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس مہم کا انجام خیر وعافیت کے ساتھ ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے ایک ہاتھ میں ابھی تک مقتول خادم کی جیب سے نکل کر سڑک پر گر جانے والا پرس تھا۔ گون کے زخم سے نکلنے والا خون بہہ کر سڑک پر جم گیا تھا اور سیاہ چمڑے کے پرس کے کنارے بھی خون آلود تھے۔ یہ خون جیلی کی طرح میری انگلیوں میں چپک رہا تھا۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا ہاتھ کسی بھی چیز سے مس نہ ہو۔ گاڑی کی سیٹ' دروازے کے ہینڈل اور خود میرے اپنے کپڑوں کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے میں نے اس ہاتھ کو کسی نجس چیز کی طرح دور رکھا تھا۔ واضح نہ ہونے کے باوجود میں لہو کی سرخی کو اور موجود نہ ہونے کے باوجود میں اس کی مہک کو محسوس کر سکتا تھا اور اپنے ہاتھ پر انسانی خون کی چپچپاہٹ سے مجھے عجیب سی وحشت انگیز کراہیت کا احساس پریشان کر رہا تھا۔

فرید نے سرگوشی میں کہا "اماں جاگ رہی ہیں۔"

میں نے گھبرا کے کہا "ابے یار' میں کیا کہوں گا ان سے؟"

فرید نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا "وہ وضو کر رہی ہیں یا پھر جائے نماز پر ہیں۔"

رخشی نے چوروں کی طرح پہلے باہر والا دروازہ کھولا جس پر فلائی پروف جالی تھی۔ اسے اندر کی طرف دبائے رکھنے والا اسپرنگ خود کار نظام کی طرح بند کر دیتا تھا۔ اندر والا ٹھوس شیشم کی لکڑی کا بھاری دروازہ لاک میں چابی گھمانے سے کھلتا تھا۔ رخشی نے چابی گھمائی تو معمولی سا کھٹکا ہوا مگر صبح کی خاموشی میں اور کچھ اپنے خوف کے باعث یہ آواز ہمیں بہت زیادہ محسوس ہوئی۔

فرید کے پیچھے میں اندر چلا گیا تو رخشی نے بے خیالی میں فلائی پروف دروازے کا پٹ چھوڑ دیا۔ سخت اسپرنگ کے دباؤ سے وہ ایک دم آگے آیا اور دھماکے سے چوکھٹ پر لگا۔

فرید اچھل پڑا "بے وقوف۔" اس نے دانت پیس کے آہستہ سے کہا۔

"سوری!" رخشی کے حلق سے مری مری آواز نکلی۔

"کون ہے؟" اندر سے فرید کی ماں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"میں ہوں امی!" فرید نے جواب دیا اور لائٹ جلا دی۔ اس نے رخشی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر بھاگ جائے۔ میں بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کے باتھ روم میں گھس گیا۔ اندر کی لائٹ جلا کے میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خادم کے پرس کو ڈھکنا اٹھا کے فلش ٹینک میں ڈال دیا۔ ڈھکنے کے اوپر گول ہینڈل سا تھا جسے اوپر کھینچنے سے ڈبلیو سی میں پانی۔ تیز آواز کے ساتھ نکلتا تھا۔ ڈھکنا اٹھانے سے بھی یہی ہوا۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں" میں نے دروازے سے کان لگا کے فرید کی ماں کی آواز سنی۔

"وہ۔۔۔ امی ناصر آیا ہے۔"

"ناصر کہاں ہے ناصر؟"

فرید نے کہا "اندر آتے ہی سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔"

"خیریت تو ہے نا؟"

فرید نے کہا "ابھی آپ خود ہی پوچھ لینا' وہ باہر آئے تو۔ مجھے تو اس نے سلام بھی نہیں کیا اور تیر کی طرح اندر چلا گیا۔ حالانکہ سلام کا جواب دینے میں کوئی دیر نہیں لگتی کہ پتلون خراب ہونے کا ڈر ہو' ہے نا پاگل!"

"مجھے کیا پتا۔ جیسا خود ویسے تیرے دوست" انہوں نے کہا "اچھا میں ذرا نماز پڑھ لوں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنے ہاتھوں کو صابن سے رگڑ رگڑ کے دھونے لگا پھر مجھے پرس کا خیال آیا۔ بدحواسی میں مجھے فلش ٹینک ہی محفوظ جگہ نظر آئی تھی۔ میں عقل سے کام لیتا تو اسے روشندان کی چوکھٹ پر بھی رکھ سکتا تھا۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ پانی میں بھیگ کے کاغذات خراب ہو سکتے تھے۔ آج کل پین کے مقابلے میں بال پوائنٹ زیادہ استعمال ہوتا ہے اس کی تحریر پانی سے متاثر نہیں ہوتی مگر قلم کی تحریر یقیناً ضائع ہو سکتی تھی۔

میں نے پھر فلش ٹینک کا ڈھکنا اٹھا کے پرس نکالا۔ ایک بار پھر پانی بہا تو مجھے اس کے رنگ میں معمولی سی لالی نظر آئی۔ یہ خادم کے خون کی لالی تھی جو انسان کی زندگی کا ضامن اور نسلی رشتوں کا معتبر حوالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو محترم ہوتا ہے اور معاف نہیں کیا جاتا۔ وہ خون بہہ کر پتھر اور تارکول کی سڑک پر پھیل گیا تھا جہاں اسے تمام دن سورج کی دھوپ سکھائے گی اور اس پر سے گزرنے والی گاڑیوں کے دوڑتے ہوئے ٹائر اسے گھس گھس کر صاف کرتے جائیں گے یہاں تک کہ شام تک لہو کا ایک قطرہ کسی قاتل کا سراغ دینے والا نہ ہوگا اور وہ خون فلش کے پانی میں مل کے نالی کے راستے گٹر لائن کی غلاظت کا حصہ ہو گیا تھا۔

خون بھی اپنا اپنا نصیب رکھتا ہے۔

پرس کے اندر کی ایک پاکٹ میں سات ہزار کے بڑے نوٹ تھے۔ دوسری پاکٹ میں کم ترمالیت کے نوٹ تھے جو میں نے شمار کیے بغیر واش بیسن میں ڈال دیے۔ چھوٹی اور نظرتہ

آنے والی ایک پاکٹ سے مجھے خادم کے کارڈ ملے جن پر اس کا نام خادم مرزا۔ اور اس کے ساتھ ڈائریکٹر لکھا ہوا تھا۔ نیچے ایک کاروباری ادارے کا نام تھا جس کا وہ ڈائریکٹر سمجھا جاتا تھا۔ "خادمین ایسوسی ایٹس' امپورٹ' ایکسپورٹرز۔"

کارڈ پر وہ تمام بنیادی معلومات دستیاب تھیں جن سے کسی فرد کا تعارف مکمل ہوتا ہے۔ اس پر کاروباری ادارے کا مکمل پتا تھا۔ ٹیلی فون نمبرز تھے اور فیکس نمبر تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ خادم حسین کوئی پرچون فروش یا بیوروکریٹ یا فیکٹری کا مالک نہیں تھا۔ وہ ملک سے مال باہر بھیجتا تھا اور باہر کے ملکوں سے مال منگواتا تھا۔ بہت سیدھا سادہ عام سا بے ضرر نظر آنے والا قانونی کاروبار جس پر نہ کوئی شک کر سکتا ہے اور نہ اعتراض لیکن غور کیا جائے تو یہ ایک مبہم سا پردہ تھا۔ ایک رسمی سا رازداری کا انداز تھا۔ سمجھنے والے تو خیر سمجھ ہی جاتے ہیں کہ بقول شاعر

تم بھی کچھ اچھا سا رکھ لو اپنے دیوانے کا نام

کباب بیچنے والے اگر اسنیک بار اور فاسٹ فوڈ کے نام سے مشہور ہوتے ہیں تو اسمگلر کسی تکلف کے بغیر امپورٹر ایکسپورٹر کہلانے لگتے ہیں۔ کوئی غیر متعلق شخص پوچھے کہ کیا لاتے ہو اور کیا لے جاتے ہو تو گول مول سا جواب کہ "جنرل آئیٹم" ورنہ جن سے معاملہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کہاں سے کیا کیسے آتا ہے اور کہاں سے کیا کیسے جاتا ہے۔

پرس میں سے ایک پاکٹ ٹیلی فون ڈائری بھی برآمد ہوئی مگر اس کے آدھے صفحات غائب تھے۔ پھاڑے جانے والے صفحات کے بقیہ حصے خود بخود الگ ہو گئے تھے۔ یہ سب سادے صفحات تھے اور بھیگ کر قابلِ استعمال بھی نہ رہتے۔ ایسا لگتا تھا کہ جن صفحات پر فون نمبر لکھے ہوئے تھے انہیں حال ہی میں الگ کیا گیا تھا۔ خادم نے اپنی سہولت کے لیے کچھ ضروری ٹیلی فون نمبرز لکھ کر ساتھ رکھے ہوں گے۔ بعد میں خود اسے احساس ہوا کہ یہ احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہے یا کسی اور نے اسے کہا کہ پاگل کے بچے' خود پکڑا گیا کبھی تو وہ سب خواہ مخواہ چکر میں آجائیں گے جن کے فون نمبر تیرے پاس سے برآمد ہوں گے۔ یہ فون نمبر کاروباری تعلق رکھنے والوں کے نہیں ہو سکتے تھے۔ خادم یا عثمان جیسا کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ اپنے غیر قانونی رابطوں کا سراغ دینے کا خطرہ مول لے۔ یہ نمبر دوست احباب اور رشتے داروں کے ہوں گے مگر مچھیرے کے جال میں صرف مچھلی نہیں پھنستی۔ کیچوے پے کچوے تک اور کیکڑے سے مگرمچھ تک سب ہی پکڑے جاتے ہیں۔ بُرا وقت آجائے تو اچھائی بھی برائی بن جاتی ہے اور جن سے کوئی کاروباری رشتہ نہ ہو وہ بھی مجرم ہو جاتے ہیں۔ ایک بات یقینی تھی کہ صفحات کو جلانے والی رات پرچی نے پھاڑ کے الگ نہیں کیا تھا۔

"ابے یار کیا سچ مچ جلاب لگ گئے ہیں" فرید نے باہر سے دستک دی۔

میں نے دروازہ کھول کے اسے مدعو کیا "تشریف لائیے۔"

"جی نہیں۔ آپ آجائیں باہر۔ اماں کہیں نماز پڑھنے۔"

میں نے کہا "اللہ نے بال بال بچایا مجھے جھوٹ بولنے سے۔"

فرید نے کہا "کیا بات بنائی میں نے بھی۔ اماں کو ذرا بھی شک نہیں ہوا۔"

میں نے باہر آ کے کہا "یہ فخر کی نہیں' شرم کی بات ہے کہ ماں جیسی مقدس ہستی کے سامنے تو نے نہار منہ ایسا جھوٹ بولا۔"

"اچھا میں ابھی سچ بتا دیتا ہوں۔ الٹا مجھے شرمندہ کر رہا ہے تو۔" فرید نے خفگی سے کہا۔

رخشی نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا "بھئی یہ کیا شور شرابا ہے صبح صبح۔ نیند خراب کر دی میری۔"

میں نے کہا "نیند کا خمار تمہاری آنکھوں سے ٹپ ٹپ ٹپک رہا ہے' اس طرح جیسے تمہارے لبوں سے۔"

"لیکن اب تم خواب خرگوش سے جاگ ہی اٹھی ہو' تو جاؤ چائے بنا لاؤ۔ یار' کیا کہتے ہیں اردو میں۔۔۔ خرگوش کی نصف بہتر کو۔"

"انسانی معاشرے کے برعکس" میں نے کسی فلسفی کی طرح کہا "خرگوشی معاشرے میں نہ کوئی نصف بہتر ہے اور نہ نصف بدتر۔"

رخشی نے ایک آہ بھری "اگر ہم خرگوش ہوتے تو اس وقت چائے بنانے کے لیے تم جاتے۔"

میں نے کہا "مگر مسز خرگوش کی حیثیت سے تمہیں دیگر سنگین مسائل کا سامنا ہوتا۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسٹر خرگوش ہر سال کتنے بچوں کے باپ بنتے ہیں؟"

رخشی جھینپ کر ہنسی اور چلی گئی۔ میں نے خادم کا پرس اور اس میں سے برآمد ہونے والی چیزیں فرید عباسی کے سامنے رکھ دیں جن کا معائنہ اس نے ایک پولیس مین کی کھوج لگانے والی نظروں کے ساتھ کیا اور دوبار سہلا کے کہا "ہوں۔"

"یہ کیا ہوں ہوں لگا رکھی ہے' کچھ پتا چلا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے گہری سوچ میں ڈوب کے کہا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ۔"

میں سسپنس میں مبتلا چند سیکنڈ خاموشی سے اس کی صورت پر طاری سنجیدگی کو دیکھتا رہا "آگے بھی کچھ فرمائیے' کیا نتیجہ نکلا؟"

"یہی کہ ہم نے آپ کے ساتھ مل کے جھک ماری خواہ مخواہ۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔" فرید نے نوٹ اپنے پرس میں رکھ کے خادم کا پرس مجھے پیش کیا۔

"کیوں؟ آپ کو حاصل ہوئے مال غنیمت کے سات ہزار آٹھ سو ستاون روپے" میں نے جل کے کہا "اس کے علاوہ بدھ کی مورتی کا ایک سر۔"

"ہاں۔ اس کو سامنے رکھ کے کوئی عامل سوال کرے تو بدھ کی روح شاید اپنے گیان سے کچھ بتادے" فرید بولا "ورنہ اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس ایڈونچر کے نتیجے میں بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ پولیس کی گاڑی علاقے کی ہوتی تو آپ اندر ہوتے۔ اس مورتی سمیت اور پھر جو خادم کی لاش اٹھا کے لے گئے' کیا وہ خادم کی جگہ آپ کو لٹا کے نہیں جاسکتے تھے۔ گاڑی کا ہم نمبر تک نہیں دیکھ سکے مگر گاڑی والے ہمیں تعاقب کرتا دیکھ لیتے تو۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "اچھا کیا جو اوپر والوں نے مجھے پہلے ہی نکال باہر کیا پولیس کی نوکری سے ورنہ مقابلہ ہوتا چوروں ڈاکوؤں سے تو اے ایس آئی فرید عباسی ایسے ہی سوالات پر غور فرماتے رہ جاتے کہ جو ہوتا یوں تو کیا ہوتا نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔"

فرید کی ماں دوپٹہ ٹھیک کرتی اندر آئی۔ میں نے انہیں اٹھ کر سلام کیا۔

انہوں نے دعا دی "جیتے رہو۔ اتنی صبح کہاں سے آئے ہو۔ تمہارے لیے تو ابھی رات ہی تھی۔ خیریت ہے نا سب؟"

میں نے کہا "جی ابھی تک تو ہے۔"

"اللہ خیریت ہی رکھے گا۔ تم تو گئے تھے کسی سے ملنے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "جی گیا تو تھا ملنے مگر بچھڑ گیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ سامنے بیٹھ گئیں۔

"مطلب یہ کہ فائدہ کوئی نہیں ہوا" میں نے سنبھل کے کہا۔

"تو کیا آدمی صرف فائدے کے لیے ملتا ہے کسی سے۔"

میں نے انہیں مطمئن کردینا بہتر سمجھا "میں گیا تھا کرنل خان سے ملنے مگر وہ بیمار ہیں اور اسپتال میں لیٹے ہوئے ہیں۔ کوما کی حالت میں۔ ان کے پاس ٹھہرنا لاحاصل تھا۔ طبیعت زیادہ مکدر ہوتی۔ واپس آرہا تھا تو ایک بلا خواہ مخواہ پیچھے لگ گئی۔"

"کیسی تھی وہ بلا۔ زنانہ کہ مردانہ؟" فرید نے لقمہ دیا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ عادت کے مطابق آپ نے آگے بڑھ کے اس بلا کو گلے لگانے کی کوشش کی ہو" یہ بات رخشی نے سینٹر ٹیبل پر چائے کے برتن رکھتے ہوئے کہی "ویسے کچھ لوگوں پر بلائیں مہربان ہوتی ہیں۔"

"آغا حشر کا ایک ڈراما ہے' خوب صورت بلا۔" فرید بولا۔

"کیا مطلب؟ یہ بھی ڈراما ہے کوئی" رخشی بولی۔

فرید کی ماں نے انہیں ڈانٹا "تم نے کیا بیچ میں اپنی بک بک شروع کردی۔ کچھ اسے بھی تو بولنے دو۔ ہاں بیٹا' تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

میں نے مظلوم اور معصوم بن کے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی مجھے شک ہوگیا کہ ایک آدمی میرا پیچھا کررہا ہے۔"

"تمہیں لوٹنا چاہتا ہوگا۔ تمہاری جیب میں جو پرس تھا اس میں سات ہزار آٹھ سو ستاون روپے تھے" فرید بولا۔

"وہ تو نکال لے ایک جیب کترے نے" میں نے کہا۔

فرید کی ماں افسوس کرنے لگی "اچھا۔ آج یہ بھی ہوا۔ ہوتا ہے بعض اوقات سارا دن خراب گزرتا ہے۔"

رخشی نے بھی ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا "ناصر کی جیب میں ٹیکسی کا کیا بس کا کرایہ تک نہیں چھوڑا۔ پیدل آنا پڑا۔"

فرید کی ماں نے کہا "جو پیچھا کررہا تھا تمہارا' وہ کون تھا؟"

میں نے کہا "ایسے ہی کوئی شرابی تھا شاید۔ بہت دیر تک میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ میں رکتا تو وہ بھی رک جاتا' پھر پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا۔"

فرید کی ماں کچھ دیر بعد اٹھ گئیں۔ معمول کے مطابق انہیں اپنے گھر کے چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کے چڑیوں کو دانہ ڈالنا تھا اور شبنم سے بھیگی گھاس پر ٹہلنا تھا۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ چندا کے رویے نے مجھے سخت دل برداشتہ اور FRUSTRATE کیا تھا۔ میں نے غصے اور جھنجلاہٹ میں دس کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پیدل طے کرکے خود کو تھکا دیا تھا۔ میرا یہ ردِعمل اس شخص کی ذہنی کیفیت کی طرح تھا جو اشتعال کی بے بسی میں اپنے آپ سے لڑے۔ چیزوں کو ٹھوکریں مارے' توڑ پھوڑ کرے اور دیواروں کو مکے مارے لیکن اس وقت جب میری اعصابی کشیدگی پر

جسمانی تھکن غالب آچکی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے چھ آٹھ گھنٹے کی نیند کی اشد ضرورت ہے ایک نئی بات ہوگئی جس نے مجھے سب بھلا دیا۔

اب صبح ہوچکی تھی اور میرے لیے سونا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں صوفے کے بازو پر سر رکھ کے نیم دراز ہوگیا۔

رخشی نے کہا "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا سوچوں۔ کیا کروں' کدھر جاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی تم آرام کرو" فرید بولا "اور کچھ بھی مت کرو۔ جب تم اٹھو گے تو بات کریں گے۔"

میں نے کہا "مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"تم ضرورت سے زیادہ آپ سیٹ ہو" فرید نے کہا۔

میں اٹھ بیٹھا "اسے تم ضرورت سے زیادہ کہتے ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ یہ جذباتی اور اعصابی دباؤ مجھے پاگل کردے گا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے اپنی شناخت کھودی ہے اور بے وجود ہوکے خلا میں تحلیل ہوگیا ہوں۔ اس سیارے کی طرح جو خلائی اسٹیشن سے چاند کے لیے پرواز کرے مگر اپنے مدار سے بھٹک جائے اور خلا میں ہی جل کے خاکستر ہوجائے۔"

"ایسا محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"وجہ ہے فرید۔ میں ناصر عظیم تھا جو شاہ عالم کی زندگی اپنانے گیا تھا لیکن ناکام رہا اور اب لوٹ کے آیا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ وہ دنیا مجھے نظر نہیں آتی جو ناصر عظیم کی دنیا تھی۔ میرا مستقبل بے یقینی کی دھند میں نظر نہیں آتا اور میرا ماضی سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ حال تو ایک لمحہ ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ آنے سے پہلے وہ مستقبل کا خیال ہوتا ہے اور گزر جانے کے بعد ماضی کی یاد۔"

"تم کو آج کی حقیقت سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ آج نہیں تو کل۔ ذہنی انتشار سے بچنے کے لیے یہ سمجھوتا جتنی جلدی کرلو اچھا ہے۔"

"اچھا تم بتاؤ' آج میں کون ہوں؟ شاہ عالم یا ناصر عظیم۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر والی مثال مجھ پر صادق آتی ہے۔ شاہ عالم کی زندگی کے حصار کو توڑ کے میں خود بھاگ آیا ہوں مگر اب مجھے ناصر عظیم کو اپنی زندگی کے حصار میں داخل ہونے کا راستہ نہیں ملتا۔ ایک راستہ چندا تھی۔ دوسرا قمر تھی۔ تیسرے خان اعظم تھے اور چوتھا فاروقی تھا مگر اب میں چاروں طرف سے مایوس ہوں۔ میں اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہوں۔ نہ شاہ عالم نہ ناصر عظیم بلکہ ایک تیسرا آدمی جو اپنے آپ کو بھی نہیں جانتا۔ جس کے پاس شناخت کا کوئی حوالہ نہیں کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ جو رشتوں اور نام و نسب سے معتبر نہیں۔"

فرید نے میرے کندھے پر تھپکی دی "جسٹ ٹیک اٹ ایزی۔ ابھی تم ریسٹ کرو۔ بعد میں بات کریں گے ہم۔"

رخشی نے کہا "ہاں۔ کوشش کروگے تو نیند بھی آجائے گی۔"

میرے انکار اور مزاحمت کے باوجود فرید نے مجھے دھکیل کر باتھ روم میں داخل کردیا۔ نہا کے میں نے فرید کے کپڑے پہنے اور خود کو خاصا بہتر محسوس کیا۔ اعصابی کشیدگی کم ہوئی تو جسم کو تکان کا احساس ہوا لیکن فرید نے کہا کہ ناشتا کرکے سونا۔ رخشی نے کچن سے اعلان کیا کہ بس پندرہ منٹ میں ناشتا لگ جائے گا۔ میں باغ میں فرید کی امی کے پاس جا پہنچا۔

سورج نکل آیا تھا اور دھوپ کی سفیدی درختوں سے چھن کر دیوار کے اوپری حصے کو روشن کررہی تھی۔ نیچے سبزے پر شبنم کی نمی میں سبزے کی مہک بڑی سکون بخش لگی۔ مختصر سے لان کی لمبائی شاید تیس فٹ اور چوڑائی اس سے آدھی تھی۔ کناروں پر موسم کے پھول تھے۔ زینیا کے چھ سات گہرے شوخ رنگوں کے بعد کاسموس کھلے ہوئے تھے۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ گل عباس کے سفید گلابی اور نیلے پھول تھے جو شام کو کھلتے تھے اور نازک بیل جیسے پودا تھے جن کو نائن او کلاک اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صبح نو بجے کے قریب کھلتے ہیں۔

"یہ سب امی کا شوق ہے" فرید نے مجھے مطلع کیا "امی کا سارا وقت انہی کے لیے وقف ہے۔ ہمیں تو گھاس بھی نہیں ڈالتیں اب۔"

میں نے کہا "گھاس ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ چر سکتے ہیں۔"

"اب میں سارا دن میں اور کیا کروں بیٹا۔ وقت گزارنے کے لیے یہی کرتی ہوں۔ اپنا شوق بھی پورا ہوجاتا ہے" فرید کی ماں نے درخت کی ایک شاخ سے لٹکے ہوئے مٹی کے پیالے میں پانی ڈالا۔ سبزے پر دانہ چگ کر فارغ ہوجانے والی چڑیاں پھر سے اڑ کر پانی پینے چلی گئیں۔

میں نے کہا "واقعی اکیلے رہ کے وقت کاٹنا بھی مشکل ہوتا ہے۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گئیں "پہلے گھر کا سارا کام میں خود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتی تھی۔ مجھے نوکر یا نوکرانی رکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔"

فرید نے کہا "اماں کو خبط کی حد تک صفائی کا شوق ہے۔ ان کا بس چلے تو گھر میں کسی کو جوتے سمیت داخل نہ ہونے دیں۔"

"تو کیا بُری بات ہے صفائی۔ نصف ایمان کہا گیا ہے صفائی کو اور یہ نوکر چاکر ایک تو خود گندے ہوتے ہیں' پھر کام کو ٹالتے ہیں۔ جہاں نظر چوکی اور کوڑا کرکٹ صوفے یا کارپٹ کے نیچے۔ پوچا آدھا لگایا' آدھا نہیں لگایا اور پھر انہی گندے ہاتھوں سے برتن دھونے شروع کردیے۔"

"اماں کا اصرار ہوتا تھا کہ برتنوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ جراثیم کش صابن سے دھونا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو واقعی ضروری ہے۔ بیشتر بیماریاں کھانے یا پانی کے جراثیم سے پھیلتی ہیں۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھولینے سے پچاس فیصد بیماریاں نہیں ہوتیں۔"

فرید کی ماں نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھا "اپنے اس دوست کو بھی سمجھاؤ' کوئی عقل کی بات۔ نہانے کا چور ہے۔ منہ دھولیتا ہے دن میں ایک بار بڑی مشکل سے۔ باہر سے آتا ہے تو نہ جوتے اتارے گا نہ ہاتھ دھوئے گا۔ بس کھانا شروع کردے گا۔"

فرید نے کہا "رہنے دیں اماں۔ یہ آپ کے سامنے باتیں بنا رہا ہے ورنہ مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے۔ رخشی سے پوچھ لو۔" میں نے کہا "میں کتنا صفائی پسند ہوں۔"

"وہ خود ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔ اماں تو متاثر ہوجاتی ہیں فوراً۔"

میں نے ٹکھنکھار کے کہا "بائی دا وے۔ یہ رخشی آخر اماں کو متاثر کرکے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ متاثر کرنے والا ڈراما کیوں کرتی ہے؟"

فرید کچھ گھبرایا "مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم؟"

فرید کی ماں نے سادگی سے کہا "خود ہے ناڈرامے باز۔ اسے سب اپنے جیسے لگتے ہیں۔ رخشی کی میں کیا تعریف کروں۔۔۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی ہے۔"

میں نے کہا "آگے میں بولوں۔۔۔ اس گھر کی ویرانی میں بہار اُتر آئی ہے۔ مایوسی کی باد سموم تھم گئی ہے اور امیدوں کے پھول کھلانے والی نسیم سحر۔"

وہ ہنسنے لگیں "مجھے نہیں آتے ایسے ڈائیلاگ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ گھر پھر گھر لگنے لگا ہے۔"

اس جملے میں "پھر" کا لفظ قابلِ غور تھا لیکن اس سے زیادہ وہ حسرت قابلِ غور تھی جو اچانک ہی ان کے لہجے میں اتر آئی تھی۔

میں نے کہا "تو بس اب جانے مت دیں اسے گھر سے۔"

میرا خیال ہے کہ ان کی بات کا مطلب بھی یہی تھا۔ یہ ان کے دل کی بات تھی جو میں نے سمجھ لی تھی اور اپنے الفاظ میں کہہ دی تھی۔

فرید نے مجھے گھورا مگر اس کی ماں نے مجھے ممنونیت کے ساتھ دیکھا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی' رخشی ناشتے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوگئی۔

فرید نے کہا "ارے۔۔۔ تم یہاں لے آئیں۔"

"ہاں۔ جاؤ اندر سے چھوٹی ٹیبل لے آؤ۔" وہ بولی۔ "میں نے سوچا کہ سب یہاں بیٹھے ہیں تو ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کیا لگانا۔"

"بڑا اچھا کیا بیٹی۔" فرید کی ماں نے خوش ہو کے کہا۔

باغیچے میں واقعی ناشتے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ مجھے بھی ایسا ہی لگا کہ یہ گھر واقعی گھر ہے۔ میں اور رخشی جو کل تک اس گھر میں اجنبی تھے' اب اس خاندان میں شامل ہوگئے تھے جو پہلے صرف دو افراد پر مشتمل تھا۔ اب ہم چاروں کے درمیان اپنائیت کا رشتہ برسوں پرانا اور حقیقی لگتا تھا۔

لیکن مجھے یہ احساس بھی بہت عجیب لگا کیونکہ ایسا تو میں نے پہلے بھی کئی بار محسوس کیا تھا۔ اس وقت جب میں ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہتا تھا اور اس کے بعد جب میں شاہدو کے ساتھ۔۔۔ ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ پھر نیلم کے ساتھ اور خان اعظم کے گھر میں رہا تھا۔ وہاں بھی مجھے اتنی ہی چاہت اور اپنائیت ملی تھی اور مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ میرا اپنا گھر ہے اور ہم سب ایک ہی فیملی ہیں۔ ہمارے درمیان خون کے رشتے رکھنے والوں سے زیادہ خلوص تھا اور اعتماد کا رشتہ تھا اور اب یہاں۔۔۔ منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی؟

ہر گھر مجھے اپنا گھر لگتا تھا جب کہ میرا گھر کوئی نہیں تھا۔ میں پھر بے گھر ہوجاتا تھا تو دربدری اور بے سکونی کا ایک دور کسی سمندری طوفان کی طرح آتا تھا۔ جب طوفان گزر جاتا تھا تو سمندر پُرسکون ہوجاتا تھا اور میں بھی کسی نئے ماحول میں اپنائیت کے نئے رشتے استوار کرلیتا تھا۔ چلتا ہوں تھوڑی دور بھر اک راہ رو کے ساتھ۔

شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے نئی پناہ گاہ میسر آجاتی تھی۔ یہ پناہ دینے والوں کی اچھائی تھی کہ وہ مجھے اپنوں

کی طرح اپنا لیتے تھے۔ خود میری سرشت میں شاید وفاداری کی استقامت نہیں تھی۔ تعلق کو استوار رکھنے کے لیے قربانی دینے اور مفاہمت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ آزمائش کی سختی جھیلنے کی طاقت نہیں تھی۔

نہیں۔۔۔ میں نے اس خیال کو مسترد کردیا۔ میں نے کب چاہا تھا کہ میں اپنے کسی گھر' اس گھر کے مکینوں اور ان کے ساتھ قائم ہوجانے والے جذبات کے رشتوں کو کسی وجہ کے بغیر ختم کردوں۔ یا ذاتی مفاد کو اپنی انا کو' تبدیلی کی خواہش کو یا ایڈونچر کو وجہ بناؤں اور ایک گھر چھوڑ کے دوسرے کو اپنا گھر سمجھنے لگوں۔ میں سندباد نہیں تھا جو اکتاہٹ اور بیزاری کے باعث نئے سفر پر روانہ ہوجاتا تھا۔ میں نے رشتے لالچ میں نہیں بدلے تھے۔ کسی کی آزمائش کی گھڑی میں ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ کسی تعلق کو مفاد پرستی اور خود غرضی کی تلوار سے ختم نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر مشہود کے گھر میں میرا رہنا بیگم صاحبہ نے ناممکن بنادیا تھا۔ شاہدو نے خود مجھے دوبار چھوڑا۔ ایک بار وہ میری دنیا سے چلی گئی تھی تو دوسری بار اس دنیا سے چلی گئی۔ اس کی زندگی کی لکیر اچانک ختم ہوگئی تھی۔ بالکل ایسے ریلوے اسٹیشن کے سامنے پھیلی ہوئی بہت سی لائنوں میں سے کسی ایک کے سامنے راستہ بند ہوجاتا ہے یا کوئی سڑک اچانک کسی کھائی یا پہاڑ کے حائل ہونے سے ختم ہوجاتی ہے۔ DEAD END یہ کس کے نوشتۂ تقدیر کی خرابی تھی جو میرا نصیب بنی۔ میں نے نیلم کو یا ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کو یا اب خان اعظم کے گھر کو اپنی خوشی اور مرضی سے کب چھوڑا تھا۔

تصور وار اگر میرے حالات تھے تو مجھے گلہ نہ اپنے آپ سے کرنا چاہیے نہ کسی اور سے۔ میں پیدائشی طور پر بے گھر نہیں تھا مگر ہوش سنبھالا تو مجھے وہ گھر نہیں ملا جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں میرے وجود کے دعوے دار ماں باپ تھے۔ میں نے اپنی عمر کا سفر اس نقطۂ آغاز سے نہیں کیا تھا جہاں سے سب کرتے ہیں۔ میری زندگی کی لکیر وہاں سے شروع نہیں ہوئی تھی جہاں سے ہر شخص کی لکیر ہوتی ہے۔ وہ کہیں درمیان سے شروع ہوئی تھی۔ اس کی ابتدا نامکمل تھی۔ شروع کا حصہ ہی غائب تھا۔ میں نے تو اچانک محسوس کیا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور میں زندہ ہوں۔ کب سے زندہ ہوں' کس کی وجہ سے زندہ ہوں' ایسے سارے سوال اس دائرے کی طرح تھے جو کوئی انگلی سے ہوا میں بنائے' بناتا جائے۔

چنانچہ ایسا ہونا ناگزیر تھا اور یہ میرے اختیار کی بات نہ تھی کہ میں قیام اور سکون کی زندگی قناعت اور آسودگی سے گزار کے گزر جاتا۔ شاہدو سے شادی کرتا۔ ہم اپنا گھر بناتے۔ بچے پیدا کرتے اور پالتے اور باری باری وقت آنے پر مرجاتے۔ یا شاہدو کی جگہ چندا آجاتی اور باقی کہانی وہی ہوتی جو سب کی آپ بیتی ہوتی ہے اور شاعر نے آدمی اور اس کی زندگی کی ساری حقیقت ایک مصرعے میں سمو کر گویا پرانے محاورے کے مطابق دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ نیا محاورہ یہ ہوسکتا ہے کہ سمندر کو ائرٹائٹ ٹن میں پیک کردیا ہے کہ ؎

لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

فرید نے مجھے جھنجوڑا تو میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ میں وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کب خیالوں سے خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔

میں نے خفت سے کہا "آئی ایم سوری!"

فرید کی ماں نے شفقت سے کہا "جاؤ اندر جا کے آرام کرو۔ تمہیں نیند کی سخت ضرورت ہے۔"

"کہہ رہا تھا نیند نہیں آئے گی" فرید ہنسا "یار' نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ چل اُٹھ' رخشی اسے لے جاؤ۔"

میں فرید کے بیڈ روم میں جا کے لیٹ گیا۔ رخشی نے سارے پردے برابر کیے اور اے سی چلادیا۔ "بس اب آنکھیں بند کرلو اور بھول جاؤ سب کچھ۔"

اچانک مجھے ایک خیال آیا "رخشی۔ وہ مورتی کا سر؟"

"فرید رکھ دے گا کہیں گاڑی سے نکال کے۔ ہم کرلیں گے مل کے سارے کام' تم فکر مت کرو۔"

"میرے وہ کپڑے' جوتے۔۔۔ جن پر خون تھا۔"

"اُفوہ۔ کہہ جو دیا کہ ہم سب سنبھال لیں گے۔ تم بس سوجاؤ۔" اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں چھ گھنٹے تک بے ہوشی کی نیند میں پڑا رہا۔ یہ نیند میرے حق میں ٹانک ثابت ہوئی۔ اٹھنے کے بعد میں نے خود کو بہت پُرسکون اور تازہ دم محسوس کیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور خاموشی تھی۔ میں نے سوچا کہ پھر سوجاؤں مگر نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی۔ وال کلاک اندھیرے میں تھا مگر اس کی روشن نظر آنے والی سوئیاں دیکھ کے مجھے پتا چل گیا کہ سہ پہر کے ڈھائی بجے ہیں۔

لیٹے لیٹے میں نے باہر کی آوازوں پر غور کیا تو آنکھ کھلنے کا سبب بھی میری سمجھ میں آگیا۔ گھر کے کسی حصے میں تیز مارخان کا چھوٹے سے جھگڑا ہو رہا تھا لیکن جھگڑے کی وجہ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندازہ کرنا مشکل تھا۔ وجہ کا ہونا کوئی ضروری نہیں تھا۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے والی بات بھی ہو سکتی تھی مگر تیس مار خان کا یہاں آنا بے سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ رئیس کے ساتھ آیا ہو گا یا اس کے کسی کام سے۔

میرا اندازہ درست تھا۔ رئیس خان اندر فرید عباسی اور رخشی کے ساتھ بڑے سنجیدہ مذاکرات میں محو پائے گئے۔

میں نے کہا "ابے نام کے رئیس عرف پھکڑ خاں۔ آخر تو ہے کہاں؟"

رئیس گرم ہو گیا "ٹوجی اسے کہتے ہیں الٹا کوتوال چور کو ڈانٹے۔"

میں نے کہا "ہمیشہ الٹا محاورہ بولے گا۔ الٹی کھوپڑی ہے تیری۔"

"ابے بھاڑ میں گیا محاورہ۔ تو بتا مجھے کہ وہ موبائل فون کہاں ہے میرا؟" رئیس نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا "وہ۔ میرے پاس ہی تھا۔ گاڑی میں ہو گا شاید۔"

"ابے شاید کے بچے۔ وہ تو نے لیا کس لیے تھا مجھ سے؟ اپن تو پاگل ہو گئے نمبر ملا ملا کے۔"

میں نے کہا "ہاں۔۔۔ وہ بند تھا۔"

"اسے بند کر کے ساتھ لیے پھرنے کا فائدہ؟ اسے پھینک دیتا کہیں تو اچھا تھا۔ تو مجھے دے، قسم اللہ کی ابھی ٹکڑے کرتا ہوں دیوار پر مار کے۔ سالے، کل سے تیرا کچھ پتا نہیں۔ جب فون کرو وہی آواز آتی ہے کہ جواب نہیں مل رہا ہے۔ خود بھی فون نہیں کیا مجھے۔"

میں نے بیٹھنے کے بعد کہا "یار، چل غصہ تھوک دے۔ تجھے فرید نے بتا ہی دیا ہو گا سب کچھ۔"

"بھائی، میں اتنا ہی بتا سکتا تھا جتنا میں نے دیکھا یا سنا۔ تو نے یہ کب بتایا تھا مجھے کہ آدھی رات کو پیدل سواری کہاں سے آئی تھی؟" فرید بولا "امی نے پوچھا تھا تو بس اتنا فرمایا تھا آپ نے کہ ملنے گیا تھا مگر بچھڑ گیا۔ اب اس کا کوئی کیا مطلب نکالے۔ ہاں خان جی کے بارے میں بھی کہا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "دراصل یار۔۔۔ اس وقت اچانک ایک نئی بات ہو گئی تھی۔ میں خود بھی خادم کے قتل اور مورتی کے سر والے معاملے میں الجھ گیا تھا اور بعد میں نہ موقع ملا۔۔۔ اور نہ کسی نے پوچھا۔ خود مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں اپنا دکھڑا لے کر رونے بیٹھ جاتا۔"

"اندازہ تو میں نے کر لیا تھا کہ صورت پر بارہ بجے ہوئے ہیں اور حالت ہو رہی ہے صحرا کی خاک چھان کر آنے والے مجنوں جیسی۔ تو معاملہ کیا ہو گا مگر میں نے بھی گریز کیا اور رخشی کو بھی منع کر دیا کہ جس بات سے ناصر کو تکلیف ہو اسے چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"اپن تو پیارے اسی لیے تیرے ساتھ نہیں گئے تھے کہ تیرا وہ کرنل خان ہے پرانا فوجی، بڈھا شیر۔ اوپر سے تو نے اس کی دُم مروڑی ہے۔ وہ تو پھاڑ کھائے گا تیرے ساتھ مجھے بھی۔ داغ دے گا دونالی بندوق تو ایک گولی لگے گی تجھے اور دوسری مجھے۔"

میں نے کہا "وہ بے چارہ اب کسی کو کیا کہے گا۔ مفلوج اور بے بس پڑا ہوا ہے۔ دکھ بہت تھا اسے میرے شاہ عالم بن کے چلے جانے کا۔"

"اس کی بیٹی کو کیا نہیں ہو گا؟" رئیس بولا۔

"اسے بہت شدید صدمہ ہوا۔ جب میں نے ناصر عظیم سے شاہ عالم بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی طرح بھی مجھے معاف کرنے پر راضی نہیں۔ خان جی سے میں نے معافی مانگی تو انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ اتنے مجبور ہیں کہ اپنی مرضی سے ہونٹ تک نہیں ہلا سکتے۔ لیکن بڑی عجیب بات ہوئی کہ میری بات پر انہوں نے سر ہلا کے جواب دیا۔ اس وقت میں اکیلا تھا ان کے پاس۔ میں نے رو دھو کے ان کی منت سماجت کی کہ میری غلطی پر مجھے معاف کر دیں تو انہوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ مسکرائے بھی تھے مگر چندا نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے جھوٹا سمجھا۔ میں اس کے لیے بالکل قابلِ اعتبار نہیں رہا یار۔"

رئیس نے مجھے تسلی دی "چل یار۔ وہ بھی مان جائے گی بعد میں۔ عورت ہے ناذرا نخرے زیادہ کرتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس کے دل میں بیٹھ گئی ہے یہ بات کہ میرے لیے کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ذاتی مفاد پر میں سب کو قربان کر سکتا ہوں۔ اس کی محبت کو بھی۔"

فرید نے کہا "اب شیشے میں بال آ گیا ہے تو آہستہ آہستہ ہی جائے گا۔"

میں نے کہا "اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ناصر عظیم ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ جب وہ نہ رہا تو ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ حالانکہ جب تک میں اس گھر کا فرد نہیں بنا تھا ان کی زندگی میں کوئی کمی نہیں تھی مگر میں رفتہ رفتہ ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گیا۔ وہ گھر ایک مثلث تھا جس کے تین ضلعے میں، چندا اور خان اعظم تھے اور

ہم سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہوئے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے۔ میں نکل گیا تو وہ مثلث ٹوٹ گئی۔ نامکمل اور ادھوری ہو گئی۔ شدید مایوسی کے عالم میں انہوں نے سب کچھ بدلے ہوئے حالات کے مطابق RESCHEDULE کیا۔ اپنے جذبات اور خیالات کا رخ موڑ دیا۔ مستقبل کے خواب بدل ڈالے۔"

رئیس نے اس کا غلط مطلب لیا "یعنی اس نے کسی اور کو پسند کر لیا اور خان جی نے بھی۔۔۔؟"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا چندا کے اختیار کی بات تھی؟ اور خان جی کے لیے کیا چندا سے یہ توقع کرنا آسان تھا کہ اب وہ کسی اور کا سہارا تلاش کر لے۔ ویسے تو ایک باپ جہاں چاہے بیٹی کی شادی کر سکتا ہے اور خان جی بھی اس فرض سے سبکدوشی کے لیے چندا سے تعاون مانگتے تو وہ کبھی انکار نہ کرتی مگر خان جی یہ ظلم کیسے کر سکتے تھے۔ انہوں نے شدید مایوسی کی کیفیت میں جو فیصلے کیے وہ چندا کی مرضی سے ہی کیے ہوں گے۔ انہوں نے اپنا سب کچھ ڈاکٹر فاروقی اور قمر کے اسپتال کو دے دیا۔ کچھ بھی نہیں رکھا اپنے پاس۔ اسے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے یار۔ یہ مایوسی کا ردِ عمل ہی تھا کہ چندا نرس بن گئی ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔"

"تو اتنا مایوس مت ہو۔ اس کا غصہ ہونا جائز ہے مگر یہ ناراضی وقتی ہے پیارے۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "بات ناراضی کی نہیں رئیس۔ ایک تو بدگمانی کے زہر نے اس کے جذبات اور احساس کو بُری طرح مسخ کر دیا ہے۔ اس حد تک کہ محبت کے آئینے میں اسے نفرت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ معلوم ہے وہ کیا سمجھتی ہے؟"

"کیا سمجھتی ہے؟"

میں نے رخشی کی طرف دیکھا "وہی جو دنیا سمجھتی ہے اور کہتی ہے۔ اس کا خیال نہیں یقین ہے کہ میں جب شاہ عالم بنا اور شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ رہا تو میں نے اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ رخشی مانتی ہے۔"

رخشی کا چہرہ سرخ پڑ گیا "اس کا یقین نہ تم دلا سکتے تھے اور نہ میں۔ صرف ہم دونوں ایک دوسرے کے گواہ تھے تو ہماری گواہی کون مانے گا۔"

فرید نے سہلایا "جو تمہارے حالات تھے۔ ان میں رخشی کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی، مجبور ہوتی۔"

"اور ہر مرد اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتا۔ فائدہ نہ اٹھاتا تو کیا پتا کسی سازشی لمحے کے چنگل میں، پھنس جاتا۔ ہر شخص خطاکار اور کمزور ہے۔۔۔ مگر خدا گواہ ہے کہ۔۔۔" میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کے ایک گہری لمبی سانس لی۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد رئیس نے کہا۔ "حسد اور شک کے معاملے میں ہر عورت برابر ہے۔ کیا پڑھی لکھی اور کیا اَن پڑھ۔"

میں نے کہا "ایک الگ معاملہ شبنم کا تھا۔ وہ سب کچھ جو اخبارات اس کے اور شاہ عالم کے تعلقات کے بارے میں شائع کرتے رہے، چندا نے اسے بھی ناصر عظیم کے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ ایک طرف اس کا دعویٰ ہے کہ وہ سب کچھ اخباروں میں پڑھتی رہی ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں پڑھا کہ صرف شبنم تھی جس نے عدالتی حکم کے باوجود مجھے شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کی مزاحمت اس انتہا تک جاری رہی جہاں بالآخر اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ ذہنی مریض ہو گئی۔ سارے زمانے نے مجھے شاہ عالم مان لیا مگر اس کے لیے یہ جذبات کی گواہی کا مسئلہ تھا جو میرے حق میں نہ تھی۔"

"لیکن بالآخر ہو گئی۔"

"یہ ویسی ہی گواہی تھی جیسی پولیس حاصل کرتی ہے۔ تھرڈ ڈگری کے طریقوں سے۔ شبنم اپنے TORTURE MENTAL کو کب تک برداشت کرتی۔ اس نے ایک ذہنی فرار میں عافیت جانی اور دل نے اپنی ہار مان لی۔ اس نے زندہ رہنے کے لیے اس یقین کی پناہ کو قبول کیا کہ میں شاہ عالم ہی ہوں۔"

رئیس نے کہا "پیارے، کل کیا ہو گا جب تو کہے گا کہ میں تو شاہ عالم نہیں، ناصر عظیم تھا۔ قسم اللہ کی قتل کر دے گی وہ تجھے۔"

میں نے چڑ کے کہا "یار، کل کی ابھی سے کیا فکر کروں میں۔ قتل کر دے مجھے جس کا جی چاہے۔"

رئیس سر کھجانے لگا۔ اس نے ایک صحیح سوال غلط وقت پر کر دیا تھا "ابے فکر کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اس سالی کے بہت نخرے اٹھاتا تھا تو۔ دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔ وہ سمجھتی ہے کہ تو پالتو کتا ہے اس کا۔ جائے گا کہاں۔"

میں نے کہا "یار، ایسا مت کہہ۔ وہ ایسی نہیں ہے۔"

"کیوں نہ کہوں، اس لیے کہ تجھے بُرا لگتا ہے۔ اتنی ذلت اٹھا کے بھی کہتا ہے کہ وہ ایسی نہیں ہے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ تو پہنچ گیا دُم ہلاتا اس کے سامنے اور لوٹنے لگا اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدموں میں کہ مجھے معاف کردو۔"
رخشی نے کہا "جس کی غلطی ہو اسے معافی تو مانگ لینی چاہیے۔ اس میں ذلت کیسی۔"
فرید نے تیز ہو کے کہا "اور جس سے معافی مانگی جائے اسے کیا کرنا چاہیے' کیا اسے بھی فراخ دلی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کچھ نہیں بھول جانا چاہیے۔ یا آدمی کو ذلیل کرکے دھتکار دینا چاہیے۔ غلطی آدمی سے ہی ہوتی ہے۔"
"عورت سے ہو تو کیا مرد معاف کردیتا ہے؟" رخشی نے بھی تیز ہو کے کہا "بڑا مہذب اور تعلیم یافتہ ہو تو تین لفظ بول کے گھر سے نکال دیتا ہے ورنہ کاروکاری جیسی رسموں پر کتنے قتل ہوتے ہیں عورتوں کے۔ غیرت کے سارے تصورات یک طرفہ کیوں ہیں۔ اس لیے کہ مردوں نے بنائے ہیں یہ معیار۔"
فرید نے ڈھٹائی سے کہا "دیکھو جی۔ ساری دنیا میں مرد کا معاشرہ ہے اور رہے گا۔ تم جتنا شور چاہو مچالو۔ ابھی یورپ اور امریکا میں یہ ذہنی انقلاب نہیں آیا۔ تم ہندوستان پاکستان میں اس کے خواب بھی مت دیکھو۔"
"شرم نہیں آتی تمہیں ایسا کہتے ہوئے۔"
"شرم کی کون سی بات ہے میرے لیے۔ جو ہے سو ہے۔ مرد شادی سے پہلے سدا کنوارہ خواہ اس کے تعلقات دسیوں سے رہے ہوں۔ سیکریٹری' ملازمہ' کلاس فیلو' پڑوسن' کزن اور رشتے دار یہاں تک کہ کوٹھے والی اور داشتہ۔ وہ سب بھی کسی کی ماں بہن یا بہو بیٹی تو ہوتی ہیں مگر کوئی اس کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو معاملہ مرد کی غیرت کا۔"
رخشی نے منہ پھلا کے کہا "اور تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو؟"
"یہ میں نے کب کہا۔ میں معاشرے کی بات کررہا تھا۔"
"اسے بگاڑنے والے مرد ہیں۔"
فرید پھر اڑ گیا "تالی کیا ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟"
میں نے کہا "یار' یہ تم آپس میں کیوں الجھ گئے۔ کیا ہم یہاں معاشرے کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے بیٹھے ہیں؟"
فرید بولا "میرا مؤقف ہے کہ چندا نے زیادتی کی۔ اسے لوٹ کے گھر آجانے والے بدھو کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا کہ بدھو پھر چلا جائے۔"
"اپن بھی یہی کہتے ہیں۔" رئیس نے اس کی تائید کی۔
"ابے یار' مرد کے لیے بس اتنا کافی ہے' وہ کہہ دے کہ چلو جو ہوا بھول جاؤ۔ نہ مانے عورت تو پیارے پھر اپنی طرح خود اسے بھول جائے۔"
میں نے برہمی سے کہا "رئیس خبیث اپنی مثال مت دے۔ تیرا کیا ہے' آج برفی ہے تو کل رس ملائی۔ پرسوں ربڑی تو اس کے بعد جلیبی۔ حلوائی کے بچے' بات ہے محبت کی۔ جو تجھے ہو جاتی ہے ہر دو سو پاؤنڈ وزن کی لڑکی سے۔"
"یار' اپن محبت کو مصیبت بنانے کے قائل ہی نہیں۔ اسی لیے اپنا تو یہی مشورہ ہے پیارے کہ بس تو بھی بھول جا اسے۔ قسم اللہ کی خود دماغ ٹھکانے آجائے گا دو دن میں۔ صاف کہہ دے کہ اچھا' تم ایسا سمجھتی ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ مزے کر شبنم کے ساتھ۔ خوب جلاسے۔"
میں نے کہا "رئیس ایسی دل دُکھانے والی بات مت کر۔ تو جانتا ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔"
"اچھا تو پھر بھاڑ میں جاؤ دونوں کے ساتھ۔"
فرید نے کہا "رئیس خان کا مطلب ہے شادی کرلے دونوں سے۔"
رئیس بولا "دو ملاؤں میں مرغی حرام ہونے والی بات تو سنی تھی۔ یہاں معاملہ الٹا ہے۔ اس مُلّا کو حلال کرنا چاہتی ہیں دو مرغیاں۔"
فرید ہنسنے لگا "لڑنے کی کیا بات ہے اس میں۔"
رخشی نے جل کے کہا "ہاں۔ ٹاس کرلیں آپس میں۔"
فرید نے افسوس سے سر ہلایا "ایسی عقل کی بات عورتوں کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔"
"مرد ہوتے تو تلواریں سونت کے سامنے آجاتے۔ ایک مارا جاتا دوسرا پھانسی چڑھ جاتا۔" رخشی بولی "زن اور زمین کو ایک جیسی ملکیت کی چیز سمجھتے ہیں۔"
رئیس بیزار ہوگیا "یار' کیا باتوں سے پیٹ بھر جائے گا۔ کوئی کھانے کی بات ہی نہیں کررہا ہے۔"
فرید نے کہا "سوری یار۔ دراصل اماں تو کھانا کھا کے ظہر کی نماز پڑھتے ہی سو جاتی ہیں۔ ہم پہلے ناصر کے اٹھنے کا انتظار کررہے تھے پھر بات ایسی شروع ہوگئی۔"
رخشی اٹھی "کھانا تیار ہے۔ ابھی دس منٹ میں لگاتی ہوں۔"
میں نے کہا "یار فرید۔ وہ مورتی کا سر کہاں ہے؟"
"گاڑی میں ہی رکھا ہوا ہے ابھی تک۔"
"تو نے نکال کے دیکھا تک نہیں۔ شرلاک ہومز اب تک اس سے قاتل کا سراغ لگا چکا ہوتا" میں نے کہا۔

"وہ تو یہ بھی پتا لگالیتا کہ سر کس مورتی کا ہے۔ وہ مورتی کس نے بنائی تھی۔ کس کس کے پاس رہی۔ سر کو دھڑ سے کب الگ کیا گیا اور کیسے۔ مورتی پر ہتھوڑا کتنے بجے مارا گیا تھا۔ ہتھوڑا مارنے والا گورا تھا یا کالا۔ دایاں ہاتھ استعمال کرتا تھا یا بایاں۔ اس دن دوپہر کے کھانے میں اس نے بیف کھایا تھا یا مٹن۔"
رئیس ہنسنے لگا "وہ اپنے زمانے میں ہوتے ہوں گے پیارے۔ تو سارے قاتل پکڑے گئے ہوتے اور پھانسی چڑھا دیے جاتے۔ لیاقت علی خان سے اب تک کتنے لیڈر قتل ہوچکے ہیں۔"
میں نے کہا "بیٹا۔ خود شرلاک ہومز کو یہاں سب سے پہلے ٹھکانے لگایا جاتا۔"
"لیکن ہم خادم اور عثمان کے قتل کا سراغ ضرور لگائیں گے" فرید نے میز پر مکا مار کے اعلان کیا۔
میں نے کہا "اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں ایک فون کرلوں۔"
فون اسی بیڈ روم میں تھا جہاں میں سو رہا تھا۔ یہ فرید کا بیڈ روم تھا اور ساری کالز اسی کے لیے ہوتی تھیں۔ فرید کی ماں کو کوئی فون نہیں کرتا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ ان کے تعلقات کا دائرہ کتنا محدود تھا۔ پاس پڑوس کے دو چار گھروں کے سوا ان کا آنا جانا کہیں نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ فرید کی ماں کے گھر والے اس وقت لاتعلق ہوگئے تھے جب انہوں نے فرید کے والد سے شادی کی تھی۔ جب فرید کی پیدائش کے سات سال بعد وہ خود شہید ہوگئے۔ وہ ایک پولیس افسر تھے۔ تو سسرال والوں نے فرید کی ماں کو غیر سمجھتے ہوئے گھر سے نکال دیا اور پھر کبھی ان کی خبر تک نہ لی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اکیلے رہ کے فرید کی پرورش کے لیے وقف کردی تھی۔
تاہم ٹیلی فون کا ایک ایکس ٹینشن فرید نے ماں کے کمرے تک ضرور پہنچا دیا تھا تاکہ فرید کی عدم موجودگی میں آنے والی کالز کا جواب دینے کے لیے انہیں بار بار اس کے کمرے تک نہ جانا پڑے۔ اب انہی کے ساتھ رخشی کا بیڈ تھا تو یہ ذمے داری بھی اس نے سنبھال لی تھی۔ وہ سوتے وقت اپنے فون کی گھنٹی بند رکھتی تھیں۔ ان کی نیند بہت کچی تھی اور ایک بار آنکھ کھل جانے کے بعد ان کے لیے دوبارہ سونا مشکل ہوجاتا تھا۔
سہ پہر کے تین بجے مجھے قمر کے گھر میں ملنے کی امید کم تھی مگر میں اس سے اسپتال میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہوتی اور اسے فون سننے کے لیے کس کے کمرے میں جانا پڑتا۔ میں نے پہلے گھر کا فون نمبر ملایا۔
پہلی گھنٹی پر ہی اس نے کہا "ہیلو!"
میں نے کہا "کیا فون سے لگی بیٹھی تھی میری منی سی بہن۔"
اس نے عادتاً ایک چیخ ماری "بھائی۔ کہاں ہیں آپ؟ بغیر بتائے چلے گئے۔ جائیں میں آپ سے نہیں بولتی" اس نے ریسیور رکھ دیا۔
مجھے معلوم تھا کہ وہ پھر گھنٹی بجنے کا انتظار کرے گی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملا کے کہا "لڑکی۔ کیا تیرا بڑا بھائی معافی مانگے گا تجھ سے۔ چل معاف کردے مجھے۔"
وہ پھر چلائی "بھائی۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ الٹا مجھے شرمندہ بھی کررہے ہیں' یہ تو بلیک میلنگ ہے۔"
میں نے کہا "بالکل ہے۔ اگر تو اب بھی نہ مانتی تو اپنی قسم دے کر منواتا۔"
"آپ آکے نہیں مناسکتے تھے مجھے؟ پہلے تو رشوت بھی دیتے تھے۔"
میں نے کہا "وہ سب چاکلیٹ کھا گئی جو میں کل لایا تھا؟"
"وہ تھے ہی کتنے۔ اور معاف کرنا بھائی' تم نے کنجوسی کی۔"
میں نے کہا "بھئی میں کیا کروں' اچھے چاکلیٹ بہت تلاش کیے مگر نہیں ملے۔"
"کہاں؟ اندرونی موچی دروازہ۔ لبرٹی اور مال روڈ پر جاتے بھائی" وہ ہنسنے لگی۔
میں نے کہا "تو اس وقت گھر پر کیسے؟"
"میں آرام کررہی ہوں" اس نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔
"پوچھیے کیوں؟"
"ظاہر ہے طبیعت خراب ہوگی۔ کوارٹر پاؤنڈ چاکلیٹ چر گئی ایک دن میں۔"
"جی نہیں۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا اور طبیعت بھی ٹھیک ہے میری بھائی!"
میں نے کہا "چل پھر تو ہی بتادے۔"
"ایک خوش خبری ہے مگر مجھے شرم آتی ہے بھائی!"
میں نے تصور میں اسے منہ چھپا کے مسکراتے دیکھا۔
"میں سمجھ گیا۔ تو مجھے ماما جی کے عہدے پر فائز کرنے والی ہے۔ رائٹ!"
"رائٹ!" وہ آہستہ سے بولی "تم ناراض ہو چندا سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائی؟"

"ہاں۔ تو نے کیسے اندازہ کیا؟"

"چندا کی باتوں سے۔ اس نے کیا کہا تم سے؟"

"اس نے مجھے اتنا ذلیل کردیا قمر۔ خود اپنی نظر میں کہ میرا وہاں ٹھہرنا بھی ممکن نہ رہا۔ اس نے کیا بتایا تمہیں؟"

قمر نے وہ سب مجھے بتادیا جو میں اسے بتانے والا تھا۔ چندا نے اس کی اور میری گفتگو بلا کم و کاست قمر اور کمال کو سنادی تھی "یہ اس نے ٹھیک نہیں کیا بھائی۔ میں نے تو بہت لڑائی کی اس سے کہ آخر اور کیا چاہتی تھیں تم۔ بھائی تمہارے قدموں میں سر رکھ کے گڑگڑائے یا ہاتھ جوڑ کے ناک سے لکیریں نکالتے۔"

"پاگل۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی؟"

"انہوں نے بھی کہا کہ تمہیں ناصر کو ایک موقع ضرور دینا چاہیے تھا۔ اس کی مجبوری کو سمجھے بغیر یہ رویہ اختیار کرنا غلط تھا۔ اس نے اگر بے عزتی محسوس کی اور غصے میں چلا گیا تو ٹھیک کیا۔"

"پھر۔؟ وہ کیا بولی؟"

"کہنے لگی کہ تمہارے دوست میں سچ کی تلخی کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مجھے الزام مت دو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے اس کے سچ کو کب تسلیم کیا؟ تم نے زبان سے بے شک نہیں کہا مگر رویے سے کہہ دیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو ناصر۔ خان جی کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلا رہے ہو کہ انہوں نے تمہیں معاف کردیا ہے۔"

"یعنی وہ اپنی بات پر قائم ہے کہ خان جی کے بارے میں جو کچھ میں نے بتایا وہ میرے ذہن کی اختراع تھی؟" میں نے دکھ اور احساسِ ذلت کی نئی خلش کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھائی۔ میں نے کہا کہ چندا تم پاگل ہوگئی ہو۔ ناصر تم سے یا مجھ سے جھوٹ بول سکتا ہے؟ اس نے بڑی بے مروتی سے کہا کہ تم تو حمایت کروگی بھائی کی مگر کیا ڈاکٹر کمال فاروقی بھی یہ مانتے ہیں کہ جب دیکھنے سننے والا اور کوئی نہیں تھا تو صرف چند سیکنڈ کے لیے خان جی کو ہوش آگیا تھا۔ اس حد تک کہ انہوں نے آنکھیں کھول کے ناصر کو دیکھا۔ مسکرائے، سر ہلا کے اقرار کیا کہ انہوں نے ناصر کو معاف کردیا ہے اور پھر کوما میں چلے گئے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ میڈیکل سائنس اس بیان کی صداقت کو تسلیم کرسکتی ہے؟"

"پھر کمال نے کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ میڈیکل سائنس قوتِ ارادی کے معجزات کو تسلیم کرتی ہے۔ ایسے ایک نہیں ہزاروں واقعات ہیں لیکن مجھے بہت رنج ہوا بھائی جب اس نے کہا کہ یہ ناصر نے بہت گھٹیا حرکت کی۔ وہ مجھ سے بات کرتا۔ شرمندگی کا اظہار کرتا میرے سامنے۔ اپنی غلطی مانتا تو میں کیا اتنی بے حس اور سفاک ہوں۔ پتھر کا دل ہے میرا کہ میں نہ مانتی مگر اس نے ڈراما کیا۔ ایک ایسے آدمی کو MISUSE کیا جو نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں۔ جو نہ تردید کرسکتا ہے اور نہ تائید۔"

"میں نے خان جی کو MISUSE کیا!" میں نے برہمی سے کہا۔

"دیکھو بھائی۔ غصہ مجھے بھی ہے" قمر رونے لگی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "تو کیوں روتی ہے پاگل؟"

"بھائی۔ میں نے اسے۔۔۔ بہت کچھ کہہ دیا۔ جو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا مگر یہ میں کیسے برداشت کرسکتی تھی۔ اس نے کہا کہ "ناصر نے میرے مرتے ہوئے باپ کی گواہی سے میرا جذباتی استحصال کرنے کی کوشش کی" پھر اس نے کہا کہ یہ صاف میری EMOTIONAL بلیک میلنگ تھی۔ اسی لیے میں نے ناصر کو بتادیا کہ اس کے بارے میں خان جی نے کیا کہا تھا۔ اپنے بارے میں خان جی کی یہ رائے اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ جو انہوں نے بقائمی ہوش و حواس دی تھی کہ چندا، کبھی زندگی میں ناصر پر اعتبار نہ کرنا۔ اسے اپنی زندگی سے اتنا پیار ہے کہ وہ تمہارے جذبات اور تمہاری زندگی کی پروا کیے بغیر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ تو پھر میں ناصر کی یہ بات کیسے مان لوں جو انہوں نے ہوش میں آئے بغیر کی" میں نے بھی سنادیں کھری کھری بھائی!"

"قمر کیا اتنا گرا ہوا آدمی سمجھتی ہے وہ مجھے؟ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے دکھ کے بے پناہ بوجھ سے کراہ کے کہا۔

"بس بھائی۔ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ میری تو بالکل بات چیت بند ہے۔ اس نے مجھے بھی ذلیل کردیا کہ میں اپنے بھائی کی ناجائز حمایت کرتی ہوں۔ آخر سمجھتی کیا ہے وہ اپنے آپ کو۔"

"قمر بات کو زیادہ مت بڑھا میری وجہ سے۔"

"اس نے تو حد کردی بھائی۔ کہنے لگی کہ میرے نجی معاملات میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ کمال نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ چندا، تم پچھتاؤ گی ایک دن اپنے فیصلے پر مگر اس وقت بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ وہ کہنے لگی کہ اچھا مجھے پچھتانے دیں۔ آپ پریشان مت ہوں۔ نقصان ہوگا تو میرا ہوگا اس غلط فیصلے سے۔ میں اس مسئلے پر کسی سے دوبارہ بات

نہیں کرنا چاہتی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس وقت وہ دہرے دباؤ میں ہے۔ ایک خان جی کی طرف سے مایوسی ہے اور ایسے میں چندا نے خود کو تنہا کرلیا ہے۔ جب اسے ہم سب کے سہارے کی زیادہ ضرورت تھی تو اس نے اکیلے رہنے کا فیصلہ کرکے خود پر ظلم کیا ہے، ابھی اسے مت چھیڑو۔"

"ہاں بھائی۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ ابھی بات کرنے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ کہیں پاگل پن میں ناصر کے بعد اس نے ہمیں بھی اپنا دشمن مان لیا تو نقصان ہوگا خان جی کا۔ وہ کہے گی کہ میں جارہی ہوں اور اپنے ساتھ انہیں بھی لے جارہی ہوں۔ کسی دوسرے اسپتال میں۔ یہاں آپ کو ناصر کی زیادہ فکر ہے اور آپ لوگ تو مجھے مجرم بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ ایسا بھی کرسکتی ہے؟"

"بھائی۔ ڈر لگتا ہے اس سے۔ اس کی ذہنی حالت کچھ ایسی ہی ہے کہ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ تم جانتے ہو وہ کتنی ضدی ہے۔ جب اکیلے رہنے اور کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس فیصلے کو بس خدا ہی بدل سکتا ہے۔ ہمارا بات کرنا بھی غلط ہوگا۔ آپ بھی اس کا خیال چھوڑ دو ابھی۔"

میں نے کہا "اچھا کیا تو نے بتادیا۔ میں اس کے سامنے بھی نہیں جاؤں گا کبھی۔"

"اس کا یہ مطلب تو نہیں بھائی کہ تم مجھ سے بھی نہیں ملوگے؟" قمر نے پھر رونے کی تیاری کی۔

"ہرگز نہیں ہے یہ مطلب۔ میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں بلاوجہ آنسو بہانے کی۔ تجھے خوش رہنا چاہیے اس حالت میں۔ سب فکریں چھوڑ دے۔ میں بھی اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔ میں امید کے ساتھ اس وقت کا انتظار کروں گا جب ہم سب اکٹھے ہوں گے اور سب کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا ہم نے سوچا تھا۔"

میرے فون رکھنے تک رخشی دوبار دروازے سے جھانک کر مجھے کھانے کے لیے بلا چکی تھی۔ قمر کی باتوں سے آج جو آئینہ خانہ بکھر گیا تھا وہ مجھے اس لیے عزیز تھا کہ اس میں میرے سارے خواب ابھی تک چراغوں کی طرح روشن تھے اور آئینہ در آئینہ ان کا عکس جھلکتا تھا تو حدِ امکاں تک مجھے اپنا مستقبل روشن نظر آتا تھا۔

اچانک آئینے نہ رہے تھے اور چراغ بجھ گئے تھے تو صرف ناامیدی اور بے یقینی کے راستوں کا تاریک سفر رہ گیا تھا جس میں اپنی منزل کا سراغ بھی نہ تھا۔ اچانک سب ختم ہوگیا تھا۔ میرے خیالوں کا ایک جزیرہ تھا جسے بدگمانی کے طوفان نے نگل لیا تھا۔ اس جزیرے پر میں نے اپنے تصور میں ایک دنیا آباد کررکھی تھی۔ وہ دنیا اچانک اُجڑ گئی تھی۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا یا شاید اس سفاک حقیقت کا ادراک ہی اصل احساسِ زیاں کا سبب بن گیا تھا ورنہ اچانک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں اس مسافر کی طرح تھا جسے خبر نہ تھی کہ اس کی جیب سے اس کی ساری کمائی نکل گئی ہے اور وہ مطمئن چلتا جارہا تھا۔ اس باپ کی طرح جس نے محنت سے پیسہ پیسہ جوڑ کے ایک صندوق کو بیٹی کے جہیز سے بھر رکھا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ چور سارا زیور گہنا جوڑے نکال لے گئے ہیں۔ اس کے لیے انکشاف اچانک ہوتا ہے۔

ایسے انکشاف کا لمحہ یقیناً بے رحم ہوتا ہے جب دل شکستگی، تہی دامنی اور بے چارگی کی اذیت اچانک تاریکی سے نکل آنے والے سانپ کی طرح ڈس لیتی ہے۔

میرے لیے ہمدردی کے الفاظ سب کے پاس تھے اور وہ سب مخلص لوگ تھے جو نیک نیتی سے مجھے مشورے دے رہے تھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے حوصلے سے کام لینا چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے خود اپنے لیے جینا چاہیے اور یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مستقبل ختم ہوگیا۔ اس حقیقت سے سمجھوتا کرلینا چاہیے کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا اور یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ چندا نے جو سمجھا یا کہا وہ کوئی آفاقی سچائی تھا کہ تبدیل نہ ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن الفاظ میرے دکھ کا مداوا نہیں تھے۔ اس کا درماں لفظ وقت کے پاس تھا۔ میں نے خود اپنے آپ کو یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ میرے رنج والم کا یہ بے بس کردینے والا احساس کسی سیلابی ریلے کی طرح ہے جو ایک بار تو سب تہس نہس کردیتا ہے مگر گزر جاتا ہے تو اجڑی بستیاں پھر آباد ہوجاتی ہیں۔ کچے گھروندے پھر کھڑے ہوجاتے ہیں اور فصلیں پھر لہلہانے لگتی ہیں اور سب ویسے ہی ہوجاتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

چنانچہ مجھے بھی مایوسی کے اس گرداب سے نکلنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا کیونکہ صرف سوچنے سے تو انتشار بڑھتا ہے اور خلفشار کینسر کی طرح پھیلتا ہے اور کرنے کو صرف محبت ہی تو نہیں ہے اور بھی غم ہیں بقول شاعر۔ جو خود ختم نہیں ہوتے مگر وقت ختم ہوجاتا ہے۔ آدمی کے پاس فرصتِ عمر بہت کم ہے اور کام بہت ہیں۔

اور میں نے اپنے آپ کو پھر اس ناصر عظیم کی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کیا جس نے اپنے سر سے یتیم خانے کی چھت کا سایہ بھی ہٹادیا تھا اور کھلے آسمان کی چھت کے نیچے آزادی سے سانس لے کر دنیا کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ آنے والی شام اور اس کے بعد رات کیسے بسر ہوگی اور کہاں بسر ہوگی۔ میں پھر بے گھر ہوگیا تھا مگر بے سہارا' بے وسیلہ اور بے حوصلہ نہیں تھا۔ میں لاوارث نہیں تھا اور گمنام نہیں تھا جیسے کہ وہ بچہ تھا۔

ذرا سی دیر کے لیے میرا وجود دو الگ سوچ رکھنے والے حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ کھانے کی میز پر موجود لوگوں کے ساتھ تھا۔ ان کی گفتگو میں شریک تھا اور ان کے مشوروں سے اختلاف یا اتفاق میں شامل تھا جب کہ دوسرا حصہ اپنے ماضی کی ویران بستی اور خوابوں کے اجڑے چمن میں کسی بدروح کی طرح بھٹک رہا تھا۔ بین کر رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے کسی سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا تھا کہ چندا ایسی نہ تھی تو پھر چندا نے ایسا کیوں سمجھا اور ایسا کیوں کیا؟

لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت کا آسیب پیچھے رہ جانے والی رات کے اندھیرے کی طرح ہو گیا اور ہر لحظہ سورج کی طرف بڑھتی زمین پر صبح کے اجالے کا یقین غالب آنے لگا۔ میرے ماضی میں بھٹکنے والے وجود کا حصہ میرے ساتھ ایسے شامل ہو آگیا جیسے رات کی تاریکی صبح کی روشنی میں ملتی جاتی ہے۔

بالآخر میں ایک رہ گیا جو حاضر لمحے میں موجود تھا۔

چنانچہ رئیس نے گھڑی دیکھ کے کہا "پھر اب کیا کرنا ہے پیارے؟"

"سوچنا کیسا' بس چلتے ہیں۔ تو نہ آتا تب بھی مجھے ادھر ہی آنا تھا' تیری طرف" میں نے کہا۔

"میں بھی آفس جاؤں گا۔ فیصل انتظار کر رہا ہوگا۔ آج دن میں کورٹ بھی نہیں گیا تھا" فرید نے کہا۔

میں نے کہا "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ اب رخشی تمہارا دردِ سر ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"اس کا مطلب ہے دردِ دل۔۔۔" رئیس بولا۔

رخشی وہاں موجود نہیں تھی۔ فرید کی ماں سو کے اٹھ گئی تھیں اور عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ رخشی معمول کے مطابق چائے بنانے چلی گئی تھی۔

فرید مسکرانے لگا "تم نے اپنی جان چھڑالی؟"

میں نے کہا "چاند سی بہو اب تیرے حوالے۔ میرا اس کے مالی معاملات اور جائداد کے مسائل سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ تم جو چاہو کرو۔ میں نے اپنے طور پر رخشی کو سب سمجھادیا تھا۔ آگے اس کی مرضی۔"

"صرف تمہاری بے غرض دیانت داری ہی نہیں' وہ تمہاری فہم و فراست اور دور اندیشی کی بھی قائل ہے۔"

"مجھ سے زیادہ تم نے خود کو اس کے اعتماد کا مستحق ثابت کیا ہے اور یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اسے ایک محفوظ ٹھکانا میسر آگیا ہے۔"

"ٹھکانا تو اپنے فرید صاحب نے بھی پکا بنالیا ہے۔ اس کے دل میں۔" رئیس نے ہنس کے کہا "کیوں پیارے' ہم نے غلط کہا؟"

میں نے کہا "یار موقع سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

رئیس نے اسے آنکھ ماری "آخر تھانے دار تھا۔ نظر مال پر رہتی ہے۔ اچھے مال پر ہاتھ مارا ہے پیارے۔"

"یہ مال بھی۔۔۔ اور وہ مال بھی۔ کروڑ پتی حسینہ!"

فرید نے گھبرا کے اندر دیکھا "یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم دونوں نے' ابھی وہ آجائے گی تو۔؟"

میں نے کہا "اچھا جب تک وہ نہیں آتی' اعتراف کرلے اپنے جرم کا۔"

"جرم؟ کیسا جرم۔۔۔" اس نے بننے کی کوشش کی۔

"جرمِ محبت کا۔ تو اس کے عشق کی دلدل میں گوڈے گوڈے دھنس گیا ہے" میں نے کہا "اور اس میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔"

وہ جھینپ کر بولا "یار' صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

رئیس نے کہا "عشق کی گاڑی کبھی ایک پٹری پر دوڑتے دیکھی ہے؟ ہم ابھی بات کرتے ہیں اماں سے پیارے۔"

"بالکل۔ ویسے تو وہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہیں اور ماں کی نظر سے بیٹے کی نیت کہاں چھپی رہ سکتی ہے۔ خدا نے انہیں پھر تلاش سے بچالیا۔ ایک چاند سی بہو خود پیروں سے چل کے گھر آگئی۔"

فرید نے کہا "نہیں یار۔ ابھی دخل در معقولات کی ضرورت نہیں۔ وہ خواہ مخواہ بدگمانی کا شکار نہ ہوجائے۔ اسے کچھ دن سکون سے اس گھر میں جینے دو۔ وہ اپنے فیصلے خود کرسکتی ہے' پھر جلدی کیسی؟"

فرید کی بات درست تھی۔ فی الحال رخشی کو ایک ایسے ہی گھر کی ضرورت تھی جہاں اسے اعتماد کے ساتھ رہنے میں کسی خوف یا دشواری کا سامنا نہ ہو۔ بظاہر رخشی کے انداز بھی چغلی کھاتے تھے کہ وہ فرید کو پسند کرنے لگی ہے مگر کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوش فہمی کی بنا پر ہمارے اندازوں کی غلطی سے بڑی خرابی پیدا ہوجاتی ہے بقول شاعر۔

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تکلم' وہ تبسم تری عادت ہی نہ ہو

اپنے موجودہ حالات میں رخشی جیسی عورت جو بے انتہا حسین اور دولت مند ہو کسی مرد پر آنکھ بند کرکے اور عجلت میں اعتبار نہیں کرسکتی خواہ اس کے ظاہر و باطن میں محبت کے خلوص کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ شک کے خوف کا یہ کانٹا آسانی سے نہیں نکلتا کہ اس کی طرف اٹھنے والی ہر نظر میں لالچ ہے یا ہوس ہے۔

وہ مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی اور میری عزت بھی کرتی تھی۔ اگر میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ اسے بلا تذبذب تھام لیتی کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی جسے زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا ناممکن لگتا تھا۔ دنیا میں ہر قدم پر چور' لٹیرے اور ڈاکو شرافت کی نقاب چہروں پر ڈالے پھر رہے تھے اور اسے اپنی جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت کے لیے ایک ایسے ہی رکھوالے کی ضرورت تھی جس پر وہ اعتماد کرتی ہو۔ عزت اور اعتماد کے باہمی رشتے ہی زندگی کی رفاقت میں بالآخر لازوال محبت کے جذبات کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

نگاہ اگر جسم کے حسن کی کشش یا مال و زر کی چکاچوند پر ٹھہر جائے تو محبت کا نام لینے سے بھی محبت رسوا ہوتی ہے۔ جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا۔ فرید کے جذبات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے رخشی کو اسے قریب رہ کر دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت تھی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر جلد بازی میں زندگی کا کوئی بڑا فیصلہ کرنے کا رسک وہ کیسے لے سکتی تھی۔ اگر اس معاملے میں ہم اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالتے تو وہ بدک جاتی اور یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتی کہ ہم اسے حالات کی مجبوری کے حصار میں لاکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔

ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ رخشی پریشان ہوکے اس گھر سے کہیں اور چلی جائے اور غیر محفوظ ہوجائے۔

ایک جذباتی مسئلے میں الجھ کے وقتی طور پر دوسرے تمام مسائل میرے لیے غیر اہم ہوگئے تھے ورنہ پہلے عثمان کا اور پھر خادم کا قتل ایسا واقعہ نہیں تھا جسے میں نظرانداز کردیتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ قتل بھی میرے سامنے ہوا تھا اور میں نے ایک یعنی شاید کی حیثیت سے قاتلوں کو لاش اٹھا کے لے جاتے بھی دیکھا تھا۔ سب سے اہم وہ سراغ تھا جو میرے ہاتھ لگا تھا مگر ابھی تک میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

کسی مہذب اور قانون کا احترام کرنے والے معاشرے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ سرعام کسی کا قتل ہو اور لاش گھنٹوں سڑک پر پڑی رہے۔ نہ دیکھنے والے پولیس کو رپورٹ کرنا اپنی قانونی ذمے داری سمجھیں اور نہ خود ایک پولیس مین جان چھڑا کے بھاگ جائے کیونکہ اسے پیڑے والا دودھ کا ایک پیالہ اپنی ذمے داری سے زیادہ عزیز ہو۔ ہم نے جائے واردات سے اہم سراغ غائب کردیے تھے۔ ہمارا خاموش بیٹھ جانا بھی قانون کی نظر میں ایک جرم تھا لیکن ہم قانون کی بات کرتے تو سب سے پہلے ہماری گردن قانون کے بہیمانہ ہاتھوں کی گرفت میں آجاتی۔

چنانچہ ہم سب' بہت سے نامعلوم تماشائی اور دودھ پینے والے دو پولیس مین... سب انجان بن گئے تھے۔ یہ معاشرہ دوغلے پن کی بے حسی' شرمناک بے ضمیری اور غیر انسانی رویوں کی دلدل تھا جس میں سب خود کو بے بس محسوس کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس سے نکلنے کی کوشش بھی لاحاصل ہوگی۔

فرید نے بدھ کی مورتی کا سر رئیس کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا اور خادم کے پرس کے ساتھ اس میں سے برآمد ہونے والی رقم بھی میرے حوالے کردی تھی حالانکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

رخشی نے کہا "اگر تمہیں یہ رقم رکھتے ہوئے احساسِ جرم ہوتا ہے تو دے دینا کسی مستحق کو۔"

"یہ کارِ ثواب ہے تو تم خود کرو" میں نے کہا اور رقم اسے تھمادی۔

فرید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "یار ناصر۔ یہ مورتی کا سر... بدھ کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو... میں نے خود دیکھا تھا۔"

"ہم نے رات کے وقت دیکھا تھا۔ اس کی صورت میں مشابہت ضرور ہے لیکن سر مہاتما بدھ کی مورتی کا نہیں ہے۔ اس کے بال دیکھنا۔ مہاتما بدھ کے سر پر بالوں کی چوٹی سی دکھائی جاتی ہے۔ جوڑے کی شکل میں بندھی ہوئی لیکن اس کے بال سائڈ سے میرے تمہارے جیسے ہیں۔ درمیان میں بال نہیں ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "پھر یہ کس کا سر ہوسکتا ہے؟"

"کسی عام آدمی کا۔ جس کی عمر اتنی ہے کہ بال اڑ گئے ہیں۔ ابھی ہمارے ملک میں لوگ مصوروں سے اپنی تصویر تو بنواتے ہیں مگر مجسمہ سازوں سے اپنا یا کسی اور کا مجسمہ نہیں

بنواتے۔" فرید بولا "کچھ گھروں میں ڈیکوریشن پیس کے طور پر رئیس کا مجسمہ ضرور نظر آتا ہے' یا کسی حبشی کا سر۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ جتنے مجسمے پہلے لاہور میں نظر آتے تھے' وہ سب بھی ہٹادیے گئے ہیں۔ سرگنگا رام کا اور کوئن الزبتھ کا۔"

"وہ سب میوزیم کی زینت بن چکے ہیں۔ ہم ایک اسلامی ملک میں کوئی بت کیسے نصب کرسکتے ہیں۔ خواہ ان کی تاریخی اہمیت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔"

رخشی نے سر ہلایا "ہم انہیں اسمگل کرکے کروڑوں روپے کا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ اپنے لیے' تم نے خبر دیکھی ہوگی۔"

میں نے کہا "نہیں' یہ کب کی بات ہے؟"

"ابھی دو چار دن پہلے کی۔ میں لاتی ہوں وہ اخبار۔" رخشی نے کہا۔

رئیس باہر گاڑی کے پاس کھڑا میرا انتظار کررہا تھا مگر مجھ سے زیادہ اسے تمیں مارخان کی فکر تھی۔ وہ چھوٹی کے ساتھ پچھلے حصے کے برآمدے میں بیٹھا پایا گیا۔ وہ دونوں برآمدے میں ایک دوسرے سے دور اپنا منہ دوسری طرف کئے خاموش بیٹھے تھے۔ یہ خاموشی سرد جنگ سے زیادہ ہولناک تھی۔ ان کے لڑنے کی آوازیں تو ہم نے کئی بار سنی تھیں مگر اب حالات اتنے خراب ہوچکے تھے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔

رئیس نے کہا "ابے یہ کیا ڈراما چل رہا ہے یہاں؟"

"صاحب... یہ بہت دردناک بات ہوئی" تمیں مارخان بولا "اب جی ام جاتی تو پھر ہمارا روح بھی اور نہیں آئی۔"

"روح نہیں بدروح کہہ اور مجھے کیا سناتا ہے' نہیں آتا تو میری بلا سے۔ چلا جا اس دنیا سے لیکن میرے پیسے دے کے جانا" چھوٹی نے ہاتھ نچا نچا کے زبان کی قینچی چلانی شروع کی "ورنہ میں بتائے دیتی ہوں' مرنے بھی نہیں دوں گی تجھے یا تیری لاش بیچ دوں گی ڈاکٹری پڑھنے والوں کو۔ وہ چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے۔ سری پائے الگ' گردے کلیجی الگ۔"

تمیں مارخان نے لرز کر ایک چیخ ماری "کیسی ظالم قصاب کا دختر ہوتی' چڑیل کا بچی ہوتی۔"

"ارے منہ سنبھال کے بات کر بے ایمان۔ ایک تو پیسے نہیں دیتا میرے اوپر سے میرے باپ کو قصاب اور ماں کو چڑیل کہتا ہے' ڈھائی تھپڑ لگادوں گی تیری مونچھوں کو۔ کان کے نیچے دیئے جلادوں گی۔"

"قسم پہ خدا۔ ام اس کا سر توڑتی اخروٹ کی طرح۔ اندر سے سڑا ہوا مغز نکالتی۔ کوّے کو کھلاتی" تمیں مارخان بھی چلانے لگا۔

"ابے چوپ طنبورے" رئیس نے دھاڑ کے کہا "اور تو بھی خاموش ہوجا بے سری سارنگی۔ دونوں ایک ساتھ بج رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ پیسوں کا کیا جھگڑا ہے آج پھر؟"

چھوٹی نے فریاد کی "صاحب جی۔ یہ شرط ہار گیا ہے تو روتا ہے۔"

"کیا پھر پتے بازی کی تھی تم نے؟" میں نے کہا۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی "قسم لے لو صاحب جی۔ جو تاش کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

رئیس نے تمیں مارخان کو دیکھا "کیسی شرط ہارا ہے تو؟"

تمیں مارخان نے مظلوم لہجے میں کہا "صاحب۔ یہ بہت بے ایمان ہوتی۔"

چھوٹی چلانے لگی "یہ لو۔ الٹا مجھے بے ایمان کہہ رہا ہے۔ ارے دم نکلتا... دو سو روپے کے لیے تو شرط لگا تا کیوں ہے۔"

میں نے کہا "آخر شرط لیا تھی' تم بتاؤ تمیں...."

"صاحب جی۔ یہ بولتی ام سے کہ آج بارش... اوپر دیکھتی' آسمان ایک دم صاف ہوتی۔ ام بولتا کہ بارش کیسے ہوتی جب بادل نہیں ہوتی۔ یہ بولتی کہ تم شرط لگاتی' شام تک بہت بارش ہوتی۔ اتنا بارش ہوتی کہ ٹی وی پر دکھاتی۔ ام بولتی کہ بارش ہوتی تو ام تم کو دو سو روپے دیتا' یہ بولتی کہ نہیں ہوتی تو ام پورا سو دیتی۔"

میں نے کہا "بارش تو نہیں ہوئی۔"

چھوٹی نے چمک کے کہا "کیوں میں نے دکھایا نہیں تجھے خبروں میں بارش ہوئی تھی۔"

تمیں مارخان اچھلا "وہ تو ادھر ہوتی... بنگلہ دیش میں۔"

"ارے تو میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہاں ہوگی۔ قسم لے لے مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھ جو یہ جھوٹ ہو" چھوٹی نے چلا کے کہا "تو قسم کھا کہ میں نے کہا تھا کہ لاہور میں بارش ہوگی۔"

تمیں مارخان نے مری مری آواز میں کہا "یہ تو نہیں بولتی تم... لگ..."

"اب چھوڑ اگر مگر کو۔ میں نے کہا تھا بارش ہوگی کہیں بھی ہو' میں نے کہا تھا کہ ٹی وی پر خبروں میں دکھاؤں گی' ابھی تو نے دیکھ لیا۔ اب میرے دو سو روپے نکال ورنہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑوں گی نہیں۔"

اس وقت تک رخشی بھی اخبار لے آئی تھی۔ ہنستے ہنستے ہم سب بے حال ہوگئے کیونکہ الفاظ کو دیکھا جاتا تو چھوٹی نے شرط جیت لی تھی۔ اس میں نیت کا سوال غیر اہم ہوجاتا تھا۔ اپنی سادہ لوحی کے باعث تیس مارخان پھر پھنس گیا تھا اور چھوٹی نے بڑی چالاکی سے دو سو روپے ہتھیا لیے تھے۔

رئیس نے اسے حکم دیا "ابے چل نکال دو سو روپے۔ تو اس آفت کی پڑیا سے شرط لگا تا کیوں ہے پاگل خانے۔"

میں نے کہا "اور اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ تم نے اپنی شرط کی رقم ڈبل کی۔ وہ جتنی چالاک ہے تم اتنے ہی احمق ہو۔"

تیس مارخان نے بادلِ ناخواستہ واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے دو نوٹ مڑی تڑی حالت میں ایک نسوار کی ڈبیا سے برآمد کیے۔ وہ نسوار استعمال نہیں کرتا تھا لیکن اس ڈبیا کے اوپر لگے آئینے میں اپنی مونچھوں کا نظارہ کرنے کی سہولت تھی اور اس کے اندر مادھوری ڈکشت کی قیامت خیز مسکراہٹ والی ایک تصویر تھی جسے وہ زندگی کے اُداس لمحوں میں دیکھ دیکھ کے آہیں بھرتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ ڈبیا میں وہ اپنا سیونگ بینک اکاؤنٹ بھی رکھتا تھا۔

"جاؤ! بی ام اللہ کا نام پر تم کو دیتی" تیس مارخان نے جل بھن کر کہا۔

چھوٹی نے آفت کی پرکالہ اور چالاک کہنے کا بالکل بُرا نہیں مانا تھا۔ اس نے فوراً نوٹ جھپٹ لیے۔ "ہاں ہاں۔ بھک منگی ہوں میں اور تو بڑا حاتم طائی ہے نا۔ شکل دیکھ کیسی ہورہی ہے' سوکھے پیاز جیسی" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔

تیس مارخان کا غصے اور صدمے سے برا حال تھا۔ وہ چھوٹی کے توہین آمیز بیان پر جاتے جاتے رک گیا تھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اسے ہنستا دیکھ کے وہ خود بھی مسکرانے لگا۔ غالباً محبوبہ دلنواز کی ہنسی اس کے دل میں سلگنے والی آگ پر شبنم پھوار بن کے پڑی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے بعد میں اعتراف کیا کہ "صاحب مادھوری جیسا ہنستی تو ہمارا دل پر بجلی گراتی۔ ہم دو لاکھ دو کروڑ دیتی۔ دو سو روپیہ کیا ہوتی۔ ام جان قربان کرتی" ظاہر ہے اسے سمجھانا لاحاصل تھا۔ اس کے لیے بہت پہلے میر نے کہہ دیا تھا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

رئیس خانے کی پناہ گاہ میں خفیہ راستے سے پہنچنے کے بعد میر خانے اس مورتی کے سر کا معائنہ کیا جو تیس مارخان نے گاڑی سے نکال کے بہ خانے تک پہنچایا تھا اور ایک میز پر رکھ دیا تھا۔ یہ واقعی سماتما بدھ کی صورت نہیں تھی۔ ان کے سیکڑوں مجسمے میں نے ٹیکسلہ پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں میں دیکھے تھے۔ کچھ اتنے چھوٹے جیسے شطرنج کے مہرے اور شیشے کے پٹوں والی الماریوں میں قطار در قطار رکھے ہوئے اور کچھ قدِ آدم اور عام کمرے کی چھت جتنے بلند۔ مٹی پتھر اور دھات کے بنے ہوئے۔ کھڑے ہوئے اور گیان دھیان کے پُرسکون آسن میں بیٹھے ہوئے۔

ان سب میں سماتما بدھ کی شبیہ ایک ہی تھی اور مورتی کا جو سر میرے سامنے تھا اس میں سماتما بدھ کے خدوخال کی مشابہت کا احساس محض نفسیاتی تھا ورنہ چین یا جاپان' تھائی لینڈ یا تبت اور کوریا میں رہنے والے باشندے سب انہی جیسی نسلی صفات رکھتے ہیں اور یہ نقوش انڈونیشیا اور برما سے پاکستان کے شمالی علاقوں میں گلگت اور چترال تک شاید دنیا کی آدھی آبادی کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

فرید نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے مورتی کے سر کو اندھیرے میں نہ سہی مکمل اجالے میں بہرحال نہیں دیکھا تھا اور اس وقت ہم سب جس قسم کے ہنگامی حالات سے دوچار تھے ان میں کسی کو بھی اس سر کا غور سے اور تفصیلی معائنہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا ورنہ کوئی بھی اسے سماتما بدھ کی مورتی کا سر نہ سمجھتا۔

اسے اندر لانے کے بعد تیس مارخان منہ کھولے کھڑا رہا۔ اس کی شکل پر دائمی مظلومیت اور طاقت کے جذبات طاری تھے۔

رئیس نے کہا "اب کیوں رونی شکل بنائے کھڑا ہے۔"

اس نے کہا "صاحب۔ آپ مسلمان ہوتی۔ بڑا گناہ کا کام کرتی۔ آپ ایک بت گھر میں لاتی۔ آپ کافر ہوجاتی۔ کافر کو اللہ دوزخ میں ڈالتی۔"

رئیس نے کہا "گنہگار تو خیر ہم ہیں مگر تیس مارخان۔ یہ ہم پوجا کے لیے تو نہیں لائے ہیں۔ اسے نوادرات کہتے ہیں۔"

"نو دو رات" اس نے زیرِ لب دہرایا "نو دو گیارہ۔ گیارہ رات کا کیا مطلب ہوتی۔"

میں نے اسے سمجھایا۔ "یہ بہت قدیم چیز ہے۔ اس سے پرانی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔ پرانے زمانے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔"

تیس مارخان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "اچھا صاحب پھر آپ اس سے پوچھتی کہ ام کب پیدا ہوئی۔۔۔

ہمارا باپ صاحب اور دادا جناب کس دن پیدا ہوتی۔ پرانا تاریخ بتاتی۔"

"چل اُٹھ۔" رئیس خان نے کہا "اور جا کے کچن میں چائے بنا۔ تیرا تو سالے نہ باپ پیدا ہوا تھا اور نہ دادا۔ معلوم نہیں تو کیوں پیدا ہوگیا؟ آخر کیا ضرورت تھی تجھے پیدا ہونے کی۔۔۔ بول۔"

تیس مارخان دم بخود رہ گیا۔ اتنے بہت سے سنی خیز اور کسی حد تک رسوا کن انکشافات کے بعد ایک دم رئیس نے وہ سوال کرلیا تھا جس کا جواب دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ "ام کیوں پیدا ہوتی؟" اس نے سر کھجا کے اپنے آپ سے کہا اور پھر سوچتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا۔ رئیس خان کا موڈ خراب نہ ہوتا تو شاید وہ کہتا کہ صاحب اس پر کچھ آپ ہی روشنی ڈالیے' ہماری سمجھ میں جواب نہیں آتی۔"

پہلے میں نے اور پھر رئیس خان نے مورتی کے سر کو لائٹ کے نیچے گھما پھرا کے ملاحظہ کیا۔ یہ بظاہر عام قسم کے چنائی پتھر کا بنا ہوا ضرور لگتا تھا مگر مجھے اس کے کم وزن نے شک میں ڈال دیا۔ اتنا بڑا ٹھوس پتھر میرے اندازے کے مطابق تین من سے کم کا نہیں ہوسکتا تھا اور اسے تیس مارخان شاید ہلا بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ اسے گود میں بھر کے لے آیا تھا۔ اگر یہ ٹھوس پتھر کا بنا ہوتا تو اسے یوں گاڑی سے پھینکنا بھی آسان نہ ہوتا۔

میں نے اپنے شک کا اظہار رئیس پر کیا "خان صاحب۔ میرا خیال ہے کہ یہ سر ٹھوس نہیں ہے۔"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں "کیا مطلب؟ یہ کھوکھلا ہے۔ اندر کچھ بھرا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "اندر کیا ہوسکتا ہے؟"

"اندر ہیرے ہوسکتے ہیں" رئیس نے رازدارانہ انداز میں کہا "ایسے بہت سے پُراسرار قصے سنے ہیں میں نے۔ دیوتا کی آنکھ میں کوئی نایاب ہیرا ہوتا ہے یا اس کے سر میں کسی خفیہ خزانے کا نقشہ۔"

"بھوسا ہے تیرے سر میں۔ اب اتنی قیمتی چیز ہوتی یہ سر تو اسے پھینکنے والے ایسے سڑک پر پھینک جاتے؟"

"ہاں یار!" رئیس مایوس ہوگیا "اپنے سر کی طرح یہ سر بھی دو کوڑی کا ہوگا۔"

میں نے سر پر مزید تحقیق کے نتائج فوراً جاری کردیے "ملاحظہ ہو۔ یہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا ہے' اوپر کا رنگ سیاہی مائل ہے' نیچے کا سفیدی مائل۔"

"پھر کیا ہوا۔ بادام سے تربوز تک ہر چیز کا رنگ اوپر کچھ اور ہوتا ہے اور اندر سے کچھ اور نکلتا ہے۔" رئیس نے ایک فلسفیانہ نقطہ پیش کیا "کیا پتا۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "سمجھے ایک ہی میٹریل سے بنائے جاتے ہیں۔۔۔ وہ پلاسٹر آف پیرس ہو' سنگ مرمر ہو۔۔۔ یہ جس طرح جھڑ کے اور ٹوٹ کر بکھرا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اوپر پلاسٹر آف پیرس ہے۔ اس کو پتھر کا رنگ دیا گیا ہے۔ اور اندر غالباً پتھر ہوگا۔ یہ صرف پلاسٹر آف پیرس ہوتا تو اتنا بھاری نہ ہوتا اور ٹھوس پتھر ہوتا تو تیس مارخان کا باپ بھی اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔"

رئیس نے فوراً مجھ سے اتفاق کرلیا "یہ تو بالکل ٹھیک اندازہ ہے تیرا مگر پیارے اس کی کھوپڑی میں آخر ہے کیا؟"

میں نے کہا "وہ بھی پتا چل جائے گا۔"

"میں لاؤں ہتھوڑا کلہاڑا۔ ایک ضربِ مجاہد سے فاش کروں۔"

میں نے کہا "پاش پاش۔ جاہل کی اولاد!"

"ابے وہی' راز فاش ہوجائے گا نا۔"

میں نے کہا "بیٹا' جلدی کس بات کی ہے۔ پہلے معلوم ہوجائے کہ آخر یہ مورت کس کی ہے۔"

"اپن تو پیارے تاریخ میں بڑے نالائق تھے۔ ہمیشہ بابر کو اکبر کا باپ بتادیتے تھے حالانکہ وہ اکبر اعظم تھا۔ اعظم کے معنی ہیں بڑا۔ یعنی وہ بڑا تھا۔ تو باپ ہی بڑا ہوا نا۔"

میں نے کہا "تاریخ کا خانہ خراب مت کر۔ بابر کا پوتا تھا اکبر اعظم۔ اس کا باپ تھا ہمایوں۔ تو اس کی صورت پر غور کر' یہ کس کا سر ہوسکتا ہے۔"

وہ جھینپ کر بولا "ابے ہوگا چین کے کسی بادشاہ کا سر۔ ان کے تو نام بھی بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ چیاؤں میاؤں لاؤ جیسے کوئی آرڈر دے ریسٹورنٹ میں کہ فرائی بلی لاؤ۔ سنا ہے وہاں بلیاں کھاتے ہیں اور ہی شی جنگ۔ جیسے میاں بیوی کی لڑائی' سوچی تو گا۔"

میں نے چلا کے کہا "خدا کے لیے چپ ہوجا اگر کوئی عقل کی بات نہیں کرسکتا۔ بادشاہوں کے ایسے بال نہیں ہوتے تھے' اس کا ہیئر اسٹائل دیکھ۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ہیئر کہاں ہیں جو اسٹائل دیکھوں۔ ہاں کان کے آس پاس اور پیچھے جو جھالر سی ہے وہ کچھ رنگروٹوں جیسی ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اس معاملے میں مجھے شبنم سے مدد لینی ہوگی۔"

"تجھے کیا شک ہے کہ یہ اس کے کسی رشتے دار کا سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے' ماموں کا یا چاچے کے سسر کا۔"

"وہ کسی اخبار یا لائبریری کے ریفرنس سیکشن میں تصویر تلاش کرسکتی ہے۔ اگر اس کے پاس ایک تصویر اس سرکی ہو۔ ممکن ہے وہ بنکاک' نیلایا یا ہانگ کانگ میں اس بندے کا پتا چلالے۔ وہاں ٹورسٹ بہت جاتے ہیں اور ایسی چیزوں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ یہ کوئی اسمگلر یا مڈل مین ہوسکتا ہے جو آرٹ کے جعلی نمونوں یا چوری شدہ نوادرات خریدتا بیچتا ہو۔ ظاہر ہے ایسے لوگ شریف نہیں ہوتے۔ کیا پتا اس کا کوئی مجرمانہ ریکارڈ ہو۔ سفارت خانوں سے معلوم کیا جائے تو مدد مل سکتی ہے۔ بعض اوقات کرمنل ریکارڈ نہیں ہوتا لیکن بندہ بڑی چیز ہوتا ہے جسے سب پہچانتے ہیں۔"

"جیسے تو تھا' یعنی شاہ عالم تھا۔" رئیس نے سوچ کے کہا۔

"اور بھی بہت نامی گرامی نام ہیں جن کو پبلک جانتی ہے کہ اصل میں کیا ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ میں شبنم کو یہاں بلاتا ہوں" میں نے رئیس کا دیا ہوا موبائل فون نکالا اور نمبر ملانے لگا۔

رئیس نے فون مجھ سے چھین لیا "دیکھ پیارے۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ ابھی پل کے بیچ میں کھڑا ہے تو۔ ایک طرف ہے چندا اور ناصر عظیم۔ دوسری طرف ہے شبنم جو صرف شاہ عالم کو جانتی ہے۔ پل پار کرکے پھر اس کے پاس چلا گیا تو ناصر عظیم نہیں رہے گا' یہ سمجھ لے۔"

میں نے کہا "چل تو ہے نا اپنی جگہ۔"

"یعنی تو اس پر آتا جاتا رہے گا۔ ادھر ہوگا تو ناصر عظیم ادھر ہوگا تو شاہ عالم۔ دونوں صورتوں میں تو دنیا کے سامنے نہیں آسکتا۔"

"مجھے کیا کرنا ہے دنیا کے سامنے آکے۔"

"ابے پاگل مت بن۔ تو پھنس جائے' آخر کب تک تو ایک طرف کے لوگوں کو یقین دلائے گا کہ شاہ عالم تو مرگیا اور میں ناصر عظیم ہوں پھر پل پار کرکے شبنم کی طرف والی دنیا میں کہے گا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور میں شاہ عالم ہوں۔ یہ دہری زندگی کوئی نہیں گزار سکتا بیٹے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "پھر میں کیا کروں یار!"

"میری مان تو کسی ایک طرف ہوجا۔ پل کے ادھر یا ادھر اور پل کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے۔" رئیس سنجیدہ ہوگیا۔ "کبھی نہ کبھی چندا بھی مان ہی جائے گی اور تیرے لیے حالات پھر پہلے جیسے ہوجائیں گے۔"

"مگر یار۔ میں اس معاملے کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا جس کا تعلق شاہ عالم کے ملک دشمن کاروبار سے تھا۔ عثمان اور خادم کے قتل سے ہے اور یہ ایسے معاملات ہیں جن سے ناصر عظیم نہیں نمٹ سکتا۔ چندا' قمر' خان جی اور ڈاکٹر کمال کی دنیا والے رشتے مجھے بے بس کردیں گے۔ اس کام کو میرے لیے ناممکن بنادیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تو نے۔ جن معاملات کا تعلق شاہ عالم کی زندگی سے تھا وہ اسی دنیا میں رہ کے نمٹائے جاسکتے ہیں مگر تو شاہ عالم بھی نہیں رہنا چاہتا۔ اب وہ بھی نہیں ہوسکتا۔ کسی کو معلوم ہوگیا... تو اس کے دشمن... پھر تیرے پیچھے لگ جائیں گے اور تیری جان لے کر چھوڑیں گے' پھر کیا ہو؟"

میں نے بے خیالی میں کہا "کیا ہونا چاہیے؟"

"سکہ ہوا میں نہیں رہ سکتا۔ وہ زمین پر گرے گا تو کسی ایک رخ۔ ہیڈ یا ٹیل۔ ٹاس کرنے سے پہلے سوچ لے تجھے کیا چاہیے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "تو کیسا دوست ہے۔ صحیح مشورہ دے۔"

"اپن تو تیرے ساتھ ہیں ہر حال میں پیارے۔ تو ٹاس جیتے یا ہارے۔ تیرا نام ناصر عظیم ہو شاہ عالم یا کوئی تیسرا نام۔ نام میں کیا رکھا ہے' تو روز بدل۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا "واقعی یار۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ جب مجھے چہرہ بدل کے روپوشی کی زندگی گزارنی ہے۔ شاہ عالم کو پُراسرار طور پر ہمیشہ کے لیے غائب ہونا ہے۔ تو پھر میں کچھ بھی کہلاؤں۔ یہ تھرڈ آپشن والی بات میرے دل کو لگی۔"

اس نے اپنا سر کھجایا "اپن نے تو ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "یہی کہا ہے ابھی تو نے کہ نہ یہ نہ وہ تو پھر کچھ اور سہی۔ ناصر عظیم تو غائب ہی تھا۔ شاہ عالم بھی غائب ہوجائے تو کوئی تیسرا سامنے آسکتا ہے۔ یہ تو بہت آسان ہے۔"

"آسان ہے' یعنی تین نام۔"

میں نے کہا "ابے محاورہ نہیں سنا۔ مایا تیرے تین نام۔ پرسا' پرسو' پرس رام اور ہمارے بہت سے گھروں میں ہوتے ہیں تین نام۔ ایک دودھیال کا۔ دوسرا ننھیال کا اور تیسرا گھر کا پیار کا نام۔"

رئیس ہنسنے لگا "یہ تو ہے۔ میں جانتا ہوں ایک حیدرآبادی فیملی کو۔ ان کے یہاں دو نام ہیں سب کے مگر بچوں کو وہی ببلو' گڈو' پنکی اور کالی وغیرہ کہہ کے پکارتے ہیں۔"

تیس مار خان نے چائے کے برتن میز پر رکھتے ہوئے مونچھیں ہلائیں "صاب اما را نام ہوتی طور سم خان۔"

"طور سم خان! وہ تو جہانگیر خان اسکوائش چیمپئن کا بڑا بھائی تھا۔"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "اس کا نام پر رکھتی اما را نام۔ وہ مشہور ہوتی بہت۔"

"ہاں۔ وہ بھی اسکوائش چیمپئن تھا' مرگیا اچانک۔"

"جی صاب۔ ام کو طور سم خان کوئی نہیں بولتی' بدل دیتی۔"

میں نے کہا "یعنی طور سم خان بگڑ کے تیس مار خان بن گیا' واہ' یہ آج معلوم ہوا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "اماں صاب بولتی چاند کا ٹوٹا۔ ابا صاب کہتی' الو کا پٹھا۔ اما را بہت نام ہوتی۔ ابی آپ سنا ام کو چھوٹی کیا بولتی' ڈھائی فٹا۔ بالشیا' ام بدبخت سب کچھ ہوتی۔" وہ ایک آہ بھر کے رخصت ہوگیا کیونکہ ہم بھی ہنسنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

اس میں شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی کہ مورتی کا سر نہ آثار قدیمہ کا حصہ تھا اور نہ کوئی قابل قدر چیز۔ اس کی بے وقعتی کے باعث ہی مورتی کے سر کو خادم کی لاش پر پھینک دیا گیا تھا۔ اب یہ سوال الگ اپنا جواب مانگتا تھا کہ خادم کا قصور کیا تھا اور اس قصور کا تعلق کس حد تک اس مورتی کے سر سے تھا۔ وہ لوگ اس مورتی کے سر کی وجہ سے مشتعل تھے اور انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے مورتی کو لاش پر پھینکنا ضروری سمجھا تھا۔

یہ ایسی ہی حرکت تھی جیسے کوئی اصل ہیرے خریدنے کے لیے رقم ادا کرے اور جب معلوم ہو کہ وہ ہیرے نہیں کانچ کے ٹکڑے تھے تو لاکھوں کا نقصان اور دھوکا کرنے والے کو مار کے وہ شیشے بھی اس کی لاش پر پھینک آئے کہ ان کا میں کیا کروں گا۔ لے جاؤ انہیں اپنے ساتھ قبر میں۔ مورتی کا سر پھینکنے والوں نے بھی یہی کیا تھا۔

چنانچہ مورتی کے سر کی وجہ سے خادم کے قاتلوں کو کسی بہت بڑے نقصان اور دھوکے سے دوچار ہونا پڑا تھا جس کا ذمے دار خادم تھا۔ یہ بات اب طے تھی اور ان معاملات سے الگ یا شاید انہی سے جڑا ہوا یہ بھی تھا کہ خادم اتنی رازداری کے ساتھ میرا پیچھا کیوں کررہا تھا۔ اگر وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا تو آواز دے کر مجھے روک سکتا تھا اور بات کرسکتا تھا۔ ممکن ہے وہ مناسب جگہ اور موقع کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے پیچھے آنے والوں کا ڈر بھی تھا کہ اچانک نہ آجائیں۔ خادم کا دوست میں بھی نہیں تھا اس لیے وہ محتاط انداز میں آرہا تھا۔ اگر اسے موقع ملتا تو ہوسکتا ہے پہلے وہ مجھے اعتماد میں لیتا اور پھر کچھ بتاتا۔

میں نے پرس میں سے خادم کے وزیٹنگ کارڈ نکالے اور اس پر لکھے ہوئے پتے پر غور کیا۔ بعض اوقات ایک سیدھی صاف بات کو آدمی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کے معما بنالیتا ہے۔ ایک بے وقوف سمجھا جانے والے شخص کو اس میں کوئی غور طلب بات ہی نظر نہیں آتی۔

یہی اس وقت میرے ساتھ ہوا۔ میں نے ایک کارڈ رئیس خان کو پیش کیا جو ویسے بھی سراغرسی کے اس کھیل میں وہی کردار ادا کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے جو شرلاک ہومز کے ساتھ ڈاکٹر واٹسن کا تھا "یہ خامن کا رپوریشن کیا ہے آخر؟"

رئیس نے کہا "خامن۔ یہ خامن نہیں پیارے۔ انسے خاماں پڑھ تو بات سمجھ میں آئے گی' خادم کا خا' عثمان کا ماں۔"

میں نے خود کو انتہائی احمق تصور کیا "حد ہوگئی یار۔ اتنی معمولی سی بات میری عقل میں آئی نہ اس سابق تھانے دار کی۔ رخشی تو خیر قابل معافی ہے۔"

"عورت ذات' ناقص العقل" رئیس نے دانشورانہ لہجے میں فرمایا۔

"ناقص العقل' جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ اس میں تو پتا بھی ہے اور فون نمبر بھی۔"

میں نے کہا "اس سے کچھ آسانی ہوگی لیکن ظاہر ہے میں یہ مورتی کا سر اٹھائے وہاں نہیں جاسکتا اور کسی تھانے دار کی طرح میز پر رکھ کے تفتیش شروع نہیں کرسکتا۔"

رئیس کچھ دیر بعد اپنے مرغی خانے کے مکینوں کی خبرگیری کرنے چلا گیا تو میں نے بہت سوچا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان معاملات میں میری سب سے کارآمد مشیر اور معاون صرف شبنم ہوسکتی ہے۔ ذہانت رخشی میں بھی تھی مگر اس میں وہ ہمت نہیں تھی جس نے شبنم کو صحافت کے خارزار میں بھی کامیاب کیا تھا ورنہ اس میدان میں مرد بھی قدم رکھنے کے بعد' آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی کا سبق بھلا دیتے تھے وہ درباری شاعر کی طرح' سرکار کی مدح سرائی کرتے تھے اور پلاٹ پرمٹ یا پیسے کی خاطر ہر حکومت کے کاسہ لیس بنے رہتے تھے یا زرد صحافت کے علمبردار ہوجاتے تھے اور بلیک میلنگ کرتے تھے۔ کالے دھندے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے والوں کے اندر کے معاملات کا کھوج لگا کے رازداری کی قیمت وصول کرتے تھے ورنہ پول کھولنے کی دھمکی دیتے تھے چنانچہ ان کو چور سے بھی حصہ ملتا تھا اور کوتوال سے بھی۔

ان کو صحافیوں کی اکثریت کالی بھیڑیں قرار دیتی تھیں مگر جیسے جیسے دولت سے معاشرتی قدریں کھوکھلی ہو رہی تھیں' ویسے ویسے ہر پیشے کی تقدیس کا بھرم بھی ختم ہوتا جا رہا تھا اور کالی بھیڑوں کا تناسب بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر' وکیل' پروفیسر اور دانشور سب اخلاقی اقدار پر معاشی ضروریات کو ترجیح دینے لگے تھے اور اسے ایک "مجبوری" قرار دیتے تھے۔ اپنی مظلومی کو وہ اپنی غلط سوچ کے حق میں جواز بنا لیتے تھے۔ تاہم جو اصول پرستی اور حق پرستی کو ایک مشن سمجھتے تھے ان کے لیے آج بھی مجبوری کوئی نہیں تھی اور ان کے نزدیک سچ ایک ہی تھا جو نہ بدلا جا سکتا تھا اور نہ خریدا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے آزمائش کے سارے دشوار مرحلے بھی انہی کے لیے تھے۔ شبنم کو بھی سرپھرے قبیلے میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

شبنم کے وسائل بھی وسیع تھے اور اس کے تعلقات کا سلسلہ بھی نامعلوم طریقے پر پاتال سے آکاش تک تھا یعنی انتہائی نچلی سطح پر کارپوریشن کی سڑک پر جھاڑو دینے والے سے شاہ کے مصاحب تک سب اس کے لیے خبروں کے ذرائع یعنی SOURCES تھے۔ کہا ہوا' سنا ہوا اور دیکھا ہوا بتانے والوں میں سے کون کتنے فیصد قابلِ اعتبار تھا' یہ اس نے تجربے سے اور اپنی چھٹی حس' اندر کی آنکھ اور INTUITION سے JUDGE کرنا سیکھا تھا چنانچہ وہ ظاہر سے باطن کا اندازہ کر لیتی تھی اور پورے سچ یا خالص سچ کو کھود نکالنے کے لیے حقائق کی کسی بھی گہرائی تک جانے کے لیے تیار رہتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ میرے معاملے میں اس نے زبردست RESISTANCE دکھائی تھی۔ اسے ناکامی کا سامنا اس لیے ہوا کہ مقابلے پر میں تھا اور مجھے اپنی بقا کی جنگ درپیش تھی چنانچہ میں نے اصل شاہ عالم کا ہر سراغ مٹانے میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دی اور سارے زمانے پر ثابت کر کے چھوڑا کہ میں ہی شاہ عالم ہوں۔ شبنم کی چھٹی حس' تجربے اور INTUITION کی ایک نہ چلی اور اگر وہ اس کشمکش میں نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہ ہوتی تو شاید کبھی تسلیم نہ کرتی کہ میں شاہ عالم ہوں لیکن اس انتہا کو پہنچ جانے کے بعد اس کے سامنے دو ہی راستے تھے یا وہ پاگل ہو کے پاگل خانے پہنچ جائے اور پھر ساری عمر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے چلاتی رہے کہ وہ ہمویا شاہ عالم نہیں ہے۔ اس کی سننے والا کوئی نہ ہوگا۔ یا خود کو بچانے کے لیے اپنے دماغ کو بھی قائل کرے کہ۔

بجا کہے جسے دنیا اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حالانکہ یہ منطقی اور عملی اعتبار سے غلط تھا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایک الگ آدمی کی آواز کو اکثریت نے دبانے کی پوری کوشش کی مگر بالآخر وہی ایک آواز حق غالب آئی اور اسے اکثریت نے مانا مثلاً سائنس داں اور پیغمبر ہمیشہ معتوب ہوئے مگر نقارۂ خدا سمجھی جانے والی آواز غلط تھی اور غلط ہی رہی۔

میں بھی جانتا تھا کہ اکثریت کو میں نے دھوکا دیا تھا اور سچ وہی تھا جو شبنم دیکھتی تھی اور محسوس کرتی تھی مگر مجھے زندہ رہنے کے لیے اسی جھوٹ پر قائم رہنا تھا۔ شبنم پہلے بیمار نہیں تھی جب وہ مجھے شاہ عالم نہیں مانتی تھی۔ اس وقت وہ بالکل صحیح الدماغ تھی۔ اب میرے نزدیک یہ اس کی ذہنی شکست تھی کہ اس نے بھی مجھے شاہ عالم مان لیا تھا مگر دنیا پہلے بھی الٹا سمجھتی تھی اور آج بھی۔

تاہم اب شاہ عالم یعنی میں آنکھ بند کر کے شبنم پر بھروسا کر سکتا تھا اور اس سے اپنی ہر بات منوا سکتا تھا۔ یہ وہی مداری والی طاقت تھی جس سے میں شبنم کو ایک معمول کی طرح استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے جادو کی ڈگڈگی بجا کے اس کے من کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور تن کی آنکھوں سے شبنم وہی دیکھ سکتی تھی جو میں اسے دکھانا چاہوں یا دیکھنے کے لیے کہوں۔

میرے ہاتھ میں پیار بھرے جذبات کی ڈگڈگی ہے" شبنم میں کون؟"

شبنم کی آنکھوں میں خواب ہیں "تم۔۔۔ تم شاہ عالم۔"

میں پیار کی ڈگڈگی بجاتا ہوں "اور تم۔۔۔ کیا ہو تم؟"

"میں اپنے اندر عشق بھی ہوں۔ عاشق بھی معشوق بھی ہوں۔"

"شبنم۔ کیا کر سکتی ہو تم میرے لیے؟"

پیار کی ڈگڈگی اسے مدہوش کر رہی ہے "کہہ کے دیکھو۔ آزما کے دیکھو۔"

"اچھا کیا دے سکتی ہو مجھے تم؟" میں بڑا اچھا مداری ہوں۔

وہ ایک بے ہوش معمول ہے "اپنی روح۔۔۔ اپنا جسم۔۔۔ اپنا سب کچھ۔"

جب تک عشق کی ڈگڈگی میرے ہاتھ میں رہے گی' شبنم کی حیثیت ایک بے اختیار معمول جیسی رہے گی۔

پھر مجھے کیا کرنا چاہیے "ڈگڈگی اٹھا کے مداری کا کھیل

شروع کر دینا چاہیے کیونکہ اس کھیل کا ایک شریک خود مداری بھی ہے۔ وہ خود ہی عامل اور خود ہی معمول نہیں ہو سکتا۔

ڈگڈگی میں جادو کی چھڑی۔ مداری کے ہاتھ میں کھیل دکھانے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔

ڈگڈگی یا جادو کی چھڑی پبلک کی توجہ بٹانے کے لیے ضروری ہے تاکہ مداری اپنے ہاتھ کی صفائی دکھا سکے۔ نعرے' وعدے' اعلان' منشور' سب مداری کی ڈگڈگی ہیں۔

ہم کشمیر کو فتح کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے

بیچارے ہمارے لیڈر عوام سے زیادہ اذیت میں ہیں

ملکی خزانہ لوٹنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا

صرف ان کے قرضے معاف کیے جائیں گے

قانون شکن عناصر سے آہنی ہاتھ کے ساتھ نمٹا جائے گا

مگر ان کے فولادی مکے سے کون نمٹے گا؟

شرحِ خواندگی سو فیصد کر دی جائے گی۔

انگلش میڈیم اور گرامر اسکولوں میں پڑھنے والوں کی

ملک کے عوام کی تقدیر بدل دی جائے گی

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

میں نہ جانے کب تک ان بے مہار خیالات کے ساتھ بھٹکتا رہتا مگر رئیس نے واپس آ کے مجھے ہلایا "کیوں بت بنا مورتی کے سر کو گھور رہا ہے پیارے۔ اس مورت میں کسی کی صورت دکھائی دے رہی ہے؟"

میں نے چونک کے کہا "آدمی کی آنکھ جسے چاہے دیکھے مگر تو کہاں جا رہا ہے ایسے سج دھج کے۔"

"یار بس دعا کر آج اللہ عزت رکھ لے میری اور عمران خان کی۔ بڑا ڈھول پٹ رہے ہیں مخالف کہ سرحد کے آزاد علاقے کا مرغا ہے۔ پہاڑوں میں اصلی سلاجیت کھا کے پلا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "ابے یہ سب پروپیگنڈا وار ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی دشمن کو خوف زدہ رکھنے کی نفسیاتی جنگ۔"

"نہیں یار۔ میں نے دیکھا ہے اسے۔ قسم اللہ کی پورا پہاڑ ہے پہاڑ مگر اپن بھی اس بار دادا صاحب کے مزار کی مٹی چٹوانے لے گئے تھے اور یہ پورا مہینہ ہم نے عمران خان کو بس دور سے جھلک دکھائی کبھی سیتا وائٹ کی تو کبھی جمائما کی۔ سالا چھڑکتا رہا مگر پاس نہیں پھٹکنے دیا کسی کے۔ وحشت سوار ہے اس پر۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "پاگل رکھا ساری عمر تجھے اس شوق نے بھی۔ آج بھی وہی حال ہے جو دس سال پہلے تھا۔"

"ابے یار شوق کے بغیر بھی سالی کوئی زندگی ہے اور یہ تو بڑا خون گرم رکھنے والا شوق ہے پیارے۔ شکر ہے دوسرے شوق نہیں ہوئے جو ہر رئیس کے ہوتے ہیں۔ شراب' کباب شباب تک جوئے کی لت نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "یہ جوا نہیں تو اور کیا ہے' آج کتنی شرط ہے؟"

"دس دس ہزار داؤ پر لگے ہیں پیارے مگر یار' جواری کھیلتا ہے راتوں رات امیر ہونے کے لیے۔ رئیس کھیلتا ہے یا سٹہ کھیلتا ہے۔ یا وہ ہیں جن کے پاس اتنا ہے کہ لٹانے کے لیے جاتے ہیں واس لیگاس۔"

"تاس ویگاس' جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ اپن تو بس جیت کو زیادہ سنسنی خیز بنانے کے لیے رقم کا تڑکا لگاتے ہیں۔ دس ہزار کمانے یا گنوانے کی بات نہیں' اچھا دیکھ تو آج آرام سے بیٹھ اور اس مورتی کے سر سے باتیں کر۔"

"ہرگز نہیں" میں نے کہا "میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"کہاں' مقابلہ دیکھنے؟" رئیس نے خوش ہو کے کہا۔

"نہیں۔ پہلے میں جاؤں گا شبنم سے ملنے۔ وہ بہت پریشان ہوگی۔"

"ابے کچھ ہماری پریشانی کا خیال کر۔ جو تیری پریشانی سے پیدا ہوتی ہے۔ کل رات بچ گیا۔ مصیبت میں پڑنے سے تو آج خارش ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"یار کیسے نہیں ہوگا۔ تو جائے گا آزاد صاحب کے آفس تو وہاں تجھے کتنے لوگ دیکھیں گے۔ کل صبح کے اخبار میں آ جائے گا کہ نہ شاہ عالم لندن گیا ہے اور نہ کہیں روپوش ہے۔"

میں نے کہا "میں اس سے آفس میں نہیں ملوں گا۔"

"پھر کیا گھر جائے گا اس کے؟ دیکھ پیارے! وہ بڑی خطرناک عورت لگتی ہے ہمیں تو۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔ بڑوں بڑوں کو چکر دے سکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تو بھروسے میں مارا جائے۔"

"وہ شاہ عالم کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

"مگر تو شاہ عالم نہیں ہے۔ کہیں وہ مکر نہ کر رہی ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رے۔ یہ نروس بریک ڈاؤن وغیرہ سب ڈھونگ ہے اس
۔ وہ اخباری رپورٹر ہے۔ اندر ہی اندر ساری معلومات
حل کرتی رہی ہو تیرے بارے میں۔ خود تیرے پیچھے لگی
ی ہو یا اپنے آدمی لگا رکھے ہوں اور مجھے پیار کا راگ
رہی ہو کہ میرے دل نے تمہیں شاہ عالم مان لیا ہے۔
تک بلالیا اس نے پولیس کو اور اخبار والوں کو اور ان
سامنے تیرا اگلا پچھلا سارا کچا چٹھا بیان کردیا کہ یہ شاہ عالم
ں' ناصر عظیم ہے۔ نہیں یقین تو کمال کلینک جاکے پوچھ لو
ں فلاں سے۔"

ایک لمحے کے لیے تو اس خیال سے میرے جسم پر کپکپی
ی ہوگئی مگر میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا "یہ ناممکن
ے۔ وہ جو PSYCHIARTIST تھے۔ ان کے سامنے مکر
ں چل سکتا اور میں بھی اتنا تو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ ڈراما
رہی ہے یا یہ اس کے حقیقی جذبات ہیں۔"

"بے شک تو بڑا سیانا ہے۔ ہمارے مقابلے میں لیکن
ں بھی یار ہیں تیرے اور گھی ٹیڑی نہیں رکھتے۔ دل میں ایک
ت آئی تھی سو کہہ دی۔ عورت ذات پر اپن تو اتنا بھروسا
نے والے نہیں ہیں پیارے۔"

میں نے کہا "میں قدر کرتا ہوں تیرے جذبات کی لیکن
ی وجہ سے کیا تجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ میرے
تھ تو بھی روپوش تھا پھر آج اچانک مقابلے میں جانے کی
ں سوجھ گئی؟"

"وہ یار۔ نہ جانے کا مطلب ہے پیٹھ دکھانا۔ عمران خان
میری وجہ سے واک اوور مل جائے۔ وہ سالا گوا سکر بغیر
بلے کے فاتح قرار دے دیا جائے؟ یہ کتنی بے عزتی کی بات
ں۔ آج تو جانا ہی پڑے گا پیارے؟" اس نے سر کھجایا۔

میں نے کہا "اور وہاں مقابلے کے بعد تیرا سامنا ہوگیا
ے کسی دشمن سے تو کیا ہوگا۔ ابھی تو سامنے کے
ازے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم چوروں کی طرح اپنے ہی گھر
آتے جاتے ہیں۔ اگر مجھے ایسے باہر نہیں جانا چاہیے تو کیا
احتیاط نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے ساتھ مجھے بھی مواد دے
کسی دن۔ یہی ہے تیری یاری۔"

رئیس کا منہ لٹک گیا "یار' یہ عمران خان اور پاکستان کی
ت کا سوال ہے۔ مگر خیر۔"

میں نے کہا "بیٹھ جا یہاں آرام سے۔ میں نہیں جاؤں گا
مر تو بھی کہیں نہیں جائے گا۔"

رئیس خان نے میرے پاس بیٹھ کے ایک آہ بھری اور
م الشان لڑاکا مرغے کے پروں پر تھپکی دینے لگا۔ "چل صبر
کر میرے شیر۔ یہی ذلت لکھی تھی تیرے مقدر میں۔ ویسے
پیارے' وہاں دوسری قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کا سیاست
سے اور شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ
خطرے کی بات کوئی نہیں۔"

میں نے اس کی بے چینی کو محسوس کیا اور مسکرا کے کہا
"میرا بھی خیال یہی ہے کہ شبنم سے ملنے میں خطرے کی کوئی
بات نہیں اور ہم احتیاط کرسکتے ہیں۔"

رئیس نے سر ہلایا "چل یار۔ اللہ جو کرے گا اچھا ہی
کرے گا۔"

اس وقت رئیس کی ایک مجبوری میرا بہانہ بن گئی۔ میں
نے مورتی کے سر کو گاڑی میں رکھوانے کا سوچا اور پھر ارادہ
بدل دیا۔ پہلے مجھے اس بارے میں شبنم کو شریک راز کرکے
اس کا ردعمل دیکھنا چاہیے۔ اگر وہ عملی طور پر میرا ساتھ
دے سکتی ہے تو پھر اسے یہاں بھی لایا جاسکتا ہے۔ بہت سے
معاملات میں ابھی میرا ذہن واضح نہیں تھا اور میرے خیالات
میں الجھاؤ تھا۔

رئیس نے دو مختلف دنیاؤں کو ملانے والے پُل کی مثال
بالکل صحیح دی تھی۔ یہ فیصلہ بہرحال مجھے ہی کرنا تھا کہ میرا
مستقبل پُل کے کون سے کنارے کی دنیا سے وابستہ ہوگا۔ اور
یہ طے کرلینے کے بعد بھی کیا پُل باقی رہے گا؟ کیا پھر کبھی مجھے
اس پل پر سے گزرنے کی ضرورت محسوس ہوگی یا مجبوریوں کی
زنجیر ہمیشہ درمیان میں حائل ہوگی۔ جیسی کہ دو سرحدوں کے
درمیان دو ملکوں کی حد کا تعین کرتی ہے۔

رئیس نے چلتے چلتے میرے سراپا کو دیکھا "ابے یار۔
تیرا یہ بھیس اپنے دل کو کچھ جچتا نہیں۔"

میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا "آج شبنم سے
مل کے میں کسی فیصلے پر پہنچ جاؤں گا تو پھر کچھ کروں گا۔"

"پھر اپن بھی کچھ سوچیں گے پیارے۔ ساری زندگی
بیکار رہ کے نہیں گزاری جاسکتی اور اپنے دھندے ذرا مختلف
قسم کے رہے ہیں۔ خدا بخش مندرال کے قتل کے بعد کوئی
ٹھکانا نہیں رہا اپنا اور اب دل بھی بھر گیا ہے اس سیاست کے
کھیل کی ہیرا پھیری سے۔ کچھ اور کریں گے۔"

"یعنی نئی قسم کی ہیرا پھیری اور بدمعاشی۔ بہت بدنام
ہوگیا ہے تو اس شہر میں بیٹا' اب یا تو پرانے دھندے چھوڑ
دے اور کوئی کام کر شرافت سے ورنہ مارا جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگا "شرافت کے دھندے اور ہم۔ نہیں
پیارے' ابھی اس شرافت کے دریا کی مچھلی نہیں بن سکتے
کبھی۔ اپنے خمیر میں نہیں ہے یہ۔"

"بکواس مت کر۔ میں تجھے ایسا کوئی کام نہیں کرنے دوں
گا۔ جیسے تو اب تک کرتا آیا ہے۔"

گاڑی کا پائلٹ نیس مارخان سڑک پر ہمارا انتظار کررہا
تھا۔ اس گاڑی کے شیشے سیاہ تھے چنانچہ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھنے
والے کو باہر سے کوئی دیکھ کے پہچان نہیں سکتا تھا۔ عمران
خان کو اگلی سیٹ پر تشریف رکھتا دیکھ کے وہ سمجھ گیا تھا کہ
اسے کہاں جانا ہوگا۔ یہ مقابلے دو ہی مخصوص مقامات پر
ہوتے تھے جن کے نام رئیس نے نیشنل اسٹیڈیم اور قذافی
اسٹیڈیم کے نام پر رکھ دیے تھے۔

جسے وہ قذافی اسٹیڈیم کہتا تھا وہ چوبرجی کے پاس ایک
احاطہ سا تھا جہاں صبح شام پہلوانی کے شوقین زور کرنے آتے
تھے۔ انہیں پہلوانی کے داؤ پیچ اور اسرار و رموز سکھانے
والے خود کو مشہور پہلوانوں کے خاص چیلے کہتے تھے مگر
حقیقت یہ تھی کہ اب پہلوانی کا فن روبہ زوال تھا اور
اکھاڑوں میں دوسرے بہت سے دھندے شروع ہوگئے تھے۔

یہ احاطہ ایک پرائمری اسکول کا حصہ تھا چنانچہ دن میں
یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ احاطے کو بچے کھیل کے
میدان کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کی دیوار کے
ساتھ ساتھ بچوں کو کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے کھڑے
نظر آتے تھے۔

رات کے وقت یہاں قوالیاں بھی ہوتی تھیں اور جوا
بھی کھیلا جاتا تھا۔ مجرے بھی ہوتے تھے اور سٹہ بھی کھیلا جاتا
تھا۔ ظاہر ہے یہ سب کسی آبادی کے بیچ اس وقت تک ممکن
نہیں تھا جب تک اس کو علاقہ پولیس کی سرپرستی حاصل نہ
ہو۔ اسکول کے مالک کا سیاسی اثر رسوخ بھی کم نہ تھا۔ مرغوں
کی لڑائی کے لیے یہ جگہ ایک پہلوان کی وساطت سے حاصل
ہوتی تھی جو پہلوان کم اور بدمعاش زیادہ تھا۔ تاہم وہ اسکول
کے مالک کا خاص آدمی تھا اور اسے علاقے میں اپنی دہشت
قائم رکھنے کے لیے من مانی کرنے کی آزادی حاصل تھی۔

نیشنل اسٹیڈیم شالیمار باغ کی طرف تھا اور ایک
ٹرانسپورٹ کمپنی کا گیراج تھا جہاں ان کی مختلف شہروں کے
روٹ پر چلنے والی بسیں مرمت اور سروس کے لیے آتی
تھیں۔

بسوں کے اڈے کا مالک خود ایک عظیم مرغباز تھا اور
جہاں جہاں اس کی بسیں جاتی تھیں وہاں وہ اپنے جنگجو مرغوں
کو لڑانے کے لیے جاتا تھا۔ ان کو وہ مرغ نہیں بلکہ اپنے
علامہ اقبال صاحب کے شاہین کہتا تھا۔ اس کا شمار اس فن
کے ماہرین میں ہوتا تھا اور خود رئیس اس کا بڑا معتقد تھا اور
اسے استاد کہتا تھا چنانچہ اس کے شاہین اور اپنے عمران خان
کے مقابلے کا تصور بھی اس کے لیے استاد کے مقابلے پر خود
آنے کے مترادف تھا اور گستاخی کی بات تھی۔

استاد کی بسوں کے پیچھے ایسے ہی اشعار لکھے ہوئے نظر
آتے تھے جن میں شاہین کا ذکر ضرور ہو۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر
پہاڑوں کی چٹانوں پر۔ کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں
اور۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا پھر کسی نے اسے بتایا کہ
شہباز بھی وہی چیز ہے اور اسے علامہ صاحب کا ایک شعر سنایا
تو وہ پھڑک گیا۔ لڑاوے مولے کو شہباز سے۔ سنانے والا
غالباً مولے سے واقف نہ تھا۔ اس نے جو سنایا وہی استاد نے
لکھوادیا۔ لڑاوے نیولے کو شہباز سے اور اب یہ اس کا تکیہ
کلام جیسا ہوگیا تھا۔ وہ اپنے حریفوں کو چیلنج کرتا پھرتا تھا
"اوئے آجا فیردم ہے تے۔ لڑاوے نیولے کو شہباز سے۔"

حریف کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ اس کے
مرغ کو نیولا کہہ کے استاد تعریف کررہا ہے یا تحقیر۔ ویسے تو
ایک اصیل خاندانی قسم کے فائٹر مرغ کو نیولا کہنا اس کی توہین
لگتی ہے مگر نیولا بڑی بہادری سے سانپ کا مقابلہ کرتا ہے اور
اسے مار ڈالتا ہے۔ استاد فوراً وضاحت کردیتا تھا کہ یار' ہم تو
تیرے ککڑ کی ہمت' بہادری' پھرتی اور طاقت کی وجہ سے نیولا
کہہ رہے تھے۔ کوئی چوہا تو نہیں کہہ دیا کہ برا مانے بندہ۔

یہ سب کچھ مجھے دس سال رئیس کی صحبت میں رہ کے
معلوم ہوا تھا۔ مختلف وقتوں میں اس نے مرغوں کی لڑائی کے
بارے میں میری معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا تھا جن سے
دلچسپ' سنسنی خیز اور حیرت انگیز واقعات کا ایک پورا
انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا جاسکتا تھا۔ بہت سے واقعات کا میں
چشم دید گواہ بھی تھا جہاں میں نے رئیس کو مورل سپورٹ
دینے کے لیے مقابلے میں شرکت کی تھی۔

میں نے رئیس کو نیشنل اسٹیڈیم پر اتار دیا "گاڑی میں
لے جارہا ہوں۔ دس بجے تک یہاں نہ آؤں تو ٹیکسی پکڑ کے
گھر آجانا۔"

رئیس نے بڑے دکھی انداز میں مرغے کو دیکھا "یعنی
اب عمران خان ٹیکسی میں جائے گا۔"

نیس مارخان نے اچانک کہا "صاب آپ ناراض
ہوتی اگر ام ایک بات بولتی۔"

میں نے اس کی صورت سے سوال سمجھ لیا "تم مقابلہ
دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ام دیکھتی اور دکھاتی۔۔۔ اس کو" وہ شرم سے سرخ
ہوگیا اور اس کی مونچھیں لرزنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...نس کے کہا "اپنی گرل فرینڈ کو مقابلہ دکھاؤ گے'
...پھر تو گاڑی بھی چاہیے اس کو لانے کے

...صاب۔ ام آپ کو چھوڑتی پھر اس کو لاتی پھر
...ی ام حاضر ہوتی" اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے گا۔
...کہا "اتنی تکلیف مت اٹھاؤ۔ میں واپس خود
...ے ایبٹ روڈ پر ڈراپ کر کے تم گاڑی لے جاؤ'

...یہاں لائے گا اسے؟" رئیس نے کہا "سالے
...کا کیا کام۔ اتنا غل غپاڑا ہوتا ہے۔ گالی گلوچ'
...ہے۔"

...خان کا چہرہ بجھ گیا "صاحب۔ وہ بولتی ام کو...
...ی ہوتی۔ وہ ایک طرف بیٹھ جاتی۔ وہ دعا کرتی
...واسطے۔"

...نے کچھ دیر سوچا "اچھا دیکھ۔ پیچھے سے آنا اور
...چڑھ جانا بس کی چھت پر۔ جو بھی قریب ہو۔
...نظر آئے گا لیکن تم نظر نہیں آؤ گے کسی کو

...رت اور مسرت سے تمیں مار خان نے رئیس
...پھر میرے ہاتھ چومے "صاب' آپ ام پر
...مارا باپ صاب پر احسان کرتی' دادا صاب

...ندر چلا گیا تو تمیں مار خان نے گاڑی آگے
...یل میرے پاس تھا لیکن میں احتیاطاً اسے بند
...س وقت شبنم اپنے یعنی آزاد صاحب کے گھر پر
...ا اور آفس میں بھی۔ میں نے پہلے گھر کا نمبر ملایا
...نے ریسیور نہیں اٹھایا پھر میں نے آفس کا نمبر
...یاتیں کر رہا تھا اور لائن بزی تھی۔

تمیں مار خان نے شدتِ جذبات سے گلوگیر
...بتانے کی کوشش کی کہ چھوٹی سے اس کی سچی
...نے لیلیٰ مجنوں کی محبت سچ ہے۔ اس نے فلم
...تھی اور ابتا متاثر ہوا تھا کہ جائز و ناجائز ذرائع
...لیے رقم حاصل کر کے روز آخری شو دیکھنے
...آدھی رات کو واپس آتا تھا اور پھر اس عشق
...و بھاتا تھا۔ اسے ہر سین اصلی ڈائیلاگ کے
...دھا اور وہ مجھے مجنوں کی لیلیٰ سے پہلی ملاقات
...والے ڈائیلاگ سنانا چاہتا تھا کہ لائن مل

میں نے اسے روک دیا "بس یار۔ باقی پھر کبھی۔"
اس کو کچھ مایوسی ہوئی۔ دراصل میری مہربانہ حوصلہ افزائی نے اس کے سمندِ عشق کو مہمیز کر دیا تھا۔
"معلوم نہیں کس نے کہا "روزنامہ خبرساز۔"
میں نے کہا "مجھے مس شبنم سے بات کرنی تھی۔"
"اچھا جی۔ کیا بات کرنی تھی۔"
میں نے کہا "تمہارے سسر کا پیغام دینا تھا۔ تم دے دو گے۔"
ظاہر ہے اس کے بعد لائن فوراً شبنم سے ملا دی گئی۔ آپریٹر بعض اوقات اس قسم کی شرارت آمیز گفتگو کرتے ہیں اور پھر کبھی جاتے ہیں اگر شکایت ہو۔
شبنم نے کہا "ہیلو" اور پھر بولی "ہیلو!"
میں نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا "شبنم!"
مجھے اندازہ تھا کہ جواب میں وہ چیخ مارے گی "عالی۔ کہاں ہو تم؟"
میں نے کہا "ابھی تک تو اسی دنیا میں ہوں اور زندہ ہوں۔"
"بھئی کہاں سے بول رہے ہو" وہ کتنی آپ سیٹ تھی اس کا اندازہ مجھے اس کے لہجے سے ہو رہا تھا۔
"کیا جواب دوں؟ اپنے منہ سے۔ یا جگہ بتاؤں کہ کہاں ہوں۔"
"کیوں پریشان کرتے ہو مجھے؟"
میں نے کہا "میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔ چند منٹ میں' راستے میں ہوں اور موبائل فون پر تم سے مخاطب ہوں۔"
"عالی' تمہارے پاس موبائل فون بھی ہے۔ اس کے باوجود تم نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔" وہ بگڑنے لگی۔
میں نے کہا "آہستہ۔ آہستہ بات کرو اور میرا نام مت لو بار بار۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں روپوش ہوں۔"
"روپوشی مجھ سے بھی۔"
"حاضر ہو رہا ہوں رونمائی کے لیے۔ ایک تو مجھے دیکھ کے جذبات پر قابو رکھنا۔ حیرت سے چیخ مار کے بے ہوش ہونے یا بننے کی ضرورت نہیں۔"
"کیوں' ایسی کیا بات ہے۔ سینگ نکل آئے ہیں تمہارے سر پر۔"
میں نے کہا "تم دیکھ لو گی۔ میں اوپر تمہارے آفس میں نہیں آؤں گا۔ تم فوراً سب کام چھوڑ کے نیچے آ جاؤ اور چلبلی کے پاس ٹھہر جاؤ۔"

"چلبلی کی طبیعت ناساز ہے۔ آزاد صاحب کئی بار یاد کر چکے ہیں تمہیں۔ اس وقت بھی نیچے موجود ہیں۔ کسی کمینگی کو ڈانٹ رہے ہیں۔"
"اف۔ مارے گئے۔ اچھا تم اپنے آفس کی بلڈنگ سے چالیس قدم دور آ جاؤ۔ چہل قدمی کرتے ہوئے۔"
"ابھی۔ اسی وقت۔ میرا مطلب ہے ایک بہت ارجنٹ رپورٹ فائل کر رہی تھی میں۔"
"چلو پھر میں نہیں آتا۔ تمہاری رپورٹ اتنی اہم ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔"
اس نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں۔ میں آتی ہوں۔ دراصل ایک اہم پیش رفت ہوئی ہے خدا بخش مندرانی کیس میں۔ میری اس رپورٹ کے بعد پولیس مجبور ہو جائے گی قاتلوں کو گرفتار کرنے پر۔"
"تم ماشاءاللہ سے تجربہ کار صحافی ہو۔ سمجھدار بھی ہو۔ یہ بتاؤ کیا اس ملک کی پولیس مجبور ہو سکتی ہے؟ اس کے علاوہ۔ خدا بخشے خدا بخش مندرانی کو' مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس کے قاتلوں کی گرفتاری سے۔ تم بھی اس چکر میں مت پڑو" میں نے فون بند کر دیا۔
دس منٹ بعد گاڑی روزنامہ "خبرساز" کے دفتر کے سامنے سے گزری تو میں نے شبنم کو فٹ پاتھ پر جاتے دیکھ لیا۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور اسٹریٹ لائٹ کے دوسرے کھمبے تک پہنچ چکی تھی جب میں نے گاڑی رکوائی۔
میرے شیشہ نیچے کرنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ آئی تھی۔ میرا حلیہ دیکھ کے وہ مسکرائی اور بیٹھنے لگی۔
میں نے کہا "تمہاری کھٹارا کہاں ہے؟"
"اندر پارکنگ ایریا میں کھڑی ہے۔"
میں نے کہا "لے آؤ۔ میں ذرا آگے رک کے انتظار کرتا ہوں۔"
وہ پلٹ کے واپس گئی اور میں نے مڑ کے دیکھا۔ شبنم کی شخصیت بھی ایک انقلاب سے دوچار ہو چکی تھی۔ ایک پہلے والی شبنم تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا تو اس کے انداز و اطوار کی بے باکی اور شوخی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کا لباس جینز کے ساتھ کالی شرٹ ہوتا تھا جس کے مردانہ کالر والے گریبان کے اوپر والے دو بٹن ہمیشہ کھلے ہوتے تھے اور وہ دوپٹہ استعمال نہیں کرتی تھی چنانچہ یہ نظارہ بڑے بڑوں کے ہوش اڑا دیتا تھا۔ اس کے بال ہمیشہ چہرے پر پھسل کر آ جاتے تھے جن کو وہ ایک ادائے ناز سے ہٹانے میں مصروف رہتی تھی۔ دن میں اس کی گوری رنگت پر یہ جوش غضب ڈھاتا تھا اور اس کو بھی معلوم تھا کہ سیاہ و سفید کا یہ خیرہ کن امتزاج اس کی شخصیت کے تاثر میں کتنا تباہ کن اضافہ کرتا ہے۔ وہ اپنی اس طاقت کا بھرپور استعمال کرتی تھی اور ہر جگہ پہنچ کے اندر کی ساری خبریں لے آتی تھی۔ ہر ادارے اور محکمے میں کسی خاص سیٹ پر بیٹھے ہوئے مردوں کی آنکھیں خیرہ اور عقل ایسی مفلوج ہو جاتی تھی کہ وہ شبنم کی ایک نگاہِ التفات اور ایک دلنواز تبسم پر فائلیں کھول کے رکھ دیتے تھے۔ یہ تو انہیں بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواب میں جھلک دکھانے والی بجلی تھی جو ان کا مستقبل تاریک کر گئی۔
صحافیوں کے حلقے میں اس سے حسد کرنے والے بھی وہی تھے جو اس پر مرتے تھے مگر جتنا مرتے تھے' اس سے زیادہ ڈرتے تھے۔ شبنم جتنی بے باک تھی' اتنی ہی نڈر اور پُراعتماد بھی تھی۔ وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی تھی اور اسے بے شرم کہنے والے بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ اس کا کردار اس کی شخصیت کے عکس سے بالکل مختلف ہے۔
شبنم کو شکست ہوئی تھی صرف شاہ عالم کے معاملے میں۔ اس کے عشق نے شبنم کو بہت رسوا کیا تھا مگر اس نے اعلانیہ اس رسوائی کے داغ کو اپنے ماتھے پر بندیا کی طرح سجا لیا تھا۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ شبنم جیسی ذہین اور کسی کے قابو میں نہ آنے والی لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اور شبنم اس کا دوٹوک جواب دیتی تھی کہ مجھے شاہ عالم سے عشق ہو گیا ہے اور عشق میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔
آج مجھے شبنم اس لحاظ سے مختلف لگی کہ اس کا لباس ہی نہیں انداز و اطوار بھی یکسر بدل گئے تھے۔ اس نے سیاہ سفید کا امتزاج یوں برقرار رکھا تھا کہ اس کی شلوار سفید تھی اور قمیص کالی تھی مگر اس پر سفید پھول جگمگا رہے تھے اور اس کے گلے میں بلکہ ایک شانے پر دوپٹہ بھی تھا۔ دوسرے شانے پر اس کا وہی پرانا بیگ تھا جس میں وہ سارے زمانے کا الم غلم جمع رکھتی تھی۔ کیمرا' ٹیپ ریکارڈر' نوٹ بک' کیسٹ اور میک اَپ کے سامان سے سینڈوچ تک۔ اس کے ہیئر اسٹائل میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شوخ قسم کا میک اَپ وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی' اس کی بے داغ جلد میں صحت مندی کا اجلاپن تھا اور جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' وہ اپنی صحت کا خاصا خیال رکھتی تھی۔ خوراک کے معاملے میں محتاط تھی اور ورزش باقاعدگی سے کرتی تھی۔
اصل تبدیلی اس کی شخصیت اور کردار میں نظر آتی تھی۔ اس کے مجرمانہ حد تک بے باک انداز اور مردوں کے تسلط والے معاشرے کے خلاف باغیانہ طرزِ عمل میں اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے جیسی شدت نظر نہیں آتی تھی۔ پہلے اس کے تیور کچھ اور ہوتے تھے۔ لگتا تھا وہ اعلانیہ سارے زمانے کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتی ہے اور کوئی کچھ بھی کہے' کسی کی پروا نہیں کرتی۔

اب اس کے اطوار میں ایک نرم رو شائستگی اور نسوانیت کے احساس کا رکھ رکھاؤ آگیا تھا۔ شاید یہ اعصاب کی شکست وریخت اور ذہن کو متاثر کرنے والے حالات و واقعات کا نتیجہ تھا کہ اس نے ایک مدافعانہ اور محتاط رویہ اختیار کرلیا تھا۔

یہ بھی ہوسکتا تھا کہ شاہ عالم کی یکسر بدل جانے والی فطرت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اس نے خود کو بھی شعوری طور پر بدل لیا ہو۔ عورت سے زیادہ مرد کی نظر کی پسند ناپسند کو کون سمجھ سکتا ہے اور قدرت نے اس کی فطرت میں اتنی لچک رکھی ہے کہ وہ کوشش کرے تو خود کو نئے ماحول میں مرد کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے ایڈجسٹ کرلیتی ہے۔

رومان پرور خیالوں کی دنیا میں رہنے والی اور کسی آئیڈیل کے خواب دیکھنے والی لڑکیاں جب ماں باپ کی پسند کے سامنے سرجھکاتی ہیں اور کسی ان دیکھے ان جانے مرد کے ساتھ زندگی کے سفر پر روانہ ہوتی ہیں تو کامیاب وہی رہتی ہیں جو پانی کی طرح خود برتن کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ انگریز قوم کے ایک قول میں بڑی عملی دانائی ہے کہ مرد کے دل پر حکومت وہی عورت کرتی ہے جو محکوم بن کے رہنا جانتی ہے۔

شبنم نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں چونکا "نگاہ تم پر ہے تو ظاہر ہے تمہیں ہی دیکھ رہا ہوں۔"

وہ مسکرائی "میں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کسے دیکھ رہے ہو' کیا دیکھ رہے ہو یہ پوچھا تھا۔"

"دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی بدل گئی ہو' جب پہلی بار دیکھا تھا تمہیں۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "پہلی بار۔۔۔ اس وقت تو میں نئی نئی آئی تھی اس فیلڈ میں۔ یونیورسٹی کی ڈگری پر بڑا غرور تھا کہ جناب صحافت میں ایم اے کیا ہے کوئی مذاق نہیں اور پوزیشن لی ہے۔ پتا کچھ نہیں تھا کہ صحافت کیا ہوتی ہے۔ بالکل کچھ نہیں آتا تھا۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ تھا' نہ کپڑے پہننے کا ڈھنگ۔ یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟"

میں اپنی بات پر خود ہی پھنس گیا تھا۔ معلوم نہیں شاہ عالم نے اسے پہلی بار کب اور کہاں دیکھا تھا۔ میں نے تو صرف ایک سال پہلے کے حوالے سے اس کی شخصیت کے انقلاب کی بات کی تھی۔

"کیا کہا تھا؟" میں نے یوں کہا جیسے مجھے یاد ہے مگر میں شبنم کی یادداشت دیکھنا چاہتا ہوں۔

"تم نے کہا تھا۔۔۔ محترمہ' آپ فیشن شو میں تشریف لائی ہیں یا ماڈل بننے۔ میں اپنی طرف سے بڑی تیاری کرکے اور بہت سج دھج کے آئی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر لوگ کسی جاب کے لیے انٹرویو دینے جاتے ہیں" وہ ہنسی۔

میرے لیے ایک اور آزمائش۔ اب مجھے کیا معلوم کہ میں نے شبنم کو اس کی درخواست کے جواب میں بلایا تھا یا وہ خود میرے استمہار کو دیکھ کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں آئی تھیں تو کس جاب کے لیے۔ شبنم کو تو دن تاریخ اور وقت تک یاد ہوگا۔

مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس انٹرویو کے نتیجے میں شبنم کو منتخب کرلیا گیا تھا یا شاہ عالم کے اس جملۂ معترضہ کے بعد وہ مایوس لوٹ گئی تھی پھر کسی موقع پر کہاں اور کتنے عرصے بعد اسے شاہ عالم کی نگاہِ انتخاب میں آئی تھی۔ وہ اور شاہ عالم پہلی بار کب ملے تھے جب کوئی اور نہ تھا۔

میں نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا "میں یہ دیکھ رہا تھا کہ پچھلے ایک سال میں تمہاری شخصیت کا بالکل نیا روپ سامنے آیا ہے۔"

وہ کچھ اُداس ہوگئی "پچھلے ایک سال کی بات کیوں کرتے ہو۔ اس ایک سال میں تو تم بھی وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔"

اب مداری کو پیار کی ڈگڈگی بجانے کی ضرورت تھی۔

میں نے کہا "تم پوچھوگی نہیں کہ یہ انقلاب کیسا لگا تمہیں؟"

"کیا فائدہ؟ مجھے معلوم ہے تم کیا کہوگے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی مرد ہوتا۔ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اب تم اچھی نہیں لگ رہی ہو جانم' تعریف کے لیے تم وہی شاعرانہ اندازِ بیان اختیار کروگے۔"

میں نے کہا "یار یہ زیادتی ہے۔ ایسے سچ پر سنے بغیر جھوٹ کا کیل لگانا۔"

"او کے۔ کیا ہے سچ؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"چلو جانے دو۔ اگر تمہیں دلچسپی نہیں۔۔۔ یہ بتاؤ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔"

"یہ سوال میں پوچھنا چاہتی تھی تم سے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ تم بیمار تھیں۔"

"میں بیمار تھی۔ اب نہیں ہوں مگر اب تم بیمار لگ رہے ہو۔"

"مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ذرا حلیہ ملاحظہ کروا اپنا۔" اس نے گاڑی کے بیک ویو مرر کا رخ میری طرف کردیا۔

میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی "سب ٹھیک ہے۔ اگر تمہاری مراد اس لباس سے ہے جو تمہیں مضحکہ خیز لگ رہا ہے' تو یہ مجبوری ہے میری۔ میں زندگی کے لیے بھاگ رہا ہوں اور موت ہر جگہ مجھے اپنے تعاقب میں محسوس ہوتی ہے۔"

"موت سے بچ کے بھاگ سکتا ہے کوئی؟"

میں نے کہا "مجھے یہ انتہا محسوس ہوتی ہے بدبختی کی۔ کہ میں عام آدمی کی حرام موت کے خوف سے بے نیاز ہوکے گلی محلوں میں سڑکوں اور بازاروں میں نہیں گھوم سکتا۔ جیسے ہمارے چاروں طرف ہزاروں لاکھوں بے فکرے پھر رہے ہیں۔ ان کو کسی نادیدہ دشمن کا خیال نہیں۔ کسی نامعلوم قاتل کا اندیشہ نہیں۔ یہ موت کو برحق سمجھ کے مطمئن ہیں کہ جب وقت آئے گا تو سبھی کو مرنا ہے مگر میں بھیس بدل کے بھی ڈر رہا ہوں۔ خوف زدہ ہوں ان دشمنوں سے جو ہر سمت سے مجھے محصور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھ سکتے ہیں مگر خود نظر نہیں آتے۔"

"تم کیوں اتنے DEPRESSED ہو۔ میں تمہارے چہرے کی بات کررہی تھی۔ تمہاری شیو کتنی بڑھی ہوئی ہے اور آنکھوں کے گرد ایسے حلقے پڑگئے ہیں جیسے تم نے فاقے کیے ہیں اور جیل کاٹی ہے" وہ بولی۔

"اچھا!" میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"یعنی ابھی تک تمہیں احساس بھی نہیں تھا؟ آج بتاؤ' تمہیں فرصت نہیں ملی۔ کسی ایسے کام میں پھنس گئے تھے یا ہوش نہیں تھا۔"

میں نے ایک لمبی گہری سانس لے کر اپنا سر پیچھے لگادیا۔ دونوں ہی باتیں تھیں۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "بتاؤں گا۔ سب بتادوں گا۔ تمہیں نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔۔۔ یہ بہت لمبی بات ہے۔ فرصت سے بتاؤں گا۔"

اس نے مایوسی کا اظہار کیا "تمہاری مرضی۔ یہ بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

"جہاں تمہارا جی چاہے' لے چلو مجھے۔ میں تمہارے DISPOSAL پر ہوں مکمل طور پر۔ اسی لیے آیا ہوں تمہارے پاس کہ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے اور اس کے لیے مجھے صرف فرصت ہی نہیں' تھوڑا سا سکون چاہیے اور تخلیہ چاہیے۔ اگر میرا کوئی گھر ہوتا تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔"

"تمہارا گھر نہیں ہے؟" وہ خوش تھی اور حیران تھی اور میرے لیے فکرمند تھی اور اس لیے مجھ سے زیادہ کنفیوز ہورہی تھی۔

میں نے کہا "ہاں' مکان بہت تھے میرے۔ محل تھے اور عالی شان دفاتر تھے۔ کاروباری ادارے تھے لیکن گھر۔۔۔ ایک گھر تھا جس میں رخشندہ رہتی تھی میرے ساتھ۔ میری بیوی' پھر میں نے دونوں کو چھوڑ دیا۔ تم جانتی ہو' مجھ بے گھر کو اپنے گھر لے جاؤ۔"

"عالی! کیا تم نے پی رکھی ہے؟" وہ ہنسنے لگی "میرا کون سا گھر ہے؟"

"اچھا۔ یعنی ہم دونوں بے گھر ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "دراصل میں بہت تھکا ہوا ہوں اور بہت پریشان بھی ہوں۔ آج کل تم آزاد صاحب کے ساتھ رہتی ہو مگر وہ جو پہلے دو بیڈ روم والا ایک پورشن تھا تمہارے پاس۔"

"وہ میرے بھائی کا تھا۔ میں اسے کرایہ دیتی تھی۔ وہاں کچھ بھی میرا نہیں تھا۔ جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ دبئی گیا تو سب ایسے ہی چھوڑ گیا تھا لیکن وہاں میں اکیلی رہتی تھی۔ اس سے بڑے مسائل پیدا ہوتے تھے۔"

"ہاں۔ اکیلی عورت۔۔۔ خصوصاً تم جیسی عورت۔۔۔ اس ہوس ناک معاشرے میں کہیں بھی اکیلی نہیں رہ سکتی اور محفوظ نہیں رہ سکتی۔"

"اس کی چابیاں ہیں میرے پاس۔" شبنم سنبھل کے بولی۔

میں نے کہا "نہیں۔ وہاں جانا کسی طور مناسب نہیں۔ نہ میرے لیے اور نہ تمہارے لیے۔"

"پھر یوں کرتے ہیں' کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔"

میں نے کہا "بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

"کسی اچھے سے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ روف ٹاپ لاؤنج میں۔"

"وہاں بہت لوگ ہوں گے اور بہت شور ہوگا" میں نے کہا۔

"پھر تم ہی بتادو" وہ جھلا کے بولی۔

"تمہیں آتا ہے کھانا پکانا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

وہ حیرانی سے بولی "سب کچھ آتا ہے مجھے۔ کھانا پکانا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے میری۔"

"آزاد صاحب تو پہنچ چکے ہوں گے آفس" میں نے گھڑی دیکھی "اور اب صبح نو بجے سے پہلے لوٹ کے نہیں آئیں گے۔"

اس کا چہرہ بے یقینی کے باوجود اُمید سے روشن ہوگیا "تمہارا مطلب ہے۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔"

اور اس وقت جب شبنم نے گاڑی کا رخ موڑا اور میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں سوئے ہوئے ارمان انگڑائی لے کر بیدار ہوتے نظر آئے۔ وہ خواب جو راکھ میں دبی چنگاریوں کی طرح بجھ گئے تھے' پھر روشن ہونے لگے تو میرے اندر کی ایک آواز نے کہا' یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یہ مداری کا کھیل ہے۔ تم جانتے ہو کہ تم شاہ عالم نہیں ہو مگر تم اپنے شاہ عالم ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہو۔'

میں نے گھبرا کے کہا' ہرگز نہیں لیکن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرا مقصد ہرگز اس کا استحصال نہیں ہے۔'

' استحصال تو حالات کرتے ہیں جو تم پیدا کر رہے ہو۔ جذباتی استحصال کا انجام جسمانی استحصال ہوگا۔ کیا تم نہیں جانتے پھر یہ دھوکا کس لیے' یہ خود فریبی کیوں کر تم دلدل میں اُتر کے دامن پر کیچڑ کا داغ لیے بغیر اپنی مرضی سے باہر نکل آنے پر قادر ہو۔'

مجھے بروقت اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ میں نے کہا "شبنم! تمہیں معلوم ہے میں ایک تہ خانے میں چھپا ہوا تھا۔ زمین کے نیچے روپوش تھا۔ اتنی ہی گہرائی میں جتنی گہرائی میں شہر خموشاں کے مکین رہتے ہیں۔ مجھے بارہا ایسا لگا جیسے میں بھی دفن کر دیا گیا ہوں اور میرے اوپر جو انسانوں کی دنیا آباد ہے' وہ مجھے فراموش کر چکی ہے۔"

اس نے ہمدردی سے مجھے دیکھا "ٹیک اِٹ ایزی۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "ان دیواروں کے درمیان میرا دم گھٹتا تھا۔ میں وہاں سے نکل بھاگا۔ میں لوٹ کے وہاں نہیں جانا چاہتا۔ بے حس سنگین دیواروں کے سامنے۔ میں کھلی ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں تذبذب اور شش و پنج کی کیفیت آگئی۔

میں نے کہا "چلو کھانا کہیں سے بھی لے کر دریا کی طرف چلتے ہیں۔ ہمیں کوئی کشتی مل جائے گی۔ آج چاندنی رات ہے۔"

خاموشی سے اس نے سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں شدید ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں۔ میرے خیالات کی رو بار بار بھٹک جاتی ہے اور اس ذہنی کیفیت میں مجھے اس کی رفاقت' غمگساری اور اعتماد کے سہارے کی ضرورت ہے۔

نعمت کدے کے سامنے اس نے گاڑی روک لی "اب تم آرام سے بیٹھے رہو۔ میں آتی ہوں پانچ منٹ میں کچھ لے کر۔ تم بتاؤ کیا لاؤں؟"

میں نے کسی بچے کی طرح سر ہلایا "جو تمہارا جی چاہے۔"

اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تمہیں۔ وعدہ کرو کہ تم باہر نہیں آؤ گے۔ شیشے بند رکھو گے؟"

میں نے مسکرا کے اسے دیکھا "میری فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ ایسا نہ ہو کہ میں واپس آؤں تو جناب کا پتا ہی نہ ہو۔" اس نے چٹکی بجائی "میں یوں گئی اور یوں آئی۔"

میں نے کہا "تمہیں چھوڑ کے میں کہاں جا سکتا ہوں۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ویسے ہی بندھے ہوئے ہیں۔"

میرے اس ڈائیلاگ نے شبنم کو خوش اور مطمئن کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں تاریک شیشوں سے باہر انارکلی کی روشنیاں اور جگمگاتی دکانوں کے اندر اور باہر کی چہل پہل کو دیکھتا رہا۔ وہاں خوش حال اور خوش پوش' خوش باش اور خوش خوراک زندہ دلانِ لاہور زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ رہے تھے۔ ایک دو سرے کی باتوں پر ہنس رہے تھے اور بڑی اپنائیت سے ایک دوسرے کو سؤر و اپتر اور حرام زادہ کہہ رہے تھے۔ لڑ رہے تھے اور کسی کے گلاس خالی کر کے ڈکاریں مار رہے تھے۔

مجھے ان سب پر رشک آیا کیونکہ غم روزگار کی چکی میں سارا دن پسنے کے بعد وہ ہنس بول کے اور گھوم پھر کے اپنی ساری تھکن اتار رہے تھے اور ان کے گھر تھے جہاں ان کی بیویاں اور ان کے بچے تھے اور ان کی فکر کرنے والے ماں باپ تھے اور نوجوانوں کے چاچوں' ماموں کی بیٹیاں تھیں جن کو وہ گھر کی کسی تقریب میں موقع پا کے کہیں بھی چھیڑ ڈال لیتے تھے اور پاس پڑوس کی لڑکیاں تھیں جن کو وہ آنکھیں مارتے تھے اور رقعے بھیجتے تھے۔

مگر ان سب سے الگ سزائے موت کے ڈر سے فرار ہونے والے کسی قیدی کی طرح۔ ایک چھوٹی سی ڈبیا جیسی کار

میں سیاہ شیشے چڑھائے میں خوف زدہ اور سمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ میں باہر کے خوش و خرم اور عام لوگوں کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ حالانکہ میں بہت دولت مند تھا اور بہت شہرت یافتہ بھی تھا مگر دولت یا شہرت کا تعلق خوشی سے نہیں تھا۔ میں غمزدہ' احساسِ محرومی کا مارا ہوا اور مسترد کیا ہوا اکیلا شخص اس دولت سے کوئی خوشی نہیں خرید سکتا تھا۔

شبنم کا خیال درست تھا۔ میں ڈیپریشن کا شکار تھا اور اس کی وجوہات بہت واضح تھیں۔ میرے اعصاب ابھی ٹھکرائے جانے کے صدمے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ میری نظروں کے سامنے خادم کو قتل کر دیا گیا اور پھر میری نظروں کے سامنے ہی قاتل اس کی لاش بھی لے گئے۔ خادم کے لہو کو میں نے سڑک پر پھیلتے اور خشک ہو کے جیلی کی طرح جمتے اور اپنے ہاتھوں سے چپکے محسوس کیا تھا اور اس کی حواس کو مختل کر دینے والی بُو کو سونگھا تھا اور پھر سارا دن ایک مورتی کی نحوست زدہ موجودگی مجھے ڈراتی رہی تھی۔ اگر میں رئیس کے جانے کے بعد اس مورتی کے سر کے ساتھ تہ خانے کے مدفن میں اکیلا رہ جاتا تو مجھے یقین ہے کہ میرا ذہن اس کے آسیب کا شکار ہو جاتا حالانکہ میں اس قسم کے توہمات کا کبھی قائل نہیں تھا۔

میرا ذہن انہی سوچوں کے گرداب میں غوطہ زن تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک سوزوکی پک اپ آ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے بڑی بدتمیزی اور جہالت کے ساتھ شبنم کی سوزوکی کا راستہ روک دیا تھا۔ ایسے گاڑی کو پارک کرنا کہ دوسرا شخص پھنس کے رہ جائے اور اپنی گاڑی نہ نکال سکے۔ BAD MANNERS کی بات تھی جس کا مظاہرہ یہاں پڑھے لکھے بھی کرتے تھے۔ سوزوکی پک اپ کے سوار تو اَن پڑھ اور مزدور... پیشہ لوگ نظر آتے تھے۔

میں اُتر کے ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ گاڑی سامنے سے ہٹا لیں یا مجھے موقع دیں کہ میں پہلے کار نکال لوں مگر ایک تو میرے پاس کار کی چابیاں نہیں تھیں' دوسرے وہ اتر کے دور نہیں گئے تھے بلکہ وہیں سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک ریڑھی کے پاس بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے صرف ڈرائیور کی صورت کا سائڈ پوز دیکھا تھا۔ دوسرا شخص دوسری طرف سے اتر گیا تھا مگر جب وہ میری طرف رخ کر کے بیٹھا تو اس کا پورا چہرہ میرے سامنے آیا۔ معلوم نہیں کیوں اسے دیکھ کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

اس وقت بھی اندھیرے اجالے کی ملی جلی کیفیت تھی۔ جب میں نے یہ چہرہ پہلی بار دیکھا تھا اور اب میں پھر اسے اتنے ہی فاصلے سے ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یہ چہرہ نہ جانے کیسے میرے لاشعور کے نہاں خانے سے نکل آیا تھا اور میں نے اسے شناخت بھی کر لیا تھا۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ اسے پھر دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا تو میں اسے نہیں پہچان پاؤں گا لیکن یہ دنیا امکانات سے بھری پڑی تھی۔ کسی تلاش' خیال یا امید کے بغیر وہ خود ہی میری زد کے سامنے آ گیا تھا حالانکہ اس وقت میرا وہاں پایا جانا اتفاقات کے ایک سلسلے کا نتیجہ تھا۔ اگر میں شبنم کی کسی اچھے سے ہوٹل کے روف ٹاپ لاؤنج میں ڈنر کی بات مان لیتا یا ہم آزاد صاحب کے گھر چلے جاتے جہاں وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانا پکاتی۔ وہ دوبارہ گاڑی نہ موڑتی اور عین نعمت کدے کے سامنے گاڑی یہاں کھڑی نہ کرتی تو نا ٹھنگ آگے پیچھے ہو جاتی اور صبح چار بجے کے بعد رات کے نو بجے میں اسے پھر نہ دیکھتا۔

میں احتیاط سے نیچے اترا اور سوزوکی پک اپ کے پیچھے سے گھوم کے اس طرف گیا جہاں وہ اپنے ساتھی کے ساتھ بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس بینچ کے بالکل پیچھے دوسری بینچ تھی جس پر ایک مرغ چھولے والے کے معزز گاہک تشریف فرما تھے۔ یہ سلسلہ بہت دور تک ایسے ہی پھیلا ہوا تھا۔ ایک ریڑھی کے ساتھ ہی دوسری ریڑھی کی حیثیت ایک الگ روڈ سائڈ ریسٹورنٹ کی تھی۔ مرغ چھولے والے کے بعد ایک کبابی تھا پھر ایک تلی والا۔ ہر ریڑھی والے نے ریڑھی کی چوڑائی سے کچھ زیادہ رقبہ اپنے سامنے ایسے گھیر رکھا تھا کہ تین طرف تین بینچوں کو آپس میں ملا دیا گیا تھا۔ درمیانی حصے کے اسٹول میز کا کام دیتے تھے اور چوتھی طرف ریڑھی سے سپلائی جاری رہتی تھی۔

میں ان دونوں کی طرف پشت کر کے بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ ان میں سے کوئی میری صورت نہ دیکھ سکے اور میں ان کے قریب رہتے ہوئے ان کی باتیں سن سکوں۔ اس بینچ پر دو افراد پہلے سے بیٹھے مرغے کی ایک ٹانگ سے کھینچا تانی میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے مرغ چھولے والے سے سوال کیا "مرغی اصلی تھی یا پلاسٹک کی بنی ہوئی؟"

اس نے سخت برا مانا "او بھائی جی۔ میں کیا چھولوں کے ساتھ کھلونے پکاتا ہوں۔ بس ذرا جاندار مرغی تھی آج۔ تھوڑی جان لگاؤ۔"

"اوئے کتنی جان لگائیں؟ دانت ٹوٹ جائیں گے۔ بوٹی نہیں ٹوٹے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھولے والے نے اپنی صفائی میں کہا "میں نے تو یہ ڈیڑھ گھنٹے چولھے پر رکھی کڑھی میں ڈال کے۔"

"اوئے کڑ دے پُتر۔ چولھے کے نیچے آگ بھی جلائی تھی؟" دوسرا بولا۔

مرغ چھولے والے نے انہیں دوسری ہوٹی بدل کے دینے کے لیے دیگ نما پتیلے میں سر ڈالا۔ میں نے سڑک کے شور وغل کے باوجود ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی جو میرے بالکل پیچھے مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھے۔ ایک بار ان کے قریب تر ہونے کی غیر شعوری کوشش میں ان کی کمر سے میری کمر بھی چھو گئی۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ اپنی باتوں میں مگن تھے۔

ان میں سے ایک کی آواز سننے کے بعد میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہی آواز میں نے صبح ہونے سے پہلے رات کے آخری پہر کی خاموشی میں بھی سنی تھی جب اس نے ایک مورتی کا سر خادم کی لاش پر پھینکتے ہوئے کہا تھا کہ اوئے اسے بھی لے جا اپنے ساتھ دوسری دنیا میں۔

سوزوکی پک اپ کا نمبر میں نے پہلے ہی نوٹ کر لیا تھا۔ اب میں ان کی گفتگو سن کے کوئی کام کی بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جسے میں نے شناخت کیا تھا' وہ بڑے جوش و خروش سے کسی بلیو فلم کا ذکر کر رہا تھا جو اس نے حال ہی میں دیکھی تھی اور دوسرا اسے دیکھنے کی آرزو میں بے تابی سے پھڑک رہا تھا۔ اس کے آتش شوق کو ہوا دینے والا فلم کے منتخب مناظر کی تصویر اپنے الفاظ میں بڑی تفصیل سے کھینچ رہا تھا اور خود ہی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اوئے میں تینوں کی دساں۔ انتیس انچ کاٹی وی تھا۔ سب ایسے لگتا تھا جیسے اپنے سامنے ہو رہا ہے۔"

دوسرے نے حسرت سے کہا "اپنے پاس تو وہی پرانا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی ہے۔ وہ بھی چودہ انچ کا۔"

پہلے نے حقارت سے کہا "اوئے دفع کر اسے۔ تو بتا کوئی بندہ ہے اپنا سنیما میں۔"

"بندہ تو ہے یار۔"

پہلے نے کہا "فیر تے واہ وا... آج کل ایک نئی چیز آئی ہے۔ ویڈیو پروجیکٹر کہتے ہیں اسے۔ وی سی آر والی فلم سنیما کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شو ہو جائے تو ہاؤس فل جائے گا رب دی سوں۔"

"مگریا... وہ سالا ہے میرا۔ رشتے کا... میری گھر والی کو بتا دا مجھ۔"

"اوئے پھر کیا ہوا" پہلے نے قہقہہ مارا "کہہ دینا کہ تجھے بھی دکھا دیں گے کسی دن۔"

مجھے شبنم کی فکر تھی کہ وہ مجھے غائب پائے گی تو پریشان ہوگی۔ اس کی گاڑی کے اور میرے درمیان سوزوکی پک اپ حائل تھی۔ میں اس موقع کو ضائع کرنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہاں بلاوجہ غیر معینہ مدت تک بیٹھے رہنا بھی مشکل تھا۔ وہ جس قسم کی گفتگو میں مصروف تھے' اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کا امکان بھی کم تھا۔

اچانک میں نے شبنم کو نعت کندے سے ایک شاپنگ بیگ کے ساتھ برآمد ہوتے دیکھا۔ اسی وقت مرغ چھولے والے نے میرے سامنے والے اسٹول پر ایک چنگیر رکھ دی جس میں دو روٹیاں تھیں اور مرغ چھولوں سے لبالب بھری ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی پلیٹ۔ یہاں آرڈر دینے یا لینے کے تکلفات نہیں تھے۔ جو بینچ پر آ کے بیٹھا ہے وہ مرغ چھولے ضرور کھائے گا۔

میں نے بوٹی پر ایک نظر ڈالی۔ دبا کے اسے ٹیسٹ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا "چل میاں سنبھال اپنے کُکڑ کی ٹانگ۔ ان سے لے کے مجھے ٹکرا دی؟"

ٹانگ کو پہلے مسترد کرنے والوں نے میرے خیال کی تائید کی۔

مرغ چھولے والے نے ان دونوں پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی جن کی باتیں سن کے میرا بھی دماغ خراب ہو گیا تھا۔ "دکانداری نہیں خراب کرنی چاہیے کسی کی۔"

"ہاں۔ تیری دکان داری نہ رکے خواہ کھانے والے کی سانس رک جائے" انہوں نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

میں گاڑی کے پاس آیا تو شبنم پریشانی سے ہر طرف دیکھ رہی تھی "تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور گاڑی سے کچھ دور لے گیا۔ "آئی ایم سوری۔ مجھے اچانک جانا پڑا۔ یہ سوزوکی پک اپ دیکھ رہی ہو جو تمہاری گاڑی کے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی ہے؟"

"ہاں! یہ کس کی ہے؟"

میں نے کہا "دو افراد اس میں سے اتر کے نیچے بیٹھ گئے ہیں اور وہی بھلے کھا رہے ہیں۔ ایک سلیٹی رنگ کے شلوار قمیص میں ہے اور کچھ موٹا ہے۔ دوسرے نے سفید کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"اچھا۔ کون ہیں وہ؟" شبنم نے کہا۔

"ان میں ایک خادم کا قاتل ہو سکتا ہے' سلیٹی کپڑوں

والا۔"

شبنم نے مجھے غور سے دیکھا "تمہارا مطلب ہے عثمان کا؟"

"نہیں۔ میں نے خادم کہا ہے تو میری مراد ہے خادم۔ جو عثمان کا ساتھی تھا۔ عثمان کا قتل بہت پہلے ہو گیا تھا۔ خادم کو آج صبح تین اور چار بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔"

"یہ... تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر خبر پہلے صحافیوں کو ملے اور پھر ہم جیسی پبلک کو اخبار سے پتا چلے۔ میں اس کے قتل کا واحد چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ قاتل ایک کار میں سوار تھے۔ میں نے ان کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔"

شبنم کا رنگ اڑ گیا "وہ... تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں یہاں؟"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ انہیں یقین ہے کہ کسی نے بھی خادم کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو وہیں مار دیتے۔ اس وقت دیکھنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ پوری بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

شبنم نے سر ہلایا "تم کیا کرنا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "تمہیں میری مدد کرنی ہے شبنم۔ وہ ابھی چند منٹ میں فارغ ہو کے اپنی گاڑی نکالنے آئیں گے۔ تم آگے بڑھ کے ان سے کہنا کہ بھائی صاحب' گاڑی کی بیٹری ڈیڈ ہے۔ وہ سامنے سے پیچھے کی طرف دھکا لگائیں گے۔ تم گاڑی کو ریورس میں اسٹارٹ کر لینا۔ میں بس اتنی دیر میں اپنا کام ختم کر لوں گا۔"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ ان کی گاڑی میں سے کاغذات نکالوں گا۔ ابھی وہ بالکل سامنے بیٹھے ہیں۔ جب ان کی پشت میری طرف ہوگی تو میں دوسری طرف جا کے گلو کمپارٹمنٹ سے گاڑی کے کاغذات نکال لوں گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس نمبر دیکھ لو۔"

میں نے کہا "نمبر میں نے دیکھ لیا ہے مگر نمبر پلیٹ جعلی بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے گاڑی ان کی نہ ہو۔ انہوں نے واردات کے لیے کسی سے چھینی ہو۔"

"پھر کاغذات سے کیا پتا چلے گا ان کے بارے میں اور ممکن ہے کاغذات ہی نہ ہوں گاڑی میں" شبنم نے کہا۔

"رائٹ پھر میں ان کے ساتھ جاؤں گا۔"

"ان کے ساتھ... پاگل ہو گئے ہو تم؟"

میں نے کہا "انہیں معلوم نہیں ہوگا۔"

شبنم نے سر پر ہاتھ مارا "میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے عالی!"

"آ جائے گا۔ یہ بتاؤ موبائل فون ہے تمہارے پاس۔"

اس نے سر ہلایا "ہاں' گاڑی میں ہے۔ چارجنگ پر لگا ہوا ہے۔"

"گڈ۔ اب تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ اگر میں ان کے ساتھ جاتا ہوں تو تم اس گاڑی کا تعاقب کرو لیکن ایسے کہ انہیں معلوم نہ ہو۔"

"یہ بہت مشکل ہے۔ وہ پہچان جائیں گے مجھے دیکھتے ہی۔"

میں نے کہا "تم فاصلہ زیادہ رکھو۔ میں تمہیں اپنے موبائل فون سے ہدایات دوں گا۔ گاڑی کدھر جا رہی ہے۔ کہاں مڑی ہے' اپنا نمبر بتاؤ۔"

وہ سخت کنفیوز نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے نمبر بتایا۔

"لیکن عالی...!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب تم جاؤ' اگر وہ گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے تو ہمارے لیے ان کا پیچھا کرنا مشکل ہو جائے گا اور خطرناک بھی" میں نے اسے دھکیل دیا۔

وہ میری ہدایات کے مطابق اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ چند منٹ کے بعد وہ نمودار ہوئے اور شبنم نے دروازے سے باہر قدم رکھ کے انہیں مخاطب کیا۔ وہ ایک ساتھ رکے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کے گاڑی کو دھکا لگانے کے لیے بڑھے۔ اتنی خوب صورت لڑکی اتنی عاجزی سے درخواست کرے تو اس کی چھوٹی سی نازک کار کو دھکا لگا کے اسٹارٹ کرانا دو تنومند مردوں کے نزدیک (جن کا گزارا بلیو فلموں پر تھا) بڑے اعزاز کی بات تھی۔ کیا پتا پردۂ غیب سے کوئی فلمی اتفاق ہی ظہور میں آ جائے اور یہ ملاقات ایک بہانہ بن جائے۔

میں کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے سوزوکی پک اپ کے دوسرے دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ وہاں اتنے لوگ تھے مگر کوئی کسی کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے یا اپنے خیالوں میں گم تھے۔ سوزوکی پک اپ کے دونوں دروازوں کے اوپر والی کھڑکیوں کے شیشے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے بائیں جانب سے ایک ہاتھ ڈال کے گلو کمپارٹمنٹ کو بٹن دبا کے کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا' گلو کمپارٹمنٹ لاک تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ سوزوکی پک اپ پیچھے سے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں ہڈیا سیٹیں وغیرہ نہیں تھیں۔ اس سے میرا کام کچھ مشکل ہوگیا۔ میں ایک سائڈ سے جمپ لگا کے اوپر چڑھا اور فرش پر سیدھا لیٹ گیا۔ مجھے امید تھی کہ شبنم نے مجھے ایسا کرتے ضرور دیکھا ہوگا لیکن اس کی کار کو دھکیلنے والوں کی میری طرف پشت تھی۔

جب تک انہیں شک نہ ہوتا انہیں آگے ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھنے سے پہلے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں دم سادھے بے حس و حرکت پڑا آسمان کو دیکھتا رہا۔ چند منٹ بعد میں نے ان کی آوازیں سنیں۔

"او یار کیا شے تھی کڑی بھی" یہ سلیٹی کپڑوں والے کی آواز تھی۔

"آہو یار۔ ایسہ کون سی؟" دوسرا سوچتے ہوئے بولا "مجھے تو لگتا ہے کہ اسے فلموں میں دیکھا ہے۔"

پھر دروازے بند ہوئے اور سوزوکی کا انجن غرایا۔ سوزوکی الٹے قدموں واپس ہوئی اور پھر سیدھی دوڑنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے ساتھ "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" والی بات نہیں ہوئی۔ ڈرائیور کے اور میرے بیچ میں پارٹیشن تھی جس کا درمیانی حصہ شیشے کا تھا اور اس میں سے وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ میں چوڑائی کے رخ بالکل پارٹیشن وال کے ساتھ ہی فرش پر لیٹا ہوا تھا۔

ان کے باتیں کرنے کی آوازیں مجھ تک دونوں کھلی کھڑکیوں کی طرف سے پہنچ رہی تھیں اور میرے دونوں جانب سڑک کی ٹریفک کا اتنا شور تھا کہ میں اس گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے آہستہ سے جیب میں ہاتھ ڈال کے رئیس کا دیا ہوا موبائل فون نکالا اور اس کے اندھیرے میں روشن نظر آنے والے ہندسوں کو دیکھ کر شبنم کا نمبر ڈائل کیا۔ "خدا کرے نمبر مجھے صحیح یاد رہا ہو" میں نے سوچا۔

نمبر ٹھیک تھا۔ اس نے گھنٹی بجتے ہی سیٹ آن کردیا "ہیلو۔"

میں نے کہا "تم میرا پیچھا کررہی ہو؟"

"ہاں عالی" وہ سخت ٹینشن میں تھی "میں تمہارا پیچھا کررہی ہوں۔"

"کتنی ڈھٹائی سے کہہ رہی ہو یہ بات۔ شرم نہیں آتی شریف لڑکوں کا پیچھا کرتے۔ گھر میں باپ بھائی نہیں ہیں کیا؟"

وہ کچھ اپ سیٹ ہوگئی "معلوم ہے لڑکیوں کو کیا جواب ملتا ہے اگر وہ یہ پوچھیں کہ گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟"

میں نے کہا "یہ سوال مجھ سے کبھی کسی نے کیا نہیں۔"

"جواب ملتا ہے کہ ماں بہن تو ہیں۔ معشوق نہیں ہے کوئی اب بتاؤ میں تم سے کیا کہوں؟"

"تم بھی یہ جواب دے سکتی ہو۔"

"یہ بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو۔ فضول باتیں چھوڑو۔"

میں نے کہا "میں ایک اوپن ائر حرکت پذیر گاڑی کے فرش پر لیٹا تاروں بھرے آسمان کا نظارہ کررہا ہوں۔"

"افوہ عالی۔ مجھے ٹریفک میں کچھ پتا نہیں چل رہا ہے کہ جناب کی سواری آخر کدھر گئی ہے۔"

میں نے کہا "میں غالباً۔۔۔ بلکہ یقیناً کچہری روڈ پر لے جایا جارہا ہوں۔"

گاڑی کو بریک لگے تو میں نے فون بند کرکے اپنے کرتے کی پاکٹ میں رکھ لیا۔ گاڑی کے رکتے ہی سفید کپڑوں والا اترگیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا "اچھا یار فیکے۔ میں چلتا ہوں اگلی کا کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی کیا پتا۔ جو ہوگا پتا چل جائے گا" فیکے نے کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

ایک فیکا اور بھی تھا جسے میں بھولا نہیں تھا۔ اس نے فقیروں کے ایک ٹھیکے دار کی بیٹی کے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلا تھا لیکن جب لڑکی نے اعلان کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو فیکے نے اس کی ذمے داری قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ معاملہ شادو کے باپ شاہ جی تک پہنچا تھا اور فیکے کو سرسری سماعت کی ایک عدالت میں پیش ہونا پڑا تھا۔ اس نے شادی سے صاف انکار کیا تو اسے سزائے موت سنادی گئی تھی۔ میں اور رئیس اس کارروائی کے عینی شاہد تھے۔ رئیس نے رسی کا پھندا بنا کے فیکے کے گلے میں ڈالا تھا اور اسے ایک اسٹول پر کھڑا کرکے رسی کا دوسرا سرا چھت کے پنکھے سے باندھ دیا تھا۔ پھر فیکے کی محبوبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ لات مار کے اسٹول گرادے۔ فیکے کو ہی نہیں مجھے اور رئیس کو بھی پورا یقین تھا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتی مگر اس نے اپنے سچے عاشق اور اپنے ہونے والے بچے کے باپ کو بلا تذبذب پھانسی دے دی تھی اور ہم دہشت سے بے حال فیکے کو جانکنی میں تڑپتا دیکھتے رہے تھے پھر رئیس نے ہی اس کی لاش اتاری تھی اور ہم نے مل کے اسے دریائے راوی کے پل پر سے نیچے پھینکا تھا۔

فیکا صرف ایک نام نہیں ایک بھیانک اور تلخ یاد کا نقش تھا جو آج بھی اپنی تمام سفاک تفصیلات کے ساتھ

میرے اور رئیس کے ذہن میں موجود تھا۔ یہ نام دوبارہ سن کے خود بخود میرے تصور میں ایک اندھیری رات آجاتی تھی۔ جب میں اور رئیس دریائے راوی کے فولادی پل پر کھڑے نیچے سے گزرنے والے گدلے پانی کو دیکھ رہے تھے جو فیکے کی لاش کو بہا کے نہ جانے کہاں لے گیا تھا اور صدمے اور دہشت سے ہماری حالت غیر تھی۔

دس سال پہلے والا فیکا دراصل رفیق تھا۔ بعد میں میرا واسطہ ایک اور فیکے سے بھی پڑا تھا مگر وہ شقی تھا چنانچہ میں فرض کرسکتا تھا کہ سلیٹی کپڑوں والا یہ فیکا جو اب سوزوکی میں اکیلا رہ گیا تھا۔ رفیق یا شقی ہی ہوگا۔

چند منٹ کے بعد میں نے سر کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا تو مجھے اپنے پیچھے بہت سی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ ان کی خیرہ کن روشنی میں شبنم کی صورت کو ونڈ اسکرین کے پیچھے دیکھنا تو درکنار اس کی گاڑی کو پہچاننا بھی مشکل تھا چنانچہ میں نے پھر موبائل فون آن کرکے اس سے بات کی۔

"میں سائے کی طرح تمہارے تعاقب میں ہوں" اس نے مجھے بتایا۔

"میرا سایہ مجھ سے کتنی دور ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم روشنی سے کتنی دور ہو؟ یہ دیکھو۔"

میں لاجواب ہوگیا۔ سورج سر پر ہو تو سایہ اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ سورج دور ہو تو سایہ کبھی آگے کبھی پیچھے دور بھاگنے لگتا ہے اور بالآخر ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

گاڑی مختلف موڑ کاٹتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ میں نے تین بار چیک کیا۔ شبنم نے ہر بار وہی مطمئن کرنے والا جواب دیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن گلبرگ کا علاقہ شروع ہوجانے کے بعد میں نے فون استعمال نہیں کیا۔ میں تقریباً ایک فرلانگ پیچھے رہنے والی ایک کار کی روشنیوں کو دیکھتا رہا جو برابر فاصلہ رکھے ہوئے مجھے رفاقت کا احساس فراہم کررہی تھیں۔

سوزوکی بالآخر ایک کوٹھی کے گیٹ پر رک گئی۔ ڈرائیور کے ہارن دینے پر شاید کسی گیٹ کیپر یا گارڈ نے اندر سے جھانک کر تصدیق کی ہوگی۔ گیٹ چند منٹ بعد کھل گیا اور سوزوکی سیدھی اندر چلی گئی۔ الٹے ہاتھ پر ایک لمبی گلی جیسی گیلری تھی۔ سوزوکی گلی سے گزر کے عقبی حصے میں پہنچی اور رک گئی۔ ڈرائیور نیچے اترا اور اندر چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور سر اٹھا کے دیکھا۔ میرے قریب کوئی نہیں تھا۔ اندر بھی خاموشی تھی۔ صرف بالائی منزل کے کسی کمرے سے بلند آہنگ اور دھمک رکھنے والے پوپ میوزک کا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

میں نے موقع پا کے موبائل نکالا اور شبنم کا نمبر ملایا۔

"شبنم!"

"بتاؤ اب میں کیا کروں۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھی ہوں۔"

"تم نے دیکھ لیا تھا کہ سوزوکی کس گیٹ سے اندر گئی تھی؟"

"ہاں لیکن میں بالکل سامنے نہیں آسکتی۔ تین چار کوٹھیاں چھوڑ کے رک گئی ہوں۔ بونٹ اٹھانا ضروری تھا ورنہ زیادہ دیر گاڑی میں بیٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔"

میں نے کہا "ایسے بھی کب تک کھڑی رہوگی۔ ابھی آجائے گا کوئی دل والا مدد کے لیے۔ کسی حسین اور نوجوان خاتون کی پریشانی کون دیکھ سکتا ہے۔"

"مجھے چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم محفوظ ہو۔"

"محفوظ نہ ہوتا تو تم سے بات کیسے کرتا۔ تم دیکھو کہ یہ کوٹھی کس کی ہے۔ آخر ایک صحافی کی حیثیت سے تمہیں کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ اگر آدھے گھنٹے تک میں تم سے رابطہ نہ کروں تو اندر آنے کی کوشش کرنا۔"

"عالی! تم کیا کرتے جارہے ہو؟" وہ پُرتشویش لہجے میں بولی "میری مانو تو کسی طرح باہر آجاؤ۔ انجانے میں تم کسی مشکل میں پڑجاؤ گے۔ اس وقت کوئی ضرورت نہیں تھی اس ایڈونچر کی۔"

"تم یہ پتا کرو کہ یہاں کون رہتا ہے؟"

"دیکھو میں نام بھول رہی ہوں لیکن وہ ہے ایک ایم پی اے۔ لاہور میں اس کا گھریا حلقہ نہیں ہے لیکن اس کی رہائش شہر میں ہے۔"

"دوسری تیسری یا چوتھی سوشل وائف کے ساتھ۔"

"ایسے ہی رہتے ہیں سب۔ دو چار کو چھوڑ کے اور تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دو چار کو چھوڑ کے سب ایم پی اے کوئی شریف لوگ نہیں ہوتے' خطرناک ضرور ہوتے ہیں" وہ بولی "تم تو اپنی شناخت بھی نہیں کرا سکتے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے شناخت کرلیا جائے۔ اس حلیے میں بھی۔"

"ملازموں نے پکڑ لیا تو تمہیں بہت ماریں گے اور پولیس کے حوالے کردیں گے۔ بہتر ہے تم ابھی نکل آؤ۔ ہم بعد میں معلوم کرسکتے ہیں۔ جو بھی تم جاننا چاہتے ہو۔"

شبنم کی بات معقول تھی مگر میرے لیے باہر جانا اندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔ میں سوزوکی سے اتر کے گیٹ تک جاتا اور گارڈ کو سلام کر کے کہتا کہ "ذرا دروازہ کھول دیں پلیز' مجھے جانا ہے" تو وہ اپنی کلاشنکوف کا رخ میری طرف کر کے انٹر کام پر مالکوں سے بات کرتا کہ اندر سے مشکوک حلیے والا ایک شخص پکڑا گیا ہے۔

میں یہ امید کر سکتا تھا کہ سوزوکی والا فیکا کچھ وقت یہاں گزار کے واپس جائے گا تو میں جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل جاؤں گا مگر اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سوزوکی رات بھر یہیں کھڑی رہے۔ ہر روز یہاں کھڑی رہتی ہو۔ ڈرائیور فیکا اندر کسی کمرے یا سرونٹ کوارٹر میں پڑ کے سو گیا ہو۔ ممکن ہے وہ صبح پھر کسی کام سے جائے مگر دن کے اجالے میں میرا پکڑا جانا یقینی تھا اور یہ بھی ناممکن تھا کہ میں رات بھر سوزوکی میں لیٹا رہوں اور شبنم باہر گاڑی کے بونٹ میں سر ڈالے کھڑی رہے۔ اچھا ہوتا اگر میں اس وقت اتر جاتا جب سوزوکی گیٹ پر رکی تھی۔

کیا پتا فیکا اپنے مالک کو دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ دینے گیا ہو۔ میں نے سوچا۔ مجھے کچھ دیر ضرور انتظار کرنا چاہیے۔

چند منٹ بعد میں نے آہستہ سے سر اٹھا کے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ یہ کم سے کم چار کنال پر پھیلی ہوئی تھی اور بہت شاندار دو منزلہ تعمیر تھی۔ پچھلے حصے میں بھی مختصر سا باغیچہ تھا اور آخری کنارے پر تین چار کمرے نظر آ رہے تھے۔ یہ سرونٹ کوارٹر ہی ہو سکتے تھے۔

سامنے والے حصے میں مجھے باغ اور وسیع لان کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ پورچ کی طرف کوئی کار اسٹارٹ ہوئی اور اس کی تیز دودھیا روشنی گھوم کے گیٹ تک پہنچی۔ گارڈ نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ کسی عورت نے کہا "ہائے" اور جواب میں کار سے ایک خوب صورت گداز اور سڈول بازو لہرایا۔

میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ گارڈ اب گیٹ بند کر رہا تھا اور اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں سوزوکی سے اترا اور ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے پلر کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک دروازہ تھا۔ یہ کچن' باتھ یا اسٹور کا دروازہ ہو سکتا تھا مگر یہ اندر سے بند تھا۔ پیچھے کی طرف کھلنے والے کسی دروازے سے میں اندر پہنچنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا لیکن یہ بہت خطرناک کام تھا۔ مجھے اندر کے راستوں کا علم نہیں تھا اور میں چوروں کی طرح داخل ہوتا تو مجھے فرار کی راہ نہ ملتی۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

سوزوکی پک اپ مجھ سے دو فٹ دور کھڑی تھی اور اس کے دروازوں کو لاک کرنا یا شیشے چڑھانا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ کوٹھی کے اندر سے گاڑی کے چوری ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا۔

اچانک مجھے گاڑی کے اندر کوئی چیز چمکتی نظر آئی اور میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی چابی والی کی چین نظر آ گئی۔ ہلکی سی چمک چابیوں کی تھی اور سنہرے سکے جیسی کسی چیز کی تھی۔

میں نے اپنے بائیں طرف دیکھا۔ گارڈ اپنی کلاشنکوف ساتھ رکھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ دوسری طرف سرونٹ کوارٹرز میں روشنی تھی مگر دروازے بند تھے۔ اوپر اور نیچے کی منزل کی ساری کھڑکیاں جو گیلری کی طرف کھلتی تھیں' بند تھیں کیونکہ ہر کمرے کا ائرکنڈیشنڈ گیلری میں حرارت خارج کر رہا تھا اور پانی ٹپکا رہا تھا۔ یہ پانی گیلری میں پھیلا ہوا تھا۔

جیب سے فون نکال کے میں نے آخری بار شبنم سے رابطہ کیا "دیکھو' میں ایک کوشش کروں گا باہر آنے کی۔ کامیاب ہو گیا تو یہ میری ذہانت اور حاضر دماغی کا کمال ہو گا اور پکڑا گیا تو انتہائی احمقانہ حرکت کہلائے گی۔"

"مجھے بتاؤ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے سرگوشی میں کہا "سوزوکی پک اپ کی چابیاں گاڑی میں ہیں۔ میں اسے اسٹارٹ کر کے لاتا ہوں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ کو کچھ نظر نہیں آئے گا کہ ڈرائیور کی جگہ میں بیٹھا ہوا ہوں یا فیکا۔"

"یہ فیکا کون ہے؟"

"وہی جو سوزوکی چلا رہا تھا۔ میں لائٹ کو فل بیم پر رکھوں گا۔ اسے شک نہیں ہو سکتا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ ابھی فیکا آیا تھا۔ وہی واپس جا رہا ہے کسی کام سے' رسک ہے مین گیٹ پر مگر اس کی نظریں چند سیکنڈ بعد کچھ دیکھنے کے قابل ہوں گی اور وہ گیٹ کھولے گا تو کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں نہیں ہو گی۔"

"کلاشنکوف بھی ہے اس کے پاس" شبنم پریشان ہو گئی۔

میں نے کہا "بی بی' وہ کیا ڈنڈا لے کر کھڑا ہو گا۔ کسی پرائیویٹ کمپنی کا سیکیورٹی گارڈ ہے لیکن کلاشنکوف اس وقت بھی کرسی کے سہارے پر کھڑی ہے۔ جب وہ باہر سے آنے والے کسی شخص کے لیے گیٹ کھولتا ہے تو کلاشنکوف ضرور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر گھر کے اندر سے جانے والے کو رخصت کرتے وقت کلاشنکوف اٹھانا ضروری نہیں۔"

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ اگر اس نے فائرنگ کر دی؟"

"میں نے ابھی ایک کار کو جاتے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کلاشنکوف نہیں اٹھائی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا رہتا ہے اور کلاشنکوف اس کے بائیں ہاتھ کی ہی طرف موجود ہے" میں نے کہا۔

"عالی! یہ خطرناک کام ہے۔ اگر اسے ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ پیچھے سے برسٹ مار سکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔"

"اچھا دیکھو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم کیا کرو گی؟"

"میں۔۔۔ میں گیٹ پر آ کے گھنٹی بجاتی ہوں۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی تم گاڑی اسٹارٹ کرنا۔ چوکیدار کی توجہ بٹ جائے گی۔"

"تھینک یو۔ اس کا نقصان یہ ہو گا کہ وہ کلاشنکوف اٹھا لے گا اور خدانخواستہ اسے شک ہو گیا کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی انڈراسٹینڈنگ تھی تو میں نکل جاؤں گا اور تم پھنس جاؤ گی۔ تم جہاں ہو وہیں رک کے میرا انتظار کرو بلکہ کچھ پیچھے چلی جاؤ۔ ہم جس راستے سے آئے تھے' اس پر واپس ایک کلومیٹر جا کے تیار رہو۔ میں دس منٹ میں آتا ہوں۔ دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ لیکن عالی۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے کہا "فکر ناٹ۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا" اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر سکون سے گارڈ کو دیکھنے کے بعد میں نے قدم آگے بڑھا کے گاڑی میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام مجھے پھرتی سے ایسے کرنا تھا کہ گیٹ کی طرف سے دیکھنے والے گارڈ کو میری صورت نظر نہ آئے۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی نظر دوسری طرف ہو اور میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے زور سے دروازہ بند کر لوں۔ جیسے کہ عام طور پر سب سوزوکی ڈرائیور بند کرتے ہیں۔ اس کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے سے گھما کر واپس لاؤں اور ہیڈ لائٹس آن کر کے اطمینان سے آگے بڑھا دوں۔ یہ کام مجھے سکون اور اعتماد کے ساتھ کرنا تھا تاکہ گیٹ کیپر کو بالکل شک نہ ہو۔

اوپر کی منزل سے سنائی دینے والی بلند آہنگ موسیقی بند ہو گئی اور کوئی شخص اونچی آواز میں چلانے لگا "پچھلی طرف کی بالکونی میں ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر آواز اوپر سے نہیں نیچے سے آ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا آگے چلتا ہوا موڑ تک پہنچا تو میں نے دوسری آواز بھی سنی۔ یہ فیکے کی آواز تھی۔ خوف سے دبلی دبلی اور گھٹی ہوئی۔

میں نے دیوار کے کونے سے جھانک کے دیکھا اور گھوم کے پھر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ یہ حصہ نسبتاً تاریک تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے اوپر عمارت کے تین طرف نکلا ہوا تین فٹ چوڑا چھجا چھت کی بلندی پر تھا۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے شیشے کے شیڈوالی سیلنگ لائٹس نصب تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ سالوں سے ان کی صفائی نہیں ہوئی ہے۔ شیشے کے اندر گرد جمع ہو چکی تھی۔ چنانچہ جو لائٹ جل رہی تھی اس کی روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر مجھے ایک روشندان نظر آیا جو زمین سے شاید ایک فٹ کی اونچائی پر تھا۔ چار فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا یہ روشندان کسی زیرِ زمین تہ خانے کی چھت کے پاس ہو گا۔ وہ آوازیں اسی روشندان سے گزر کے میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔

قریب سے مجھے ہر لفظ صاف سنائی دینے لگا۔ غصے میں چلانے والا شخص فیکے پر خفا ہو رہا تھا۔ "جھوٹ بکتا ہے وہ۔"

فیکے نے عاجزی سے کہا "جناب عالی! آپ اسے مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ ایسا بندہ نہیں ہے۔"

"فیکے! انسان کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لاش کے پاس سے دو چیزیں نہیں ملیں۔ ایک وہ مورتی کا سر اور دوسرا خادم کا پرس۔"

"جناب عالی۔ آپ نے ہی فرمایا تھا کہ مورتی کا سر اس حرام زادے کو ہماری طرف سے تحفہ پیش کر دینا۔"

"کتے! ہمارے سامنے بھونکتا ہے۔ یہ کب کہا تھا ہم نے کہ مورتی کا سر سڑک پر پھینک آنا۔ معلوم نہیں کون اٹھا کر لے گیا۔ خواہ مخواہ کی مصیبت۔ پولیس ایک گھنٹے بعد پہنچی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ لاش' نہ وہ مورتی کا سر اور نہ خادم مرزا کا پرس۔"

"پرس میں کتنی رقم تھی سر!"

"اس نے مجھے پرس دکھایا تھا۔ کافی نوٹ تھے اس میں۔ آٹھ دس ہزار روپے ضرور ہوں گے۔"

فیکے نے کہا "پھر تو جناب عالی' پولیس نے خود ہی رکھ لیا۔"

"اور وہ مورتی کا سر؟ وہ پولیس کے لیے بے کار تھا۔ اسے کون لے گیا؟ آٹھ دس ہزار کی کوئی بات نہیں۔ جانو نے رکھ لیے تو بتا دے۔"

فیکے نے کہا "جناب عالی۔ جانو بالکل خالی تھا۔ اس کی جیب میں پیسہ ہوتا اچھلتا ہے۔ میں جانتا ہوں' میں نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا کہ یار لکشمی چل کے تندوری چرغا کب کھلائے گا؟ وہ ایک شرط ہار گیا تھا مجھ سے' وہ کہنے لگا کہ یار آج تو بس دہی بھلے کھلا سکتا ہوں' ہاتھ بالکل صاف ہیں آج۔"

"اس بات کا کیا مطلب ہوا اوئے!"

"وہ جی۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے نا۔ اس کے پاس مال ہو تو وہ کہتا تھا کہ ہاتھ بڑے میلے ہیں آج۔ چل کہیں موج میلہ کرتے ہیں۔ جیب ہلکی ہو تو کہتا تھا کہ ہاتھ صاف ہیں۔ میں نے کہا کہ یاروں کے ساتھ چالاکی کرتا ہے تو اس نے کہا کہ فیکے' مال کیا یاروں سے پیارا ہے۔ تو بے شک تلاشی لے کر دیکھ لے۔ جیب میں سترّ اسّی روپے ہیں۔ زیادہ ہوں تو تیرے۔"

"ہوں۔۔۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی وہ مورتی کا سر بھی لے گیا اور خادم کا مال بھی۔"

فیکے نے کہا "وہ جی۔۔۔ ہم ذرا دیر سے گئے تھے۔"

"کیوں؟ تمہیں تو ایک ساتھ جانا تھا" وہ برہم ہو کے بولا۔

"ساتھ ہی تھے جناب عالی۔ دس منٹ کے فرق سے آگے پیچھے گئے۔ ہم نے سوچا کہ دس منٹ بہت ہیں۔ اتنی دیر میں بندہ پھڑک کے ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن گاڑی خراب ہو گئی' چلتے چلتے بند ہو گئی۔ اس کا کوائل شارٹ ہو گیا تھا۔"

"کوائل کیسے شارٹ ہو گیا۔"

"بس جی۔ الیکٹرک پارٹ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ پلگ' پوائنٹ' کنڈنسر' کچھ بھی جل جائے۔ میں نے پہلے پلگ دیکھے۔ صاف کر کے لگائے اور جانو سیلف مارتا رہا۔ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ بیٹری بیٹھ گئی۔ دھکا لگایا بڑی دور تک پھر میں نے پوائنٹ کو ریگ مال مارا۔ روٹر کو رگڑا پھر دھکا لگایا مگر کرنٹ ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں تو سمجھ گیا تھا کہ کوائل شارٹ ہوا ہے۔"

"پھر کیسے اسٹارٹ ہوئی گاڑی!"

"اس وقت اور کیا ہو سکتا تھا جناب عالی۔ نہ مکینک کی دکان کھلی تھی اور نہ آٹو پارٹس کی۔ میں نے ایک ورکشاپ دیکھی۔ اس کے سامنے تین گاڑیاں خراب کھڑی تھیں۔ آگے پیچھے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے بونٹ کھولا اور ایک کا کوائل نکال لیا۔ پلاس پیچ کس تھا میرے ہاتھ میں مگر اس میں جناب پورا گھنٹا ضائع ہو گیا۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ لاش اتنی دیر وہیں پڑی رہی ورنہ اسے پولیس اٹھا کے لے جاتی تو اور پریشانی ہوتی۔ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا بعد میں۔"

"ہاں جی" فیکا بولا "ہم لاش اٹھا کے لے گئے تھے۔ اس کی جیب میں سے کچھ نکلتا تو ہم آپ کو ضرور بتاتے۔ جانو نے تلاشی لی تھی۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پرس کوئی لے گیا۔"

"اوجی' آج کل کس کا بھروسا ہے۔ کون لحاظ کرتا ہے کسی کا۔ یہ جو رات کے وقت پھرتے ہیں۔ چوکیدار اور گشت کرنے والی پولیس۔ ان کے علاوہ بھی ایک مخلوق ہے۔ نشہ کرنے والے۔ کسی نے لاش دیکھی اور فوراً ہاتھ ڈال دیا جیب میں۔" فیکے نے کہا۔

"تو نے دیکھا تھا۔ مورتی کا سر نہیں تھا وہاں۔"

"نہیں جناب عالی۔ اتنی بڑی چیز تھی' یہ کیسے ہو سکتا تھا نظر نہ آتی۔"

"مگر فیکے۔ اس پاگل کے بچے نے مورتی کا سر وہیں پھینک دیا تھا' معصوم کرو مورتی کا سر کس نے اٹھایا۔۔۔"

"اوجی مٹی پاؤ۔ جس نے بھی اٹھایا رکھ لے اپنے گھر میں سجا کے۔"

ایک چٹاخے جیسی آواز گونجی۔ یہ تھپڑ کی آواز تھی جو فیکے کے گال پر پڑا تھا۔ "فیکے! مجھے وہ مورتی کا سر چاہیے ورنہ تم سب کے سروں کی خیر نہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔"

نصف درجن شاندار گالیاں کھا کے فیکے کی سمجھ میں بات آئی ہو نہ آئی ہو۔ میری سمجھ میں ضرور آ گئی تھی۔ وہ مورتی کا سر یقیناً بہت اہمیت کا حامل تھا جسے غلط فہمی یا بے وقوفی کے باعث بے وقعت سمجھ کے پھینک دیا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اب فیکے کے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا۔

"چل دفع ہو جا۔ کل شام تک مجھے مورتی کا سر چاہیے۔ جانو سے بھی کہہ دینا ورنہ میں سب کے سر کاٹ لوں گا اگر میرا نقصان پورا نہ ہوا۔"

میں نے ذرا جھک کے روشندان میں سے جھانکا اور تہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہ کسی کباڑی کے گودام جیسی جگہ تھی۔ فیکے کو میں نے آواز سے پہچانا تھا۔ دوسری آواز نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ یہ آواز بھی مجھے سنی ہوئی لگی تھی مگر بولنے والا میرے سامنے نہیں تھا اور اس کا نام میرے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔

روشندان سے تہ خانے کی صرف ایک سائڈ نظر آتی تھی۔ فیکا جس شخص سے بات کر رہا تھا وہ میری نگاہ سے اوجھل تھا۔ جب فیکے کو دفع ہو جانے کا حکم ملا تو میں نے واپسی اختیار کی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتا ہوا واپس چلنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد گارڈ کی نظر بچا کے میں سوزوکی میں بیٹھ چکا

تھا۔ اس کی چابی گھماتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میں نے وقت ضائع کر دیا ہے۔ فیکا اب کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا تھا۔ سوزوکی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر اس کے کان فوراً کھڑے ہو جائیں گے۔

میں نے بڑی تیزی سے سوزوکی کو آگے بڑھا کے ریورس کیا اور پھر گیٹ کا رخ کر کے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔ مجھے اب تیس چالیس فٹ کا فاصلہ طے کر کے خیر و عافیت کے ساتھ گیٹ تک پہنچ جانا اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا جتنا کسی سپاہی کے لیے گولیوں کی بوچھاڑ میں مورچے تک پہنچنا۔

سیکیورٹی گارڈ کرسی پر سے اٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ وہ بروقت گیٹ کھول دے۔ میرے کان پیچھے کی طرف تھے۔ اصل خطرہ مجھے فیکے کی طرف سے تھا جو پیچھے سے چلا کے کہہ سکتا تھا کہ گاڑی کو روکو اور گیٹ کھولنے والا گارڈ خطرے کو محسوس کرتے ہی کلاشنکوف اٹھا کے میری راہ میں حائل ہو سکتا تھا یا گیٹ پھر بند کر سکتا تھا۔

گیٹ کو توڑتے ہوئے اور کلاشنکوف کے برسٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے فرار ہو جانا صرف اس صورت میں ممکن تھا جب یہ کسی فلم کا سین ہوتا اور میں اس فلم کا ہیرو ہوتا۔

اچانک میں نے بائیں جانب دیکھا اور میری نظر نے وہ چہرہ دیکھا جس کی آواز سن کے مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

○☆○

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے مگر میں نے ہمت سے کام لیا اور گھٹنوں کے بل شادو پر جھک گیا۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور اس کے جسم پر کسی زخم سے ابلنے والے لہو کو تلاش کیا مگر شادو کے لباس پر۔۔۔ کہیں خون کی سرخی کا داغ تک نہ تھا۔ دیوانوں کی طرح "شادو۔۔۔ شادو جی" پکارتے ہوئے میں نے اس کے بدن کو اچھی طرح ٹٹولا۔ اس وقت تک کچھ راہ گیر بھی ٹھہر گئے تھے۔

"کی ہویا جے باؤ!" ایک پہلوان جیسے شخص نے رکوع کے انداز میں جھک کے کہا۔

میں نے وحشت میں سر اٹھایا "گولی۔۔۔ گولی ماردی ہے کسی نے شادو کو۔۔۔ وہ ایک کار میں تھے۔"

وہ مسکرانے لگا "کدھر سے گولی ماردی ہے۔ کون کہتا ہے گولی ماردی ہے؟"

میں نے پھر شادو کو دیکھا "مجھے۔۔۔ ایسا ہی لگا تھا۔"

"چل ہٹ۔ میں دیکھتا ہوں" وہ میرے پاس بیٹھ گیا "ایہہ تے بے ہوش ہے۔"

"بے ہوش ہے؟" میں نے شادو کو غور سے دیکھا تو مجھے خفت ہوئی۔

"یہ کیا معاملہ ہے بھئی" ایک بزرگوار نے عینک کے پیچھے سے مجھے گھور کے دیکھا "کون ہیں یہ محترمہ اور تم کون ہو؟ ہمیں تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے شادو کو اپنے بازوؤں میں بھر کے اٹھا لیا "چلئے پلیز' یہ بیوی ہے میری۔ بے ہوش ہو گئی ہے کسی وجہ سے۔"

پہلوان بھی اٹھ کھڑا ہوا "ہے نا پاگل۔ اتنی جلدی گھبرا گیا۔ گولی ماردی ہے' اونہہ۔"

بزرگوار نے کہا "میاں' ہماری گھر والی کو تو سچ مچ ماردیتا کوئی گولی تو ہم ایسے حواس باختہ نہ ہوتے۔ بس اللہ کا شکر ادا کر کے انالہ پڑھتے۔"

پہلوان نے ان سے کہا "تمہاری تو ہو گی ناگوروں کے وقت کی چیز' پر اس کی تو نویں کھور ہے۔ نئے سال کا ماڈل۔"

میں شادو کو ہاتھوں میں اٹھائے سڑک پار کر گیا۔ اس وقت وہ مجھے اتنی ہلکی لگی جیسے روئی کی بنی ہوئی گڑیا۔ ایک جیتی جاگتی زندہ عورت کا وزن ہی نہیں رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی جسم نہیں صرف ایک روح رہ گئی ہو۔ میں عمارت کی بیرونی سیڑھیاں چڑھ کے ہال سے گزرا تو بہت سی خشک اور تجسس بھری نظروں نے مجھے دیکھا ہو گا اور بہت سے لبوں پر سوال بھی آئے ہوں گے مگر میں نے کچھ نہیں دیکھا اور کچھ نہیں سنا۔

لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔ اس کے واپس آنے تک میں شادو کو اسی طرح اٹھائے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے زینے کا رخ کیا۔ اوپر سے آنے والوں نے خود ایک طرف ہو کے مجھے راستہ دیا۔ ایک موڑ پر بریف کیس اٹھائے کھڑے ہوئے دو افراد نے غور سے مجھے اور پھر شادو کو دیکھا۔

"او مائی گاڈ۔ انہیں کیا ہو گیا؟"

"جاوید۔۔۔ وہی ہیں نا۔۔۔ مسز ہاشمی؟"

نیچے جاتے ہوئے پہلے نے کہا "ہیں نہیں' تھیں برادر۔ فی زمانہ تو اسی کی ہیں۔"

دوسرا ہنسا "جس کی پہلے بھی تھیں۔"

میں نے ان کی باتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ہاشمی صاحب کے آفس سے نکلنے والے ایک شخص نے ہمدردی سے مجھے سمجھایا "بھائی' اس بلڈنگ میں سب وکیل ہیں۔ ڈاکٹر نہیں ہے کوئی۔"

میں نے لات مار کے شیشے کے اندر باہر جھولنے والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازہ کھولا اور شادو کو اندر لے گیا۔ راہداری میں کھڑا ہوا ایک چپراسی اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ ایک کیبن سے برآمد ہونے والے کسی وکیل کی آنکھیں ایک سوالیہ نشان بن گئیں۔

میں نے کہا "میڈم کے کمرے کا دروازہ کھولو۔"

چپراسی میرے لہجے سے مرعوب ہوگیا "جی۔۔۔ جی سر' میں چابی لاتا ہوں۔"

گلباز خان نے آہستہ سے اپنے کمرے کے شیشے کے پٹ والا دروازہ کھولا "یہ کون بدتمیز شور کررہا ہے؟" پھر اس کی نگاہ مجھ پر اور میرے بازوؤں میں بے ہوش جھولنے والی شادو پر گئی۔

"واٹ از آل دس؟" اس کے ماتھے پر نخوت اور ناپسندیدگی تھی۔

"SHE HAS FAINTED" میں نے کہا۔

چپراسی نے بڑی عجلت میں تالا کھولا اور دروازے کو پکڑ کے کھڑا ہوگیا۔ میں نے شادو کو اندر لے جاکے ایک صوفے پر لٹادیا۔ آفس سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا چنانچہ بند ہونے کے باوجود اس کمرے میں خوش گوار ٹھنڈک تھی۔ جس میں پہلے ہاشمی صاحب بیٹھتے تھے اور کچھ عرصے سے شادو بیٹھ رہی تھی۔

گلباز خان نے اندر آکے کہا "کیا ہوا ہے انہیں؟"

میں نے نرمی سے کہا "میں بتاچکا ہوں۔ اب آپ مجھ سے مزید سوالات کرنے کے بجائے کسی ڈاکٹر کو بلائیں پلیز۔ جو بھی قریب ہو اور فوراً آجائے۔"

اس نے سرہلایا اور باہر چلا گیا۔ شادو کے پیر سے نکل کے ایک جوتا کہیں باہر گرگیا تھا۔ وہ چپراسی نے اندر لاکے مجھے پیش کیا۔ میں نے اس سے پانی منگوایا مگر پانی آنے سے پہلے ہی شادو نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے چھت کو دیکھتی رہی پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا "شادو جی۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں" وہ کمزور سی آواز میں بولی "مجھے ایک چکر سا آیا تھا۔ بہت کمزوری محسوس ہورہی ہے۔ مجھے سہارا دے کے اٹھاؤ۔"

میں نے کہا "نہیں۔ تم لیٹی رہو۔ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔"

"ڈاکٹر کی ضرورت نہیں" اس نے خود اٹھنے کی کوشش کی "کس نے فون کیا ہے ڈاکٹر کو۔ اسے منع کردو ناصر۔"

میں نے مجبوراً اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر سنبھل گئی' اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور آگے بڑھ کر اس گھومنے والی کرسی پر گرگئی جو اس کے مرتبے' پوزیشن اور STATUS کی علامت اور نگہبان تھی۔ اس ہی کرسی پر ہاشمی صاحب بیٹھتے تھے کیونکہ وہ ہاشمی اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ اب مالک شادو تھی۔ یہاں بیٹھ کے وہ اس احساس سے اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور دوسروں کے سامنے اس اعتماد کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے گھنٹی کا بٹن پیر سے دبا کے چپراسی کو طلب کیا۔ "ڈاکٹر کو جس نے بھی فون کیا ہے۔ اسے کہو کہ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یس میڈم۔ گلباز خان صاحب نے فون کیا تھا۔"

"انہیں بلاؤ یہاں اور دیکھو' کافی چاہیے اور کسی کو بھیجو سینڈوچ لائے شیزان سے۔۔۔ جلدی" شادو کے اندازِ تحکم نے مجھے حیران کردیا۔

"یس میڈم۔" چپراسی سرجھکا کے نکل گیا۔

شادو میری طرف دیکھ کے مسکرائی "کیسی ہے میری ایکٹنگ؟ رعب پڑا تم پر؟"

"بہت زیادہ" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور سرجھکا کے کہا "لیکن میڈم۔ یہ جو ایکٹنگ فرمارہی ہیں آپ کہ طبیعت بالکل ٹھیک ہے اور ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ زیادتی ہے' غلط ہے۔"

"پلیز ناصر' مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میں کسی کو یہ امپریشن دینا نہیں چاہتی کہ میں کمزور پڑگئی ہوں۔ کسی بھی وجہ سے۔۔۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

میرا دل موم کی طرح پگھلنے لگا "تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں شادو جی' میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری طاقت بن کر۔"

گلباز خان اندر آیا اور شادو کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کے حیران سے زیادہ مایوس ہوا "میں تو پریشان ہوگیا تھا میڈم!"

شادو مسکرائی "آپ سب کی پریشانی لے کر بھی پریشان ہونے والے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں' مجھے تجربہ ہے اس کا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا "پرانی باتیں چھوڑیئے مسز۔۔۔ میرا مطلب تھا مس۔۔۔؟"

"ناصر۔۔۔ ناصر عظیم" شادو نے میرا تعارف کرایا "اور یہ گلباز خان' ہاشمی صاحب مرحوم کے دست راست۔ میرے سب سے قابلِ اعتماد دوست اور اس کمپنی کے مالک۔"

میں نے گلباز خان سے مصافحہ کیا "یہ آپ کی بہت

تعریف کرتی ہیں۔"

شادو کی تعریف نے گلباز کو خوش کردیا تھا "میڈم کی بڑی مہربانی ہے۔ اصل مالک تو یہی ہیں۔"

"نہیں گلباز۔ آپ نے جس طرح لندن میں مجھے سہارا دیا اور حوصلہ دیا اور جیسے سب معاملات کو سنبھالا۔ ایسے کوئی بھائی ہوتا تو شاید وہ بھی نہ کرپاتا۔ میں قائل ہوں آپ کی ہمت اور انتظامی صلاحیت کی۔"

"وہ تو میرا اخلاقی فرض تھا" گلباز خان نے رسمی لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ اس سے پہلے بھی ہاشمی صاحب ہمیشہ کہتے تھے۔ گلباز دایاں پاؤں ہے' میں بایاں اور ان دو پیروں پر کمپنی کھڑی ہے آج۔۔۔ ان کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ سب بار دائیں پاؤں نے اٹھا رکھا ہے۔ میں تو ایک مفلوج عضو کی طرح تھی۔۔۔ لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔"

گلباز خان کا رنگ تیزی سے بدلا "اچھا کیا آپ نے کمی لپٹی نہیں رکھی۔ صورتِ حال واقعی بدل گئی ہے۔"

شادو نے جلدی سے کہا "میں وضاحت کردوں۔ میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں اس کمپنی کے سینئر پارٹنر کی حیثیت سے اپنی ذمے داری پوری نہیں کرسکتی۔"

"چنانچہ آپ اپنی جگہ اس کو دینا چاہتی ہیں۔ ایک میٹرک پاس لڑکے کو" گلباز خان نے تلخی سے کہا "یہ آپ کی نجی زندگی کا معاملہ ہے کہ جسے چاہیں شوہر تسلیم کریں مگر میں اس کو اپنے سینئر پارٹنر کی حیثیت سے قبول نہیں کرسکتا۔"

میں نے سکون سے کہا "میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے ارادے کیا ہیں؟ یہ میں جانتا ہوں" وہ بولا۔ "مگر تمہارے یہ ارادے پورے نہیں ہوں گے۔ میں نے پولیس کو فون کردیا ہے۔"

اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

گلباز خان کی حرکت اتنی غیر متوقع تھی کہ ایک لمحے کے لیے تو میں اپنی پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا اور میری نظر نیلگوں سیاہ دھات کی سفاک نال سے جھانکنے والی موت پر مرکوز ہوگئی جو ایک ڈیڑھ انچ لمبی گولی کی شکل میں مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر رکی ہوئی تھی۔

پھر میں نے شادو کی طرف دیکھا' جس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ اس کے بیمار چہرے کا زرد رنگ بے جان لاش کی سفیدی میں ڈھل گیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ پھر بے

اندھیر نگری — محی الدین نواب — چار حصے — قیمت 150 روپے
سنہری جونک — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
مقدس عہد — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
مقدس نشان — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے
راکھشس — ایک پراسرار اور خوفناک ناول — ساحر جمیل سید — قیمت 125 روپے
راکھ — ایک خوفناک ناول — وجیہہ سحر — قیمت 100 روپے
ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے
تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ
اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز — ۴۰ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور — ۷۲۴۷۴۱۴
اسٹاکسٹ
علی بکسٹال — نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوش ہو جائے گی۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کے میں نہیں ڈرا تھا مگر شاہو کی حالت دیکھ کے میں ڈر گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خوف یا اشتعال کی کیفیت میں مجھ سے کوئی اجل کو دعوت دینے والی غلط حرکت سرزد نہیں ہوئی۔ اگر ایک جنونی جذباتی ردِعمل کے طور پر میں گلباز خان کی طرف لپکتا یا اس سے ریوالور جھپٹ لینے کی کوشش کرتا تو اس کا انجام میری موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ یہ بہادری نہیں 'خودکشی کہلاتی۔

"خود شاہو نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور دہشت زدہ ہو کے چیخ مارنے سے گریز کیا۔ میری طرح وہ بھی پُرسکون رہی اور ایک خطرناک لمحہ گزر گیا۔

پہلے شاہو نے کانپتی آواز میں کہا "خان صاحب۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

پھر میں نے کہا "گلباز خان۔ اس سے پہلے کہ کوئی اندر آئے۔ تم اس ریوالور کو واپس جیب میں رکھ لو۔"

وہ بولا "شٹ اپ! میں تم کو بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے بھاگنے کا اور نہ میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں" میں نے برہمی سے کہا "ایسا کوئی جرم نہیں کیا ہے میں نے۔"

شاہو نے کہا "پلیز گلباز۔ مجھے بتائیں کہ پولیس کو کیوں بلایا ہے آپ نے؟"

"بتا دوں گا۔ پولیس کے آجانے کے بعد" اس نے اپنی نگاہ مجھ پر رکھی۔

"میری اجازت کے بغیر پولیس یہاں نہیں آئے گی" شاہو نے کہا۔

"ایک قاتل کی گرفتاری کا معاملہ ہو تو پولیس ہر جگہ جا سکتی ہے اور تم آخر چیز کیا ہو کہ پولیس تم سے اجازت لے؟"

"یہ مت بھولو کہ میں ہی مالک ہوں اس کمپنی کی گلباز!"

"تم خود بھی قاتل ہو اور ایک قاتل سے شادی کرنا تمہارا دوسرا جرم ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے معلوم نہیں۔ اپنے شوہر کو تم نے کیسے ٹھکانے لگایا تھا' اس پار کے لیے۔ تم دونوں کی سازش کو ہاشمی صاحب نہیں سمجھے۔ مگر میں نے۔"

اس کی اشتعال انگیزی نے صورتِ حال کو دھماکا خیز کر دیا۔ گھنٹی کا بٹن شاہو کی میز کے نیچے اس تختے پر تھا جس پر وہ اپنے پاؤں رکھتی تھی۔ اس نے بٹن دبایا تو باہر لیبری میں سے بزر کی کرخت آواز سنائی دی۔ ایک سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کے لیے گلباز خان کی توجہ دروازے کی طرف ہوئی اور اس کی نظر کا فوکس بدلا۔

شاہو نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر اس سے پہلے کہ میں اس مہلت سے فائدہ اٹھاتا' شاہو کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے کوئی چیز گلباز خان پر کھینچ ماری۔ یہ ٹن کی ردی کاغذ ڈالنے والی باسکٹ تھی جو اس کے دائیں ہاتھ پر نیچے رکھی ہوئی تھی اور میری نظر سے بھی اوجھل تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت شاہو نے بڑی حاضر دماغی اور ہمت سے کام لیا۔ اگر وہ میز پر رکھی ہوئی کسی چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو گلباز خان اسے وہ چیز اٹھانے کی مہلت ہی نہ دیتا۔ وہ بالکل ساکت بیٹھی ہاتھ کو آہستہ آہستہ ویسٹ پیپر باسکٹ کی طرف لے گئی۔ اس کا وزن کم تھا مگر یہ خاصی بڑی چیز تھی۔ اس کا کنارہ مضبوطی سے تھام کے شاہو نے اچانک اسے اٹھا لیا اور گلباز پر پھینک دیا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے غوطہ مارا۔ وہ چیز گلباز خان کے سینے پر لگی اور اس نے خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا لیکن ٹین کی بالٹی جیسی باسکٹ لگنے سے اس کا توازن برقرار نہیں رہا تھا اور ریوالور کی نال کا رخ خود بخود بدل گیا تھا۔

شاید یہ سب اس لیے ہوا تھا کہ دستِ اجل نے وہ وقت کسی اور کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے بہت پہلے سے مقرر کر دیا تھا۔ وہ شخص دفتر کا چپراسی تھا جو بالکل صحیح وقت پر دروازے سے اندر آیا۔ گولی چلنے سے پہلے ہی اس کا ایک ہاتھ دروازہ کھولنے والا ہینڈل گھما چکا تھا اور اس کا ایک پاؤں اٹھ چکا تھا۔ اس وقت واپسی اس کے لیے ناممکن تھی۔

گولی بھی اسی وقت ریوالور کی نال سے نکل کے دروازے کی طرف بڑھی اور کافی سینڈوچ کی ٹرے اٹھائے اندر آنے والے چپراسی کے سر میں گھس گئی۔ اس کا سر گولی کے راستے میں خود ہی آ گیا تھا۔ فرشتۂ اجل اس کا منتظر نہ ہوتا تو گولی تھوڑا سا دائیں بائیں یا اوپر سے گزر کے دیوار میں پیوست ہو جاتی یا چھت میں جا لگتی۔

چپراسی کی حیرت اور دہشت سے بھری وہ نگاہ مجھے آج بھی یاد ہے جو سوال کرتی تھی کہ یہ کیا؟ گلباز خان نے مجھ پر گولی کیوں چلائی؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ میں بگاڑ بھی کیا سکتا تھا۔ میں ایک معمولی بے حیثیت چپراسی تھا۔ اتنے بڑے وکیل کے ساتھ میری کیسی دشمنی۔ میں نے تو اسے آج تک شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا پھر اس نے مجھ پر فائر کیوں کیا؟

اور اگر نشانہ کوئی اور تھا تو گولی مجھے ہی کیوں لگی؟

وہ تھوڑا سا اچھل کے اور گھوم کے دروازے میں گرا۔

جو ٹرے اس نے اٹھا رکھی تھی' اس کے سارے برتن بکھر گئے۔ کسی چیز کے لگنے سے کمرے کی کھڑکی کا ایک شیشہ بڑے چھناکے سے ٹوٹا۔ میں نے شاہو کی چیخ اس وقت سنی جب میں فرش سے اٹھ کے گلباز خان پر جست لگا چکا تھا۔

گلباز خان صحت مند پٹھان اور جاندار آدمی تھا مگر اس کی عمر نے جسم کے فطری REFLEXES کو تھوڑا سا SLOW کر دیا تھا۔ قدرے بھاری بدن میں اب پہلے جیسی پھرتی اور مستعدی باقی نہ رہی تھی۔ اس کی عمر مجھ سے دگنی کے قریب تھی۔

وہ اٹھا مگر اپنے دفاع میں کچھ نہ کر سکا۔ میں اس پر گرا تو وہ کرسی سمیت فرش پر گر گیا۔ اس کا سر میز کے پائے سے ٹکرایا۔ شاید اسی چوٹ کی وجہ سے ایک سیکنڈ کے لیے اس کا دماغ چکرا گیا اور اس کی مزاحمت میں فرق آیا۔ میں نے اس کا ریوالور والا بازو کلائی سے پکڑ کے جھٹکا اور پھر میز کے پائے پر مارا تو ریوالور چھوٹ کے نیچے چلا گیا۔

فائر' دھماکے اور شور کے ساتھ شاہو کی چیخ پکار نے سارے عملے کو وہاں کھینچ لیا تھا مگر سب لوگ دروازے تک پہنچ کے رک گئے تھے۔ آگے عین دروازے میں چپراسی کا جسم نزع کے کرب میں پھڑک رہا تھا اور خون دلیز کے دونوں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ کمرے کے اندر گہرے سرخ رنگ کے قالین پر لہو اتنا نمایاں نہیں تھا مگر اس کے مغز کی سفیدی ایک بھیانک تضاد کے ساتھ واضح تھی۔

گلباز خان اب پوری طرح مغلوب ہو گیا تھا۔ جسمانی طور پر زیر ہو جانے کے بعد اس نے ذہنی طور پر بھی اپنی شکست کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ وہ عقل و ہوش سے بے گانگی کا ایک قابلِ لمحہ تھا جو بے گناہ چپراسی کی جان کا نذرانہ لے کر گزر گیا تھا۔ اس سے اگلا لمحہ احساسِ جرم کے پچھتاوے اور خوف کے ردِعمل کا تھا۔

وحشت اور جنون کی کیفیت اب مجھ پر سوار تھی۔ میں گلباز خان کے سینے پر سوار ہو کے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگی تھیں اور وہ منہ پورا کھول کے سانس لینے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

شاہو نے مجھے کئی بار چلا کے کہا "ناصر۔ ناصر۔ پاگل ہو گئے ہو تم۔ یہ مر جائے گا ناصر۔ چھوڑو اسے۔"

"نہیں۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا" میں نے ہانپ کے کہا۔

شاہو نے میرے بال پکڑ کر کھینچے اور پھر ان لوگوں پر چیخنے لگی جو خوف زدہ کمزے کچھ بھی نہیں کر رہے تھے۔ "کیا دیکھ رہے ہو تم سب؟ خدا کے لیے اسے پکڑو ورنہ ایک خون اور ہو جائے گا۔"

شاہو کی بات پر جیسے اچانک انہیں ہوش آ گیا اور احساس ہو گیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ان میں سے دو لاش کو پھلانگ کے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے پکڑ کے کھینچ لیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے گلباز خان کو دبوچ لیا۔ اب وہ ان کا باس نہیں' ایک قاتل تھا۔ گلباز خان نے ان پر رعب جمانے کی بے سود کوشش کی۔ وہ اسے یوں سختی سے جکڑے رہے جیسے ذرا بھی ڈھیل دی تو وہ فرار ہو جائے گا۔

مجھے ایک کرسی پر زبردستی بٹھا دیا گیا۔ مجھ سے پہلے شاہو کو عزت و احترام کے تقاضوں کی پروا کیے بغیر کرسی پر بٹھایا جا چکا تھا۔ کسی نے اس کے اور میرے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا۔ میری سانس میرے قابو میں نہیں تھی اور میرا دماغ کسی پریشر ککر کی طرح جذباتی دباؤ پہ سنسنا رہا تھا۔

میں نے تھوڑا سا پانی پی کے ایک گہری سانس لی اور شاہو کی طرف دیکھا "تم ٹھیک ہو نا' پانی پی لو۔"

شاہو نے صرف میری بات ماننے کے لیے پانی پیا ورنہ وہ خود کو مجھ سے پہلے سنبھال چکی تھی مگر اس کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے جذبات پوری شدت کے ساتھ عیاں تھے۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم ٹھیک ہو نا صرا!"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ہاں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پولیس آنے والی ہوگی۔"

یہ قدرت کی ستم ظریفی کا کمال تھا کہ پولیس کو بلانے والا خود گلباز خان تھا۔ وہ مجھے ایک قاتل قرار دے کے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر اچانک بازی پلٹ گئی۔ جب پولیس آئی تو قتل کے الزام میں گرفتار وہ خود ہوا۔

لاش اپنی جگہ پر تھی اور گلباز خان کا ریوالور میز کے نیچے پڑا تھا۔ مرنے والے کے جسم سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اس کا خون کے پھیلتے دروازے اور دلیز سے آگے تک پھیلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے تھے۔ قالین پر اور فرش پر بہنے والا خون ٹھہر کے جمنے لگا تھا اور اس کی سرخ چمک ماند پڑ چکی تھی۔

عملے کے لوگ قانون کو سمجھتے تھے اور پولیس کے آنے تک کسی بھی چیز کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے مگر انہیں لاش کے خون کو اپنے جوتوں سے روند کے آگے آنا پڑا تھا۔ کچھ لوگ اب بھی کمرے سے باہر تھے۔ اندر آجانے والے چار افراد میں سے دو نے ابھی تک گلباز خان کو پکڑ رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کا جی متلانے لگا۔ کمرے میں خون کی مہک بھر گئی تھی۔ اس نے ایک ابکائی لی اور چکرا کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کسی نے اسے پانی پلایا مگر اس کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ دو افراد اسے باہر لے گئے۔ وہ بدستور دروازے کی راہ میں حائل کھڑے گلباز خان کو گھورتے رہے جو اب ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

پولیس کے آنے سے پہلے ہی یہ خبر بلڈنگ میں پھیل گئی تھی کہ ایک وکیل گلباز خان نے کسی کا خون کردیا ہے۔ تجسس کے مارے لوگ اوپر نیچے سے آکے زینے کے موڑ پر جمع ہو رہے تھے اور ایک دوسرے سے قتل کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ آفس کا دروازہ بند کردیا گیا تھا چنانچہ کسی سے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

پولیس نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا کیونکہ بلاوا ایک بہت بڑی قانونی فرم کی طرف سے آیا تھا۔ ایک سب انسپکٹر چار ماتحتوں کی مسلح نفری کے ساتھ صرف پینتالیس منٹ میں پہنچ گیا حالانکہ اس جگہ سے تھانہ بمشکل دس منٹ کی دوری پر تھا۔ پولیس نے زینے پر موجود سب لوگوں کو چلتا کیا اور ایک کانسٹیبل نے زینے کے موڑ پر آفس گیٹ کے سامنے ڈیوٹی سنبھال لی۔

سب انسپکٹر جس کی وردی کی پاکٹ پر اس کا نام اصغر علی لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا بے حس کی حد تک ٹھنڈے مزاج والا جہاں دیدہ شخص تھا۔ خونریزی کے ایسے مناظر دیکھنا اس کے لیے روز مرہ کی بات تھی۔

شادو نے آہستہ سے کہا "ناصر۔ جو میں کہوں اس کی تردید مت کرنا۔"

سب انسپکٹر نے اندر آکے کہا "یہاں سے کوئی باہر تو نہیں گیا ہے؟"

شادو نے نفی میں سر ہلایا "نہیں انسپکٹر' سب موجود ہیں۔"

"جب تک میں اجازت نہ دوں کوئی جائے گا بھی نہیں۔ کسی چیز کو چھیڑا تو نہیں گیا؟" اس نے لاش کو غور سے دیکھا "کون ہے یہ بندہ!"

"ہمارے دفتر کا ایک چپراسی!" شادو نے کہا۔

"اور قتل کس نے کیا ہے؟" انسپکٹر نے گلباز خان کی صورت دیکھی اور پھر ضابطے کی کارروائی کے لیے احکامات جاری کرنے لگا۔ اس نے وہیں بیٹھ کے جائے واردات کا نقشہ بنایا اور ایک سادے کاغذ پر ضروری تفصیلات کا اندراج کیا۔ اس نے قتل کے عینی گواہوں کے نام پوچھے جو صرف دو تھے۔ میں اور شادو۔ پھر اس نے لاش کو اٹھوا کے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا۔

رات کے نو بجے عملے کے باقی ارکان کو گھر جانے کی اجازت شادو کی سفارش پر ملی۔ جو کمرے میں موجود تھے انہوں نے بھی اپنے بیان کو اصل حقائق تک محدود رکھا کہ وہ اپنے کام میں مصروف تھے جب انہوں نے فائر کی آواز سنی پھر برتن گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی میڈم چلانے لگیں تو ہم اپنا کام چھوڑ کے بھاگے۔ یہاں پہنچ کے ہم نے دیکھا کہ چپراسی مر رہا ہے۔ گولی نے اس کا سر پاش پاش کردیا تھا۔ ناصر صاحب اور گلباز خان گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ انہوں نے دونوں کو کھینچ کے الگ کردیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ چپراسی کافی اور سینڈوچ لے کر میڈم کے کمرے میں گیا تھا اور فائر سے پہلے کسی نے کمرے سے کوئی اونچی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

"اب ہم جائیں؟" ان چار افراد میں سے ایک نے ہمت کرکے کہا جو واردات کے بعد سب سے پہلے کمرے میں پہنچے تھے۔

"کہاں جائیں؟" تھانے دار نے غرا کے کہا "ابھی تو تفتیش شروع ہوئی ہے۔ تمہارا نام ایف آئی آر میں آئے گا۔ عینی گواہ ہو تم بھی۔"

دوسرے نے پریشانی سے کہا "ہم عینی گواہ کیسے ہو گئے۔ ہم نے تو صرف انہیں چھڑایا تھا۔ وہ بھی میڈم کے کہنے پر۔"

"زیادہ دلائل دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب باتیں عدالت میں کہنا۔ اوئے ان کو لے جاؤ تھانے" تھانے دار نے دروازے کے باہر کھڑے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

شادو نے کہا "تھانے دار صاحب۔ ان کا بیان ہو گیا۔ جب ان کی ضرورت ہوگی تو یہ تھانے آجائیں گے۔ اس کی ذمے داری میں لیتی ہوں۔ ابھی آپ جانے دیں انہیں۔"

"دیکھو میڈم! ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ کو قانون کا پتا نہیں لیکن اپنا کام ہم جانتے ہیں" تھانے دار نے ناگواری سے کہا۔

پھر معلوم نہیں شادو نے اسے کیا اشارہ کیا کہ تھانے دار

کا رویہ بدل گیا اور اس نے شادو کی بات مان لی۔

جب کمرے میں صرف ہم تین افراد رہ گئے تو تھانے دار نے دروازہ بند کرادیا اور گلباز خان کی طرف دیکھا "ہاں بھئی' بڑا چپ کرکے بیٹھا ہوا ہے تو وکیل صاحب۔ قتل کے بڑے مجرم پھانسی سے بچائے ہوں گے تو نے۔ اب تجھے کون بچائے گا؟"

گلباز خان اب پوری طرح سنبھل چکا تھا "دیکھو سب انسپکٹر۔ مجھ سے ایسے بات مت کرو۔"

"بات تو کریں گے تھانے جا کے" تھانے دار گرم ہو گیا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک بہت نامور وکیل ہوں۔ پولیس کے اعلیٰ افسر میرے دوست ہیں" گلباز خاں نے ہاتھ فون کی طرف بڑھایا۔

"خبردار۔ ایک قاتل صرف قاتل ہوتا ہے۔" سب انسپکٹر نے اپنی چھڑی اس کے ہاتھ پر ماری "قتل کیا ہے تو نے ایک غریب چپراسی کو۔"

شادو نے کہا "دیکھیے تھانے دار صاحب' اس قتل کی وجہ کوئی نہیں۔"

"اچھا جی!" وہ طنز سے بولا "آپ کو زیادہ پتا ہے۔ یہ تو تفتیش کے بعد پتا چلے گا کہ معاملہ کیا تھا۔ چپراسی کے اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات تھے یا بہن سے۔"

"شٹ اپ!" گلباز خان نے چیخ کے کہا۔

غصے سے تھانے دار کا چہرہ لال ہو گیا "پتا چل جائے گا صبح تک سب۔"

شادو نے گلباز خان کو ہاتھ کے اشارے سے روکا "تھانے دار صاحب۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس قتل کی وجہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک حادثہ تھا۔"

میں چونکا مگر مجھے شادو نے پہلے ہی منع کردیا تھا کہ میں اس کے بیان کی تردید نہ کروں۔ گلباز خان کی صورت پر بھی الجھن کے آثار عیاں تھے۔ معلوم نہیں شادو کیا چاہتی تھی۔

تھانے دار ہم سے زیادہ سیانا ثابت ہوا کہ اس نے صورت حالات کو قانون کے تقاضوں سے زیادہ سب کی سہولت اور فائدے کی ترازو میں تولا اور سمجھ لیا کہ عزت دار لوگ ایک باعزت تصفیہ چاہتے ہیں اور ظاہر ہے عدالتِ انصاف کے باہر ایسا ہر فیصلہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے جب فریقین مل کے حقائق کا چہرہ بدلنے پر متفق ہو جائیں یا پھر اخفائے راز کے لیے کسی بھی انتہا تک جانے پر تیار ہوں۔

تھانے دار نے کہا "دیکھو جی۔ قتل تو ادھر ہوا ہے۔ مقتول خود تو چلا گیا چپ چاپ دنیا سے۔ اب میرا کام ہے قاتل کو پکڑنا اور قانون کے مطابق سزا دلوانا۔ مجھے قتل کی وجہ معلوم کرنی ہے۔ آلۂ قتل کا سراغ لگانا ہے میں نے۔"

شادو نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ ریوالور گلباز خان کا تھا اور گولی بھی انہوں نے چلائی' مگر ایسا جان بوجھ کے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے۔"

تھانے دار مسکرایا "اچھا جی۔ ایسا نشے میں ہو گیا یا نیند میں؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ ایک حادثہ تھا" شادو نے کہا۔

"آپ ذرا کھل کے بات کرو جی۔ ابھی تک تو معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ حادثے سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"گولی غلطی سے چل گئی تھی۔"

"تت۔ تت۔ تت۔" سب انسپکٹر نے مصنوعی افسوس کا اظہار کیا "بندہ تو پھر بھی مر گیا نا جی' قتل تو ہو گیا۔"

"ہاں۔ بے چارہ چپراسی اس کی زد میں آکے مارا گیا۔ کوئی اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ایک افسوسناک اتفاق تھا کہ۔" شادو نے کہا۔

"ایک منٹ میڈم!" چالاک تھانے دار نے اس کی بات کاٹ دی "یہ دوسرا بندہ بھی عینی گواہ ہے۔ کیا نام ہے ان کا؟"

"یہ میرے شوہر ہیں۔ ناصر عظیم۔!" شادو بولی۔

"ہاں جی ناصر صاحب۔ آپ بتاؤ کیا ہوا تھا۔ آپ کیوں چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "جو میری وائف نے بتایا وہ درست ہے۔"

"لو جی' ہم نے کب کہا کہ غلط ہے مگر آپ کے منہ سے سننا چاہتا ہوں میں کہ یہ حادثہ کیسے پیش آیا۔ آپ نے تو ماشاء اللہ بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور آلۂ قتل چھین کر میز کے نیچے ڈال دیا۔ یہ بات سب نے کہی ہے اپنے بیان میں۔"

میں نے شادو کی اور پھر گلباز خان کی طرف دیکھا "یہ ٹھیک ہے۔"

"یار' کیا ٹھیک ہے؟ اچھا ہے آپ ادھر ہی بتا دو ورنہ میں سب کو تھانے لے جاؤں گا۔ ساری رات میں یہاں نہیں بیٹھا رہ سکتا۔" تھانے دار کا پارا چڑھ گیا۔ "وہاں پھر تسلی سے سب کے بیانات ہوں گے' سب کے سامنے۔"

میں نے کہا "یہ۔ اپنا ریوالور صاف کر رہے تھے۔"

شادو کے چہرے پر تھوڑا سا سکون آگیا "ان کو پتا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "کہ ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میڈم شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھیں۔ کیا اپنے وکیل صاحب کو پتا نہیں تھا کہ ریوالور بھرا ہوا ہے....؟" تھانے دار طنز سے مسکرایا۔

میں نے کہا "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ جس کا ریوالور ہو' اسے ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد وزن کے فرق سے ہی پتا چل جاتا ہے۔"

"سیفٹی کیچ بھی ہٹانا پڑتا ہے۔ خود نہیں ہٹ جاتا" تھانے دار بولا۔

"بس وہ بنا ہوا تھا" شادو نے جھنجلا کے کہا "تم کو یہی لکھنا ہے اپنی رپورٹ میں کہ گولی بلا ارادہ چل گئی اور کچھ نہیں۔"

"اور مقتول کے وارث! وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ قانونی تقاضے پورے ہو جائیں گے ایسا لکھنے سے؟" سب انسپکٹر تیز ہو کے بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ چپراسی بھی اپنی فیملی کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا ہر باپ یا شوہر ہوتا ہے۔ ان سے ہم معافی مانگ لیں گے اور ان کے نقصان کی تلافی بھی کر دیں گے جس حد تک ممکن ہوگا۔ باقی رہے قانونی تقاضے' تو یہ مت بھولو کہ ہاشمی اینڈ کمپنی ایک لیگل فرم ہے۔ تم اپنی ایف آئی آر میں ہمارا بیان نہیں بدل سکتے۔ تم شوق سے مقدمہ درج کرو۔ جو چاہو لکھو' ہم ضمانت بھی کرالیں گے گلباز خان کی اور مقدمہ بھی لڑیں گے۔ صفائی کے جتنے گواہ تم چاہو پیش کر دیں گے اور ان کو باعزت طور پر رہا بھی کرالیں گے۔ بات صرف وقت کی ہے" شادو نے برہمی سے کہا "اور رقم کی بھی۔"

تھانے دار کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ فائدہ اٹھانے کا اچھا خاصا موقع اس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ ایک معمولی حیثیت کے چپراسی کا خون بہا ان کے لیے کچھ بھی نہیں جو معاشرے میں اپنی دولت مندی اور اثر رسوخ کی طاقت رکھتے ہیں۔

"آپ تو بلاوجہ خفا ہو گئیں میڈم!" تھانے دار بولا "میں نے تو پہلے ہی عرض کی تھی کہ آپس کی بات ہے مگر مجھے وکیل صاحب کو اپنے ساتھ تو لے جانا ہی ہوگا۔ ضابطے کی کارروائی کے لیے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ان کو بہت عزت آرام کے ساتھ رکھا جائے گا' ضمانت پر رہائی ملنے تک۔"

"اخبار والوں کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے" شادو نے کہا۔

"یہ تو ذرا مشکل ہے۔ آپ کا اسٹاف جانتا ہے اور بلڈنگ میں بہت سے لوگوں تک بات پہنچ گئی ہے۔"

"کل صبح کے اخبار میں کچھ نہیں آسکتا۔ کل آپ ہر کرائم رپورٹر سے معاملہ طے کر لیں۔ اگر وہ خبر دے تو نام نہ لکھے" شادو نے کہا اور اپنی میز کی ایک دراز کھولی پھر اپنے پرس میں دیکھا اور بہت سے نوٹ میز پر ڈال دیے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پچاس ہزار یا اس سے بھی زیادہ رقم کے نوٹ تھے۔

"اس وقت یہی ہیں" شادو نے کہا۔

"چلو جی' باقی پھر سہی۔" تھانے دار نے انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ نوٹ سمیٹ لیے "اپنے وکیل صاحب اگر گھر میں کسی سے بات کرنا چاہیں تو ضرور کریں لیکن گھر والوں کو ذرا اپنے طریقے سے سمجھا دیں کہ شور شرابا نہ کریں۔ یا ایسا کیوں نہیں کرتے آپ۔ ابھی چلتے ہیں آپ کے دولت خانے کی طرف سے۔ آپ ان سے مل لیں اور سامنے بات کر لیں۔ گھر سے کچھ لینا ہے تو ساتھ لے جائیں۔ میرا مطلب ہے کپڑے اور ضرورت کا سامان۔ بے شک کھانا کھائیں اور کھانا پہنچانے کے لیے بھی کہہ دیں۔"

گلباز خان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ شادو کے رویے نے اس کے جارحانہ رویے کی آگ پر پانی ڈال دیا تھا اور اب وہ صرف شرمندہ تھا۔ اس میں نظر ملانے کی اخلاقی جرأت بھی نہ رہی تھی۔

سب انسپکٹر اٹھا "پھر کیا خیال ہے سر جی' چلیں؟"

گلباز خان اٹھا۔ اس نے شادو کی طرف دیکھا "آئی ایم سوری!"

شادو نے دوستانہ اور ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جو کچھ ہوا غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اسے بھول جاؤ گلباز خان۔ ہم اچھے دوست اور پارٹنر تھے.... اور رہیں گے۔"

"تھینک یو۔۔۔ لیکن مجھے کچھ اور کہنا تھا" اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہم بعد میں بات کریں گے گلباز خان" شادو بہت چرسکون تھی۔

"آیئے وکیل صاحب۔" سب انسپکٹر نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ٹھہرو۔۔۔" گلباز خان نے اپنا بازو چھڑا لیا "مجھے ناصر سے ایک بات ابھی کہنی ہے۔ اس وقت تم اپنی خوش قسمتی سے بچ گئے ہو۔ ورنہ پولیس کو میں نے بلایا تھا۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اپنی بیوی کا۔"

میں نے کہا "بندے کو صرف خدا کا شکر گزار ہونا

چاہیے گلباز خان!"

جب وہ باہر چلا گیا اور دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا تو شادو نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر پیچھے کر کے آنکھیں بند کر لیں۔

"آر یو آل رائٹ ڈیئر!" میں نے قریب جا کے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"اوہ ناصر۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو" اس نے میرا ایک ہاتھ تھام کے اپنے رخسار سے لگا لیا "وحشت ہو رہی ہے مجھے اتنی۔ کہ پاگل ہو جاؤں گی۔"

"اوکے۔ چلو اٹھو" میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

"باہر کوئی ہے؟ نہیں ہے تو۔۔۔" وہ دروازے تک پہنچ کے رک گئی کیونکہ آگے خون تھا جو اب سرخ قالین پر بھی سیاہ دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"کم آن! ڈرنے کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

لیکن وہ اسی طرح دہشت زدہ سی کھڑی رہی۔ خود مجھے اس خون پر سے جوتوں سمیت گزرتے ہوئے کراہیت محسوس ہو رہی تھی مگر یہ ناگزیر تھا۔ اس پر سے گزرے بغیر ہم باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ایک لمبی جمپ لگا کے کمرے سے کوریڈور میں صاف جگہ پر پہنچ جاتا مگر شادو کے لیے یہ ناممکن تھا۔ اس نے اونچی ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی اور انہیں اتار کے بھی وہ چھلانگ نہیں لگا سکتی تھی۔

میں نے اسے اٹھا لیا۔ اسی طرح اپنے بازوؤں میں اٹھا کے میں اسے اندر لایا تھا۔ یہ تین گھنٹے پہلے کی بات تھی مگر تین گھنٹوں میں مجبوری کی نوعیت میں فرق آ گیا تھا۔ آتے وقت وہ بیماری کے دورے سے اس قابل نہ تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکے اور جاتے وقت اس کے اعصاب شکستہ تھے۔

اس کا وزن مجھے محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا لیکن میں خون پر سے احتیاط کے ساتھ گزرا۔ خون کی چکناہٹ میرے جوتے کے سول پر آ گئی تھی اور میں پھسل جاتا تو اسی خون پر ہم دونوں ایک ساتھ گرتے۔ ہمارے کپڑوں پر خون لگ جاتا تو ہمارے لیے نیچے کھڑی ہوئی اپنی کار تک پہنچنا بھی مشکل ہو جاتا۔

کوریڈور میں پہنچ کے وہ میری گود سے اتر گئی۔ زینے اور لفٹ کی طرف کھلنے والے صدر دروازے تک دونوں جانب کے چاروں کیبن بند تھے۔ یہ ماتحت عملے کے لیے بنائے گئے تھے اور ہر کیبن میں دو افراد کے لیے میز کرسی ڈال دی گئی تھی۔ وہ سب جاتے وقت اپنے اپنے آفس مقفل کر گئے تھے۔ صرف گلباز خان کا کمرا کھلا ہوا تھا۔ جو شادو کے کمرے کی طرح صدر دروازے کے بالکل سامنے اور راہداری کے آخر میں تھا۔ پورے آفس کے ہر دروازے' الماری اور میز کی درازوں کے تالوں کی چابیوں کا مکمل سیٹ صرف شادو اور گلباز خان کے پاس تھا۔ ماتحت عملے کے پاس اپنے اپنے کیبن کی چابیاں تھیں اور بلڈنگ کے چوکیدار کے پاس ہر آفس کے باہر والے دروازے کی چابی موجود رہتی تھی۔

شادو نے گلباز خان کی کرسی پر بیٹھ کے ایک دراز کھولی۔ "ناصر۔ پلیز ذرا میرے آفس کی چابیاں نکال دو۔ ایسی ہی میز ہے اور اسی دراز میں ہوں گی لیکن درازیں اور الماریاں سب لاک ہیں۔ یہ دیکھ لینا۔ اور پھر کمرا لاک کر دینا۔"

جب میں چند منٹ کے بعد واپس آیا تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ وہ انتہائی مضمحل اور خستہ حال لگ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد اس ماحول سے نکال کے لے جاؤں۔ اس پر بیماری کے حملے نے مجھے متفکر کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اس کے ناتواں وجود میں اب زندگی کے لیے لڑنے کی توانائی کا کتنا ذخیرہ باقی رہ گیا ہے۔ آفس میں پیش آنے والے واقعات سے اسے شدید ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچا تھا مگر وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر حالات کا مقابلہ سکون اور دل جمعی سے کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ ایک عام صحت مند انسان کے مقابلے میں اس کی قوتِ برداشت کی حد بہت کم تھی۔ وہ کسی بھی وقت COLLAPSE ہو سکتی تھی۔

اس نے فون رکھ دیا "بس پانچ منٹ۔ ایک ضروری کام ہے چھوٹا سا۔"

"شادو۔ چھوڑو دو ساری فکریں۔ لعنت بھیجو اس چھوٹے سے ضروری کام پر۔ تم دیکھو تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے۔"

"میں ٹھیک ہو جاؤں گی" وہ میرا دل رکھنے کے لیے مسکرائی "بعض اوقات کتنی مایوسی ہوتی ہے جب کسی وجہ کے بغیر کوئی تدبیر الٹی ہو جاتی ہے۔ کوئی منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے پہاڑ کی چوٹی کو سر کر لیا مگر آخری قدم پر اچانک کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک معمولی سا کنکر آ جاتا ہے پاؤں کے نیچے یا کوئی پتھر جگہ چھوڑ دیتا ہے اور پھر واپس ہزاروں فٹ کی گہرائی تک کنکروں پتھروں کے ساتھ نیچے پہنچنے والا آدمی ساری امیدوں اور خوابوں کے ساتھ بکھر جاتا ہے۔"

وہ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے ہمکلام تھی کیونکہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی نظریں مجھ پر جمی ہونے کے باوجود کہیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔ میرا دل درد کے شکنجے میں آگیا۔ کیا وہ اپنی زندگی کا المیہ سنا رہی تھی۔

بات کا رخ پلٹنے کے لیے میں نے کہا "یہ گلباز خان کو اچانک کیا ہوگیا تھا؟"

اس نے سر ہلایا "میں اسی کی بات کر رہی تھی۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ یہاں آکے بڑے دوستانہ اور خوش گوار ماحول میں سارے معاملات طے کرلیں گے۔ اسے آفر دیں گے کہ وہ ہاشمی اینڈ کمپنی خرید لے اور اس کا مالک بن جانے کے بعد چاہے تو اسے گلباز خان اینڈ کمپنی بنالے۔"

"اس نے پوری بات سنی ہی نہیں" میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ وہ پہلے سے اندیشوں کا شکار تھا۔ تم سے میری شادی کی خبر سن کے اس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اب حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔"

شادو سوچ میں پڑ گئی "لیکن ناصر۔ یہ قتل کا الزام میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر وہ بھی وکیل ہے۔ یہ جانتا ہے کہ بے بنیاد الزامات عائد کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ چاہے خود تمہیں کتنا بھی ناپسند کرے' یہ تو معلوم ہے اسے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میری پہلی اور آخری محبت ہو۔"

"شاید یہ مایوسی اور فرسٹریشن کی انتہا تھی۔ رقابت کی' حسد اور احساسِ ذلت کی شکست کا ردِعمل تھا۔"

"شکست کیسی۔۔۔ رقابت کس سے۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "ممکن ہے اس نے تم سے کچھ توقعات وابستہ کرلی ہوں۔ تمہارے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا رویہ بے غرض نہ ہو۔ اس کے ذہن میں ہاشمی صاحب کی موت کے بعد یہ خیال ایک یقین کی صورت اختیار کرگیا ہو کہ ایک نہ ایک دن وہ خود کو تمہارا قابل اعتماد دوست' مضبوط سہارا اور بالآخر پرستار ثابت کردے گا اور تم جو اس کی بزنس پارٹنر ہو اسے اپنا لائف پارٹنر قبول کرلوگی۔"

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔ ایسا فضول خیال کیسے آسکتا تھا اس کے ذہن میں۔ وہ شادی شدہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا ایک اور شادی اور وہ بھی کسی بیوہ سے۔۔۔ مذہب' قانون یا معاشرے کے لیے ناقابلِ قبول ہوسکتی تھی؟ اسے ایک نیکی سمجھا جاتا اور ویسے بھی اسے بہت خوش فہمی ہوگی اپنے بارے میں۔ وہ ہاشمی صاحب کے مقابلے میں بہت کم عمر' ہینڈسم اور صحت مند ہے۔ اس کے پاس کسی بھی چیز کی کمی نہیں۔ تعلیم' عزت' دولت لیکن میں پھر بیچ میں ٹپک پڑا۔ حالانکہ میرا نام بھی تمہاری کتابِ زندگی سے خارج ہوچکا تھا۔ کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔ میں گزر جانے والے وقت کی طرح تھا۔"

وہ رم بخود بیٹھی رہی "شاید۔۔۔ شاید ایسا ہی ہوگا۔۔۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے گلباز خان کے پاگل پن کی مگر ناصر' تم نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"ابھی تک میں نے کتنی بار سوچا۔ عہد کیا اپنے آپ سے اور قسم کھائی۔ ایک میرے ہمنام دوست ناصر کا بچا تھا۔ اس کے بعد۔"

"ہاشمی صاحب تھے" شادو نے میری ادھوری بات پوری کی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "ہاں' وہ بھی تھے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے سب سے زیادہ نفرت انہی سے کی اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چھوٹے بڑے ملک برادران تھے۔ ان سب کو قتل کرنا میرے لیے کارِ ثواب کا درجہ رکھتا تھا۔ بڑا سکون ملتا مجھے ان کی جان لے کے لیکن ہر خواہش کی راہ میں کوئی نہ کوئی خیال حائل ہوتا رہا۔ ہاشمی صاحب اس لیے بچ گئے کہ مجھے تمہارے خیال نے روک لیا تھا۔"

"انہیں قتل بھی تم میری وجہ سے ہی کرنا چاہتے تھے؟" وہ بولی۔

"ہاں مگر اس خیال نے روک لیا کہ پھر تم مجھ سے نفرت کرنے لگوگی۔ تم کہوگی کہ یہ محبت نہیں ہوس تھی۔ جسم کو حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ ورنہ اپنے محبوب کو دکھی کون کرتا ہے۔"

وہ سحرزدہ سی مجھے دیکھتی رہی "عجیب باتیں ہیں تمہاری بھی۔"

میں نے کہا "یہ ملک برادران بھی صرف تمہاری وجہ سے بچ گئے۔ حالانکہ انہیں قتل بھی میں تمہاری وجہ سے کرنا چاہتا تھا۔ تم نے مجھے قسم دے کے روک دیا۔ خیال کا کیا ہے' مجھے یتیم خانے کے یک چشم صوفی کو قتل کرنے کا خیال اکثر آتا تھا اور میں۔۔۔ شاہ جی کو قتل کرنے کا سوچتا تھا۔۔۔ مگر قتل کوئی نہیں کیا میں نے۔"

"پھر گلباز خان نے کس یقین کی بنیاد پر پولیس بلالی تھی؟"

"یہ میں اس سے ضرور پوچھوں گا کسی دن۔"

شادو نے میرے پیچھے دیکھا "ناصر' جاکے باہر کا دروازہ کھولو۔ وہ آیا ہے سبحانی۔ میں نے بلایا تھا اسے۔"

سبحانی ایک جونیئر وکیل تھا۔ چوبیس پچیس سال کا جوان

آدمی جس کی صورت پر سخت حالات کی تحریر آج بھی پڑھی جاسکتی تھی۔ اس کی صحت اچھی نہیں تھی اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر جھائیاں تھیں۔ وہ کچھ جھینپا ہوا مظلوم اور احساسِ کمتری کا مارا ہوا لگتا تھا۔ اس کی عمر زدہ متانت اس کی عمر سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ مجھ سے تعارف کے بعد وہ اخلاقاً بھی نہیں مسکرایا۔

"بیٹھو سبحانی۔ میں نے ایک کام سے بلایا ہے تمہیں۔۔۔ جو میرا خیال تھا کہ تم ہی کرسکتے ہو۔"

اس نے سر ہلایا "آپ حکم کریں۔ کام ہوجائے گا۔"

"پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہ چپراسی کہاں رہتا تھا۔ جو گلباز خان کے ہاتھوں خواہ مخواہ مارا گیا ہے' بے چارہ!"

"ایسی کیا بات کی تھی اس نے میڈم۔۔۔!"

"کوئی بات نہیں تھی سبحانی۔ بس اس کی قضا آئی تھی۔۔۔ گولی غلطی سے چل گئی۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "گلباز خان کو گرفتار کرلیا ہے پولیس نے؟"

"ہاں مگر ہم ضمانت کرالیں گے اس کی۔ پولیس کے ساتھ بھی معاملات طے کرنے ہیں میں نے۔"

سبحانی نے چپراسی کا پتا ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا۔

"آپ جائیں گی اس کے گھر؟"

"کیا نہیں جانا چاہیے مجھے سبحانی۔" شادو نے وہ کاغذ کا پرزہ میری طرف بڑھادیا اور میں نے ایک نظر ڈال کے جیب میں رکھ لیا۔

"ضرور جانا چاہیے آپ کو۔ اس کی فیملی بڑی مشکل میں پڑجائے گی۔"

شادو نے کہا "کتنے لوگ ہیں اس کی فیملی میں؟"

"چار بچے ہیں۔ سب سے بڑا میٹرک کرچکا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ دو سال سے بے روزگار تھا۔"

شادو نے سوچتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ پھر ہم رکھ لیں گے اسے۔۔۔ اور اگر وہ لڑکا اس قابل ہوا۔۔۔ تو اس کے لیے بھی جگہ نکالیں گے۔ وہ پڑھنا چاہے کالج میں تو اس کی مرضی۔ ہم سارے اخراجات کی ذمے داری لیں گے۔"

"اور کچھ نہیں۔۔۔" سبحانی مایوس نظر آنے لگا۔

"بات یہ ہے سبحانی کہ زندگی کا مول تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ باپ کا نعم البدل کہاں مل سکتا ہے بچوں کو۔"

"شوہر تو مل جاتا ہے دوسرا" سبحانی بے خیالی میں کہہ گیا پھر گھبرایا "میرا مطلب ہے دوسری شادی تو عمر بھی کرلیتے ہیں۔"

شادو نے اس کی بات کو نظرانداز کیا "میرا خیال ہے کہ ان کی کچھ مالی مدد بھی کی جائے۔ اگر ان کے پاس رہنے کے لیے جگہ نہیں ہے تو انہیں کوئی مکان دلوادیا جائے یا پھر دو چار لاکھ نقد دے دیے جائیں۔ وہ میں کرلوں گی۔ جس کام کے لیے میں نے تمہیں بلایا تھا' وہ کچھ اور ہے۔"

"آپ بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

شادو نے کہا "تم میرے کمرے کی صفائی کرا سکتے ہو۔ نیچے چوکیدار ہوگا' اسے کہو کہ کسی کو مدد کے لیے بلالے۔ تم صرف نگرانی کرو۔ پہلے تو میرے کمرے سے کارپٹ نکالنا ہے۔"

"میں نکلوادوں گا۔ کیا اسے آپ کے گھر پہنچادوں؟"

شادو نے گھبرا کے کہا "نہیں بھئی۔ اسے پھنکوا دو کہیں۔ جلوا دو۔۔۔ یا چوکیدار کو دے دو۔ وہ دھو کے استعمال کرنا چاہے تو اس کی مرضی۔ کارپٹ ہٹا کے فرش کو صاف کرانا ہوگا۔ رات کے وقت یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ پانی بہہ کے زینے میں جائے گا۔ صبح تک بالکل خشک ہوجانا چاہیے۔"

"آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔"

"اس کے بعد۔۔۔ کل صبح جب بازار کھلے تو کسی کارپٹ ڈیلر کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ کمرے میں نیا کارپٹ ڈال دے۔ میز رہے اپنی جگہ مگر کرسیاں نئی ڈال دو۔ کرلوگے یہ سب کام؟"

"بالکل کرلوں گا' آپ مطمئن ہوجائیں۔"

شادو اٹھ کھڑی ہوئی "پھر میں جاتی ہوں۔ آفس کی چابیاں اپنے پاس رکھنا۔ اور یہ لو' دس ہزار ہیں" اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے میز پر ڈال دی "یہ کم ہیں۔ کارپٹ اور فرنیچر والوں سے کہنا شام کو بل لے آئیں۔ ہم چیک دیں گے' رائٹ۔"

نیچے گاڑی تک پہنچتے ہوئے شادو ہانپ گئی۔ میں نے اس کو گاڑی میں بٹھاکے کہا "بس اب آج رات اور کچھ نہیں کروگی تم۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "آرام۔۔۔! کچھ دن کی بات ہے ناصر پھر تو آرام ہی آرام ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ گاڑی کی سیٹ سے سر لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور نقاہت اس کے چہرے پر کسی بے برگ و بار درخت کا تاثر دیتی تھی جس کو دیمک نے اندر سے بھی کھوکھلا کردیا ہو۔ اس حالت میں وہ مزید تفکرات اور مصروفیات کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "اب ہم سیدھے گھر جا رہے ہیں۔"
وہ سیدھی بیٹھ گئی "ہم گھر کیسے جا سکتے ہیں۔ سارے کام چھوڑ کے۔"
میں نے کہا "پھر وہی کام۔ بھاڑ میں گئے سارے کام اور یہ کیا ضروری ہے کہ ہر کام کے لیے تم خود پریشانی اٹھاؤ۔ مجھ پر بھروسا نہیں ہے تمہیں؟"
"یہ تم نے کیا بات کی؟" وہ ناراضی سے بولی۔
"ابھی تم نے ایک ماتحت کو بھروسے کے قابل سمجھا اور اسے سونپ دیے بہت سے کام۔ میں کیا اس سے بھی گیا گزرا ہوں" میں نے بھی ناراضی کا جواب ناراضی سے دیا۔
"تم بلاوجہ ایسا سمجھ رہے ہو۔ لڑنا چاہتے ہو مجھ سے۔"
میں نے کہا "ہاں۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو لڑائی ضرور ہوگی۔ ہم ابھی گھر جا کے کھانا کھائیں گے۔"
"مگر مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"
"نہ ہو مگر وہ جو ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم ان سے کیا فرمائش کر آئے تھے۔ وہ سب کچھ پکا کے بیٹھے ہوں گے۔ ہم نے کچھ نہ کھایا تو ان کی کتنی دل شکنی ہوگی۔ کھانے کے بعد تم وہیں آرام کر لینا۔ جو کام تمہارے کرنے کے ہیں وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔"
وہ شرمندگی کی پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی "یہ تو میں بھی چاہتی ہوں۔"
"تو اب سنو" میں نے کہا "کھانا ضروری ہے ورنہ میں تم کو گھر پر ڈراپ کر کے نکل جاتا۔ میں پہلے جاؤں گا میو اسپتال۔ وہاں دیکھوں گا کہ چپراسی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بنی ہے یا نہیں۔"
"تین گھنٹے ہو گئے اس بات کو۔"
میں نے کہا "غریب اور لاوارث آدمی کی لاش تین دن بھی ایسے ہی پڑی رہتی ہے۔ خصوصاً وہ جو پولیس کے ذریعے سے آتی ہیں۔ لواحقین اور ورثا پریشان پھرتے رہتے ہیں۔"
"پوسٹ مارٹم میں اتنی دیر کس لیے؟"
"شادو۔ کیا تم اس معاشرے کا حصہ نہیں ہو؟ تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں کوئی بھی کام قانونی جواز یا استحقاق کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ کام ہوتا ہے رشوت یا سفارش سے۔"
"یعنی۔۔۔ یہ کام بھی" شادو نے بے یقینی سے کہا۔
"یہ کام بھی۔ بے شک ہر جگہ ایسا نہیں ہوگا مگر ایسا بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات وارثوں کو اطلاع ہی نہیں دی جاتی اور ضابطے کے مطابق تین دن میں وارث تھانے اور مردہ خانوں کی خاک چھانتے ہوئے اپنے کسی پیارے کی تلاش میں نہ پہنچیں تو لاش فوراً لاوارث قرار دے دی جاتی ہے اور میڈیکل کے طلبہ کو چیر پھاڑ کے لیے بھیج دی جاتی ہے۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹکڑے کچھ عرصہ ایک کیمیائی محلول کے تالاب میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی کا ہاتھ' کسی کا پاؤں' دھڑ کسی کا اور سر کسی کا۔"
وہ کانپنے لگی "خدا کے لیے مت کرو ایسی باتیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"
"میں نے یہ سب دیکھا نہیں مگر کسی اخبار نویس نے اس پر ایک پورا فیچر چھاپ دیا تھا۔ وہ میں نے دیکھا تھا۔ اس میں تصویریں بھی تھیں۔ اس میں جسم کے اعضا اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ بے کار ہو جانے والے اعضا کو جلانے کے لیے ایک بھٹی ہے۔ کچھ ادھ جلے رہ گئے تھے۔ ان کی تصویر الگ تھی۔"
"اس پر تو بڑا ہنگامہ ہوا ہوگا۔"
"یہی تو کمال ہے۔ اس کی اشاعت سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ انسان کی لاش کی حرمت' اس کے احترام اور اس کے تقدس کی باتیں کرنے والے سب نے بے حسی کی چپ سادھ لی۔ کوئی نہیں بولا۔ نہ کوئی مذہب کا ٹھیکے دار' نہ انسانیت کا علمبردار۔"
"دیکھو۔ ان بے چاروں کو مزید پریشانی نہ ہو۔"
"میں نہ گیا تو ہوگی۔ حرام خور گدھ جلدی لاش دینے کے پیسے لیں گے۔ اگر انہیں اطلاع نہ ملی تو میرا کام زیادہ مشکل ہو جائے گا پھر مجھے ڈیڈ باڈی کے ساتھ گھر بھی جانا پڑے گا۔ اس صورتِ حال کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جب انتظار کرنے والوں کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ موت نے ان پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔ ایک عورت کے لیے بیوہ اور بچوں کے لیے یتیم ہونے کی خبر کو حقیقت سمجھ کے قبول کرنا کٹھن ہوتا ہے۔"
"ناصر۔ کیا لاش کو گھر لے جانا ضروری ہے' اس حالت میں؟"
"کیا مطلب؟ میں خود اس کی تدفین کرا دوں؟"
"اچھا ہے اگر اس کے گھر والوں کو وہ لاش نہ دیکھنی پڑے' وہ صرف ایک قبر دیکھیں اور رو دھو کے صبر کر لیں۔"
"ابھی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے وہ پہلے سے اسپتال میں موجود ملیں۔ ان کے جذبات فی الحال کچھ اور ہوں گے۔ وہ چاہیں گے کہ گلباز خان کو پھانسی ہو۔ کچھ دن بعد جب انہیں صبر آ جائے گا تو پھر بات کریں گے کچھ دینے دلانے کی۔ نقد معاوضہ اور چپراسی کی جگہ کسی کو ملازمت دینے کی

بات۔ ہفتہ دس دن میں وہ خود سمجھ جائیں گے کہ گلباز خان کو پھانسی تو کیا جیل بھی نہیں ہوگی۔"
رات کے ساڑھے دس بجے میں نے گاڑی کو ہیر کلینک کے سامنے کھڑا کیا۔ اوپر سے ڈاکٹر رانجھا نے جھانک کے دیکھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بے چینی سے ہماری واپسی کے منتظر تھے۔
"ابھی انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔
شادو نے کہا "تم زیادہ دیر مت لگانا۔"
میں نے کہا "دیر تو ہوگی۔ مجھے پولیس اسٹیشن بھی جانا ہوگا۔"
"وہ کس لیے؟"
"میں ذرا گلباز خان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
ماسی ہیر کا موڈ بہت خراب تھا۔ "نا۔ ابھی بھی کیا ضرورت تھی گھر آنے کی۔ کھانا تو کھالیا ہوگا کسی ہوٹل میں۔ ہمارا کوئی خیال ہے کہ ہم انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔ کوئی ٹائم ہوتا ہے کسی چیز کا۔"
میں نے کہا "ماسی۔ یہ ہو سکتا تھا بھلا کہ ہم فرمائش کر کے جاتے اور پھر کھانا باہر کھا لیتے۔ ہاں کچھ دیر ہو گئی۔"
"بڑی مہربانی ہے تمہاری جو ہم غریبوں کا اتنا خیال کیا" وہ طنز سے بولی۔
شادو نے کہا "دیکھو ماسی۔ یہ لڑائی والی باتیں ہیں۔"
"ہمارے لیے تو تمہاری گرما گرم گالیاں بھی باہر کے تنوری مرغ سے زیادہ مزے دار ہیں" میں نے کہا۔
"چل بکواس مت کر۔ باتوں سے بے وقوف بناتا ہے مجھے۔"
"جیسے رانجھا بنا رہا ہے رات دن۔ پہلے دن سے۔" میں نے کہا۔
"او یار۔ وہ تو رب نے جیسی شے بنا کے بھیج دی دنیا میں' ویسی ہی ہے۔ اب اُلو کو اگر کوئی اُلو بنانا چاہے تو خود اُلو۔" رانجھا ہنسنے لگا۔
ماسی اس سے لڑنے کھڑی ہو گئی "کیا مطلب ہے آخر اس بات کا۔ میں پیدائشی بے وقوف ہوں۔"
رانجھا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے "او نہیں بابا۔ تو بڑی سیانی ہے۔ سیانی نہ ہوتی تو یہ گوہرِ مقصود تیرے ہاتھ کیسے آتا' کھانا گرم کر۔"
وہ جاتے جاتے پھر رک گئی "یہ تو کس مقصود کی بات کر رہا ہے؟"
رانجھے نے مجھے آنکھ ماری "مقصود وہی' جو تیری گلی کے نکڑ پر رہتا تھا۔ بڑی آہیں بھرتا تھا تجھے دیکھ دیکھ کے اور تو بھی کوٹھے پر ٹنگی رہتی تھی جب وہ پتنگ اڑاتا تھا۔"
"ہائے میں مرگئی" ماسی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا "رانجھے کچھ شرم حیا کر۔ اس عمر میں بچوں کے سامنے کیسا جھوٹا الزام لگا رہا ہے مجھ پر۔"
"یہ جھوٹ ہے؟ تو گئی نہیں تھی چوری چھپے اس کے ساتھ۔ کون سی فلم دیکھنے گئی تھی؟" وہ سوچتے ہوئے بولا "ہاں' ماہی منڈا اور فلم کا اتنا اثر ہوا تھا تجھ پر کہ تو نے کہا تھا اس سے کہ وے مقصود' چل چلے دنیا دی اس نکرے۔"
ماسی سمجھ گئی اور ہنسنے لگی۔ "کیسا بے ایمان گئی ہے۔ کوئی اور سنے تو پتا نہیں سچ سمجھے۔ یہ گانا تو بنا ہی ابھی ہے۔"
شادو سیدھی اندر جا کے لیٹ گئی تھی۔ رانجھے نے اس پر کچھ تشویش کا اظہار کیا۔ "خیر سے شادو کا جی خراب ہے' کیا بات ہے؟"
ماسی نے کچن میں سے اسے ڈانٹا "شادو تو کیوں کہتا ہے۔ دھی رانی بول یا دلہن کہہ۔ اور جی تو خراب ہوتا ہے۔ میں بتا سکتی ہوں تجھے کہ بات کیا ہوگی۔"
میں نے گھبرا کے کہا "خدا کے لیے ماسی' وہ واقعی بیمار ہے۔"
وہ کچھ مایوس ہوئی "یعنی وہ بات نہیں مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
"کیا کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اس کی صورت سے پتا چلتا ہے۔ تو بے شک شرط لگا لے" ماسی مسکرانے لگی "ڈاکٹرنی کو کھائے گا تو وہ بتا دے گی۔ کہ وہ امید سے ہے۔"
میرا دل ڈوبنے لگا "ایسا مت کہو ماسی۔"
ماسی کا چہرہ حیرت کی تصویر بن گیا "نا۔ تو پاگل ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں نہ کہوں۔ خوشی سے کانپنے لگتے ہیں یہ خبر سن کے۔۔۔ جو پہلی بار باپ بنتے ہیں۔"
اس وقت میں نے بات کو ٹال دیا مگر یہ فکر میرے دل میں پھانس کی طرح چبھ گئی۔ ماسی کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا مگر اس کے درست ہونے کا خیال انتہائی ڈراؤنا تھا۔ شادو کے پاس تو زندگی کی مہلت ہی بہت کم رہ گئی تھی۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی زندگی کو وجود عطا کر سکے۔
شادو پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ شام کے بعد پیش آنے والے واقعات کی خونیں تصویر میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظروں میں تھی اور بے گناہ رزقِ خاک ہو جانے والے لہو کی جو میرے تصور میں بس گئی تھی۔ مجھے ابھی اس سے زیادہ پُر آزار اور دل خراش تجربات سے دوچار ہونا تھا جن کا تصور ہی میری نیند بھوک اڑانے کے لیے کافی تھا۔ ماسی کی بات نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ مجھے یہ پُر وحشت خیال ڈرانے لگا کہ کیا ایک شادو کے لیے آنے والے وقت میں اذیتوں کے کتنے سلسلے ہوں گے؟

وہ اپنے آپ پر جبر کے عذاب کا ایک لمبا سفر تھا جو نداموں کے کانٹوں سے بھرے راستے پر اس نے دل کی ویرانی اور اکیلے پن کے ساتھ طے کیا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ محبت کے تقاضوں میں طلب کا کوئی مفہوم نہیں ہے' میری زندگی کے مستقبل کو تحفظ اور کامیابی کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے اس نے اپنا بدن بیچ دیا تھا جس پر میں اپنے حق ملکیت کی اجارہ داری کو قائم رکھنے کا اس حد تک خواہاں تھا کہ جب اس نے ہاشمی صاحب سے شادی کی تو بڑی کمینگی کے ساتھ میں شادو کو زر پرست کسبی اور جسم فروش فقیر زادی کہتے ہوئے نہیں شرمایا تھا۔

شادو نے ہر تہمت کو' اپنوں کی انگشت نمائی کو اور غیروں کی ہرزہ سرائی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا تھا۔ قدرت نے اسے بیوگی عطا کی تو اس نے مان لیا کہ یہ اس کے اعمال کی سزا تھی۔ یہ الزام بھی قبول کر لیا کہ ہاشمی صاحب کو لندن لے جانا' ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سازش تھی جس میں اس کا بے غیرت پرستار بھی شامل تھا جو اس سے "سچی محبت" کرتا تھا۔

تقدیر کا ایک اور بے رحمانہ مذاق اسے بیک وقت اپنی موت کی نوید اور اپنے وجود میں پرورش پانے والی زندگی کی خبر دیتا تھا۔ حسنِ تخلیق کا وہ شگوفہ پھوٹنے سے پہلے ہی بربریت کی ایک چٹان کے نیچے دب کے مر گیا تھا۔ مامتا کا کومل جذبہ چھوٹے بڑے ملک کی شیطانی درندگی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ وہ مقدر کی ہر سزا کو قبول کرتی رہی تھی اور صعوبتوں کے صحرا کے اس آبلہ پا سفر کے بعد بالآخر وہ مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت جب اس کی اپنی زندگی کا سفر ختم ہو رہا تھا۔

اب کیا مرتے وقت وہ یہ غم بھی اپنے ساتھ لے جائے گی کہ جاتے ہوئے وہ مجھے اپنی نشانی نہ دے سکی۔ کتنا صدمہ ہو گا اسے کہ دستِ غیب نے اس کی سزائے موت میں تھوڑے سے التوا کی اپیل بھی منظور نہیں کی۔ صرف اتنی کہ وہ ماں بن جائے ایک بار۔ اس زندگی کی تکمیل کر لے جس کا انحصار اس کے وجود پر ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ ماں کے ساتھ بچے کو بھی دفن ہونے کی سزا نہ ملے۔

ماسی ہیر نے بڑی محبت اور محنت سے کھانا بنایا تھا مگر ہماری مجبوری کی شرکت اور عدم دلچسپی نے اسے بہت مایوس اور بد مزہ کیا۔

"یہ تم کھانا کھا رہے ہو یا... ٹیم پاس کر رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"کھانا کھا لیا ماسی۔ جتنی بھوک تھی" میں نے کہا۔

"میں کیا جانتی نہیں تمہاری بھوک کو؟" وہ خفا ہو گئی "رات گیارہ بجے تک کچھ نہ کھایا ہو تو بندہ کیسے کھاتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری قسم ماسی۔ ہم نے دوپہر کے بعد کچھ نہیں کھایا۔"

"پھر کیا بات ہے' توبتا کڑی" ماسی نے کہا۔

میں نے شادو کی طرف سے جواب دیا "اس کی طبیعت تو شام سے ٹھیک نہیں ہے۔ یہ دفتر میں بھی بے ہوش ہو گئی تھی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے بڑے محتاط انداز میں پوچھا "برخوردار۔ کسی وجہ کے بغیر بے ہوش ہو جانا تو بڑا سنگین معاملہ ہے۔ تم نے مشورہ نہیں کیا ہے ابھی تک کسی ڈاکٹر سے تو اب دیر مت کرو۔"

ماسی ہیر نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا "نا۔ گاڑی لے کے پھرتے رہتے ہو ادھر ادھر۔ ذرا حالت دیکھ لڑکی کی۔"

ڈاکٹر رانجھا نے سہلایا "خون کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ آنکھیں دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ رنگ بھی پیلا پڑا ہوا ہے۔ ذرا نبض دکھا؟"

"رانجھے۔ تو رہنے دے اپنی ڈاکٹری۔ گھر والوں کو بخش دے خدا کے لیے۔ باہر مار' جتنے بندے مارنے ہیں" ماسی نے کہا۔

"ہے نا عقل کی دشمن۔ اس کی گواہی پر تو مجھے پھانسی ہو جائے کئی بار کہ یہ بندے مارتا پھرتا ہے۔ تیرے گھر کا مارا ہے کوئی؟" رانجھا گرم ہو گیا۔

"وہ سب مرگئے تھے پہلے ہی' قسمت والے تھے۔"

میں نے کہا "مجھے ایک کام سے جانا ہے۔"

ماسی نے چمک کے کہا "پھر جانا ہے؟ تو آیا ہی کیوں تھا نامراد۔ کام کام کیے جاتا ہے۔ کام کا کچھ پتا نہیں چلتا۔"

رانجھا پٹڑی بدل کے ماسی کا ہم خیال ہو گیا "یہ تو خیر مجھے بھی کچھ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بات چھپا رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "وہ... دراصل میرے اپنے مسائل ہیں اور کچھ شادو کی طرف سے بھی پریشانی ہے... ورنہ آپ سے

کیا چھپانا۔"

وہ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے یہ سب کہا ہے مگر اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہ انہیں یہ بتا سکتا تھا کہ شادو کی بیماری کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ کہ اس وقت میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں؟

شادو حالات کا مقابلہ بڑی بہادری سے کر رہی تھی اور ابھی تک اس نے اپنی ذہنی' جسمانی اور اعصابی قوت کو ایک واضح نصب العین اور پروگرام کے مطابق بڑے ڈسپلن کے ساتھ اپنے کنٹرول میں رکھا تھا جو میرے نزدیک انتہائی غیر معمولی بات تھی۔ اس نے بیماری کو زندگی کے توجہ طلب مسائل پر حاوی نہیں آنے دیا تھا اور دنیاوی معاملات کی پریشانی کو بیماری پر اثر انداز نہیں ہونے دیا تھا۔

پہلے مجھے شک ضرور تھا کہ شادو کو اپنی بیماری کی نوعیت کا علم نہیں اور وہ میرے ساتھ اپنی اداکاری سے وہی ڈراما کر رہی ہے جو میں اس کے ساتھ کر رہا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ انجان بن کے خود اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں لیکن اب میرا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ شادو یقیناً اپنے انجام سے واقف ہے اور ایک ناگزیر حقیقت کے ادراک اور اعتراف نے ہی اسے اپنے آپ پر مکمل کنٹرول کی سپر ہیومن طاقت عطا کر دی ہے۔

یہ سمجھ لینے اور طے کر لینے کے بعد کہ اب اس کے پاس کتنا وقت باقی ہے' اس نے کچھ مقاصد کے حصول کے لیے ایک ٹائم ٹیبل مرتب کر لیا ہے اور اب اپنی ساری صلاحیت اور استطاعت کے ساتھ اس ٹائم فریم میں رہتے ہوئے سب کچھ کر رہی ہے۔ مثلاً اس نے طے کر لیا تھا کہ۔

اسے مجھ سے شادی کرنی ہے۔

مجھ سے اپنی بیماری کو آخری وقت تک چھپانا ہے۔

مجھے وعدوں اور قسموں سے پابند کرنا ہے کہ میں اس کی ہر خواہش کو حکم سمجھتے ہوئے قبول کروں اور ہر حکم کی تعمیل کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہوئے اس سے کوئی سوال نہ کروں۔

اس کے بعد اپنا سب کچھ میرے حوالے کرنا ہے۔

پھر دنیا سے رخصت ہو جانا ہے۔

اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے اور موت کے درمیان بالا ہی بالا کوئی معاہدہ ہو گیا تھا کہ جب تک میں اپنے مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتا' اس وقت تک شادو کو جینے کی مہلت عطا ہوتی رہے گی اور چونکہ اس میں دستِ غیب کی تائید شاملِ حال تھی اس لیے سب کچھ پروگرام کے عین مطابق ہو رہا تھا اور موافق حالات خود بخود پیدا ہوتے جا رہے تھے۔

صرف ایک معاملے میں اسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیماری کو مجھ سے چھپا نہیں سکی تھی لیکن اس سے شاید شادو کو فرق نہیں پڑا تھا۔ یہ امکان اس کے ذہن میں ہو گا کہ بالفرض مجھے پتا چل گیا کہ اس کی زندگی بہت محدود ہو گئی ہے تو اسے بھی وہ نوشتۂ تقدیر کی طرح ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کر لے گی لیکن اپنے باقی پروگرام پر عمل درآمد جاری رکھے گی۔ جو ہے سو ہے' جو کرنا ہے سو کرنا ہے۔

اب اس سے زیادہ عذاب میں میری جان تھی۔ میں اس سے کیے ہوئے وعدوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا اور اس کی زندگی کی قسم کھا چکا تھا اور محبت کے نام پر حلف اٹھا چکا تھا کہ اس کی ہر بات مانوں گا اور اس کی کسی خواہش کو کسی عذر پر نہیں ٹالوں گا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ میرا اور اس کا ساتھ بہت تھوڑا ہے' میں زیادہ مجبور اور بے بس ہو گیا تھا اور وہ اپنی من مانی کرتی جا رہی تھی۔

آج مجھے ساری رومانی داستانیں' محبت کی ساری روایتی کہانیاں' عشق کے سارے نظریات و تصورات۔ وہ سب جو محبت کی عظمت اور عشق کی آفاقیت پر شاعروں نے لکھا اور ادیبوں نے فلمی کہانیوں میں ڈھالا۔ ان سب کی حیثیت اس محبت کے سامنے کچھ بھی نہیں جو شادو سے مجھے ملی تھی۔

محبت کے حسین جذبوں اور اپنی رفاقت کی خوب صورت یادوں کے ساتھ وہ مجھ پر تصور میں نہ آنے والے اور امکان کی حد سے باہر نظر آنے والے بے حساب احسانات کا ایک بار گراں چھوڑ گئی اور ناقابلِ فہم قربانیوں سے اس نے میری نظر میں ایک ایسا ارفع مقام حاصل کر لیا جہاں تک میری نظر کی رسائی بھی شرمندگی کے ساتھ تھی۔

جس شادو نے میرے جذباتی اور حقیقی خوشی کے سارے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کو آسان اور ممکن بنایا اور میرے لیے دنیاوی کامیابیوں کے ہر سفر کو منزل کی ضمانت فراہم کی اور عزت' شہرت اور دولت کے خزانوں کے در کھولنے کے لیے مجھے لگن' ہمت اور یقین کی چابی فراہم کی' وہ شادو خود ایک بے حیثیت' بے نسب اور بے آسرا فقیر زادی تھی۔ جو دنیا سے گئی تو خالی دست و خالی دل تھی۔

میں اس رات شادو کو آرام کی تاکید کر کے نیچے اترا تو میرا دل بہت بوجھل تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ مجھے آج رات شادو کے پاس ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے آپ کو خوف اور وحشت کے ہسٹریا سے بچائے رکھنے کے لیے بڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زبردست جدوجہد کی تھی۔ ایک عام' صحت مند عورت بھی ایسے لرزہ خیز قتل کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کرتی تو چیخ مار کے بے ہوشی کی پناہ میں چلی جاتی مگر شادو نے سب کچھ برداشت کیا تھا اور اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا تھا۔

وہ وقت گزر جانے کے بعد اس کے اعصاب کی شکست کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اب اسے رفاقت اور سہارے کی ضرورت تھی لیکن وہ دو مجبوریوں کے دباؤ میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میرے ساتھ جاسکے۔ وہ مجھے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بار بار یہی کہتی رہی کہ دیکھو' اپنا خیال رکھنا۔ جلدی آجانا۔ میری فکر مت کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

شادو کی عالی شان کار چلاتے ہوئے مجھے عجیب سا لگا۔ یہ ہاشمی صاحب کی وہی گاڑی تھی جس میں شادو کے ساتھ میں سہمے ہوئے مفرور مجرموں کی طرح بیٹھ کے کورٹ گئے تھے کہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرائیں پھر اسی کار میں شادو دلہن بنی ہاشمی صاحب کے ساتھ گئی تھی۔ اسی کار میں وہ بجھ سے ملنے اسپتال آئی تھی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اوپر آتی۔ اس کے شوفر نے مجھے جو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا تھا' وہ میں نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا اور میں نے اسے نیچے کار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا تو اس سے سخت نفرت محسوس کی تھی۔

یہ کار اب میرے تصرف میں تھی۔ آدمی کا اس کی اپنی زندگی کے سوا کیا ہے؟ گھر کے مکین بدلتے رہتے ہیں۔ گھر وہی رہتا ہے' چپراسی کی ملازمت پر کل کوئی اور آجائے گا۔ ممکن ہے کل یہ کار میری جگہ کوئی اور چلائے پھر کوئی اور۔۔۔ کھمبے' سڑک' ٹریفک سگنل' ان کو کیا فرق پڑتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ایک دن۔۔۔ اور وہ دن نظر نہ آنے کے باوجود کہیں قریب ہے۔ جب شادو نہیں ہوگی۔ کیسا ہوگا وہ دن؟ میں نے ایک ڈرانے والی ویرانی کے سفاک اکیلے پن کو ہارٹ اٹیک کے درد کی طرح محسوس کرنے کی کوشش کی۔

پیچھے سے کسی گاڑی نے کئی بار لائٹس کا غلیش دیا پھر میں نے ہارن کی آواز سنی اور مجھے غصہ آیا کہ سڑک خالی ہے تو پھر گزرنے والا گزر کیوں نہیں جاتا۔ میں نے رفتار تھوڑی ہی کم کی اور کچھ بائیں طرف ہوا تو ایک سفید کار تیزی سے گزری اور مجھ سے آگے چلنے لگی۔ کار کے فلیشر آن ہوئے اور میرا راستہ روکتے ہوئے کار آہستہ آہستہ رک گئی۔

اسے کوئی عورت چلا رہی تھی۔ جب نیلم باہر آئی تو میں حیران ہوا۔ میں انجن بند کرکے نیچے اترا "نیلم۔ تم کہاں سے آرہی ہو اس وقت؟"

"اسٹوڈیو سے۔ میرا شیڈول تو ایسا ہی ہوتا ہے مگر تم کہاں جارہے ہو؟ یہ گاڑی کس کی ہے؟ بہت شاندار ہے۔"

میں نے کہا "شادو کی ہے۔"

"اور خود شادو کہاں ہے؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"شادو گھر پر ہے اور کہاں ہوگی؟"

"مجھے شک ہوا کہ۔۔۔ کہیں وہ اسپتال میں نہ ہو۔ میں سمجھی تم اسپتال جارہے ہو۔" نیلم نے کہا "کیسی ہے اس کی طبیعت؟"

"جیسی ہونی چاہیے" میں نے افسردگی سے کہا۔

"مجھے تو تمہاری حالت زیادہ خراب نظر آرہی ہے" وہ تشویش سے بولی "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری رفتار کیا تھی؟ دو بار تم بال بال بچے ہو حادثے سے۔۔۔ بچانے والے دوسرے تھے جنہوں نے گاڑی روک لی ورنہ تم سگنل کی پروا کیے بغیر نکلے تھے۔"

میں نے کہا "اچھا! دراصل پہلے بڑی گاڑی چلائی نہیں اس لیے اندازہ نہیں ہوا رفتار کا۔"

"میں نے تو اتفاق سے دیکھ لیا۔ جب تم نے مجھے اوورٹیک کیا پھر مجھے سگنل پر گاڑی روکنی پڑی۔ بڑی مشکل سے پکڑا ہے تمہیں۔ سچ بتاؤ' کیا بات ہے؟ تمہاری حالت تو ایسی ہورہی ہے جیسے برسوں کے بیمار ہو۔"

میں نے کہا "ایسے ہی' وہم ہے تمہارا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ اچھا کہاں جارہے ہو ادھر اکیلے؟"

میں نے کہا "اس وقت تفصیل سے نہیں بتا سکتا۔ ایک ضروری کام ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یہ گاڑی ایک سائڈ پر پارک کرکے لاک کرو اور آجاؤ میری گاڑی میں" نیلم نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"نیلم۔ پلیز' تم اپنے گھر جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں" میں نے چڑ کے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ تم حادثہ کر بیٹھو گے کہیں' چلو میرے ساتھ۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "دیکھو نیلم۔ جہاں میں جارہا ہوں وہاں تمہارا جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ رہی میری بات تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ محتاط رہوں گا۔ ہاں تم کو کچھ کرنا ہے تو شادو کے پاس چلی جاؤ۔ ویسے تو ماسی ہیر اور ڈاکٹر انجم ہیں اس کے ساتھ۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔؟"

"اگر شادو کی طبیعت بگڑ گئی تو وہ کیا کریں گے۔ اس کو تمہاری کمپنی میں کچھ CONSOLATION ملے گی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ وہ جاگتی رہے گی اور پتا نہیں کیا سوچ سوچ کے ڈرتی رہے گی۔"

"یا میرے خدا۔ ایسی کیا پریشانی لاحق ہوگئی ہے بیک وقت تم دونوں کو؟ لڑے تو نہیں ہو آپس میں؟" وہ خفا ہونے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں نیلم۔ جو بات ہے وہ شادو تمہیں بتادے گی۔ ماسی ہیر کو نہیں بتائے گی۔ تم اس سے کہو گی کہ ناصر ملا تھا اور اس نے بھیجا ہے تمہیں۔"

نیلم مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ "کیوں نہ میں اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "وہ نہیں جائے گی۔ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ پھر سیڑھیاں اترے۔۔۔ اور وہ بھی اجازت نہیں دیں گے اس کی۔ ہیر رانجھا اور دیکھو' اسے مت بتانا۔۔۔ کہ میں گاڑی احتیاط سے نہیں چلا رہا تھا۔"

"نہیں بتاؤں گی۔۔۔" نیلم نے سر ہلایا "مگر اب احتیاط کرنا اور جہاں بھی جارہے ہو' وہاں سے فون کردینا ضرور۔"

میں مسکرایا "فکر مت کرو۔ میں خیریت سے پہنچ جاؤں گا۔"

وہ میری بات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے آہستہ آہستہ اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسے ہاتھ ہلایا اور بیک ویو مرر میں دیکھتا رہا۔ اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوئیں پھر گاڑی گھوم کے ایک یوٹرن میں واپس ہوگئی۔

اسپتال پہنچ کے میرا CASUALTY وارڈ میں سخت مصروف ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا۔ حادثات اور واردات کے زخمی اور مرنے والوں کے ہر کیس کے ساتھ بہت سے لوگ آتے ہیں۔ لواحقین' پولیس والے' مدد کرنے والے۔ سب فوری توجہ مانگتے ہیں اور شور کرتے ہیں۔ میری بات کا جواب کون دیتا کہ کچھ دیر پہلے وہاں کسی چپراسی کی لاش آئی تھی جس کے سر میں گولی لگی تھی۔ وہ اب کہاں ہے؟

ایک ڈاکٹر نے جھنجلا کے کہا "یار' یہاں ہر پانچ منٹ بعد کوئی کیس آتا ہے۔"

دوسرے نے کہا "ہمیں کیا معلوم کون چپراسی ہے' کون افسر۔"

ایک اسسٹنٹ نے کہا "میڈیکو لیگل کیس ہے۔ ایم ایل او سے پوچھنا صحیح۔"

میں ڈاکٹروں کے کام میں حارج ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ایمبولینس کے ڈرائیور کو فارغ دیکھ کے میں نے اس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ یقیناً جانتا ہوگا کہ پوسٹ مارٹم کیس کہاں ہوتے ہیں اور میرا خیال صحیح تھا۔ اس نے میری بات پر غور کرنے کے بعد مجھے مشورہ دیا کہ میں مردہ خانے میں جھانک لوں۔

"میاں جی' پوسٹ مارٹم ہوگا تو صبح کے بعد۔۔۔ ابھی رات کے وقت کون سی ایمرجنسی ہے۔" وہ بولا "رپورٹ بھی کل ہی ملے گی۔ بہت جلدی ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "جلدی تو ہے۔"

"تو پھر میاں جی' جتنی جلدی ہے اتنی گریز ڈال دو۔ گریز ڈالنے سے پتا تیز چلتا ہے اور یہ سرکاری پیاوا تو جام رہتا ہے گریز نہ ہو تو۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا مگر گریز کہاں ڈالوں؟"

اس نے سوچ کے کہا "ایک بندہ ہے مگر اس وقت نہیں صبح ہی ملے گا وہ بھی۔ تاج نام ہے اس کا۔"

مجھے مایوسی ہوئی "کیا اس وقت کوئی نہیں ملے گا؟"

"ملے گا۔ سابو ملے گا کہیں ادھر ہی۔ وہ دکھادے گا مردہ خانہ۔ اسے بھی دے دینا کچھ ورنہ۔" اس نے بات کو عمداً ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی ہوسکتا ہے میاں جی۔ لاش ہی نہ ملے صبح تو پوسٹ مارٹم کس کا ہوگا؟"

سابو مجھے ایک برآمدے میں سوتا ملا۔ میں نے سابو کو پچاس روپے دیے جو اس کی توقع سے بہت زیادہ تھے۔ شاید یہ کام دس بیس روپے کا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا پھر اس نے نوٹ جیب میں رکھا "جی تسلی سے دیکھو' آپ اندر۔ جب تک جی چاہے دیکھو۔ کوئی روکے تو مجھے بتادینا" وہ پھر کمبل تان کے برآمدے میں سوگیا۔

مردہ خانے کے اندر شکستہ ٹوٹے پھوٹے بے جان اور لاوارث پڑے جسموں کے چہرے دیکھنا ایک ایسا بھیانک تجربہ تھا جس کے تصور سے آج بھی مجھ پر لرزہ سا طاری ہوجاتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں والے خون میں لتھڑے ہوئے۔ آدھے ادھورے نہ جانے کتنے مگر دے تھے۔ ان میں ایک بچہ بھی تھا اور کچھ عمر رسیدہ عورتوں کے درمیان ایک جوان لڑکی کا بے لباس جسم بھی تھا۔ اندر ایک اعصاب شکن گھٹن اور بدبو تھی۔ مجھے چکر آنے لگے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ کچھ دیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور وہاں رہا تو میں انہی مُردوں کے درمیان گر کے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ چپراسی کی لاش وہاں نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر سابو کو جگایا اور اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے پچاس کا ایک اور نوٹ آگے کر دیا۔ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔

ایک بار پھر میں شعبۂ حادثات میں پہنچا مگر اب ایک راہ نما میرے ساتھ تھا جسے شاید وہاں بلا روک ٹوک آنے جانے کے اختیارات حاصل تھے۔ اس نے کسی سے کچھ کہا پھر مجھے بتایا کہ یہ بندہ رجسٹر نکال کے دیکھ سکتا ہے مگر۔۔۔

میں نے اسے سو کا نوٹ پیش کیا کیونکہ وہ سابو کے مقابلے میں اتنا ہی معزز نظر آتا تھا جتنا چپراسی کے مقابلے میں کلرک ہوتا ہے۔ اس نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے مجھے مزید مشکل میں ڈال دیا۔ چپراسی کی لاش وہاں نہیں لائی گئی تھی پھر شاید میری صورت دیکھ کے اسے رحم آگیا۔ اس نے مجھے بلا معاوضہ ایک مشورہ دیا کہ میں فلاں فلاں اسپتال جانے سے پہلے تھانے والوں سے پوچھ لوں۔ ورنہ میری ساری رات مردہ خانے "پھرولتے" گزر جائے گی۔

مجھے صرف تھانے دار کا نام معلوم تھا۔ شعبۂ حادثات کے باہر پولیس والوں کے نام سن کے غور کیا۔ جائے واردات کا پتا پوچھا اور پھر کہا کہ میں فلاں تھانے کے ڈیوٹی افسر سے پوچھ لوں۔ فلاں تھانے کے ڈیوٹی افسر نے تصدیق کی کہ اس نام کا سب انسپکٹر تو ہوتا ہے یہاں مگر اس کی ڈیوٹی آٹھ بجے ختم ہو چکی ہے۔ وہ مجھے اس کے گھر کا فون نمبر دینے پر تیار نہیں ہوا۔ "کیوں بھئی' آخر تو ہے کون؟ ڈی آئی جی کا سالا بھی آدھی رات کے وقت انچارج صاحب کو نہیں جگا سکتا۔"

میں نے کہا "سالا نہ سہی۔ ڈی آئی جی تو جگا سکتا ہے۔ کیا میں ان سے بات کروں۔ وہ میرے سگے ماموں ہیں۔"

ڈیوٹی افسر کے لہجے نے بتا دیا کہ وہ متاثر نہیں ہوا "آپ کس کی تڑی دے رہے ہو جی مجھے؟ ہمت ہے تو ادھر آ کے بات کرو۔"

مجھے اُس ڈی آئی جی کا نام یاد تھا جس کے ساتھ اسپتال میں میری تصویر اتاری گئی تھی اور یہ تصویر اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس میں وہ مجھے پھول پیش کر رہا تھا۔ میں نے انسپکٹر بشیر چوہدری کی جان بچائی تھی۔ ڈی آئی جی اس کارنامے کی خبر سن کے ایک تیر سے دو شکار کرنے آیا تھا۔ اس نے اپنے محکمے کے ایک افسر کی عیادت کی اور پھر پبلک میں اپنا امیج بنانے کے لیے میرے پاس پریس فوٹوگرافر کے ساتھ آگیا۔ سب کی موجودگی میں ڈی آئی جی نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ کسی کام کے سلسلے میں وقت کے بعد میں اس سے مل سکتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اب شاید وہ مجھے پہچاننے سے بھی قاصر رہتا یا ملنے سے بھی انکار کر دیتا۔

ڈی آئی جی کا نام لیتے ہی ڈیوٹی افسر کا لہجہ اور رویہ بدل گیا "نام کیا ہے تمہارا۔؟ میں ان سے معلوم کرتا ہوں۔"

"کیا واقعی تم جگا سکتے ہو اس وقت ڈی آئی جی صاحب کو؟ ایسا کرو' انسپکٹر بشیر چوہدری کے گھر فون کرو اور اسے جگا کے پوچھو کہ ناصر عظیم کیا واقعی ڈی آئی جی کا بھانجا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ آپ کے کون ہیں؟" ڈیوٹی افسر کی سری سری آواز آئی۔

"کیوں؟ ہمت جواب دے گئی؟ تم تو ڈی آئی جی صاحب سے تصدیق کرنے والے تھے۔ ایک انسپکٹر سے نہیں پوچھ سکتے۔ وہ پوچھیں میرے۔ نام لکھ لو' صبح پوچھ لینا اور اب مجھے انچارج کے گھر کا نمبر بتا دو۔" ظاہر ہے اس کے بعد مجھے نمبر مل گیا۔

میری بات سنتے ہی نیند سے جاگنے والا انچارج گرم ہو گیا "تمہارا دماغ خراب ہے؟"

میں نے کہا "کیا تم نشے میں ہو۔ میں ناصر عظیم ہاشمی اینڈ کمپنی کے آفس سے بول رہا ہوں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ ڈی آئی جی سے میرا کیا رشتہ ہے؟"

"یار ہو گا رشتہ' مجھے کیا؟" وہ بیزاری سے بولا "مجھے کیوں جگایا ہے؟"

"اس چپراسی کی لاش کہاں ہے جسے گلباز خان نے قتل کیا تھا؟ اب یہ مت پوچھنا کہ کون چپراسی اور کون گلباز خان۔ تمہارا بہت مالی نقصان ہو جائے گا۔ تم نے ایک لیگل فرم کے آفس میں بیٹھ کے سودا کیا تھا اور ہم کچا کام نہیں کرتے۔" میں نے اطمینان سے انگریزی میں کہا۔

وہ سنبھل گیا "لاش۔۔۔ ہم نے سنبھلوا دی تھی۔۔۔ ہماری ایمبولینس خراب تھی۔ ایک خیراتی ادارے والے لے گئے تھے۔"

"دیکھو سب انسپکٹر اصغر علی' مجھے لگتا ہے کہ اس کیس میں صبح تمہاری پیشی اتر جائے گی۔ چند گھنٹے کی بات ہے۔ میں صبح ڈی آئی جی کے گھر جا کے اسے سب بتا دوں گا کہ تم نے ایک غریب چپراسی کے قتل کے کیس کو دبانے کے لیے گلباز خان سے کتنی رشوت لی ہے۔ اسے خالی خولی دھمکی مت سمجھنا۔ پوچھو انسپکٹر بشیر چوہدری سے اسی وقت کہ میں ایسا کر سکتا ہوں یا نہیں؟"

وہ کھسیانی ہنسی ہنسا "یار' آخر معاملہ کیا ہے۔ تم اس چپراسی کی لاش کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہو؟"

"مجھے لاش چاہیے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ چاہیے"

میں نے کہا۔

"لاش اس کے گھر پہنچ جائے گی صبح۔"

"اور پوسٹ مارٹم رپورٹ؟"

"وہ شام سے پہلے کہیں مل سکتی" وہ بولا۔

"نہ۔ رپورٹ مجھے دوپہر تک چاہیے۔ تدفین سے پہلے اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے" میں نے کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا "رپورٹ میں حادثاتی موت کا ذکر ہو گا۔"

میں نے کہا "غلطی سے گولی چل جانا ایک حادثہ تھا۔"

"نہیں۔۔۔ میں سڑک پر پیش آنے والے حادثے کی بات کر رہا تھا۔ وہ بندہ کسی نامعلوم گاڑی کے نیچے آگیا تھا۔"

"اچھا؟ گویا اب یہ ہو گئی ہے صورتِ حال" میں نے برہمی سے کہا "گلباز خان نے دی تھی یہ لائن۔ یا تم نے اسے آفر دی تھی۔ تم کیا سمجھتے ہو' ایسا ہو سکتا ہے؟ گلباز خان اپنے ہاتھ سے ہو جانے والے قتل کو ایک روڈ ایکسی ڈینٹ بنا سکتا ہے تمہارے تعاون سے؟ سارے دفتر کے عملے کی گواہی کے باوجود؟"

"میرا خیال تھا کہ تم خود یہ کیس بنانا نہیں چاہتے؟"

"غلط تھا تمہارا خیال" میں نے کہا "اور گلباز خان نے بھی اس کا غلط فائدہ اٹھایا۔ کتنا پیسہ دیا ہے اس نے تمہیں اصغر علی!"

"پہلے تم اس سے بات کر لو۔ آپس میں طے کر لو" سب انسپکٹر اصغر علی پریشان ہو گیا "آخر کرنا کیا ہے؟"

"جو کرنا تھا' وہ ہم بتا چکے تھے مگر تم اس حد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ ایسی دھاندلی نہیں چلے گی تھانے دار صاحب۔ ایک غریب چپراسی کے قتل کو سڑک پر پیش آنے والا حادثہ نہیں بنا سکتے تم۔"

"ذرا ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ قتل کا کیس بنانے سے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ غیر ارادی قتل کا کیس ضرور درج ہو جائے گا مگر مصیبت سب کے لیے ہو گی۔ سب پیشی بھگت بھگت کے پریشان ہوں گے۔ گلباز خان کی ضمانت تو ہو ہی جائے گی کل۔ تم اور تمہاری بیوی عینی شاہد ہو۔ تم خود بھی گلباز خان کو سزا دلوانا نہیں چاہتے۔ باقی عملے کو چھوڑو۔ وہ کسی قانونی معاملے میں نہیں پڑیں گے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ کچھ مدد اس کی تم کر رہے ہو' کچھ گلباز خان کرے گا۔ ان کے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ پانچ دس جو ملیں خدا کا شکر ادا کر کے لے لیں۔ خدا نے ایک موقع دیا ہے۔ اسے ضائع نہ کریں۔ صبر تو آ ہی جائے گا۔ اتنی دولت ساری عمر خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہیں ہو گی" اس نے میرا جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہونے کے باوجود مجھے تھانے دار کی بات عملی طور پر زیادہ قابلِ قبول لگی۔ گلباز خان بہت سینئر وکیل تھا اور بلاشبہ اس کے تعلقات نیچے سے اوپر تک تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران' دوسرے ہم پیشہ وکلا۔ اور جج سب اس کی عزت کرتے تھے۔ اس پر بلا ارادہ ایک چپراسی کے قتل کا مقدمہ قائم ہونے سے اس کی ساکھ متاثر نہیں ہوتی تھی۔ اس چپراسی کے ساتھ گلباز خان کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اس بات کا گواہ آفس کا سارا عملہ ہو گا۔ میں اور شاہد پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ گلباز خان اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی اور چپراسی خواہ مخواہ اس کی زد میں آگیا۔ ایسی غلطی کسی سے بھی ہو سکتی تھی۔ اخبارات میں ایسی خبریں آتی ہیں کہ صفائی کرتے ہوئے ریوالور سے یا بندوق سے چلنے والی گولی نے گھر کے کسی فرد کی جان لے لی۔ باپ کے ہاتھوں بیٹا مارا گیا یا بھائی کے ہاتھوں بھائی کا خون ہو گیا۔

کوئی بس یا ٹرک کے نیچے آجائے تو ڈرائیور پر قتلِ عمد کا نہیں غیر ارادی قتل کا مقدمہ بنتا ہے اور اگر قانون کے طویل پے چیدہ عمل سے گزرنے کے بعد بھی مقدمہ باقی رہے تو سیشن کورٹ سے تین سال کی سزا ہو جاتی ہے۔ عام طور ملزم اتنا عرصہ پہلے ہی جیل میں کاٹ چکا ہوتا ہے۔ فیصلے کے ساتھ ہی اسے رہائی مل جاتی ہے۔ نوّے فیصد یا زیادہ مقدمات میں مرنے والے کے لواحقین اسے کب کے بھول چکے ہوتے ہیں اور مقدمے کی ہر سماعت پر پیشی سے اتنے عاجز آجاتے ہیں کہ وہ بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جان چھوٹی۔

پھر گلباز خان پر غیر ارادی قتل کا مقدمہ دائر کرنے سے کیا ہو گا؟ چپراسی کے گھر والوں کو پریشانی کے سوا کیا حاصل ہو گا؟ سب انسپکٹر اصغر علی کا مشورہ درست تھا کہ اسے قتل کے بجائے حادثے کا نام دے دیا جائے تو لواحقین کا کچھ بھلا ہو جائے گا۔ گلباز خان نہیں چاہے گا کہ اس کا نام کسی ایف آئی آر میں آئے اور کسی زرد صحافت کو فروغ دینے والے اخبار کی شہ سرخی بنے۔ "مشہور وکیل کے ہاتھوں بے گناہ چپراسی کا قتل" اور دردناک پیرائے میں بیان کی جانے والی تفصیلات کے ساتھ لاش پر بین کرتے ہوئے اہلِ خانہ کی تصویر کے ساتھ قاتل کی تصویر بھی شائع ہو۔ یہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے وہ پانچ لاکھ بھی ادا کر دے تو اس کے لیے بڑی رقم نہیں مگر چپراسی کے گھر والوں کے لیے یقیناً اہمیت رکھتی ہے۔ قتل کے مقدمے میں گلباز خان کو کچھ نہیں ہو گا مگر چپراسی کے گھر والوں کا نقصان ہو جائے گا۔

گاڑی میرے پاس تھی اور اب میرے ذہن میں کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنفیوژن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے ایک جگہ چائے پی۔ وہیں سے شاہد کو فون کیا۔ ریسیور نیلم نے اٹھایا۔ "کہاں ہو تم؟"

میں نے کہا "گھر سے بہت دور۔ تم نے کہا تھا اس لیے فون کیا ہے۔"

وہ بولی "شاہد کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اسے تیز بخار ہے۔"

میں نے کہا "اسے ڈاکٹر نوید کو بلا کے دکھاؤ۔ یا اسپتال لے جاؤ اگر ضروری ہو۔"

"شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ تم کب تک آؤ گے؟"

میں نے کہا "مجھے دیر لگے گی۔ صبح ہو جائے گی۔"

"یہ کام اتنا ضروری تھا؟" وہ بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "ضروری نہ ہوتا تو میں شاہد کو چھوڑ کے جاتا۔ اچھا ہے کہ تم ہو اس کے پاس۔"

"اس نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہی پڑے گا۔"

"پلیز نیلم! دیر مت کرو" میں نے کہا "میں فراغت ملتے ہی سیدھا تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

رات کے دو بجے کے بعد میں نے چپراسی کی لاش دریافت کر لی۔ وہ ایک لاوارث لاشوں کو ٹھکانے والے والے بدنام فلاحی ادارے کے مردہ خانے میں پڑی تھی۔ اس کے منتظم ایک ایسے گروہ کے افراد بتائے جاتے تھے جو لاشوں کی سپلائی کے ٹھیکے دار تھے اور ہڈیاں بھی فراہم کرتے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ وہ انسانی جسم کے قابلِ استعمال حصے منتقلی کے لیے ضرورت مندوں کو بیچتے تھے۔

منیجر کے کمرے میں ایک بالشت لمبی داڑھی والا ایک شخص میز پر خود ہی ایک لاوارث لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے جگائے جانے پر خاصی ناگواری کا اظہار کیا مگر پھر مجھے کولڈ اسٹوریج میں لے گیا۔ یخ بستہ ماحول میں بہت سی ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی منجمد لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں کچھ واقعی لاوارث تھیں مگر کچھ ایسی بھی تھیں جو وہاں لواحقین نے امانتاً رکھوائی تھیں۔

"یہ لاش یہاں کیسے آئی؟" میں نے چپراسی کی لاش پہچان کے کہا۔

"کیسے آئی؟ ظاہر ہے کوئی لایا۔ لاش خود تو آ نہیں سکتی۔"

"مگر اسے یہاں کون لایا؟ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بھئی ہماری ایمبولینس میں ڈرائیور لے کر آیا' سڑک پر مرا پڑا تھا کہیں۔ کسی نے فون پر ہمیں بتایا' ہم اٹھا لائے" مولانا نے کہا "یہی کرتے ہیں ہم۔"

"اس کا پوسٹ مارٹم وغیرہ نہیں ہو گا؟"

"وہ پولیس کی مرضی۔"

"اسے لاوارث بھی قرار دے دیا آپ نے فوراً؟"

وہ مشتعل ہو گیا "کیا مطلب ہے فوراً کا آخر؟ اس کی شناخت نہیں ہوئی۔ جیب میں سے کچھ نہیں ملا۔ ابھی تک کوئی پوچھنے نہیں آیا تھا تو ہم اور کیا کرتے؟ ہم تین دن انتظار کرتے ہیں۔"

"اور اس کے بعد؟" میں نے کہا۔

"دفنا دیتے ہیں۔ کفن دے کر مگر تم یہ جرح کیوں کر رہے ہو۔ تم اس لاش کے لیے آئے ہو یا میرا انٹرویو کرنے۔ کیا تم اخبار والے ہو؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں شام سے مردہ خانوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ اب ملی ہے یہ لاش۔ یہ چپراسی تھا ہاشمی اینڈ کمپنی میں۔"

"ہاشمی اینڈ کمپنی۔ کیا کاروبار ہے ان کا؟"

میں نے کہا "لیگل فرم ہے۔ وکیلوں کی کمپنی ہے۔"

"تم وکیل ہو گویا؟"

میں نے کہا "میں مالک ہوں اس کمپنی کا۔"

اس کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "ماشاء اللہ۔ آپ کو خدا جزائے خیر دے۔ مرحوم کے لواحقین کا پتا ضرور جانتے ہوں گے؟"

میں نے اسے پتا لکھنے کو کہا "لاش صبح اس پتے پر بھجوا دیں۔ لیکن اس حالت میں نہیں' صاف کر کے اور کفن وغیرہ دے کے۔"

"اس کے اخراجات۔؟"

میں نے اخراجات ادا کر دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ پوسٹ مارٹم کے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ رپورٹ بعد میں ہم خود براہِ راست لے لیں گے۔

ایک طویل فاصلہ طے کر کے میں ایک غریبانہ بستی میں پہنچا جہاں وہ چپراسی اپنے ہی جیسے معاشی بدحالی کی سب سے نچلی سطح پر جینے والوں کے ساتھ رہتا تھا۔ گلیوں میں اندھیرا تھا اور ایسے علاقے میں دن کے وقت میری شاندار گاڑی دیکھ کے لوگ بہت مرعوب ہوتے مگر اس وقت مجھے راستہ بتانے والا بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک جگہ ٹوٹی پھوٹی سڑک بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ختم ہوگئی تو مجھے گاڑی روک کے پیدل جانا پڑا۔

میں نے بہت سے دروازے بجائے اور لوگوں کو جگا کے پتا پوچھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس علاقے میں پہلی بار آنے کے باوجود میں اس جگہ سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے دور ہی سے اندازہ ہوگیا کہ وہ مصیبت زدہ گھر کون سا ہوگا۔ وہاں لوگ جاگ رہے تھے اور صبح ڈیوٹی پر جانے شام کو لوٹ آنے والے کا آج اچانک لاپتا ہوجانا گھر والوں کے لیے باعثِ تشویش تھا۔

دو افراد گھر کے دروازے کے باہر گلی میں کھڑے کچھ مشورہ کررہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اندر چلا گیا اور دوسرا میری طرف آیا۔ وہ تیسرے گھر کے دروازے میں داخل ہونے لگا تو میں نے اسے اشارے سے روک لیا۔

میں نے کہا "یہ گھر اسی چپراسی کا ہے جو وکیلوں کے ساتھ کام کرتا ہے؟"

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا "ہاں۔ آپ کون ہو؟"

"میں۔۔۔ میں بھی وہیں کام کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"آج وہ گھر نہیں لوٹا۔ گھر والے بہت پریشان ہیں سب" پڑوسی نے کہا۔

میں نے کہا "ابھی آپ جس سے بات کررہے تھے' وہ کون تھا؟"

"اس کا بھائی۔ وہ خود کہاں ہے؟"

میں نے کہا "میں کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔"

پڑوسی گھبرا گیا "کیا ہوا ہے اسے؟"

میں نے کہا "اسے ایک حادثہ پیش آگیا تھا۔ میں یہی خبر اس کے گھر والوں کو سنانا چاہتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے بات کروں؟"

"وہ زندہ تو ہے نا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "آئی ایم سوری۔ یہ خبر اچانک اس کے بیوی بچوں کو ملے گی تو ظاہر ہے انہیں بہت صدمہ ہوگا۔ آپ ذرا اس کے بھائی کو بلا لائیں تو میں اسے سمجھا دوں۔"

پڑوسی بہت دکھی نظر آنے لگا۔ "بے چارے رات گیارہ بارہ بجے تک تو انتظار میں بیٹھے رہے کہ شاید دفتر میں کام سے رک گیا ہو۔ بعض اوقات اسے دیر ہوجاتی تھی تو وہ اپنی بہن کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن وہ گھر پر اطلاع کردیتا تھا؟"

"فون کردیتا تھا؟"

اس نے سر ہلایا "فون یہاں کہاں جی۔ اُدھر گلی کے آخر میں ایک دکان پر ہے۔ وہ پیسے لے کر فون کرنے دیتا ہے۔ وہاں پیغام مل جاتا تھا تو کوئی گھر آکے بتا جاتا تھا۔ وہ پان سگریٹ کی دکان ہے۔ بارہ بجے سے پہلے ہی بند ہوگئی۔ اب یہی سوچ رہے تھے سب کہ کیا کریں۔ کس سے معلوم کریں۔ دفتر میں تو کوئی نہیں ہوگا اس وقت۔ خیر میں اس کے بھائی کو بلاتا ہوں۔"

مرنے والے کا بھائی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ اب ذمے داری اسی کے کندھوں پر ہے۔ میت صبح آجائے گی۔ تدفین اور سوئم وغیرہ سے فارغ ہوکے آفس آجانا۔ تمہارے لیے بھائی کی جگہ ملازمت کی بات ہوگئی ہے اور اگر مرنے والے کا بیٹا بھی کچھ کرنا چاہے تو چھوٹی موٹی نوکری اسے بھی مل سکتی ہے۔

وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا "آپ کی مہربانی ہے جناب۔ بھائی نے بڑی کوشش کی میرے لیے مگر مجھے نوکری نہیں ملی۔"

"چلو اب وہ اپنی جگہ دے گئے ہیں تمہیں' تم کام کرو۔"

"آپ کو انشاء اللہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ اب رونا دھونا بھول گیا تھا۔ "مجھے تنخواہ کیا ملے گی۔ وہی جو بھائی کو ملتی تھی؟ اور اس کے بیٹے کو بھی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ میرا خیال ہے۔ اس کے علاوہ مالک کچھ تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کی قیمت کوئی نہیں لگا سکتا لیکن مرحوم کی خدمات کے بدلے میں کمپنی فیملی کی مدد کرے گی۔"

"کتنی مدد کرے گی جناب!" وہ چوکنا ہوگیا۔

میں نے کہا "چار پانچ لاکھ نقد دینے کی بات ہوئی تھی۔ یا کوئی مکان خرید کے دے دیا جائے۔"

"چار پانچ لاکھ۔۔۔ نقد!" اس نے بے یقینی سے دہرایا "ٹھیک ہے جی۔ آپ نقد ہی دے دینا۔ اتنے بڑے مکان کا کیا کریں گے ہم' یہ گھر کافی ہے۔"

میں نے کہا "جیسا فیملی چاہے گی ویسا بندوبست ہوجائے گا۔"

"فیملی کیا جی۔ بڑا تو اب میں ہی ہوں گھر میں" وہ بولا "میں ہی سنبھالوں گا سب کو۔ آپ مجھے دلوا دینا۔ بھابی بے چاری عورت ذات۔۔۔ ویسے بھی ان پڑھ ہے اور لڑکا ابھی کیا ہے' میٹرک پاس کرلیا ہے مگر بچہ ہی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ چار پانچ لاکھ کے ذکر نے بھائی کی موت کا صدمہ غیر اہم کردیا ہے۔ اب اس کے لیے اتنی بڑی دولت کا حصول زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے وہ گھر کا بڑا بھی

بن گیا ہے۔ اس کی بھابی بے وقوف اور جاہل عورت رہ گئی ہے اور اس کا بیٹا جو اسی کے ساتھ ملازمت کرتا' اب بچہ ہوگیا تھا۔

اس کے پڑوسی نے دبے دبے لہجے میں ایک مخلصانہ مشورہ دیا "ابے نقد رقم اڑ جائے گی پر لگا کے۔ نقصان بھی ہوسکتا ہے کوئی۔"

"کیوں ہوگا نقصان۔ بزنس کرسکتے ہیں ہم" وہ تیز ہوکے بولا۔

"پہلے کبھی کیا ہے بزنس۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی بزنس کرنا۔ کوئی بڑا دو منزلہ مکان لے لو۔ کرایہ آئے گا ہر مہینے۔"

وہ گرم ہوگیا "یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے جی' ہم کرلیں گے جو کرنا ہوگا۔"

"میں تمہارے بھلے کی بات کررہا تھا۔ تم دونوں نوکری کروگے تو بزنس کون کرے گا۔ دونوں کی تنخواہ ہوگی اور مکان کا کرایہ ملے گا تو۔۔۔" پڑوسی نے میری طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا "کیوں جی' میں غلط کہہ رہا ہوں؟ رہنے کو یہ مکان کافی ہے تو دوسرا کرائے پر اٹھا دو۔"

"آپ اس کی بات مت سنیں جی۔ میں انشاء اللہ کل نہیں تو پرسوں شام آپ کے دفتر آجاؤں گا۔" نوجوان میرے ساتھ چل پڑا "آپ نے غلطی کی کہ اس آدمی کے سامنے پیسوں کا ذکر کیا۔ یہ سارے میں پھیلا دے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو احساس ہورہا ہے کہ اس وقت چار پانچ لاکھ کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔ اگر یہ بات سب کو معلوم ہوتی ہے تو ہوجائے۔ ہم کوئی غلط کام تو نہیں کررہے ہیں۔"

وہ جلدی سے بولا "یہ بات نہیں جناب۔ سو حاسد بھی ہوتے ہیں' میں نمٹ لوں گا سب سے۔ یہ گھر اب میرا ہے۔"

میں نے کہا "مگر ابھی تو تم جاؤ' پہلے گھر میں بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔"

میرے لہجے نے اسے کچھ شرمندہ اور بے حوصلہ کیا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کے واپس چلا گیا۔ ابھی میں گلی کے موڑ تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ میں نے اس گھر سے عورتوں' بچوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سنیں۔ مجھے بہت دکھ ہوا مگر اس سے زیادہ دکھ مجھے اس شخص کے رویے سے ہوا تھا جو مرنے والے کا بھائی تھا۔ وہ تو بھائی کی موت کو قسمت کی لاٹری کا انعام سمجھ کے ساری دولت ہتھیانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ وہ بیوہ بھابی اور اس کے یتیم بچوں کا حق مارنا چاہتا تھا۔ غم کے جذبات انتہائی سطحی اور مصنوعی ثابت ہوئے تھے۔ اندر سے وہ خوش تھا کہ دو سال کی بے روزگاری کے بعد اسے اتنی اچھی نوکری مل گئی اور نوکری کے ساتھ اتنی بڑی دولت کے تصور نے اس کے دماغ میں ایک شیطانی اور سازشی چکر چلا دیا تھا۔

میں گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ اندھیرے سے اس کا پڑوسی نمودار ہوا۔ "ایک منٹ جناب!" وہ ہانپتا ہوا میرے قریب آیا۔

میں نے کہا "بھائی' یہ کہنے آئے ہو کہ میں مرحوم کے بھائی کو کچھ نہ دوں؟"

"اللہ بھلا کرے آپ کا۔" اس نے سکون کا سانس لیا "جو رہتا ہے جی' اس کے بیوی بچوں کے سوا کسی کو مت دینا۔ یہ حرام خور نہ کام کا نہ کاج کا' سب لے کے بھاگ جائے گا۔ اس نے کبھی آج تک کام نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم تسلی رکھو۔ مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ تمہارا مشورہ بالکل ٹھیک تھا۔ ہم نقد کسی کو نہیں دیں گے۔ مرحوم کی بیوہ کے نام کوئی مکان کردیں گے جس کی آمدنی سے اس کا گزارہ ہوتا رہے۔ اور اگر اسے اس گھر سے نکال دیا جائے تو اس کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہو۔ شرافت سے نوکری کرے تو بھائی اپنی تنخواہ میں رہ سکتا ہے۔"

پڑوسی مطمئن ہوکے اور مجھ سے ہاتھ ملا کے لوٹ گیا۔ واپس جاتے ہوئے میرے جذبات کچھ اور ہوگئے تھے۔ اس غربت اور افلاس کے مارے طبقے میں زندگی بڑی ہی بے وقعت چیز تھی اور رشتوں کی آبرو کا مول بہت کم تھا۔ کیا پتا یہی بات میں مرنے والے کی بیوی سے کرتا تو اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔ کیا وہ بھی بیوگی کا غم بھول کے اس دولت کے خوش آئند تصورات میں گم ہوجاتی جس کا وہ اپنے شوہر کی زندگی میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اللہ جنت نصیب کرے تمہیں۔ زندگی میں تو غربت کی سختی اور مہینے کی لگی بندھی تنخواہ کے سوا کچھ نہ دیا۔ مرگئے تو لاکھوں دے گئے ہیں۔ پھر اتنی دیر کیوں کی تم نے مرنے میں مُنّے کے ابا!

میں نے سر سے ان فضول خیالات کو جھٹک دیا۔ اگر بھائی لالچی اور کمینہ تھا تو ضروری نہیں کہ بیوی بھی ایسا ہی اندازِ نظر رکھتی ہو۔ عورت کے لیے اس کے سہاگ سے بڑھ کے دنیا کی کوئی چیز نہیں۔ دولت باپ کی شفقت اور محبت کا نعم البدل کیسے فراہم کرسکتی ہے۔

اب صبح کی اذان ہونے والی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ واپسی میں تھانے جا کے گلباز خان سے ملوں گا مگر اب وہ معاملہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی غتربود ہوگیا تھا۔ گلباز خان نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میں یا شادو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرکے اسے سزا دلوانے کے موڈ میں نہیں ہیں اور یہ بات موقع شناس سب انسپکٹر نے بھی سمجھ لی تھی چنانچہ تھانے میں عزت و آبرو کے دوسرے معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ گلباز خان نے غیر ارادی قتل کے الزام کو بھی حرفِ غلط کی طرح مٹادیا اور یہ ایک روڈ ایکسی ڈنٹ کا کیس ہوگیا۔ ظاہر ہے اپنے دامن کو بے داغ رکھنے کی گلباز خان نے منہ مانگی قیمت ادا کی ہوگی اور پھر آرام سے گھر جاکے سوگیا ہوگا۔

دفتر میں ماتحت عملے کا نقطۂ نظر بھی ہرگز گلباز خان کے خلاف انتقامی نہیں ہوسکتا تھا۔ چپراسی کے لیے ہمدردانہ جذبات ایک فطری بات تھی۔ کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی کہ گلباز خان کو اس قتل کی قانونی سزا ملے۔ سب یہی چاہیں گے کہ چپراسی کے لواحقین کو فراخ دلی سے معاوضہ ادا کردیا جائے۔ وہ ہم کررہے تھے۔ دفتر سے خون آلود قالین اور قتل کے سارے سراغ مٹائے جاچکے تھے چنانچہ سب ٹھیک تھا۔ بس ایک چپراسی نہیں رہا تھا تو اس کی جگہ دوسرے کا بندوبست بھی ہوگیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے نئے قالین کا۔

میں واپس گھر پہنچا تو مجھے "ہیر کلینک" کے سامنے یا اس کے قریب کہیں بھی نیلم کی گاڑی نظر نہ آئی۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ شادو کو اپنے ساتھ اسپتال لے جاچکی ہے۔ اذان ہوچکی تھی۔ اوپر کی لائٹ جلتی دیکھی تو میں سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ماسی ہیر ایک کونے میں نل کی ٹونٹی کھولے وضو کررہی تھی۔ میرے سلام کا جواب دینے کے اس نے کہا "یہ تو نہیں پوچھوں گی میں کہ ساری رات کہاں گھجل خوار ہوکے آیا ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ کیوں نہیں پوچھوگی؟"

"کیا فائدہ۔ تو بتائے گا نہیں یا جھوٹ بولے گا۔" وہ مجھ سے خفا تھی۔

میں نے پیچھے سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں "کبھی بچے ماں کو خوش رکھنے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اس لئے دکھ دینے والا سچ نہیں بولتے۔"

وہ میرے ہاتھ جھٹک کے کھڑی ہوگئی "بکواس مت کر میرے سامنے۔ نہیں بتاتا تو مت بتا۔"

میں نے کہا "ماسی ہمارے دفتر کا ایک چپراسی حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ مجھے اس کی لاش نکلوانی تھی مردہ خانے سے اور اس کے گھر پہنچانی تھی۔ اب مجھے بتاؤ یہ سب جان کے تمہیں دکھ ہوتا یا نہیں۔ تم دس سوال کرتیں کہ بندہ کون تھا؟ کیسے ہوگیا ایکسی ڈنٹ۔ کہاں رہتا تھا اس کے کتنے بچے ہیں۔ میرے پاس وقت نہیں تھا یہ سب بتانے کے لیے۔ ادھر شادو کی طبیعت خراب تھی۔"

وہ متفکر ہوگئی "کیا اسے بتادیا تھا تو نے؟"

"ماسی۔ اس کے دفتر کا چپراسی تھا۔ اسے پہلے معلوم ہوا' وہ خود جانا چاہتی تھی' میں نے روک دیا۔ اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ نیلم لے گئی ہے اپنے ساتھ۔"

"طبیعت کیسی تھی اس کی؟" میں نے کہا۔

"اچھی نہیں تھی۔ بخار تیز ہوگیا تھا۔ نیلم کہہ رہی تھی کہ اسپتال میں داخل کرائے گی۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ آخر مجھ سے کیوں چھپاتے ہیں ہر بات' سارے لوگ مل کے۔"

"تم سے کوئی بھی نہیں چھپاتا کوئی بات۔"

"یہ غلط ہے۔ نیلم نے بھی مجھے نہیں بتایا۔ میں ساتھ جانا چاہتی تھی تو مجھے روک دیا۔ آخر۔ ایسی کیا بیماری ہے شادو کو۔ بخار تو اتر جاتا۔ رانجھے نے کہا کہ ڈاکٹر کو گھر بلالیں مگر نیلم نے کہا کہ آپ تکلیف مت کریں۔ لو جی' اب ہم کو بیٹا کچھ نہیں بتاتا' ہو کچھ نہیں کہتی۔ اور وہ نیلم کہتی ہے کوئی فکر کی بات نہیں پھر اسپتال کیوں لے گئی ہے اسے داخل کرانے؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "یہ بھی پتا چل جائے گا تمہیں ماسی' یہ بات کب تک چھپائی جاسکتی ہے آخر۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "ناصر۔ ایسی کیا بات ہے پتر؟"

میں نے کہا "تم نماز پڑھ لو۔ میں آتا ہوں شادو کو دیکھ کے۔"

اس نے میرا بازو پکڑلیا "نہیں۔ نماز میں قضا پڑھ لوں گی۔ تو ایسے آدھی بات کرکے مت جا' میرا دل ڈول گیا ہے۔"

"اچھا میں نہیں جاتا۔ تم نماز پڑھو۔ میں فون پہ بات کرلیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

باتوں کی آواز سے ڈاکٹر رانجھا بھی اٹھ کے آگیا۔ اس وقت ماسی نے نیت باندھ لی تھی اور میں اسپتال کا نمبر ڈائل کررہا تھا۔ وہ میرے پاس خاموش بیٹھ گیا۔

اسپتال میں فون کا ریسیور خود نیلم نے اٹھایا "ناصر کہاں ہو اس وقت تم۔ تمہیں یہاں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں آتا ہوں ابھی آدھے گھنٹے میں۔ شادو کی حالت کیسی ہے؟"

"اسے داخل کرلیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے کہ سینے میں کچھ INFECTION ہے۔ کنٹرول ہوجائے گا۔ ڈاکٹر نوید یہی بات کررہے تھے کہ ان کو نرس بلا کے لے گئی۔ ان کی وائف انجم بھی ہے شادو کے پاس۔"

"وہ ہوش میں تو ہے نا؟"

"نہیں۔ جب میں اسے یہاں لائی تو ہوش میں تھی مگر یہاں پہنچ کے بے ہوش ہوگئی۔ اس کی کنڈیشن پہلے کے مقابلے میں بہت خراب ہے ناصر۔"

میں نے کہا "کنڈیشن تو خراب ہی ہوگی روز بروز۔ اس میں کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی بتادیا تھا۔ یہ بتاؤ فوری خطرے کی کوئی بات تو نہیں ہے؟"

"ڈاکٹر نوید نے یہی کہا ہے۔ اب پتا نہیں مجھے مطمئن کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہو تو۔ تم آجاؤ جتنی جلدی آسکتے ہو۔"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں۔ اور نیلم۔ تھینک یُو!"

"فضول باتیں مت کرو" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ڈاکٹر رانجھا غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظروں سے مجھے دیکھتا رہا "یہ کیا معاملہ ہے پُتر۔ اپنی شادو کا کوئی سیریس مسئلہ ہے؟"

میں نے ماسی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی سجدے میں گئی تھی "ایسا ہی ہے کچھ معاملہ ڈاکٹر رانجھا۔ آپ نے کچھ اندازہ کرلیا ہوگا۔"

"او یار' ہم کیسے اندازہ کرسکتے ہیں لیکن تمہاری شکل دیکھ کے اور شادو کی حالت دیکھ کے شک ہوتا ہے۔۔۔ خدا نخواستہ۔۔۔ خدانخواستہ۔"

میں نے کہا "آپ کا شک درست ہے۔ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے گھبرا کے باہر دیکھا "آہستہ بول۔ کیا کہا تو نے؟"

میں نے کہا "بلڈ کینسر۔۔۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ لندن کے ڈاکٹروں نے اسے چھ مہینے کا ٹائم دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال۔ پانچ مہینے سے زیادہ گزر گئے ہیں۔"

ڈاکٹر رانجھا سپاٹ مفلوج چہرے کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "یہاں بھی بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔"

"کسی کی قابلیت نہیں۔ کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے شادو کو۔"

"کیا۔۔۔ شادو کو پتا ہے؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے بھی شک ہے کہ وہ جانتی ہے کیونکہ جو کچھ وہ کررہی ہے' جانتے بوجھتے کررہی ہے۔۔۔ اس نے بڑی جلدی میں شادی کی مجھ سے۔۔۔ مجھے شادی کے بعد پتا چلا۔ کسی اور نے بتایا۔۔۔ اس کے بعد شادو نے مجھے اپنی قسم دے دی کہ میں اس کی ہر بات مانوں گا۔۔۔ میں انکار کیسے کرتا اسے۔"

"یہ تو بہت ہی افسوس ناک بات ہے" وہ بولے۔

ماسی نے سلام پھیرا اور چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تو میں نے اپنی بات جاری رکھی "اس سے کیا فرق پڑسکتا ہے مجھے یا خود اسے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کررہا ہوں کہ اسے خوش رکھوں۔ وہی کروں جو وہ چاہتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو بہت سی باتوں پر اعتراض ہوگا کہ میں ایسا کیوں کررہا ہوں۔ مثلاً یہ کہ میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔ چھوٹی ہے اور بہت معمولی ہے۔ میرا اپنا گھر ہے مگر میں کوٹھی میں جاکے رہتا ہوں۔ شاید مجھے یہ شاندار گاڑی اور عالی شان کوٹھی اچھی لگتی ہے۔ ایسا نہیں ہے لیکن شادو کا اصرار ہے کہ جو میرا ہے وہ اس کا ہے اور اس کی ہر چیز میری ہے۔"

"ویسے تو اس کی بات ٹھیک ہے۔"

"لوگ بھی یہی سمجھتے ہوں گے۔ کیا پتا آپ کے دل میں یہی خیال آیا ہو۔ کہ مجھے لالچ تھا۔ میں نے شادو سے اس کی دولت کے لیے شادی کی۔ میں کسی کے سامنے صفائی پیش نہیں کروں گا' سوائے آپ کے۔"

"کوئی ضرورت نہیں صفائی پیش کرنے کی۔"

میں نے کہا "شادو کے پاس جب کچھ بھی نہیں تھا' وہ ایک فقیرزادی تھی تب بھی اس سے شادی کرنے کے لیے میں نے جان کی بازی لگادی تھی۔ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ آج بھی وہ میرے لیے شادو ہی ہے۔ کل بھی میں اس کے ایک اشارے پر اپنی جان تک قربان کرسکتا تھا۔ پھر آج میں اسے کیسے انکار کروں۔ وہ کہتی ہے کہ تم میرے شوہر ہو۔ میرے جسم و جاں کے مالک ہو۔ میں تمہاری ہوں تو پھر میری دولت جائداد کیا چیز ہے۔ اس کے مالک بھی تم ہی ہو۔ میرے سارے معاملات کے ذمے دار تم ہو۔ سب کچھ تمہیں سنبھالنا ہے۔ مجھے بھی اور میرے کاروبار کو بھی۔ اب آپ بتاؤ' میں انکار کیسے کروں۔ اس صورتِ حال میں جبکہ مجھے اس کو خوش رکھنا ہے اور میں اس سے عہد کرچکا ہوں' اس کے سر پر ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھ کے قسم کھا چکا ہوں کہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ جانتے بوجھتے اس نے مجھے قسموں وعدوں کے جال میں ایسا باندھا ہے کہ اب انکار ناممکن ہے۔ انکار سے اسے دکھ ہوگا۔ کل شام وہ مجھے اپنے آفس لے گئی تھی۔"

"آفس میں تو وکیل ہوتے ہیں سارے۔"

"ہاں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس آفس میں بیٹھوں مگر میں نے کہا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں۔ ابھی میں صرف میٹرک پاس ہوں۔ خود شادو کی تعلیم بھی اتنی ہی ہے۔ ہاشمی صاحب کی بیوی کی بات اور تھی۔ مالکن وہ آج بھی ہے مگر اسے قانونی معاملات اور دفتری امور کا کیا پتا۔ میں نے اسے کہا کہ وکیلوں کی یہ کمپنی بیچ دے۔ اس وقت جو سب سے سینئر وکیل ہے وہ ہاشمی صاحب کا پارٹنر تھا۔ وہ کمپنی کو خوشی خوشی خرید لے گا۔ پھر وہ اکیلا مالک ہوجائے گا۔ یہ بات کل طے ہوجاتی کہ ایک بڑا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔"

"کیا ہوگیا آخر؟"

"بس۔۔۔ ہونے والی بات تھی۔ جسے ہم کمپنی دینا چاہتے تھے' اس وکیل کے ہاتھوں ایک قتل ہوگیا۔"

"ہائے میں مرگئی" ماسی نے اندر آتے ہوئے چیخ ماری اور چائے کی ٹرے اس کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچی "کس کا قتل ہوگیا؟"

میں نے ٹرے پکڑلی "میرا نہیں ہوا' تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی "تو کسی وکیل کی بات کررہا تھا؟"

میں نے کہا "ماسی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میری طرف سے کچھ بدگمان ہو۔ یہ سمجھتی ہو کہ شادی کے بعد میں پہلے والا ناصر نہیں رہا۔ ایک ساس کی طرح تم شادو سے جلتی ہو کہ میں اس کی خوشی کی خاطر تمہیں نظرانداز کرتا ہوں۔ تم سے جھوٹ بولتا ہوں۔"

"اللہ نہ کرے کہ میرے دل میں شادو کے لیے کوئی بات ہو۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ تم خوش رہو۔ اسی میں خوشی ہے ہماری مگر تم بھی خوش نہیں ہو۔ پتا نہیں کیا پریشانی لیے پھر رہے ہو۔ کچھ بتاتے بھی نہیں۔"

میں نے کہا "ماسی ایک تو شادو کی بیماری ہے۔"

"ہائے او میرا ربا۔ ایسی کیا بیماری لگ گئی ہے اسے جس کا علاج نہیں۔ بیمار ہے تو ٹھیک ہوجائے گی" وہ خفگی سے بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ بس تشخیص نہیں ہورہی تھی پہلے بیماری کی۔۔۔ پتا چل گیا ہے کہ ٹائیفائڈ ہے" میں نے راجھا کی طرف دیکھا۔

"بہت ٹائم لگتا ہے بندے کو بالکل ٹھیک ہونے میں۔ علاج بھی ہے اور احتیاط بھی ضروری ہے" وہ بولا۔

"ٹائیفائڈ کی فکر نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بعض اوقات اس کے نقصانات بعد میں ہوتے ہیں۔ جوڑوں کا درد' بہرا پن' بال گر جانا۔"

"اللہ اپنا فضل کرے گا پُتر۔ دل میں وہم مت لا۔" ماسی نے کہا "تو کس کے قتل کی بات کررہا تھا؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ تم جانتی ہو کہ شادو ایک کمپنی کی مالک ہے اور وہ وکیلوں کی کمپنی ہے۔"

"ہاں۔ وہ ہاشمی صاحب وکیل تھا' اسی کی کمپنی تھی۔"

"وہ تو مرگیا۔ اب شادو ہے مالکن اور اس کے ساتھ دوسرا شریک ہے ایک وکیل گلباز خان۔ شادو چاہتی تھی کہ کمپنی میں ہاشمی صاحب کی جگہ میں بیٹھوں' سارے معاملات کو سنبھالوں مگر میں نے انکار کردیا۔"

"بہت چنگا کیا" ماسی نے کہا "بندے کو اپنا کام کرنا چاہیے۔"

"کل ہم اس وکیل گلباز خان سے یہ بات کرنے گئے تھے کہ کمپنی کو وہ خرید لے۔ شادو کے حصے کا پیسہ ادا کردے تو شادو الگ ہوجائے گی کمپنی سے اور وہ سارے کا مالک ہوجائے گا۔ وہ بھی راضی تھا۔ بس قیمت کی بات باقی رہ گئی تھی کہ یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ اس کے ہاتھوں غلطی سے دفتر کے ایک چپراسی کا قتل ہوگیا۔"

ماسی نے کہا "غلطی کا کیا مطلب ہے آخر' اس نے مارا ہوگا۔"

میں نے کہا "بس گولی غلطی سے چل گئی۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔"

"ہائے تو دفتر میں اس نے ریوالور نکالا ہی کیوں تھا؟" ماسی نے کہا۔

میں نے کہا "وہ ریوالور دکھا رہا تھا۔ نیا خریدا تھا اس نے۔ اچانک گولی چل گئی اور سامنے آگیا وہ غریب بے گناہ چپراسی۔"

ماسی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی "غلطی سے گولی کسی امیر آدمی کو کیوں نہیں لگتی۔ وہ وکیل پکڑا گیا کہ نہیں؟"

میں نے کہا "پکڑا گیا ماسی۔۔۔ وہ بھاگ کے کہاں جاتا مگر یہ سب شادو کے سامنے ہوا۔ سب دیکھا اس نے۔"

"ہائے' اسی کا اثر ہوگا شادو پر۔" ماسی نے رنج سے سرہلایا۔

"اثر تو لازمی ہوگا۔ کل رات ہم اسی لیے دیر سے آئے

تھے اور ہم سے کھانا بھی اسی لیے نہیں کھایا گیا تھا۔ میں اسی چکر میں رات بھر ہلکان ہوتا رہا۔"

"تو یہ بات بتاتا نا مراد!" ماسی نے افسوس سے کہا۔

"جب میں ساری بات پھر دہراتا' تمہارے سامنے تو شادو کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی اور تمہارا موڈ بھی خراب ہوتا۔ کل شام شادو کی طبیعت ویسے ہی بگڑی ہوئی تھی۔ وہ آفس پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار بے ہوش ہوگئی تھی لیکن پھر اس کی حالت سنبھل گئی تو اس نے کہا کہ جو بات کرنے آئے ہیں وہ کرلی جائے۔۔۔ بات شروع ہونے سے پہلے ہی یہ سانحہ ہوگیا۔"

"مگر تو نے تو کہا تھا۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ بولا تھا میں نے۔ میں نے سوچا قتل کا سن کے تم گھبرا جاؤ گی۔"

"پھانسی ہوجانی چاہیے اس کو تو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

میں نے کہا "ہوجائے گی۔ تم دعا کرو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں۔۔۔ میں پھانسی کے لیے دعا کروں۔۔۔ کیسی باتیں کرتا ہے۔"

میں نے کہا "میں شادو کے لیے کہہ رہا تھا ماسی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آج کا دن بھی باہر گزرے گا۔"

"میں بھی جاؤں گی اسپتال۔"

میں نے کہا "نہ ماسی' تم ابھی نہیں شام کو جانا۔ ابھی کوئی نہیں گھسنے دے گا تمہیں اندر۔ ملاقات کا وقت پانچ بجے سے سات بجے تک ہے۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ میری جیب میں بہت تھوڑے پیسے تھے۔ شادو کے بیگ میں سے مجھے دو ہزار مل گئے مگر یہ ناکافی تھے۔ میں نے ایک لاکھ کا چیک ڈاکٹر راجھا کو دیا۔ "یہ آپ کیش کرالینا کسی وقت خود جاکے۔"

اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا "یہ ٹائیفائڈ کیوں بتایا ہے تو نے ماسی کو؟ اچھا ہے اسے بھی حقیقت کا ابھی پتا چل جائے۔"

میں نے سوچ کے کہا "اچھا۔ پھر آپ اسے میرے جانے کے بعد بتادینا۔ جب تک شادو اسپتال میں ہے وہ رو دھولے۔ اس کے سامنے ماسی کو اپنے جذبات پر بھی کنٹرول رکھنا ہوگا۔۔۔ اور زبان پر بھی۔"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ میں سب سیٹ کرلوں گا۔ یہ سمجھو کہ اب ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ جیسا شادو کہے' تم ویسا کرو۔ بس اسے خوش رکھو' جہاں تک ممکن ہو۔ اگر واقعی تھوڑی سی زندگی ہے اس کی۔" وہ بولا۔

میں اسپتال پہنچا تو سورج نکل آیا تھا مگر صبح کا رنگ پھیکا تھا۔ ماحول ایک اداس خاموشی میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ آدمی کے سارے موڈ ہی اس کی دنیا کے موسم بناتے ہیں۔ اندر کی خوشی کے رنگ باہر کی فضا میں نظر آتے ہیں۔ روح کے غموں کا سایہ گھر کے در و دیوار کو اداس کردیتا ہے۔

ڈاکٹر نوید یا اس کی بیوی کے کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹاف نرس نے مجھے بتایا کہ وہ گھر گئے ہیں۔

"ان کے ساتھ نیلم بھی ہے۔"

جس بے تکلفی سے میں نے نیلم کا نام لیا تھا' اس سے نرس کچھ حیران ہوئی "جی۔۔۔ وہ بھی یہیں بیٹھی تھیں' ابھی گئی ہیں۔"

میں نے کہا "میری وائف کس کمرے میں ہے۔۔۔ مسز ناصر۔ انہیں نیلم اپنے ساتھ لائی تھی۔"

"آپ میرے ساتھ آئیں" نرس نے کہا اور آگے آگے چلتے ہوئے اس نے ایک دروازہ کھول دیا "ویسے وہ سو رہی ہیں۔"

شادو ایک بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا "شادو!" مگر اس نے کوئی رسپونس نہیں دیا۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور دروازہ بند کرکے باہر نکل آیا۔

پیچھے ڈاکٹر نوید کے گھر میں نیلم چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر نوید کی بیوی انجم تھی۔ اس نے ایک کپ چائے تھرماس سے میرے لیے نکالی۔

نیلم نے کہا "ساری رات کہاں گزاردی؟"

میں نے کہا "تمہاری بات ہوئی شادو سے؟"

"اس نے سب بتادیا تھا مجھے۔"

میں نے کہا "تو پھر یہ سمجھ لو کہ میں انہی معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ خیر' سب ٹھیک ہوگیا۔ شادو کی کیا کیفیت ہے؟"

"تم نے دیکھا ابھی اسے؟" ڈاکٹرانجم بولی۔

"ہاں مگر وہ سو رہی تھی" میں نے کہا۔

"یہ SEDATIVES کا اثر ہے۔ شام تک اس کی حالت سنبھل جائے گی' وقتی طور پر۔"

میں نے افسردگی سے کہا "میں سمجھتا ہوں ڈاکٹرانجم۔ سب وقتی بات ہے مگر اب وقت کتنا رہ گیا ہے؟"

اس نے مایوسی سے نفی میں سرہلایا "یہ کون بتا سکتا ہے۔ اگر میں اپنا حساب دیکھوں' تو وہ بونس میں جی رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیماری کی تشخیص کرنے والے لندن کے ڈاکٹروں نے اسے چھ مہینے دیے تھے مگر ایسے کیس میں مریض کی قوتِ ارادی سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔"

"لیکن ایک حد تک۔"

"بالکل ایک حد تک۔ اچانک بھی آسکتی ہے وہ حد۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شادو کی مزاحمت سے دو مہینے گزر جائیں۔"

"یعنی دو مہینے کی حد ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ مجھ سے مت کہلواؤ۔ کوئی ڈاکٹر کسی کی زندگی یا موت کا وقت مقرر نہیں کرسکتا۔ ہم مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے دعا کی قوتِ شفا پر بھی یقین رکھتے ہیں اور بجا طور پر ایسا سمجھتے ہیں کہ دستِ قدرت میں سب کچھ ہے۔ کوئی معجزہ رونما ہوجانا بھی ناممکن نہیں اور لوگ تو آخری وقت تک جدوجہد کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے پہلے ہی بتادیا گیا ہے کہ جدوجہد لاحاصل ہے۔ میں اسے لندن یا امریکا لے جاؤں تو اس سے شادو کی اذیت کا ردِ جو ابھی شروع بھی نہیں ہوا' کچھ زیادہ لمبا ہوجائے گا۔"

ڈاکٹر نے سہلایا "اس میں میرے لیے شک کی بات کوئی نہیں ناصر کہ لندن کے جس اسپتال نے مرض کی تصدیق کی ہے' اس کے بعد پاکستان کے ڈاکٹر کچھ نہیں کرسکتے۔ لاہور' کراچی' اسلام آباد میں ایک سے ایک لائق ONCOLOGIST بیٹھا ہے مگر لوگ دوسرے طریقۂ علاج بھی آزماتے ہیں۔ ہومیوپیتھی' حکمت' آیورویدک' آکوپنکچر۔ مایوس آدمی ہر جگہ جاتا ہے۔ جوگیوں' سنیاسیوں سے لے کر درگاہوں اور مزاروں تک۔ پیر فقیر' تعویذ گنڈے' جادوئی نسخے' چٹکی اور پھٹکی' سب آزماتے ہیں لوگ۔"

"میں بھی کروں گا یہ سب کچھ لیکن کوئی امید تو ہو۔ جو علاج چل رہا ہے' اسے موقوف بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے کہا "اور ابھی ایسی کوئی بات بھی نہیں کہ میں اسے ڈپریشن میں مبتلا کروں۔ اگر وہ یہ امپریشن دینا چاہتی ہے کہ وہ ٹھیک ہے تو میں بھی اسے یقین دلاؤں گا کہ واقعی وہ ٹھیک ہے۔ اس کا اعتماد بحال رکھوں گا جب تک ممکن ہوگا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر انجم نے کہا "لیکن سب ایسے ہی نہیں چلتا رہے گا۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔"

"اگر وہ اچانک COLLAPSE ہوگئی تو تمہیں اس کو شفٹ کرنا پڑے گا۔ چوتھے اور آخری مرحلے میں خصوصی علاج اور دیکھ بھال یہاں نہیں ہوسکتی۔ تمہیں میرا مشورہ ہے کہ اسے اسلام آباد لے جاؤ۔ PIMS میں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس ہی سب سے بہتر جگہ ہے۔"

میرے دل پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا "مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہ وقت آگیا ہے۔ کیا علامات ہوں گی؟"

ڈاکٹر انجم اٹھ گئی "پتا چل جائے گا تمہیں۔ میں اب کچھ دیر آرام کروں گی۔ تم دونوں ناشتا کیے بغیر مت جانا۔"

جب نیلم اکیلی رہ گئی تو میں نے کہا "تم کو رات بھر جاگنا پڑا۔ آدھی رات کو تم شوٹنگ سے فارغ ہوکے تھکی ہاری واپس آئی تھیں۔"

نیلم نے شاید میری بات ہی نہیں سنی "ناصر۔ شادو چاہتی ہے کہ تم یہ سارے کام جلد از جلد نمٹادو۔"

"کون سے کام؟"

"یہی۔ ہاشمی اینڈ کمپنی سے پارٹنرشپ ختم کرنے کا۔ گلباز خان جو بھی دے دلا کے کرو۔"

"بس شادو کرے گی۔"

"وہ بس کرچکی ہے۔ تم ڈیل کو فائنل کرو۔ ممکن ہو تو آج ہی ورنہ کل تک۔ اس لیے شادو نے گلباز خان کو قتل کے الزام سے بچانے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بچ گیا۔ اس پر کوئی الزام نہیں۔ چپراسی کی موت ایک حادثہ ہوگئی ہے۔ روڈ ایکسی ڈنٹ۔"

"وہ کیسے۔؟" نیلم حیران ہوئی۔

"دنیا میں سب ہوتا ہے۔ پیسے کا کھیل ہے سب۔ گلباز خان اس وقت اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔ پولیس میں اس کے خلاف کوئی کیس نہیں۔ کسی اخبار میں اس واردات کی ایک سطر کی خبر نہیں۔ میں ابھی جاتا ہوں اور اس سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے نام مکمل ملکیت کے کاغذات بنوالے۔ پارٹنرشپ ختم کرے یعنی DISSOLUTION کی کارروائی مکمل کرے اور ایک چیک بنادے شادو کے نام۔"

"تم اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادو گے۔ جو تمہارا اور شادو کا مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔" نیلم نے کہا "وہ کوٹھی اور یہ گاڑی۔"

"یہ تم کیا ذکر لے بیٹھی ہو۔"

"مجھ سے شادو نے کہا ہے یہ سب کچھ۔ تم کوٹھی اور کاریں نہ رکھنا چاہو تو تمہاری مرضی مگر شادو چاہتی ہے کہ تمہارے نام ہونی چاہیے ہر چیز۔"

"نیلم خدا کے لیے اور کوئی بات کرو۔ رات کو شادو نے اور کیا بتایا تمہیں۔ کوئی ایسی بات جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی

بیماری کو سمجھتی ہے۔"

"اسے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کے پاس مہلت کم ہے اسی لیے جلدی ہے اسے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ تسلیم کچھ نہیں کرتی۔ کہتی یہی ہے کہ میں ٹھیک ہوجاؤں گی مگر میں اپنے آپ کو گھر تک محدود کرنا چاہتی ہوں۔ باہر کے معاملات سب ناصر کے سپرد کرکے آرام سے بیٹھ جاؤں گی۔ ہاشمی صاحب کے ساتھ تو آفس بھی جانا پڑتا تھا۔"

میں نے کہا "اور بھی کوئی بات کی اس نے؟"

"اور کیا بات؟ اس نے چپراسی کے بارے میں بتایا۔۔۔ اور اپنی باتیں کرتی رہی۔ میری معصومیات کے بارے میں پوچھتی رہی۔ کہنے لگی کہ میں بھی تمہیں بس اتنا ہی جانتی ہوں جتنا تمہارے چاہنے والے جانتے ہیں۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ مجھ سے میرے ماضی کی باتیں پوچھتی رہی پھر کہنے لگی کہ ناصر تمہاری جتنی تعریف کرتا ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ اچھی ہو۔"

"یہ تو ہے۔"

"نہیں ناصر۔ جب میں شادو کی زندگی کو دیکھتی ہوں اور اس کی قربانی کو جو اس نے تمہارے لیے دی' تو اس کے سامنے میں خود کو بہت چھوٹا اور کمتر سمجھنے پر مجبور ہوجاتی ہوں۔ معلوم نہیں تقدیر نے یہ ظلم کیوں کیا اس کے ساتھ ناصر۔ اس نے تو بس محبت کی تھی تم سے۔۔۔ اتنی کہ خود کو بھی اس محبت میں فنا کردیا۔ اسے کچھ مہلت مل جاتی۔ کچھ دن وہ سکھ کے ساتھ خوش رہ سکتی۔ تمہارے گھر میں تمہارے لیے کچھ کرسکتی۔ قربانی دے کے بھی اسے کیا ملا۔ بس دکھ ہی دکھ تھے اس کی قسمت میں" نیلم رونے لگی۔

"ظلم تو اس نے میرے ساتھ کیا نیلم! ایک بار نہیں دوبار ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ دونوں بار دھوکا دیا مجھے اور اب بھی وہ چاہتی ہے کہ میں جیوں۔ ہنسی خوشی جیوں اس کے بغیر۔ بہت چالاکی سے اس نے مجھے داتا صاحب کے مزار پر لے جاکے اپنی قسم دی۔ یہ کہا کہ ہم میں سے کبھی ایک نہ رہا تو دوسرا غم کو زندگی کا روگ نہیں بنائے گا۔ ہم میں سے جو زندہ رہے گا' وہ ایسے ہی خوش و خرم رہے گا جیسے ہم آج ہیں۔ وہ اپنا گھر آباد رکھے گا۔ میں سب سمجھتا تھا۔ وہ ہم کا لفظ استعمال کررہی تھی۔ یہ جمع کا صیغہ تھا مگر اسے معلوم تھا کہ مرنے والا کون ہوگا اور کون زندہ رہے گا۔ اور ایسی حالت میں وہاں اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں زندہ رہوں گا۔ اس کے مرنے کے بعد خوش بھی رہوں گا۔ اپنا گھر بھی آباد رکھوں گا۔ کتنی سنگدلی کی بات ہے یہ نیلم۔ میں سب سننے پر مجبور تھا' آج بھی مجبور ہوں۔" نیلم کی بات نے مجھے بھی اتنا جذباتی کردیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کے میں بھی رو پڑا۔

وہ اٹھ کے میرے پاس آگئی "ناصر۔ ابھی رولو جتنا رونا ہے۔ اس کے سامنے مت رونا۔ شادو کے سامنے تمہیں مسکراتے رہنا ہے۔ وہ تمہیں مسکراتا ہی دیکھنا چاہتی ہے۔" وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے روتی رہی۔

"نیلم پتا نہیں' میں یہ سب کیسے برداشت کرپاؤں گا" میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

"اس نے یہ ذمے داری مجھے سونپ دی ہے۔ بتاؤ میں' کیا کروں؟"

"کیسی ذمے داری۔۔۔!"

"کہتی ہے تم ناصر کا خیال رکھو۔ وہ تمہاری بات مانے گا۔ اسے کہنا کہ وہی کرے جو میں نے کہا تھا۔ اپنے عہد پر قائم رہے۔ میری سمجھ میں تو اس کی باتیں نہیں آئی تھیں مگر میں نے کہا کہ ناصر تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کرسکتا ہے؟ وہ کوئی بات نہ مانے تمہاری تو مجھے بتانا مگر اس کا مطلب کچھ اور تھا۔"

میں نے اپنے ہاتھوں سے نیلم کے آنسو صاف کیے "اگر تم مجھ سے پہلے رونے لگی ہو تو پھر یہ ذمے داری کیسے نبھاؤ گی؟ تم ہی تو میرا ایک سہارا ہو۔ شادو کا تم پر اعتماد غلط نہیں ہے۔"

ڈاکٹر انجم کے نوکر نے اندر آکے کہا "ناشتا لگا ہوا ہے سر۔"

میں اور نیلم چونک کے الگ ہوگئے۔ معلوم نہیں یہ منظر اس ملازم نے کتنی دیر دیکھا تھا اور اس کا کیا مطلب نکالا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کس کے لیے رو رہے ہیں۔ اس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے رو رہے ہیں۔ محبت کرنے والے تو روتے ہی نظر آتے ہیں۔ کبھی تقدیر کو کبھی زمانے کو۔

خلافِ توقع ناشتے کی میز پر ڈاکٹر انجم موجود تھی "میں نے کوشش کی مگر نیند نہیں آئی پھر سوچا کہ چلو ناشتا تمہارے ساتھ کرلوں۔ تم دونوں۔۔۔ رو رہے تھے۔"

نیلم نے جھینپ کے مسکرانے کی کوشش کی "نہیں۔ وہ دراصل۔۔۔"

"واٹ نان سنس۔ تم جوان لوگ اتنے جذباتی کیوں ہوجاتے ہو؟"

میں نے کہا "میڈم۔ یہ عمر گزر جائے تو پھر جذبات ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہاں رہتے ہیں۔"

"ہم شادو کی باتیں کررہے تھے۔" نیلم نے نظر جھکا کے کہا۔

"ہم ان باتوں پر رو رہے تھے جو شادو نے کی تھیں" میں نے کہا۔

"رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں دل ہلکا ہوجاتا ہے۔ چلو اچھا کیا اکیلے میں بیٹھ کے رو لیے۔ اب ٹھیک سے ناشتا کرو میرے ساتھ" انجم نے ہمیں ڈانٹا "دیکھو' زندگی اسی کا نام ہے۔ اس میں مسائل اور بحران آتے ہیں۔ حادثات ہوتے ہیں۔ دیکھو کل رات وہ چڑا سی کیسے اچانک مرگیا۔ کیا بیتی ہوگی اس کے گھر والوں پر مگر وہ بھی دو چار دن میں COMPROMISE کرلیں گے زندگی سے۔ بیوی اپنے شوہر کے بغیر جینا سیکھ لے گی۔ بچے بن باپ کے حالات کا سامنا کریں گے۔ تم تو جوان ہو' سب کچھ دیا ہے خدا نے تمہیں۔ صحت اور عقل۔ تم کسی کے محتاج نہیں ہو۔ ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہو۔"

میں اور نیلم خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ حقائق سے انکار اتنا ہی دشوار اور ناممکن تھا جتنا جذبات سے مغلوب نہ ہونا۔

نیلم نے جاتے ہوئے میرے ساتھ شادو کو دیکھا۔ وہ اسی طرح پُرسکون انداز میں محوِ خواب تھی اور اس وقت اچانک مجھے اندھیرے سے نکل آنے والے سانپ کی طرح ایک خیال نے ڈس لیا۔ ایک دن میں اسے بالکل اسی طرح دیکھوں گا مگر وہ کبھی ختم نہ ہونے والی نیند ہوگی۔ کیا اس وقت بھی شادو ایسی ہی لگے گی۔

نیلم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "میں جارہی ہوں۔ دو بجے کا شوٹنگ شیڈول بہت اہم ہے۔ میں اسے مس نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "دو بجے تک ضرور سوجانا۔ تمہاری آنکھیں لال ہورہی ہیں۔"

نیلم کے جانے کے بعد میں کرسی پر شادو کے پاس بیٹھ گیا۔ ایک نرس اس کی نس میں جانے والی گلوکوز کی سوئی کو ٹھیک کرنے لگی۔ ڈرپ میں دوا تھی۔ نہ جانے کون کون سی۔ دوسری ڈرپ سے قطرہ قطرہ خون اس کی رگوں میں شامل ہوتا جارہا تھا۔ اسے ہر ہفتے ایک خاص مقدار میں خون کی ضرورت پڑتی تھی۔

نرس نے پلٹ کے میری طرف دیکھا "یہ جو آپ کے ساتھ تھیں' یہ وہی تھیں نا۔۔۔ نیلم' مشہور ہیروئن؟"

میں نے کہا "نہیں' یہ وہ نہیں تھیں۔"

میں نے اسے مایوس کیا تھا مگر اتنا زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ نیلم دوسری تھی جس کے حسن کی آتش سوزاں لاکھوں دیکھنے والوں کے جذبات میں آگ لگادیتی تھی اور جس کے شباب کی آتش فشانی سے لاکھوں کے مہ و ہوش کا خرمن راکھ ہوجاتا تھا۔ یہ نیلم ایک عام درد مند دل رکھنے والی جذباتی سی لڑکی تھی۔ جس کو خدا نے صورت سے زیادہ سیرت کے حسن سے نوازا تھا۔ زمانہ اس کی ایک نگاہِ ناز کے لیے تڑپتا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رو رہی تھی۔ اس شادو کے لیے دکھی تھی جس کے ساتھ وہ دردِ مشترک کا رشتہ رکھتی تھی۔ وہ میرے دکھ پر دکھی تھی اور اس کے آنسو فلم سیٹ پر نکلنے والے گلیسرین کے آنسو نہیں تھے۔

میں اس امید میں بیٹھا رہا کہ شادو آنکھیں کھولے تو میں اس سے کوئی بات کروں۔ اسے بتاؤں کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے اور اس کے ہونٹوں سے اپنا نام سنوں۔ اس کے زرد رخساروں پر حیا کی گلابی شفق پھوٹتے دیکھوں اور پھر اعترافِ محبت کی روشنی صبح کے سورج کی کرنوں سے سجی مسکراہٹ بن کر اترے تو میں اسے یقین دلاؤں کہ ہماری زندگی ایسی ان گنت صبحوں کے اُجالے کا سفر ہے۔ آنے والے دنوں' ہفتوں' مہینوں اور سالوں کی راہ پر ہمیں چلتے جانا ہے۔ ایک پُرمسرت عہدِ رفاقت کی سلور جوبلی' گولڈن جوبلی' ڈائمنڈ جوبلی مناتے ہوئے۔ اپنے بچوں اور پھر ان کے بچوں کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ہمیں اکیسویں صدی میں بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بچوں کی شادیاں پھر ان کے بچوں کی شادیاں۔ ایک چمن آباد کرنا ہے ہمیں۔

اور اس سے اتنا جھوٹ بول کے اور پھر شادو سے اتنا ہی جھوٹ پورے یقین کے ساتھ سن کے میں مطمئن ہوجاؤں کہ میں نے شادو کو سکون آور گولی کی تاثیر رکھنے والے خوابوں میں الجھادیا ہے اور شادو مطمئن ہوجائے کہ ابھی تک مجھے اس سفاک حقیقت سے بے خبری کا سکون حاصل ہے جس کا نام موت ہے اور جو لمحہ لمحہ قدم بڑھاتی' آگے آتی قریب ہوتی جارہی ہے۔

دس بجے نرس نے دروازہ کھول کے اندر جھانکا "سر' آپ کو میڈم نے بلایا ہے اپنے کمرے میں۔"

میں نے کہا "انہیں کہو کہ یہاں آجائیں۔"

"وہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ کوئی ملنے آیا ہے آپ سے" نرس نے کہا۔

میں نے دروازے کو اپنے پیچھے آہستہ سے بند کیا اور ڈاکٹر انجم کے آفس میں پہنچا تو وہاں رئیس اور ماسی ہیر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر انجم وہاں نہیں تھی۔

ماسی نے ایک دم میرا بازو پکڑلیا "ناصر۔ یہ رانجھا کیا کہہ رہا تھا۔ کیا کوا اس کی تھی تو نے اس کے سامنے۔"

میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "آرام سے بیٹھ ماسی۔"

رئیس نے اداسی سے کہا "ماسی میری بات پر بھی یقین نہیں کرتی۔ کہتی ہے تم دونوں حرامی ہو۔ مجھے ڈرانے کے لیے ننگ کررہے ہو۔"

"اور کیا۔۔۔ چور کا گواہ ڈاڈو۔ بھیڑی شکل ہے تو بات بھی منہ سے بری کرتے ہو منحوسو۔۔۔ رب سلامت رکھے میری شادو کو۔ کینسر ہو اُس کے برا چاہنے والے دشمنوں کو۔"

میں سمجھ گیا کہ ماسی کے ذہن پر اس خبر کے صدمے کا اثر ہے۔ جو اسے ڈاکٹر رانجھا نے دی ہوگی۔ ایک شدید مزاحمتی ردِعمل کے طور پر اس نے ہم سب کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے اس بات کو ماننے سے انکار کردیا ہے کہ شادو کی بیماری کوئی معمولی نوعیت کی ٹھیک ہونے والی بیماری نہیں ہے۔ اس کے کینسر کا آخری جان لیوا مرحلہ شروع ہوگیا ہے اور وہ چند برسوں کی نہیں' چند مہینوں کی بھی نہیں' چند ہفتوں یا شاید دنوں کی مہمان ہے۔

میں نے کہا "ماسی۔ یہ خدا کی رضا ہے۔ اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ شادو کے لیے برا سوچ سکتا ہوں میں؟ زبان سے کہنا تو دور کی بات ہے۔"

اسی وقت ڈاکٹر انجم لوٹ آئی "میں ذرا چائے کے لیے کہنے گئی تھی۔"

"آپ ڈاکٹر ہو جی!" ماسی نے کہا "آپ بتاؤ مجھے۔"

ڈاکٹر نے میرے اور ماسی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "میں کیا بتاؤں؟"

میں نے کہا "ماسی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔۔۔ کہ شادو کو کیا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر انجم نے سر ہلایا "یہ بہت دکھ کی بات ہے ہمارے لیے بھی۔۔۔ مگر کیا ہوسکتا ہے۔"

ماسی کا چہرہ ایک دم تاریک ہوگیا۔ "کیا مطلب ہے جی اس بات کا آخر؟ آپ نے ڈاکٹری پڑھی ہے۔ آپ کے پاس کوئی علاج نہیں ہے اس کی بیماری کا؟"

"اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے دنیا میں۔"

ماسی ایک دم کھڑی ہوگئی "لعنت بھیج سارے ڈاکٹروں پر ناصر۔ تو لے کے چل شادو کو میرے ساتھ۔ میں نے تو ڈیرا ڈال دینا ہے داتا صاحبؒ کے آستانے پر۔ اپنی مراد پائے بغیر اٹھنا نہیں ہے میں نے۔ اوئے دوا نہ سہی' دعا قبول ہوگی میری۔ میرے مولا کو سننی ہی پڑے گی میری۔ بتا کہاں ہے شادو؟"

میں نے اسے پھر بٹھادیا "ماسی۔ ہم سب ایک ساتھ چلیں گے اور دعا کریں گے لیکن ابھی شادو کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ جائے۔"

اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "تم سب پڑھے لکھے سیانے بندے ہو نا۔ تم سمجھتے ہو بڈھی پاگل ہوگئی ہے مگر تم دیکھ لینا' میں مرنے نہیں دوں گی اسے۔ بے شک مت ملنے دو تم مجھے اس سے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ اس سے ضرور ملیں۔ ناصر' ان کو لے جاؤ شادو کے کمرے میں۔"

میں نے کچھ تامل کے ساتھ کہا "وہ۔۔۔ سو رہی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ یہ ایک نظر دیکھ لیں گی اسے اور واپس آجائیں گی۔ ماسی' آپ خیال رکھیں گی نا۔ اس کے آرام میں خلل نہ پڑے۔"

"ہاں ہاں' میں تو سانس بھی آہستہ لوں گی" اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے "چل ناصر!"

میں ماسی کو شادو کے کمرے میں لے گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر گئی اور شادو کے قریب جاکے خاموش کھڑی ہوگئی پھر میں نے دیکھا تو وہ زیرِلب کچھ پڑھ رہی تھی۔ رئیس میرے ساتھ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کیا دعا مانگ رہی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول کے شادو پر پھونکا اور اپنے ایک ہاتھ کو اس کے پورے جسم پر پھیرا پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے گرد پھرنے لگی۔ وہ مسلسل کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے رئیس کو پیچھے کھینچ لیا۔ ماسی نے ایک چکر لگا کے پھر شادو پر پھونکا۔ پھر دوسرا چکر شروع کردیا۔ اس نے سات چکر مکمل کیے اور سات بار شادو پر پھونکا۔

مجھے اس وقت اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا جب شادو نے آنکھیں کھول کے مجھے اور پھر ماسی کی طرف دیکھا اور مجھے اس کی مسکراہٹ بالکل ویسی ہی لگی جیسے کوئی سوتے سے جاگ کے مسکرائے۔ جیسے وہ ہر روز مسکراتی تھی۔ اس نے قدرے حیرانی سے خون کی اور گلوکوز کی بوتلوں کو دیکھا پھر میری طرف اور ماسی ہیر کی طرف۔

"شکر ہے میرے مولا!" ماسی نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا "کیا حال ہے اب تیرا پتر؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے۔ میں نے تو نیلم سے کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ زبردستی مجھے اسپتال لے آئی۔" شادو نے کہا "کہاں ہے وہ خود؟"

میں نے کہا "وہ گھر گئی ہے کچھ آرام کرنے کے لیے۔ رات بھر جاگی تھی۔"

"آپ کب آئیں؟" وہ ماسی سے مخاطب ہوئی۔

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ میرا بس چلتا تو تجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتی۔ یہ ڈاکٹر میری نہیں سنتے۔ خواہ مخواہ لٹکا دی ہیں یہ بوتلیں' چنگی بھلی ہے تو۔"

"آپ کھڑی کیوں ہیں؟"

"بس میں جا رہی ہوں۔ سو کام چھوڑ کے آئی تھی۔" اس نے مسکرا کے شادو کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

جب وہ چلی گئی تو شادو نے رئیس کو دیکھا۔ "تم کہاں ہو آخر دیور جی..... کب سے صورت نہیں دیکھی تمہاری۔"

رئیس بھونچکا رہ گیا۔ شادو نے کبھی اس سے پیار کے ایسے رشتے کے حوالے سے بات نہیں کی تھی اور کبھی اس لہجے میں اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ پہلے رئیس اس سے ڈرتا تھا پھر خود اس کے سامنے جانے سے گریز کرتا رہا کیونکہ اس کا خیال تھا شادو اسے پسند نہیں کرتی۔ اس کی عادات اور مزاج' زبان اور صحبت نے خود رئیس میں ایک احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا۔

رئیس نے بڑی مشکل سے کہا "میں..... بس ٹھیک ہوں..... بھابی!"

میں نے محسوس کیا وہ سخت جذباتی ہو گیا تھا۔ شادو نے جس اپنائیت کا اظہار کیا تھا وہ اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ایک ایسا خوش گوار تجربہ جس نے اس کا کمپلیکس دور کر کے اسے اعتماد عطا کر دیا تھا۔

میں نے کہا "کسے بھائی بنا رہی ہو تم میرا۔ جانتی نہیں ہو اس کی عادتوں کو۔"

"جانتی ہوں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ دوستی بھی دیکھی ہے تمہاری۔ خون کے رشتے سے زیادہ مضبوط ہے یہ رشتہ' تم کھڑے کیوں ہو؟"

رئیس میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ میں شادو کو دیکھتا رہا۔ ابھی میری نگاہوں نے ایک ناقابلِ یقین کرشمۂ محبت دیکھا تھا۔ اسے معجزہ شاید نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے ہوشی کی نیند عطا کرنے والی دواؤں کے زیرِ اثر سوتی ہوئی شادو جاگ اٹھی تھی۔ یوں جیسے وہ رات بھر آرام کر کے اٹھی ہو۔ اس پر گزشتہ شب کے بخار کی نقاہت یا بیماری کا کوئی اثر تک نہ تھا۔ وہ خوش اور تازہ دم تھی۔ مجھے اس کے چہرے کی زردی میں ہی زندگی کی سرخی کی جھلک نظر آنے لگی۔

میں نے کہا "کیا ہو گیا تھا تمہیں رات کو۔ تم نے نیلم کو بلاوجہ پریشان کیا۔"

اسے جیسے کچھ یاد آ گیا "اوہ ناصر۔ میرے ذہن پر اس بے چارے چپراسی کی موت کا بہت اثر تھا۔ کیا ہوا اس کا؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو گیا۔"

"ٹھیک کیا ہو گیا؟ تدفین کب ہو گی اس کی۔ تمہیں شریک ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "میں چلا جاؤں گا اگر تم کہتی ہو۔ میں نے اس کے بھائی کو اور بیٹے کو بتا دیا ہے کہ وہ چاہیں تو ان کے لیے کمپنی میں جگہ ہے ملازمت کے لیے۔"

"تم اس کی بیوہ سے ملے تھے؟"

میں نے کہا "نہیں" اور پھر مختصراً اسے بتا دیا کہ میری کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا تھا اور لواحقین کے بارے میں میرے کیا تاثرات اور اندیشے تھے۔

اس نے کچھ افسوس کا اظہار کیا "آدمی کی آنکھ بند ہوتے ہی کتنی جلدی رشتوں کی بنیادیں بکھرنے لگتی ہیں۔"

"ایسا سب کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اب گلباز خان سے بات کرنے کے لیے جانا تھا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو۔ اس حالت میں تم جا سکتی ہو کہیں؟"

"یہ خواہ مخواہ باندھ دیا ہے ڈاکٹروں نے مجھے۔ کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آرام سے لیٹی رہو۔"

"دیکھو ناصر۔ تم سے زیادہ میرا تعلق تھا اس چپراسی سے۔ یہ میری اخلاقی ذمے داری بنتی ہے کہ میں اس کی بیوہ سے مل کے اسے تسلی دوں..... اور اسے بتاؤں کہ ہم اس کے خاندان کو پورا تحفظ فراہم کریں گے۔ وہ عورت ہے' عدت میں کسی نامحرم سے نہیں مل سکتی۔ شام کو گلباز خان سے بھی فائنل بات کرنی ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی میں جنازے میں شریک ہو جاؤں گا۔ تم شام کو میرے ساتھ چلنا اگر ڈاکٹر انجم اجازت دے۔ جب تک یہ ڈرپ باقی ہے تم کو یہاں لیٹنا پڑے گا۔ میں رئیس کو یہاں چھوڑ کے جاؤں گا' تاکہ تمہارا خیال رکھے۔"

"ہاں۔ رئیس کو چھوڑ جاؤ" اس نے ایک گہری سانس

لے کر جیسے اپنی مجبوری کو تسلیم کر لیا "مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں اس سے..... نیلم کب آئے گی؟"

"نیلم ابھی سو رہی ہو گی۔ دو بجے اس کو شوٹنگ کے لیے جانا ہے۔ پتا نہیں کب فراغت ہو گی اسے' میں جاؤں؟"

"جاؤ مگر مجھے بھوک لگ رہی ہے بہت سخت۔" وہ مسکرائی۔

میں نے کہا "جو کھانا ہے رئیس سے کہہ دو۔ ڈاکٹر انجم کے گھر سے آ جائے گا۔"

شادو کے لب و لہجے میں' انداز میں اور رویے کے ساتھ اس کی ظاہری حالت میں رونما ہونے والی بہتری نے مجھے ہی نہیں رئیس کو بھی حیران کر دیا تھا۔ یہ یقین کی قوت کا اور اعتقاد پر بھروسے کا کرشمہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ایک سیدھی سادی ان پڑھ عورت نے اپنے طریقے سے صرف دعا مانگی تھی مگر اس کے دل میں ایقان کا درجہ اس حد تک کامل تھا کہ اس نے اپنے معبود سے کہا اور معبود نے اس کی بندگی کے خلوص اور عاجزی کو دیکھتے ہوئے دعا کو قبول کر لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ساری عمر نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ایک مالک کی نوکری کرنے والے ملازم کو یقین ہوتا ہے کہ وہ مالک سے چھٹی مانگے گا یا قرض کی درخواست کرے گا تو مالک اسے انکار کر ہی نہیں سکتا۔

اب ماسی نے کیا دم کر کے پھونکا تھا؟ کیا پڑھ کے شادو پر ہاتھ پھیرا تھا اور سات بار اس کے گرد طواف کیوں کیا تھا؟ یہ سب فروعی باتیں تھیں۔ اس نے خدا کے پاک کلام کا ورد کیا تھا اور اسی کی برکت سے شادو ہوش میں آ گئی تھی۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس ان پڑھ عورت کی طرح میرا یقین کامل نہیں اور تشکیک کا پہلو میری بے غرض دعا میں بھی کسی نہ کسی پہلو سے شامل رہتا ہے کہ نہ جانے یہ دعا قبول ہو گی یا نہیں۔ ہر دعا قبول نہیں ہوتی اور ہر گھڑی قبولیت کی گھڑی نہیں ہوتی۔ ماسی شاید کچھ سوچتی ہی نہیں تھی۔

اب بھی جو سوال میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا یہی تھا کہ کیا ماسی نے شادو کی بیماری اپنے سر لے لی تھی۔ کیا شادو کی شفایابی کا تاثر عارضی تھا؟ اس کی حالت میں یہ بہتری وقتی طور پر آئی تھی یا اسے واقعی ایک لاعلاج مرض نے جان کا نذرانہ لیے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ میری عقل کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ایسے کیسے ممکن ہے۔ حالانکہ دستِ قدرت میں کیا نہیں ہے۔ انا اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔ یہ الفاظ اپنے اندر بڑے پُروثوق معانی رکھتے ہیں۔ میرے ذہن میں اس واقعے کی بازگشت بھی تھی جب ایک مغل شہنشاہ نے اسی طرح شاہزادے کی بیماری اپنے سر لے لی تھی اور خدا نے اسی انداز میں مانگی جانے والی دعا قبول کرتے ہوئے مرض الموت میں مبتلا ولی عہد کو شفا دی تھی اور بادشاہ بیمار پڑ گیا تھا اور بالآخر راہیِ ملکِ عدم ہوا تھا۔

لیکن تاریخ کا یہ واقعہ جو ایک روایت بھی سمجھا جا سکتا ہے' ماسی نے کہاں پڑھا ہو گا۔ کیا اس نے کسی سے سنا تھا کہ کس طرح اس مغل شہنشاہ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ولی عہد کی زندگی مانگ لی تھی لیکن خدا کے حضور تو۔ بندہ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

تو دعا مانگنے والا بھی خدا کا ایک بندہ تھا۔ ایک باپ تھا' اور خدا نے محض اس کے جذبات کی نوعیت کو دیکھا اور اس کی قربانی کو قبول کر لیا۔

میں نے شادو کی خواہش کے مطابق دوپہر کے بعد چپراسی کے جنازے میں شرکت کی۔ وہاں مجھے پہچاننے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک مرنے والے کا بھائی اور دوسرا اس کا پڑوسی جو مجھے گزشتہ رات دیکھ چکے تھے مگر میں ان کی نظر سے دور ہی رہا۔ پڑوسی تو۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' تدفین کے وقت موجود ہی نہیں تھا۔ بھائی کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہو گئی تھی چنانچہ وہ صبح کام پر چلا گیا تھا اور حقِ ہمسائیگی ادا کرنے کے لیے واپس نہیں آیا تھا۔

بھائی نے مجھے قبرستان میں دیکھ لیا اور جب تدفین کے بعد لوگ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے تو وہ کھسکتا ہوا میرے قریب آ گیا "السلامُ علیکم سر۔ آپ کی مہربانی سے بھائی صاحب کی میّت کفن کے ساتھ آ گئی تھی۔ وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی دے گئے تھے۔"

میں نے کہا "بھائی کی مغفرت کی دعا کرو' باتیں مت کرو۔"

اس نے کھسیانا ہو کے ہاتھ اٹھا دیے مگر پھر وہ مجھ سے چپک گیا "آپ ایسے نہیں جا سکتے' گھر چلیں' کھانا تیار ہو گا۔"

میں نے کہا "سوری۔ میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا تھا۔"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "کیا میں شام کو ڈیوٹی پر آ جاؤں سر؟"

"آج شام؟" میں نے حیرانی سے کہا "نوکری کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ سوئم تک تو رک جاؤ دنیا داری کے لیے۔"

قبرستان کے باہر ایک ہی گاڑی تھی۔ وہ بڑے خوشامدانہ انداز میں مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا اور لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے مجھ سے لمبا مصافحہ کیا۔ وہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری گاڑی کوئی نہیں تھی چنانچہ سب کی نظر اس شاندار شاہانہ قسم کی کار پر تھی۔

سہ پہر کے بعد میں آفس پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ رات بھر میں صفائی کرانے کے بعد سجاتی نے شادو کے کمرے میں نیا قالین اور نیا فرنیچر ڈلوا دیا تھا۔ وہ سمجھدار آدمی تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ آرڈر پر نئی میز بنوانا ممکن ہوتا چنانچہ اس نے میز کا رخ بدل دیا تھا۔ نئی ترتیب سے یہ کمرا کسی اور کا کمرا نظر آرہا تھا۔

اس وقت بھی وہ آرائش کو فنشنگ ٹچ دے رہا تھا جب میں آفس پہنچا۔ میں نے اس کی کوشش کی تعریف کی تو وہ خوش ہوا۔

"میڈم کی طبیعت اب کیسی ہے سر!" وہ بولا۔

میں نے کہا "میڈم آئیں گی شام کو اور اس کارکردگی کے مظاہرے پر یقیناً تمہیں انعام دیں گی۔"

وہ اداس ہوگیا "یہ میں نے کسی انعام کے لالچ میں نہیں کیا تھا سر۔ یہ ضروری تھا ورنہ میڈم کو یہاں بیٹھ کے وہی یاد آتا ہر وقت۔"

میں نے کہا "تم رات بھر جاگتے رہے اور دن بھر مصروف رہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ آرام کرو۔"

"بس یہ کتابوں کا شیلف رکھوا دوں' پھر جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "گلباز خان صاحب کس وقت آتے ہیں؟"

وہ چونکا "عام طور پر کورٹ سے فارغ ہو کے سہ پہر کے بعد پہنچ جاتے ہیں چار بجے تک۔۔۔ لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "وہ ضمانت پر رہا ہو گئے تھے صبح ہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے کسی کو ان کی گرفتاری کا پتا ہی نہیں چلنے دیا۔۔۔ فرم کی بدنامی ہوتی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے سر۔ بس اس بے چارے کی قضا آئی تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔"

میں نے کہا "آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ رک کیوں گئے؟"

"وہ سر۔ ویسے تو آپ مالک ہیں۔ میں جانتا ہوں چپراسی ایک غریب آدمی تھا۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا اس کا۔ ایک جوان بہن کی شادی کے لیے بہت پریشان رہتا تھا۔ کہتا تھا اگر لڑکا کہیں کام سے لگ جائے۔"

میں نے کہا "انشاء اللہ سب ہو جائے گا۔ ہم نے لڑکے کو رکھ لیا ہے چپراسی کی جگہ۔ اتنی ہی تنخواہ پر۔ باقی مسئلے بھی حل ہو جائیں گے۔ انہیں مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

"ایک بات اور تھی سر! میں جانتا ہوں کہ یہ کوئی موقع نہیں ہے ایسی بات کا لیکن اس سے پہلے مجھے موقع نہیں ملا ورنہ میں میڈم سے کہتا۔"

میں نے کہا "سامنے بیٹھ کے آرام سے بات کرو۔"

وہ کرسی کے کنارے پر ٹک گیا۔ "وہ سر۔۔۔ آپ غلط نہ سمجھیں۔۔۔ میڈم اچھی طرح جانتی ہیں۔۔۔ کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ میں ان سے مدد کے لیے درخواست کرتا مگر ابھی ان کی طبیعت ناساز ہے۔"

میں نے کہا "تم مجھ سے کہو۔"

وہ اپنے دونوں ہاتھ اضطرابی کیفیت میں ملتا رہا "اس کی جو بہن ہے' ہے تو میٹرک پاس۔ بھائی کے ساتھ اسکول آتی تھی۔ وہ بھی اسی اسکول میں چپراسی تھا دن کی شفٹ میں۔ وہاں سے فارغ ہو کے یہاں آجاتا تھا۔ وہ بھی آتی تھی اور ایک طرف بیٹھ کے پڑھتی رہتی تھی۔ واپسی میں بھائی ساتھ لے جاتا تھا۔"

جو بات وہ کہنا چاہتا تھا وہ اس کی تمہید سے ہی واضح ہوگئی تھی لیکن دلچسپی کی وجہ سے میں نے اسے پوری بات کہنے کا موقع فراہم کیا۔

"۔۔۔ میں نے بہت پہلے میڈم سے کہا تھا اور انہوں نے بات کی بھی مگر پتا چلا اس کی بات کہیں ہو چکی ہے۔۔۔ اس کے بعد میں نے اسے یہاں نہیں دیکھا۔"

"یعنی کہیں اور دیکھا' خیر آگے بولو۔"

وہ جھینپ گیا "مجھے پتا چلا کہ۔۔۔ وہ بات غلط تھی۔ دراصل اس کا ایک اور بھائی ہے۔ اس نے اپنی ٹانگ اڑادی۔ کوئی اکبری منڈی کا آڑھتی ہے۔ پہلی بیوی چار بچے چھوڑ کے مرگئی۔ اس نے ملازمت دینے کا وعدہ کیا۔ اس شرط پر کہ وہ خدیجہ۔۔۔ اس کا نام خدیجہ ہے۔ خدیجہ کا رشتہ کرادے۔ اس نے بڑے بھائی سے کہا اور اس پر دباؤ ڈالا کہ خدیجہ کو سمجھائے۔ وہ راضی نہیں تھی۔ ظاہر ہے بڑے بھائی نے زبردستی کرنے سے انکار کردیا۔ اب بڑا بھائی ہی نہیں رہا۔۔۔ خدیجہ کی شادی زبردستی اس شخص سے کردی جائے گی۔"

وہ خاموش ہوگیا اور پُرامید نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "تم ہمدردی میں یا مدد کرنے کی خاطر تو ایسا نہیں چاہتے؟"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں سر! وہ پسند تھی مجھے۔۔۔ بہت پہلے سے۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہ بھی۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بے فکر ہو جاؤ۔ میں میڈم

کو بتادوں گا اور خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ خدیجہ کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرے گا۔"

اس کا چہرہ ایک اندرونی مسرت سے چمکنے لگا "تھینک یُو' تھینک یُو سر!"

اب دوسرے کمرے کھل گئے تھے اور ماتحت عملہ ایک ایک کرکے آفس پہنچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گلباز خان بھی آگیا۔ وہ سیدھا شادو کے کمرے میں آیا اور اندر کے بدلے ہوئے منظر سے زیادہ مجھے شادو کی جگہ بیٹھا ہوا دیکھ کے ٹھٹکا۔

میں نے متانت سے کہا "آیئے خان صاحب' آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا میں۔"

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا "یہ سب بدل دیا تم نے رات بھر میں۔"

میں نے کہا "رات بھر میں تم نے بھی تو قتل کو حادثے میں بدل دیا۔"

اس نے ناگواری سے میری بات برداشت کی "بہتر ہے کہ ہم اس پر بات نہ کریں۔"

"میں اسے حادثہ تسلیم کرلوں گا۔ نظریۂ ضرورت کے تحت ورنہ گواہ تو بہت ہیں میرے علاوہ بھی۔ اس دفتر کا سارا عملہ ہے اور چوکیدار ہے۔ بلڈنگ میں بہت سے لوگ ہیں۔"

"اگر تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہاں لیکن میں تم سے اپنی زبان بند رکھنے کی کوئی قیمت طلب نہیں کروں گا۔ ظاہر ہے شادو کو یا مجھے تم سے کوئی پرخاش ہوتی تو ہم کل بھی سچ بولتے۔ میں نے نہیں کہا کہ گولی تم نے مجھ پر چلائی تھی۔ نہ شادو نے ایسا کہا۔ اور اس کی وجہ سے تمہارے لیے قتل کو حادثہ بنانا ممکن ہوا ورنہ غیر ارادی قتل کے علاوہ تم پر ارادہ قتل کا مقدمہ بھی بنتا اور وہ تھانے دار اصغر علی تمہاری کوئی مدد نہ کرسکتا۔ ایم آئی رائٹ!"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "اب کیا چاہتے ہو تم؟"

"تم نے کیس کی نوعیت بدلنے کا کیا معاوضہ ادا کیا اس سب انسپکٹر کو۔ فکر مت کرو' یہ ساری گفتگو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ آف دی ریکارڈ۔ میں نے اسے خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کے لیے کمرے کی ترتیب نہیں بدلی ہے اور تمہیں اعتبار نہیں تو یہاں بات مت کرو۔"

"اس حرام زادے نے پورے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔"

"ٹھیک ہی لیے۔ بڑے آدمی کا بڑا معاملہ تھا۔ خیر' مجھے کیا؟ اصل مسئلہ تھا ایک غلط فہمی کا۔"

"کیسی غلط فہمی؟"

میں نے کہا "میں اس کرسی پر بیٹھا ہوا اچھا لگتا ہوں۔ بیٹھ بھی سکتا ہوں اگر چاہوں اور یقین کرو وکیل نہ ہونے کے باوجود انتظامی معاملات میں شادو سے بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہوں۔ وہ عورت تھی' مصلحتاً یا مجبوراً' دخل اندازی سے گریز کرتی تھی۔ ہاشمی صاحب کی بات اور تھی۔ میں ان کی برابری کا کیسے دعویٰ کرسکتا ہوں مگر یہ ہے کہ چاہوں تو چار چھ سال میں وکیل بھی بن سکتا ہوں لیکن نہ میری ایسی نیت ہے اور نہ ایسا ارادہ ہے۔ شادو کی یہی خواہش تھی مگر میں نے انکار کردیا۔ صرف اس لیے کہ اس سے مسائل پیدا ہوتے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ کمپنی کی گڈول متاثر ہوتی۔ اگر اتنی بڑی لیگل فرم کا ایک پارٹنر میرے جیسا ہو' صرف میٹرک پاس۔"

گلباز خان کی صورت پر پہلی بار سکون اور طمانیت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ RELAXED نظر آنے لگا۔ "یہ ایک حقیقت پسندانہ خیال ہے۔"

"مگر کل تم نے انتہائی غیر حقیقت پسندانہ و مدبرانہ اختیار کیا۔ شادو نے میری بات مان لی تھی اور ہم یہ طے کرکے آئے تھے کہ تم سے پارٹنرشپ DISSOLVE کرنے کے معاملے پر گفتگو کریں گے۔ تم ابھی تک خود کو شادو کا اچھا دوست سمجھتے اور ثابت کرتے رہے ہو۔ اس نے بھی ایک اچھے دوست کی طرح سوچا تھا کہ فرم کو تمہارے حوالے کردیا جائے۔ جملہ حقوق ملکیت حاصل کرنے کے لیے تم شادو کو معقولیت کے ساتھ جو پیش کش کرتے ہم قبول کرلیتے۔ تم یقیناً INTERESTED ہو گے کہ ہاشمی اینڈ کمپنی کے اکیلے مالک بن جاؤ۔"

ناہید سلطانہ اختر کے شہرہ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

قیمت 300 روپے

لمحہ بہ لمحہ بظریہ سطر تحیر' تجسس اور درد میں ڈوبی ایک حقیقی داستان

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی محبت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رہ جانے والے چار بہن بھائیوں کی کہانی' جس کی بدقسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بیگانہ کردیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آف کورس۔ میں INTERESTED ہوں" اس نے نئے جوش کے ساتھ کہا۔

"تمہیں یقیناً کمپنی کے ASSETS کی ویلیو معلوم ہوگی جس میں کمپنی کی گڈوِل بھی شامل ہے۔ ایک اچھے دوست' ایک قانون پرست وکیل اور منصف مزاج شخص کی حیثیت سے تم یہ منافع کا سودا کرنے کے لیے کیا قیمت ادا کرسکتے ہو۔ کروڑوں یا لاکھوں میں نہیں' فیصد میں بات کرو۔"

"تم میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہے ہو۔"

"تھینک یو۔ ممکن ہے بعد میں تم کو اپنی رائے پھر بدلنی پڑے۔ ہوشیار کی جگہ تم مجھے چالاک اور عیار کہنے پر مجبور ہوجاؤ۔"

"ہاشمی صاحب کے ساتھ برابر کا حافظہ ہوتا۔ تمہیں ایک تہائی منظور ہوں تو بات ہوسکتی ہے۔"

"پچاس فیصد پر شادو دستبردار ہوجائے گی۔ حالانکہ میرا خیال اس سے زیادہ کا تھا۔ آج ساٹھ فیصد نقد بھی کم ہیں کیونکہ کل تم اس سے دس گنا ہیں گنا کماؤ گے۔"

"آئی ایم سوری۔ میں BARGAINING پسند نہیں کرتا۔ مجھے شادو کی پارٹنرشپ اور اس کے قانونی نمائندے کی حیثیت سے تمہارے اس کرسی پر بیٹھنے کے حق کو تسلیم کرنا ہوگا۔" وہ اٹھنے لگا۔

میں نے اسے اشارہ کیا "بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

"میری بات ختم ہوگئی۔"

"اوکے۔ میری بات پوری سن لو۔ پارٹنرشپ DISSOLVE نہیں ہوگی لیکن نہ شادو کا عملی طور پر کوئی تعلق رہے گا فرم سے نہ میرا۔ ہمارے معاملات اور INTERES کی نگرانی ایک بہت سینئر وکیل کرے گا۔ پورے قانونی اختیارات کے ساتھ۔ تم جانتے ہو تمہارا سب سے خطرناک قانونی حریف اور مخالف کون ہے؟"

وہ ایک دم بیٹھ گیا "تم عارفین کی بات کر رہے ہو؟"

"ٹھیک سمجھے تم۔ جب عارفین یہاں بیٹھے گا تو تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ یہ ایک مملکت میں دو بادشاہوں اور ایک نیام میں دو تلواروں والی پوزیشن ہوگی۔ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ کمپنی کی گڈوِل تباہ ہوجائے گی' تمہارے آپس کے اختلافات سے۔ اس کے بعد تمہیں ہی جانا ہوگا۔ وہ تمہیں عرب کے اونٹ کی طرح نکال باہر کرے گا۔ یہ بات یقینی ہے۔"

"بہت خطرناک چال سوچ کے آئے تھے تم۔"

میں نے کہا "میرے بارے میں تمہاری رائے بہت جلد بدل گئی۔ اب تم اپنی ویلیو ایشن کو RECONSIDER کرکے بتاؤ۔"

وہ کچھ دیر میز پر پنسل بجاتا رہا "ٹھیک ہے۔ پچاس فیصد۔"

میں نے آگے جھک کے اس سے ہاتھ ملایا "تم نے صحیح فیصلہ کرلیا بہت جلد۔ مبارک ہو' ایک چھوٹی سی بات رہ گئی۔"

"وہ کیا؟"

"تمہیں اس چپراسی کی فیملی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ ایک حرام خور تھانے دار کو پانچ لاکھ روپے دیے ہیں تم نے۔"

"یو آر رائٹ۔ ہم کیا کرسکتے ہیں ان کے لیے؟ کیا کرنا چاہیے ہمیں؟"

میں نے کہا "میں نے لواحقین سے دو وعدے کیے ہیں۔ اس کے بیٹے کو مناسب ملازمت دی جائے گی۔ اتنی ہی تنخواہ بھی ہوگی اس کی اور اس کے بھائی کو بھی۔ اگر یہاں نہیں تو کہیں بھی۔"

"اور دوسری بات؟"

میں نے کہا "بیوہ کو ہم ایک مکان لے کردیں گے۔ دس لاکھ روپے تک مالیت کا۔ جس میں وہ خود بھی رہ سکے اور اس کے ایک حصے سے اسے کرایہ ملتا رہے۔ کوئی دو منزلہ مکان پانچ مرلے کا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ اختلاف کرے گا مگر وہ مان گیا "بالکل ٹھیک۔ اس سے میرے ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہوجائے گا۔ مجھے کوئی خوشی نہیں کہ غیر ارادی قتل کا یہ کیس روڈ ایکسی ڈنٹ بن گیا۔ بے شک میں قانونی گرفت سے بچ گیا مگر میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ اسے میں نے گولی ماری تھی۔"

"وہ گولی تم مجھے مارنا چاہتے تھے۔"

"وہ اپنے دفاع میں قتل ہوتا۔ تم ایک قاتل ہو آج بھی میری نظر میں۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "کس کا قتل کیا تھا میں نے؟"

"تم کیسے بھول سکتے ہو۔ اس کا نام تھا رفیق عرف فیکا۔"

میں نے کہا "تم سے کس نے کہا۔۔۔ کہ فیکے کو قتل کرنے والا میں تھا؟"

"اس کی بیوی نے مجھے خود بتایا۔"

میں ہنس پڑا "اس کی بیوی۔۔۔ فیکے کی بیوی؟"

"ہاں۔ وہ میرے گھر میں کام کرتی ہے۔ ایک آٹھ نو

سال کا بچہ بھی ہے اس کا۔" فیاض خان سنیوز نظر آنے لگا۔

"بچہ ہوسکتا ہے فیکے کا مگر اس کی بیوی کوئی نہیں تھی اور اس بچے کی ماں سے خود فیکے نے شادی سے انکار کردیا تھا۔ اگر سچ پوچھو تو فیکے کو قتل کرنے والی وہی لڑکی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس واقعے کا۔ میں بھی اور میرا دوست رئیس بھی۔ ہم نے بعد میں لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ پُل پر سے دریائے راوی میں پھینکا تھا مگر قتل میں نے نہیں کیا تھا فیکے کو۔"

"پھر۔ تمہارا نام کیوں لیا اس نے؟"

"شاید اس لیے کہ میں اور رئیس ہی فیکے کو پکڑ کے لے گئے تھے ورنہ وہ بھاگا ہوا تھا" میں نے کہا "شاید وہ سمجھتی ہوگی کہ ہم اسے نہ لے جاتے تو وہ بچ جاتا حالانکہ یہ ناممکن تھا۔ شاہ جی اسے چھوڑنے والا نہیں تھا اور نہ اس لڑکی کا باپ۔"

میں نے گلباز خان کو اس واقعے کے پورے پس منظر سے آگاہ کیا مگر اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے موقف کو پوری طرح درست تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے۔

"آخر اس لڑکی نے خاص طور پر تمہارا نام ہی کیوں لیا۔ اس نے تمہارے بارے میں مجھے جو بتایا وہ واقعاتی اعتبار سے سچ ہے۔"

میں نے کہا "اس کا فیصلہ تم کیسے کرسکتے ہو؟"

"میں سب کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "میرے بارے میں صرف ایک شخص سب کچھ جانتا ہے جو میری زندگی کے روزِ اوّل سے میرے ساتھ ہے۔ وہ ہے رئیس خان۔ باقی سب نے میری زندگی کو دور سے دیکھا ہے یا اس کے کسی حصے میں ان کا میرا ساتھ رہا ہے۔ تمہارے پاس فرسٹ ہینڈ انفارمیشن نہیں ہوسکتی۔ تم نے دوسروں سے سنا ہوگا۔ ایک سال پہلے تم ناصر عظیم نام کے کسی شخص سے بھی آشنا نہیں تھے۔ تمہیں وہ معلوم ہوگا جو شادو نے مرحوم ہاشمی صاحب کو بتایا اور ان سے تم تک پہنچا۔"

"دیکھو۔ میں ایک وکیل ہوں' واقعاتی شہادت پر آنکھ بند کرکے اعتبار نہیں کرتا۔"

"میں جھوٹ بول رہا ہوں تمہارے خیال میں؟"

"ہاں۔ کیونکہ جو واقعات مجھے اس عورت سے معلوم ہوئے ہیں وہ تقریباً وہی ہیں جو تم نے سنائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم نے انجام کو ایک فلمی قسم کا ڈرامائی موڑ دے کر خود کو بے گناہ ثابت کیا ہے۔"

میں نے کہا "اس عورت کی کہانی کیا ہے بلکہ ٹھہرو' میں خود اس کی زبانی سنوں گا۔"

"اب چھوڑو۔ میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تم سے میرے تعلقات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ تم نے ایک احسان کردیا ہے مجھ پر۔ تم نے شادو کی بات مانی اور مجھے بدنامی سے بچالیا۔ بے شک تم نے اپنے INTEREST میں ایسا کیا۔"

"میرا کیا INTEREST تھا تمہیں بچانے میں؟"

"اگر میں اس قتل۔۔۔ غیر ارادی قتل کے معاملے میں ملوث ہوجاتا تو میرے ساتھ کمپنی کی ساکھ متاثر ہوتی' اس کی ویلیو گر جاتی۔"

"یہ خوش فہمی ہے تمہاری۔ اس کمپنی کو آج بھی کوئی بڑا وکیل اس سے زیادہ قیمت پر لینے کو تیار ہوجائے گا جو تم ادا کرو گے۔ تم اصل قیمت کا نصف دو گے' مارکیٹ ویلیو اس سے بہت زیادہ ہوگی مگر میں جو سودا ذاتی تعلقات کی بنیاد پر کر رہا ہوں' کاروباری نفع و نقصان کو دیکھے بغیر' کیونکہ شادو ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ تم نے نیکی کا برتاؤ کیا تھا' تم اس کے مرحوم شوہر کے دوست تھے اور اس کمپنی سے پرانے تعلق کی بنا پر تم کو ترجیح حاصل ہے اور بفرضِ محال گڈوِل خراب ہوجاتی تو کتنا نقصان ہوتا مجھے؟"

"مجھے نہیں' شادو کو۔" اس نے میری تصحیح کی "مالک تم نہیں ہو۔"

"اوکے۔ شادو کو۔ دس بیس لاکھ روپے کا فرق پڑجاتا" میں نے برہمی سے کہا۔

"کیا یہ فرق اتنا کم ہے کہ تم اسے نظرانداز کرسکو؟"

"میں نہیں' شادو" میں نے اس کا وار اسی پر کیا "اپنی بیوی کو میں جانتا ہوں۔ میں تم سے یہ بات اس کے قانونی نمائندے کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کمپنی تمہیں گفٹ کردوں تو وہ اعتراض نہیں کرے گی اور میں تم کو نہ دوں تو وہ کچھ نہیں کہے گی۔"

"میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ پرانی باتوں کو دہرانے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں ہے وکیل صاحب۔ دس بیس لاکھ کا فرق شادو کو آج بھی پڑسکتا ہے۔ اگر میں کہوں کہ جو آفر تم نے کی ہے وہ کم ہے۔ میں ساٹھ فیصد FACE ویلیو پر اصرار کروں تو تم دو گے۔ یہ رقم آج غیر اہم ہے تو کل بھی غیر اہم تھی۔ میں اپنی CLEARANCE کو اہم سمجھتا ہوں۔ پہلے میں یہ ثابت کروں گا کہ وہ عورت جھوٹی ہے اور تم بے وقوف نہیں کہ اس کی بات کو اب بھی سچ کہہ رہے ہو۔ ایسا تم مجھ سے عناد کی بنا پر سمجھتے ہو۔"

"مجھے تم سے کیوں عناد ہوگا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے اور بہت ذاتی ہے۔ میں نے تمہارے سارے PLANS غلط کردیے۔ میں سمجھتا ہوں گلباز خان کہ تم کیا چاہتے تھے۔ تم اس کمپنی کے مالک ضرور بننا چاہتے تھے مگر ایسے نہیں۔ براہِ راست، تم اسے خریدنا نہیں چاہتے تھے۔ تم شادو کو حاصل کرلیتے تو کمپنی خود بخود تمہاری ہوجاتی۔"

خفت اور غصے سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا "بند کرو یہ بکواس۔"

میں نے کھڑے ہوکے کہا "تم سچ نہیں سن سکتے۔ میں جھوٹ نہیں سن سکتا۔ اب یہ ڈیل اسی وقت ہوگی جب میں خود کو تمہاری نظر میں بے گناہ ثابت کرلوں گا۔"

گلباز خان ٹھنڈا پڑگیا "دیکھو۔ غصے میں نقصان ہوجاتا ہے۔"

"لعنت اس منافع پر جو ایک الزام کے ساتھ ملے۔۔۔ یا تم مجھے اس عورت کے پاس لے چلو۔ یا یہاں بلوالو اسے۔ میں تمہارے سامنے اس سے بات کروں گا۔ میں رئیس کو بھی بلواتا ہوں۔ وہاں اس وقت پانچ آدمی تھے۔ ان میں سے دو مرچکے ہیں۔ شاہ جی اور اس لڑکی کا باپ۔ باقی تین ہم تھے۔ میں رئیس اور وہ لڑکی۔ چوتھی شادو ہے جو سب کچھ جانتی ہے مگر وہ وہاں نہیں تھی۔"

"چلو ہم مان لیتے ہیں کہ وہ جھوٹی ہے۔"

"نہیں۔۔۔ جھوٹ سچ کی بات سامنے ہوگی۔ میں ہمیشہ تمہاری نظر میں ایک ایسا مجرم بن کے نہیں رہنا چاہتا جسے شک کی بنیاد پر یا دباؤ کے تحت چھوڑ دیا گیا ہو۔ تم مجھے ایک بے وقوف تاجر۔ کار نوجوان کی طرح TREAT مت کرو۔ میں سمجھتا ہوں اس چال کو گلباز خان۔ تمہارا ارادہ اس عورت کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنے کا تھا۔ وہ آئندہ بھی ایسا کرسکتی ہے۔ کل کو وہ کہہ سکتی ہے کہ بچہ میرا ہے۔"

بات بنتے بنتے بگڑ گئی تھی۔ گلباز خان بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے بھی انکار کردیا۔ بالآخر مجبور ہوکے اس نے اپنے ڈرائیور کو گھر بھیجا اور میں نے اسپتال میں فون کیا۔ شادو کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی اور وہ بے چینی سے میری واپسی کا انتظار کررہی تھی۔

"ناصر، تم نے سارا دن باہر گزار دیا۔ مجھے تو ڈاکٹر انجم نے اجازت دے دی تھی گھر جانے کی" وہ بولی۔

میں نے کہا "تو تم چلی جاتیں گھر۔ مجھے ابھی کچھ دیر لگے گی۔"

"کیوں؟ کہاں ہو اس وقت تم؟"

میں نے کہا "میں آفس میں ہوں۔" بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلطی کی۔

"باقی سب کام ہوگئے؟"

"ہاں ہوگئے۔ تم ذرا رئیس کو فون دو۔" میں نے کہا۔

"کیا گلباز خان سے بھی بات ہوئی؟" شادو بولی۔

"کہا نا سب کام ہوگئے جو تم نے کہے تھے۔"

اس نے شاید میرے لہجے سے جھلاہٹ کا اندازہ کرلیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے رئیس کی آواز سنی۔ "پیارے، کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "یار تو یہاں آجا میرے پاس، آفس میں۔ فوراً۔"

"فوراً؟"

"ہاں۔ میں گاڑی بھیج رہا ہوں" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

گلباز خان سخت ٹینشن میں اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسٹاف کے سب لوگ معمول کے مطابق اپنے اپنے کام میں لگ گئے تھے مگر ایک پُراسرار سی خاموشی نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گزشتہ روز کے واقعات پر کیسے اثر و رسوخ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ایک بے گناہ کے بے آسرا لہو کے سراغ کو کیسے مٹادیا گیا ہے۔ سب کے سامنے گرفتار کیا جانے والا گلباز خان کیسے پھر اپنے دفتر میں موجود ہے۔ یہ سب دیکھ رہے تھے اور محسوس کررہے تھے مگر ان معاملات پر وہ بات کررہے تھے تو دبے دبے لہجے میں یا اظہارِ خیال سے ہی گریزاں تھے۔

عملے نے آفس میں تبدیلی کو نوٹ ضرور کیا ہوگا مگر انہوں نے اسے بھی قبول کرلیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے ہاشمی صاحب کی جگہ شادو کو اور شادو کی جگہ مجھے قبول کرلیا تھا۔

میں نے ایک ٹائپ کلرک کو گاڑی دے کے بھیجا۔ وہ ڈرائیونگ جانتا تھا۔ میں خود آفس چھوڑ کے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک تو مجھے یہ اندیشہ تھا کہ میری عدم موجودگی میں گلباز خان اس لڑکی کو عدالتی گواہ کی طرح بیان کی تیاری نہ کرادے۔ دوسرے میں اسپتال جاتا تو شادو مجھ سے دس طرح کے سوالات کرتی اور شاید مجھے معاملہ رفع دفع کرنے پر مجبور کرتی۔ میں اس وقت نہ وضاحتوں کے چکر میں وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ دلائل میں۔ مجھے ایک ضد ہوگئی تھی کہ اب گلباز خان کے یقین کو بے بنیاد ثابت کرنا میرے لیے زندگی اور موت کے مسئلے سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔

تاہم جس بات کا مجھے ڈر تھا وہ ہوکے رہی۔ جب گاڑی واپس آئی تو اس میں صرف رئیس ہی نہیں تھا۔ شادو بھی

آفس آنے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے کپڑے بالکل مناسب نہیں تھے مگر شاید اسے رئیس کے طلب کیے جانے سے شک ہوگیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

مزید خرابی یہ ہوئی کہ بالکل اسی وقت گلباز خان کی گاڑی بھی آگئی اور زینے سے اوپر آتے ہوئے شادو نے، رئیس نے اور اس لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہچان بھی لیا۔

شادو نے اندر آنے کے بعد آفس کا جائزہ لیا۔ "ویری گڈ۔ یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ اب کم سے کم میں یہاں بیٹھ کے سانس تو لے سکتی ہوں۔"

رئیس نے براہِ راست سوال کیا "یار ناصر۔ ابھی زینے میں مجھے ایک عورت ملی تھی۔"

میں نے کہا "آرام سے بیٹھ جا۔ اسے میں نے بلوایا ہے۔"

شادو نے مجھے غور سے دیکھا "اسے۔۔۔ تم نے بلوایا ہے، کیوں؟"

میں نے کہا "ابھی سب معلوم ہوجائے گا۔ آؤ، ہم گلباز خان کے کمرے میں چل کے بات کرتے ہیں۔"

انہیں کوئی سوال کرنے کا موقع دیے بغیر میں کمرے سے نکلا اور گلباز خان کے آفس میں گھس گیا۔ گلباز خان اس عورت سے کچھ بات کررہا تھا۔ گلباز خان کی صورت پر برہمی اور اس عورت کی صورت پر تردّد کے آثار بہت عیاں تھے۔

میں ایک صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ شادو اور رئیس بھی میرے ساتھ ہی اندر آچکے تھے چنانچہ گلباز خان کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں نے کہا "رئیس۔ ان کو پہچانتا ہے نا تو۔ شادو تم بھی جانتی ہو یہ خاتون کون ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن بات کیا ہے؟" رئیس پریشان ہوکے بولا۔

میں نے کہا "خاتون۔ دس سال بعد مجھے تمہارا نام یاد نہیں لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں سب یاد ہے۔ ذرا ہم سب کے سامنے بتاؤ کہ رفیق کون تھا اور اس کے ساتھ تمہارے مراسم کی کیا نوعیت تھی؟"

گلباز خان نے احتجاج کیا "ایسے BEHAVE مت کرو جیسے تم وکیلِ استغاثہ ہو اور یہ ملزم ہے۔"

میں نے کہا "سوری۔ چلو میں سوال بدل دیتا ہوں۔ خاتون، آپ رفیق سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ کیوں نہیں ہوئی تھی یہ شادی؟"

وہ نروس ہوگئی "فیکا۔۔۔ رفیق نے انکار کردیا تھا۔"

"اس کے باوجود کہ تم اس سے محبت کرتی تھیں اور تم اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ دھوکے باز تھا۔ اس نے مجھ پر بڑا گندہ الزام لگایا۔۔۔ کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں کسی اور کا گناہ اس کے سر منڈھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ بات اس نے کس کے سامنے کہی تھی؟"

"میرے۔۔۔ میرے باپ کے سامنے۔۔۔ اور ان کے۔۔۔ شاہ جی کے سامنے۔" وہ بولی "اس نے جھوٹ بول کے ذلیل کیا مجھے۔"

"اچھا، پھر کیا ہوا؟"

"شاہ جی نے اسے سمجھایا مگر۔۔۔ وہ بکواس کرتا رہا۔ شاہ جی نے اسے ڈرایا۔ دھمکی دی کہ اس نے مجھ سے شادی نہ کی تو اس کی خیر نہیں مگر وہ نہیں مانا۔ شاہ جی نے کہا کہ اسے پھانسی پر لٹکادو اور تم نے لٹکادیا۔ تم دونوں نے۔" وہ اس پورے واقعے کی یاد سے بھی اتنی دہشت زدہ تھی کہ کانپ رہی تھی۔

"پھانسی پر میں نے لٹکایا تھا اسے؟" رئیس بولا "میں نے پھندا بنا کے ڈالا تھا اس کے گلے میں۔ میں نے اسے کھڑا کیا تھا اسٹول پر۔"

گلباز خان نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا "تم دونوں ہی اس کو پکڑ کے لائے تھے وہاں۔"

میں نے مشتعل ہوکے کہا "ہاں، ہم اسے لائے تھے۔ یہ شاہ جی کا حکم تھا اور ہم انکار نہیں کرسکتے تھے مگر اس کو پھانسی میں نے نہیں دی تھی۔"

"پھانسی میں نے بھی نہیں دی تھی۔" رئیس نے بگڑ کے کہا "مجھ سے شاہ جی نے کہا تھا کہ اس کو ذرا دبکا لگانا ہے۔ ڈرانا ہے۔ شاہ جی بھی اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے مارا خود اس عورت نے جو اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ محبت کرتی تھی رفیق سے۔ پوچھ لو اس سے۔"

وہ لڑکی ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھ دیا "میں پاگل ہوگئی تھی۔ رفیق کی بات نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ پتا نہیں کیسے میں نے لات ماردی اسٹول کو۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور اسے رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ رئیس اور شادو جو اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے، دم بخود بیٹھے رہے۔ گلباز خان خلا میں دیکھتا رہا۔ دفتر کے عملے کی آوازیں خاموش ہوگئیں۔ خدا نے میری عزت رکھ لی تھی۔ اس عورت کو میرے خلاف استعمال کرنے کی خواہش رکھنے والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلباز خان اپنے مذموم مقصد میں ناکامی کے بعد احساس ذلت سے دوچار تھا۔ اچانک اپنے سامنے چشم دید گواہوں کو پاکے اس عورت کا حوصلہ جواب دے گیا تھا اور وہ سچ بولنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ہم سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول سکے۔

ایک وکیل کے آفس میں بھی موکل شام کو ہی قانونی صلاح مشورے کے لیے آتے ہیں۔ اس لیگل فرم میں بھی چھ بجے کے قریب لوگ آنے لگے تھے مگر ان سے ماتحت وکیل نمٹ رہے تھے۔ ہر طرف سے بنداٹر کنڈیشنڈ آفس میں ہونے والی گفتگو باہر سنائی نہیں دیتی تھی۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا "گلباز خان، اب ہم چلتے ہیں۔ کرنے کے لیے اور کوئی بات نہیں رہی۔"

اس نے سر ہلایا "جو کچھ بھی ہوا، یا کہا گیا۔ اس کے لیے مجھے کہنا چاہیے کہ آئی ایم سوری۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے وضاحت کرنے کے لیے موجود ہوں" میں نے کہا "کل تمہارا نشانہ خطا نہ ہوتا تو آج تمہیں سب سے زیادہ افسوس ہوتا کہ ایک بے بنیاد یقین پر تم میرے خلاف ہوگئے تھے۔ تم نے پولیس بلالی اور ریوالور نکال لیا مجھ پر۔"

شادو نے کہا "چلو، ختم کرو یہ بات۔"

میں نے کہا "THE DEAL IS DONE"

"DONE" گلباز خان نے کہا۔

"بس تو پھر کم سے کم وقت میں قانونی کارروائی پوری کرلو۔" شادو نے کہا "میرے پاس وقت کم ہے۔"

شادو کے منہ سے نکلنے والا یہ جملہ غیر ارادی تھا۔ اس کا مطلب گلباز خان نے وہ نہیں لیا جو تھا، جو میں اور رئیس سمجھ سکتے تھے "آپ جارہی ہیں کہیں؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔"

وہ بولا "ایک اور ہنی مون!"

اس کے لہجے کے تیکھے طنز اور کڑوے پن نے شادو کی حالت ایسی کردی جیسے اسے کل تک مسز ہاشمی سمجھ کے عزت دینے والے گلباز خان نے کوئی رُسوا کرنے والی گالی دے دی ہو۔ "جی نہیں۔ میرے نجی معاملات کے بارے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں گلباز خان۔"

رئیس نے بگڑ کے کہا "ہاں بھئی، ہم نے تو نہیں پوچھا کہ یہ اپنے آشنا کو قتل کرنے والی ایک وکیل کے گھر میں کیوں موجود ہے؟"

"یہ میرے گھر میں کام کرتی ہے۔"

رئیس سکرایا "کام تو لرتی ہے۔۔۔ طرلوں سا کام۔۔۔ ہم نے تو پہلے بھی دیکھا ہے اسے۔۔۔ اور اس وقت بھی دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ بیٹھی ہو گاڑی میں تو بیگم صاحبہ نظر آئے گی تمہاری۔ مگر ہمیں کیا۔"

میں نے رئیس کو اور شادو نے مجھے کھینچ لیا۔ ایک بار پھر جذباتی فضا بے حد کشیدہ اور مکدر ہوگئی تھی۔ زندگی کے تلخ حقائق مصلحت کا جامہ اتار کے اپنی ساری بدصورتی کے ساتھ سامنے آرہے تھے اور دلوں کا عناد کسی آتش فشاں کی طرح دھواں دینے لگا تھا جو پھٹنے کے قریب ہو۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں پھٹ پڑا۔ میں نے گلباز خان کو ایک سو ایک گالیاں دیں "حرام زادہ۔ بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ قتل کردیتا کل مجھے پولیس کے آنے سے پہلے ہی۔ اس کے ساتھ میرا ایک دن بھی نباہ نہ ہوتا، یہ مارا جاتا میرے ہاتھوں۔"

شادو نے مجھے ٹھنڈا کیا "چلو اب تو بات ختم ہوئی۔"

رئیس نے بھی کہا "ابے چھوڑ۔ سالے کتے بھونکتے ہیں تو آدمی ان کے ساتھ بھونکنے نہیں لگتا۔ کم ذلت اٹھائی کل اس نے۔ یہ عملہ سب جانتا ہے جن کا وہ باس ہوگا۔ خون کا داغ ضمیر پر تو رہے گا۔"

شادو نے کہا "چلو کہیں اچھی سی جگہ چل کے بیٹھتے ہیں۔ بہت دن سے ہم کہیں نہیں گئے۔ ہنسنا بولنا ہی بھول گئے ہیں۔"

رئیس بولا "باجی ٹھیک کہتی ہے۔ اب ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔"

"ہم آپس کی باتیں کریں گے" شادو بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر دل کے سارے غبار کو خارج کیا اور اس شام کو شادو کی رفاقت کے خوش گوار لمحات کے لیے وقف کردیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس شام کو یاد رکھنے کے قابل ہونا چاہیے کہ جب شادو صحت مند اور خوش و خرم نظر آتی ہے اور ہم سب ساتھ ہیں جو ہمیشہ ساتھ تھے۔ ہم نے ایک بہت پُرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور پھر نہر کے ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے جلو کی طرف نکل گئے۔ اس رات چاند کی پندرھویں یا سولھویں شب تھی۔ چاند دیر سے نکلا تو اس کا اُجالا بہت دُھندلا تھا مگر تھوڑا سا اوپر اٹھ کے وہ پورا روشن ہوگیا۔

ہم نے واپسی میں رات کا کھانا ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں کھایا اور وہیں سے ماسی ہیر کو فون کردیا کہ ہم شاید آج رات دیر سے آئیں یا نہ آئیں۔

رئیس بولا "باجی ٹھیک کہتی ہے۔ اب ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔"

"ہم آپس کی باتیں کریں گے" شادو بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر دل کے سارے غبار کو خارج کیا اور اس شام کو شادو کی رفاقت کے خوش گوار لمحات کے لیے وقف کردیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس شام کو یاد رکھنے کے قابل ہونا چاہیے کہ جب شادو صحت مند اور خوش و خرم نظر آتی ہے اور ہم سب ساتھ ہیں جو ہمیشہ ساتھ تھے۔ ہم نے ایک بہت پُرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور پھر نہر کے ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے جلو کی طرف نکل گئے۔ اس رات چاند کی پندرھویں یا سولھویں شب تھی۔ چاند دیر سے نکلا تو اس کا اُجالا بہت دُھندلا تھا مگر تھوڑا سا اوپر اٹھ کے وہ پورا روشن ہوگیا۔

ہم نے واپسی میں رات کا کھانا ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں کھایا اور وہیں سے ماسی ہیر کو فون کردیا کہ ہم شاید آج رات دیر سے آئیں یا نہ آئیں۔

میں نے کہا "اگر وہ نہ آئے۔۔۔ پھر؟"

"آئیں گے کیسے نہیں۔ مجھے انکار کرہی نہیں سکتے وہ۔"

میں نے کہا "ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔"

"رئیس بھی اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ تم اب انٹر کا امتحان دو گے تو اسے بھی میٹرک کی تیاری کراؤ گے۔"

رئیس ہنسنے لگا "بھابی، یہ اپن کے بس کی بات نہیں۔"

"بس کی بات کیسے نہیں۔ میں دیکھوں گی۔" اس نے چائے بنا کے مگ ہم دونوں کو تھمائے اور ہم اوپر کی منزل پر ٹیرس میں آگئے جہاں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔

"بالآخر ایک دن ہم دونوں ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ ہوجائیں گے۔۔۔ ہم اپنے نام عالم خاں فاضل خاں رکھ لیں گے۔"

"مذاق مت کرو۔ کاروبار کی سوچو۔ کیا کرسکتے ہیں ہم مل کے۔ امپورٹ ایکسپورٹ مارکیٹ دیکھو۔ کہیں بزنس سیٹ ہوجائے تو پھر رئیس خاں کا بھی کوئی بندوبست کیا جائے۔"

وہ چونکا "کیسا بندوبست بھابی؟"

ارے دیورجی۔ کیا ایسے ہی لنڈورے پھرتے رہو گے ساری عمر۔ تمہیں بھی کسی کے ساتھ تو منسلک کرنا ہے۔"

رئیس ہنس پڑا "آپ میں بڑا صبر اور حوصلہ تھا کہ اس

رئیس بولا "باجی ٹھیک کہتی ہے۔ اب ہم کوئی ایسی بات نہیں کریں گے۔"

"ہم آپس کی باتیں کریں گے" شادو بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر دل کے سارے غبار کو خارج کیا اور اس شام کو شادو کی رفاقت کے خوش گوار لمحات کے لیے وقف کردیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ میں نے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور ہم نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اس شام کو یاد رکھنے کے قابل ہونا چاہیے کہ جب شادو صحت مند اور خوش و خرم نظر آتی ہے اور ہم سب ساتھ ہیں جو ہمیشہ ساتھ تھے۔ ہم نے ایک بہت پُرسکون اور خوب صورت ماحول میں چائے پی اور پھر نہر کے ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے جلو کی طرف نکل گئے۔ اس رات چاند کی پندرھویں یا سولھویں شب تھی۔ چاند دیر سے نکلا تو اس کا اُجالا بہت دُھندلا تھا مگر تھوڑا سا اوپر اٹھ کے وہ پورا روشن ہوگیا۔

ہم نے واپسی میں رات کا کھانا ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں کھایا اور وہیں سے ماسی ہیر کو فون کردیا کہ ہم شاید آج رات دیر سے آئیں یا نہ آئیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو پال پوس رہے ہو۔ اپن کو کون بدبخت برداشت کرے گی۔ بھاگ جائے گی دو دن میں یا خود کشی کرلے گی۔"

"ایسا مت کہو۔ ایک دوسرے کی طبیعت کا عکس ہو تم دونوں۔ ایسا نہ ہوتا تو تمہارا ساتھ کب کا چھوٹ جاتا۔ ناصر کے گن بھی مجھ پر اتنے ہی عیاں ہیں جتنے تمہارے بلکہ تم کو میں زیادہ جانتی ہوں۔ پہلے سے جانتی ہوں۔ تم کو تھوڑے سے کنٹرول کی ضرورت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تم نے پڑھا لکھا نہیں ورنہ ناصر سے کسی طرح بھی کم نہ ہوتے۔ خواہ مخواہ کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ اعتماد ہونا چاہئے تمہیں اپنے آپ پر۔" وہ بولتی گئی۔

اس رات نیند جیسے اس کی آنکھوں کا راستہ ہی بھول گئی تھی۔ جب رئیس سونے چلا گیا تو میں اور وہ ٹیرس پر اکیلے رہ گئے۔ وہ میرے ساتھ آ کے بیٹھ گئی "تمہیں نیند تو نہیں آ رہی ہے۔ دیکھو' رات کتنی خوب صورت ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ تمہاری طبیعت اچھی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پھر خراب کرلو۔ چلو سو جاؤ۔"

وہ ہنسی "بس اب سونا ہی سونا ہے آگے۔۔۔ میرا مطلب ہے سونے کی کیا فکر کرنا۔ روز ہی سوتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے تم سے خوب باتیں کروں آج۔"

"آج کیا ہے؟" میں نے اس کی باتوں میں چھپے ہوئے معانی کو نظرانداز کردیا "کل کرلینا باقی باتیں۔"

"نہیں دیکھو اس دنیا کو۔ کیا ان ستاروں سے سجے آسمان کو اور چاندنی کے اجالے کو چھوڑ کے کوئی تاریکی میں گم ہونا چاہے گا اور یہ رات جس میں تم میرے ساتھ ہو۔ میرے اتنے قریب' میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ چھو سکتی ہوں اور محسوس کرسکتی ہوں۔ کیا پتا یہ پھر نہ آئے۔ ایسا نہ ہو کہ باتیں رہ جائیں۔"

میں نے اس کا بازو پکڑ کے اٹھالیا "یہ کیا پاگل پن کی بات ہے۔"

وہ میرے سہارے پر چلنے لگی۔ اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔ لائٹ آف ہوتے ہی جیسے دنیا ایک دم غائب۔ ہر منظر اوجھل۔ چاہے باہر پھول کھلے ہوں۔ دھوپ ہو یا برف پڑ رہی ہو۔ ساری آوازیں ختم' احساس معدوم۔"

میں نے کہا "یہ تم بیڈ روم کا ذکر کر رہی ہو یا قبر کا۔"

وہ ہنسی "نیند اور موت میں کیا فرق ہے آخر۔ ایک رات سورج نکلتے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ دوسری کب ختم ہوگی' کوئی نہیں جانتا مگر انتظار کا وقت گزارنے کا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ نہ سونے والے کو' نہ مرنے والے کو۔"

میں نے اسے بیڈ پر بٹھادیا "مجھے ایک بات بتاؤ' آخر یہ کیا مسئلہ ہے۔ تم کیوں موت کا ذکر کرتی ہو بار بار۔"

وہ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی "اس لیے کہ اب موت سے ملنا ہے مجھے۔ اس کا انتظار ختم ہونے والا ہے۔"

مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں کچھ بول بھی نہ سکا۔

اس نے میرے چہرے کو چھوا "ایکٹنگ مت کرو' تم بھی جانتے ہو یہ بات۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "بھی۔۔۔ بھی کا کیا مطلب ہے شادو جی۔"

"مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا" وہ بڑے سکون کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی اور بولتی رہی "یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مجھے پتا نہ چلتی۔ جب میں ہاشمی صاحب کے ساتھ لندن گئی تھی تو وہاں میرے کچھ ٹیسٹ ہوئے تھے۔ PREGNANCY ٹیسٹ تھے۔ اس میں بلڈ ٹیسٹ بھی ہوئے۔ ڈاکٹرز نے ہاشمی صاحب پر شک کا اظہار کیا اور کچھ دوسرے ٹیسٹ لکھے۔ ان سے کنفرم ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ ہاشمی صاحب کو یہی جان کے ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ دل کے مریض وہ پہلے سے تھے۔ یہ خبر بہت بڑا دھچکا بن گئی' ان کا دل برداشت نہ کرسکا۔ شاید ان کو یہ احساس بھی ہوا ہے کہ انہوں نے مجھ سے شادی کرکے بہت بڑی غلطی کی۔ تم پر ظلم کیا اور مجھے حاصل کرکے انہیں کوئی خوشی نہیں ملی۔ ایک بیوی پہلے تھی وہ مرگئی پھر دوسری شادی انہوں نے تنہائی اور احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے کی تھی مگر قدرت کا فیصلہ پھر ان کے خلاف ہوا۔ بیوی اور بچہ دونوں کی زندگی پر دستِ قدرت نے خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا۔"

میں نے آنسو ضبط کرکے کہا "شادو۔ پلیز' مت دہراؤ یہ باتیں۔"

"مجھے بولنے دو ناصر۔ کہنے دو سب کچھ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید تقدیر پھر اتنی مہلت نہ دے اسی لیے میں نے کہا تھا کہ کہیں باتیں رہ نہ جائیں۔ دل کے دورے کا ایک اور سبب بھی ہوسکتا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس انکشاف کے بعد محسوس کیا ہو کہ میں نے ان کو بے وقوف بنایا۔ انہیں دھوکا دیا اور اپنی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جانے بوجھتے مگر وہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ایسی بیماری جس کی علامات کا دور دور تک پتا نہیں تھا' اس کا علم مجھے کیسے ہوسکتا تھا۔ نہ تو ڈاکٹر بھی فوراً تشخیص نہیں کرپاتے تھے۔ اس کے مخصوص ٹیسٹ ہوئے تھے پھر کہیں جا کے تصدیق ہوئی تھی۔ خیر' وجہ کچھ بھی ہو' اس صدمے نے ان کی جان لی۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں۔ یہ صدمہ ایک بہانہ بن گیا۔ دل کا حال

ان کا پہلے ہی بہت خراب تھا اور یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ خود انہوں نے نہیں بتائی تھی۔ مجھے لندن جا کے معلوم ہوا کہ ہنی مون تو بہانہ تھا۔ دراصل وہ دل کے چیک اپ کے لیے گئے تھے اور شاید علاج کے لیے۔ ڈاکٹرز نے ان سے کہا تھا کہ وہ داخل ہوجائیں۔ اوپن ہارٹ سرجری کا کیس تھا۔ وہ ڈر گئے اور رسک لینے پر تیار نہیں ہوئے۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کی موت کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"ہاں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں لندن لے جا کے خود مار دیا۔ زہر دے دیا انہیں یا ان کا گلا گھونٹ دیا۔ جب ان پر ہارٹ اٹیک ہوا تو میں نے ڈاکٹر کو نہیں بلایا اور نہیں اسپتال لے جانے میں دیر کی۔"

"کیا یہ غلط ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی "ہاں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے انہیں اسپتال لے جانے میں بہت دیر کی لیکن جان بوجھ کے نہیں۔ اگر میں ایمبولینس منگوا لیتی تو شاید ہم بیس منٹ میں پہنچ جاتے۔ معلوم نہیں ان کی زندگی اس بیس منٹ کے فرق سے بچ سکتی یا نہیں مگر میں نے گاڑی خود ڈرائیو کی۔ پہلے میں راستہ بھول گئی پھر ایک پولیس مین نے میری مدد کی۔ میرے پاس تو انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا اور گاڑی کرائے کی تھی۔ پولیس مین نے کہا کہ ٹکٹ تو میں آپ کو بعد میں دوں گا۔ پہلے آپ راستہ سمجھ لیں اور فوراً اسپتال جائیں۔ مریض کی حالت خراب ہے پھر ڈرائیونگ اس نے خود ہی سنبھال لی۔ کمال کے انسان دوست پولیس والے ہیں لندن میں۔ ہر مشکل میں آپ کے سب سے بڑے مددگار۔ بدقسمتی سے کچھ دور جا کے ٹائر فلیٹ ہوگیا۔ اس نے پانچ منٹ میں ٹائر بدل دیا لیکن دیر تو ہوچکی تھی۔ دیر ایک منٹ کی بھی بہت ہوتی ہے۔ اسپتال والے انہیں نہیں بچا سکے۔ انہوں نے بھی کہا کہ آپ بہت دیر سے آئیں۔ بھلا ہو اس پولیس مین کا۔ اس نے میرے حق میں گواہی دی۔"

"چالان کرنا بھول گیا؟"

"نہیں۔ چالان بھی کیا بعد میں لیکن مجھ سے ہمدردی کرکے رخصت ہوا۔ ٹکٹ دینے کے بعد اس نے کہا کہ آپ فوراً رہیں لندن میں اور شاید یہاں کی ایمبولینس سروس اور پولیس سے واقف نہیں ورنہ خود مریض کو گاڑی میں لانے کی غلطی نہ کرتیں۔ آخر ایمبولینس اور ایمرجنسی سروس کس لیے ہوتی ہے۔ وس پاؤنڈ کا جرمانہ بعد میں گلباز خان نے پوسٹ آفس میں جمع کرایا۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے اسپتال سے اپنی رپورٹیں لیں اور میرے پوچھنے پر ڈاکٹروں نے مجھے صاف بتادیا اور میں نے نوشتۂ تقدیر کو قبول کرلیا۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ بس اس کے بعد میں نے طے کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اور تم نے وہی کیا۔"

"ہاں۔ میں نے سب کچھ کرلیا۔ میں بہت مطمئن ہوں آج۔"

"تم نے مجھے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا؟" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم جان لوگے۔ تم سے کچھ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ بیماری ایسی نہیں تھی پھر مجھے کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے بعد تمہارا کیا رویہ ہوتا۔ تم یہی کروگے کہ لاعلم اور انجان بنے رہوگے اور تم میری دلجوئی کے لیے سب کچھ کروگے۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ میں نے تم سے ہر بات منوالی اپنی' اس یقین کے ساتھ کہ اب تم کسی وعدے سے انحراف کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے یہ سب طے کرلیا تھا۔ چنانچہ میں بہت مطمئن ہوں۔ میری زندگی تمہارے کسی کام آئی۔ میں نے تمہارے لیے کچھ کیا۔ یہی احساس بہت اطمینان کا باعث تھا۔"

اب اپنے آنسوؤں کو روکنا میرے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ "یہ ظلم مت کرو شادو مجھ پر۔ ایسا مت سوچو' میرے ساتھ رہو۔"

"تمہارے ساتھ ہوں میں اور رہوں گی ہمیشہ۔" اس نے اپنے دوپٹے سے میرے آنسو صاف کیے۔ "ایسے رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں تم کو روتا دیکھنا نہیں چاہتی۔ میری خوشی اسی میں ہے کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔ کیا تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا شادو۔۔۔ میں کیا کروں؟ تم کہتی ہو زندہ رہو اور خوش رہو۔ کیا یہ ممکن ہے میرے لیے؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اسے ممکن بنا جاؤں۔ تم قسم کھا چکے ہو میرے ساتھ دانا صاحب کے دربار میں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں۔۔۔"

"اس کا مطلب بالکل صاف اور واضح تھا۔ ہم میں سے جو زندہ رہے گا وہ خوش و خرم زندگی گزارے گا۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا "میری قسم کھا کے کہو' کیا یہ غلط ہے۔ اب تمہیں اپنے وعدے پر قائم رہنا ہے ناصر۔ میری ہر چیز تمہاری ہے۔ صرف تمہارے لیے ہے۔ یہی ایک تحفہ دے کے جاؤں گی میں تمہیں۔ تمہیں جتنے دکھ میں نے دیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے روتے روتے اسے چوما "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک دن تمہیں سب بتادوں گی۔ اور تم سے صاف بات کروں گی۔ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو میری بات مانو۔"

"ہر بات تو مانی ہے میں نے تمہاری۔"

"ناصر۔ میری بڑی آرزو تھی کہ تم پڑھ لکھ کے بڑے آدمی بنو۔ عزت' دولت اور شہرت حاصل کرو۔ میں تمہیں کامیابی کی اعلیٰ ترین منزلوں پر دیکھنا چاہتی تھی اور سچی بات تو یہ ہے ناصر کہ میری بھی وہی بچکانا خواہش تھی جو کبھی تمہاری خواہش تھی۔ کہ تم وزیراعظم بنو۔"

"پاگل۔ بالکل پاگل ہو تم۔"

"وزیراعظم نہ سہی' تم دیکھ لینا ایک دن تم کو دنیا سلام کرے گی۔"

میں نے کہا "شادو۔ مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔"

"آدمی کو دنیا میں سب کچھ جس کی وہ آرزو کرے نہیں ملتا لیکن ہمیں تو سب کچھ ہی مل گیا۔ ایک زندگی کی مہلت کم ملی مجھے تو اس کا خدا سے کیا گلہ کرنا۔ جتنی محبت تم نے کی مجھ سے' وہ کس کا نصیب ہوتی ہے۔"

میں روتا رہا۔ "یہ کیسی محبت ہے تمہاری کہ تم ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

"یاد کرو' میں نے کیا وعدہ کیا تھا بلکہ ہم نے کیا وعدہ کیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔ میری محبت ایک مشن تھی۔ ایک مقدس فریضہ تھی میرے لیے۔ میں تم کو اس دنیا میں وہ سب کچھ دینا چاہتی تھی جس کی تمنا یہ دنیا کرتی ہے اور اسی لیے میں تمہارے راستے سے ہٹ گئی تھی کہ میں تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ تم بھول رہے تھے کہ دنیا میں تمہیں بہت بڑے کام کرنے ہیں۔ جن کے سامنے محبت کوئی کام نہیں۔ وعدہ کرو ناصر کہ تم وہ سب کرو گے جو میں چاہتی تھی۔ تم پڑھو گے' خوب پڑھو گے' محنت کرو گے' خوب عزت اور شہرت کماؤ گے۔ تم ذہین ہو' ہمت اور حوصلہ رکھتے ہو۔ اچھا ہوتا اگر تم یہ لیگل فرم چلاتے' میری جگہ بیٹھتے۔ ایک دن ہاشمی صاحب سے بھی بڑے وکیل بنتے مگر تم یہ نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں اس لیے دے رہی ہوں کہ کامیابی کی راہ میں وسائل کی کمی تمہیں کبھی محسوس نہ ہو۔ دنیا کے سب کام پیسے سے چلتے ہیں۔ پیسہ بہت بڑی طاقت ہے اور یہ تمہاری مدد کرے گا۔"

"میں سمجھتا ہوں شادو۔ تم نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔"

"سمجھتے ہو نا۔" وہ خوش ہو کے بولی "اور اب تم کو میرے لیے کرنا ہے۔ کرو گے نا جو میں چاہتی ہوں۔ تم نے میری محبت کی قسم کھائی ہے۔"

ظاہر ہے میرے پاس انکار کی گنجائش اس نے کہاں چھوڑی تھی۔ اس نے ہر طرف سے مجھے وعدوں اور قسموں کی زنجیر میں جکڑ لیا تھا اور میرے گرد محبت کے نام پر مجبوریوں کی ایسی دیواریں کھڑی کردی تھیں جن کو گرانا میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔

یہ میری زندگی کے پہلے جنم کی کہانی ہے۔ وہ جنم جو شادو کے لیے تھا۔ اس کے نام سے تھا اور اسی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ وہ ناصر عظیم جو اس کے بعد بھی زندہ رہا' کوئی اور تھا۔

اس رات کی گفتگو کے بعد پیش آنے والے واقعات میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ اگلے دس دن میں شادو نے اپنی ہر چیز میرے حوالے کردی۔ اس کی لیگل فرم کی ملکیت سے دستبرداری کے بعد گلباز خان نے اسے جو ادائیگی کی وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوگئی جو اس وقت تک میرا اور شادو کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ اس نے اپنی کوٹھی بھی میرے نام کردی تھی مگر میں وہاں ایک دن بھی نہیں رہا اور بعد میں اسے سازوسامان کے ساتھ فروخت کرنے سے پچاس لاکھ مزید وصول ہوئے۔

شادو نے کسی اسپتال جانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کی زندگی کے آخری ہفتے میں جب اس کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی تھی' میں نے ہر لمحہ اس کی قربت میں گزارا۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی وہ میرا ہاتھ تھامے لیٹی رہی اور ایک بات بار بار دہراتی رہی۔ "ناصر۔ اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ خوش رہنا۔ کامیابی کے لیے زندہ رہنا۔"

جب اس کی حالت زیادہ بگڑی تو گھر آنے والے ڈاکٹر انجم نے اسے مسلسل SEDATION میں رکھا اور اسے درد کا احساس مٹانے والے انجکشن لگتے رہے۔ ماسی وہیں اپنا مصلیٰ ڈالے نوافل ادا کرتی رہتی تھی اور خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتی رہتی تھی۔ اس کی زندگی کے بدلے اپنی زندگی لینے کی التجا کرتی رہتی تھی۔ رئیس میرے ساتھ سوتا جاگتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر انجم سر تھامے بیٹھا رہتا تھا یا کمرے میں چکر لگاتے ہوئے ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا تھا۔

آخری بار اسے ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا اور اس کے لیے مجھ سے بات کرنا بھی مشکل

ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس کا ہاتھ تھام کے میں اپنا چہرہ اس کے قریب لے گیا۔ وہ سرگوشی میں رک رک کے بولی "ناصر۔ ایک تے ایک اور وعدہ۔ آخری وعدہ۔ میری خاطر۔"

میں نے اس کا ہاتھ چوم کے کہا "جان اور بیٹیاں مت ڈالو میرے پیروں میں۔"

"بس ایک۔ آخری وعدہ۔"

"بولو۔" میں نے بے بسی سے کہا "اور کیا چاہتی ہو تم؟"

"تم۔ شادی کرلینا۔ نیلم سے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"خدا کے لیے شادو۔" میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ "نہیں۔ رونا نہیں۔ بتاؤ۔ کرو گے۔؟" اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی مگر اچانک اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میرا اقرار سننے سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگئی۔

مجھے یاد نہیں کہ کتنا عرصہ میں نے خود فراموشی اور دیوانگی میں بسر کردیا۔ میں اس بستر پر لیٹا چھت کو دیکھتا رہتا تھا جس پر اس نے میرے ساتھ شبِ عروسی گزاری تھی اور پھر زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ ماسی ہیر میری حالت دیکھ دیکھ کے روتی تھی اور مجھے بہت کچھ سمجھاتی رہتی تھی۔ میں دیوانہ وار اٹھتا تھا اور قبرستان چلا جاتا تھا۔ وہاں رات گئے تک میں شادو سے باتیں کرتا تھا پھر رئیس مجھے ڈھونڈتا ہوا آجاتا تھا اور پکڑ کے گھر لے جاتا تھا۔

ایک رات میں سوتے سے جاگا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے شادو نے جگایا ہے۔ میں اس آواز کے پیچھے چلنے لگا جو مجھے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ یہ میرا نیند میں چلنے کا پہلا واقعہ تھا کہ میں آدھی رات کے وقت قبرستان پہنچ گیا۔ میں نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔

ایسے ہی ایک رات سڑک پار کرتے ہوئے میں کسی گاڑی سے ٹکرا گیا۔ اس وقت تک میں سویا ہوا تھا پھر میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔ نیند میں چلتے ہوئے میں کرنل خان کی جیپ سے ٹکرایا تھا اور وہ مجھے اسپتال لے گئے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد بہت عرصے تک مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ عارضی طور پر میری یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ مجھے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔

کئی ماہ کے مسلسل نفسیاتی علاج کے بعد بالآخر میں واپس زندگی کی طرف لوٹ آیا لیکن یہ زندگی بالکل مختلف تھی۔ اس کا میرے ماضی سے کوئی تعلق تھا تو صرف رئیس کی حد تک۔ اس نے مجھے تلاش کرلیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کرنل خان کے ساتھ جیپ میں دیکھ لیا تھا۔ وہ پیچھے بھاگا اور جیپ کا نمبر دیکھنے میں کامیاب ہوگیا پھر اس نے نمبر کی مدد سے کرنل خان کے گھر کا سراغ لگایا اور بالآخر ایک دن میرے پاس پہنچ گیا۔

میں نے رئیس کو پہچان لیا لیکن نیلم۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر انجم اور اسی طرح ڈاکٹر مشہود' ڈاکٹر انجم اور نوید۔ یہ سب نام میرے لیے بہت عرصہ اجنبی رہے۔

بالآخر میں خان اعظم کے گھر کا ایک فرد ہوگیا۔ انہوں نے مجھے پناہ دی۔ محبت اور شفقت دی۔ پڑھایا لکھایا اور میری تربیت کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے مارشل آرٹ سکھائے اور یہ بتایا کہ مجھے اپنے پیسے کا استعمال کیسے کرنا چاہیے۔ دو سال بعد جب میری یادداشت پوری طرح بحال ہوچکی تھی' وہ پیسہ جو میرے اکاؤنٹ میں بے مصرف پڑا رہا تھا' بڑھ کر ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔

شادو سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق میں زندہ رہا لیکن میں نے نیلم سے شادی نہیں کی۔ اس کا میں نے شادو سے وعدہ ہی نہیں کیا تھا۔ یہ وعدہ لینے سے پہلے ہی وہ مرگئی تھی۔ بہت عرصے بعد رئیس نے مجھے بتایا کہ شادو نے مجھ سے پہلے نیلم کو راضی کرلیا تھا۔ نیلم نے اس سے وعدہ کرلیا تھا کہ اگر ناصر نے چاہا تو وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائے گی اور اس کا خیال اسی طرح رکھے گی جیسے شادو رکھتی تھی۔ رئیس نے مجھے بتایا کہ نیلم نے یہ وعدہ شادو کا دل رکھنے کے لیے مجبوری میں نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی مگر بعد میں اسے مایوسی ہوئی۔ میں اسے ایسے بھول گیا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ نیلم آج بھی فلمی دنیا میں ہے۔ وہ آج بھی بڑی ہیروئن ہے اور شاید پہلے سے زیادہ حسین ہے۔ اس کے پرستار بھی پہلے سے زیادہ ہوں گے مگر ان میں ناصر عظیم نام کا کوئی دیوانہ نہیں ہے۔

خان اعظم کے گھر میں [illegible] ناصر عظیم زندگی کے تیسرے دور میں چند اکا ہوگیا [illegible]س کی زندگی کا پہلا دور یتیم خانے میں گزرا تھا۔ دوسرا دور شادو کا تھا۔ اس کی زندگی کا چوتھا دور کیسے شروع ہوا۔ یہ آپ جانتے ہیں۔ چوتھے دور میں وہ شاہ عالم ہوگیا تھا۔ اس کی کتابِ ماضی کا یہ آخری ورق وہی ہے جو اس کے مستقبل کی کتاب کا پہلا ورق تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے چھوٹے ملک کا چہرہ تھا جسے میں دس سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔

اس کی صورت کے بنیادی خدوخال نہیں بدلے تھے اسی لیے میں نے اسے پہلی نظر میں شناخت کرلیا۔ عمر میں دس برسوں کے اضافے نے اس کی شخصیت کو کچھ بھاری بھرکم بنادیا تھا۔ اگر اس کے چہرے پر داڑھی کا اضافہ ہوجاتا تو وہ بالکل بڑے ملک کی دس سال پرانی تصویر نظر آتا۔

میرا حلیہ کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہ سہی۔ اس وقت اسی بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے چھوٹے ملک کی نظر مجھے نہ پہچان سکی۔

اسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے نکل جانا گستاخی کے مترادف ہوتا اور شک پیدا کرتا۔ ملک کا کوئی نمک خوار تو اسے سلام کیے بغیر دنیا سے گزر جانے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے سکون کا ظاہری اعتماد برقرار رکھا اور لہجے میں موروثی غلامانہ عاجزی کا انداز پیدا کرتے ہوئے ہاتھ کو پیشانی تک اٹھایا "سلاواں لیکم ملک صاحب....."

اسے چھوٹے ملک صاحب کہنے کا خطرہ میں نے عمداً مول نہیں لیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ بڑا ملک ابھی تک زندہ ہے یا مرچکا ہے۔ اس کی موت کے بعد چھوٹے بڑے کا فرق خود بخود ختم ہوجاتا اور چھوٹے ملک کی حیثیت صرف ملک صاحب کی ہوتی۔

اس نے نظرت اور مزاج کے مطابق سر پر غرور کو ہلا کے بھی سلام کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "تم۔۔۔ کون ہو؟"

میں نے پھر ہاتھ سلام کے انداز میں اٹھایا "آپ کے نمک خوار غلام ہیں ہم بھی سرکار۔ نیکے نے کہا تھا۔۔۔"

اس نے سر ہلایا "اچھا اچھا۔ دیکھو اس بار کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔ اسے بارہ بجے کے بعد لانا اور پچھلی طرف سے۔"

اس وقت میں نے بیک ویو مرر میں نیکے کو دیکھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میں نے گاڑی روکنے کے بعد نہ انجن بند کیا تھا اور نہ ہیڈ لائٹس آف کی تھیں۔ گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میرے اور گیٹ کے درمیان شاید تیس گز کا فاصلہ حائل تھا۔ ٹھیک وقت پر ملک پلٹا اور میں نے ایکسی لیٹر دبا کے کلچ چھوڑ دیا۔ میں نے نیکے کے چلانے کی آواز گیٹ سے گزر جانے کے بعد سنی۔ میرا اندازہ ہے کہ پہلے تو گیٹ کیپر کی سمجھ میں ہی نہیں آیا ہوگا کہ وہ کیوں چلا رہا ہے۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے رک کر چھوٹے ملک سے بات کی تھی اور ظاہر ہے چھوٹے ملک نے مجھے نہ پہچانا ہوتا تو وہ خود مجھے روکتا۔ گیٹ بند کرنے والے چوکیدار نے جشنی دیر میں نیکے کی فریاد کا مطلب سمجھا ہوگا' اتنی دیر میں کوٹھی کے اندر سے گاڑی چوری کرکے لے جانے والا بہت دور جاچکا تھا۔ چوکیدار اپنی عادت کے مطابق اندر کی طرف سے گیٹ کھولتے وقت کلاشنکوف ہاتھ میں نہیں رکھتا تھا۔

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے کلاشنکوف کرسی کے سہارے کھڑی چھوڑ دیتا تھا۔ اب وہ کتنی ہی پھرتی کیوں نہ دکھاتا' اسے کلاشنکوف تک پہنچ کے واپس گیٹ تک آنے میں چند سیکنڈ ضرور لگتے اور اس کے بعد بھی وہ اندھا دھند گلی میں فائر نہیں کھول سکتا تھا۔

میں نے چند سیکنڈوں کی اس سہولت سے پورا فائدہ اٹھایا اور ایکسی لیٹر کو دبا کے فرش سے لگا دیا۔ گاڑی زخم خوردہ وحشی درندے کی طرح جست لگا کے بھاگی۔ میں عقب سے آنے والی بندوق کی گولی کے لیے تیار تھا۔ فکرمند نہیں تھا۔ اگر گولی پر میرا نام ہوگا تو میری ہوشیاری کام نہیں آئے گی۔ گولی مجھے ضرور لگے گی اور زندگی باقی ہوگی تو کلاشنکوف کے برسٹ سے بھی مجھے خراش تک نہیں آئے گی۔

شبنم کی اندھیرے میں کھڑی ہوئی گاڑی مجھے دور سے نظر آگئی۔ شاید اس نے بھی اندازہ کرلیا کہ خالی سڑک پر یوں ریس کے انداز میں گاڑی دوڑانے والا میرے سوا کون ہوسکتا ہے کیونکہ جب گاڑی روک کے اور چابی نکال کے میں اس کی طرف بڑھا تو شبنم بالکل تیار تھی۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔

میرے ساتھ بیٹھ کر دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔ اس کی پرانی سوزوکی ایف ایکس ہرگز اس قسم کی ریس کے لیے موزوں نہیں تھی جیسی کہ فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ ایک دو منٹ کے وقفے سے جو گاڑی میرے تعاقب میں روانہ ہوگی' وہ بہت طاقتور انجن والی پے جیرو یا اکارڈ ٹائپ گاڑی ہوگی جو شبنم کی کھٹارا کو ٹکر مار کے ہی چکنا چور کردے گی اور ہم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پیچھے سے فائر کی جانے والی ایک سو ایک گولیاں ہماری اور گاڑی کی باڈی میں سوراخ ہی سوراخ کردیں گی۔

شبنم نے بڑی وحشت اور گھبراہٹ میں سوال کیا "کیا ہوا' دیکھ لیا کسی نے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا "ادھر۔۔۔ گلی میں موڑ کے گاڑی روک لو۔ فوراً۔۔۔ لائٹس آف کردو۔"

شبنم نے کسی روبوٹ کی طرح تعمیل کی۔ اس کی کھٹارا ایک نئی اور چمکتی ہوئی نسان کے آگے ٹھہر گئی۔ میں نے شبنم کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور ہم ایک ساتھ چند قدم چل کے واپس گئے۔ نسان میں کوئی بھی نہیں تھا مگر اسے کھولنے کی کوشش کرنا بھی حماقت ہوتا۔ اس کے سب دروازے سینٹرل لاک سے بند ہوں گے اور اسے غلط چابی لگائی جاتی تو شاید اس کا الارم سسٹم شور کرنے لگتا۔

جس کوٹھی کے دروازے پر نسان کھڑی تھی وہاں چوکیدار کوئی نہیں تھا۔ گیٹ لائٹس روشن تھیں اور میں بند گیٹ کے اندر بھی ایک کار دیکھ سکتا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھے بغیر میں شبنم کے ساتھ باہر گیٹ سے سڑک تک پھیلی ہوئی باڑھ کے پیچھے پہنچ گیا۔ ڈم ڈم کی

گھنی سبز دیوار کا ایک تاریک گوشہ ہمارے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔ ہم سانس روک کے اور سر جھکا کے بیٹھ گئے۔

یہاں ہر کوٹھی کے سامنے اسی قسم کی باڑھ موجود تھی۔ یہ سڑک سے کوٹھی کی دیوار تک کا حصہ کسی کی ملکیت نہیں تھا مگر تقریباً سب نے ہی بیرونی دیوار سے سڑک تک لان بنائے ہوئے تھے اور اسے لوہے کی جالی یا باڑھ سے گھیر کر سرکاری زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس سے سترفٹ چوڑی سڑک مٹ کر تارکول کی بیس فٹ چوڑی پٹی رہ گئی تھی۔

میں بالکل دیوار سے پیٹھ لگائے گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا اور شبنم میرے اور باڑھ کے درمیان تھی اور مجھ سے چپٹی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر سے کبھی کبھی کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی بچوں کے شور کی۔ ایک بار دروازہ زور سے بند ہوا۔ ایک برتن گرا۔ کسی عورت نے شاید کسی ملازم کو ڈانٹا۔

سامنے والے مکانوں کا فاصلہ سو فٹ کے قریب تھا۔ اتنی دور سے کوئی آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سارے گیٹ بند تھے اور ساری گیٹ لائٹس روشن تھیں۔ گاڑیاں ہر گیٹ کے باہر خاموش کھڑی تھیں۔ یہ مہمانوں کی گاڑیاں بھی ہوسکتی تھیں اور مکینوں کی بھی۔ انہیں رات کو سونے سے پہلے اندر کھڑا کرکے گیٹ لاک کردیا جاتا ہوگا۔

شبنم نے اپنے ہونٹ میرے کانوں سے لگا کے کہا "اب کچھ بولیے جناب۔ اتنا ڈرنے کی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "پہلے مجھے یقین تو آجائے کہ میں زندہ ہوں۔"

اس نے بڑے زور سے میرے بازو میں چٹکی لی "اب یقین آیا؟"

میں نے اپنا بازو سہلایا۔ "وہ کوٹھی چھوٹے ملک کی تھی۔ ویسے تو کوئی اسے چھوٹا کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا مگر ایک بڑا ملک بھی ہے۔ اس کا بڑا بھائی ہے۔"

وہ بولی "اب مجھے یاد آگیا۔ یہ کوٹھی ملک شاہنواز کی ہے۔ اس کا بڑا بھائی تھا ملک رب نواز۔"

"تھا کا کیا مطلب ہے خاتون؟"

"اس کا قتل ہوگیا تھا کوئی سال بھر پہلے۔"

وہ سڑک جس پر میں نے سوزوکی پک اپ چھوڑی تھی' میرے دائیں ہاتھ کی طرف سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پیچھے آنے والے جب گاڑی کو لاوارث کھڑا دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ وہاں کوئی دوسری گاڑی پہلے سے موجود تھی اور میں اس دوسری گاڑی میں بیٹھ کے فرار ہوگیا مگر فوراً واپس جاکے ملک کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے سے بات ختم نہیں ہوسکتی تھی۔ ملک ان کو ٹھسے میں گالیاں دیتا کہ سب ایک سے بڑھ کر ایک کام چور اور حرام خور ہیں۔ آگئے دو منٹ میں چھک مار کے مجھے بتانے کہ بندہ بھاگ گیا۔ اوئے' بھاگ کے کدھر گیا۔ جاؤ اس کے پیچھے۔ دیکھو' تلاش کرو آس پاس کی ساری گلیوں میں۔ جیسے بھی ہو اسے پکڑ کے لاؤ۔

چنانچہ کچھ نمک خوار میری تلاش میں سیدھے گئے ہوں گے تو کچھ گلیوں کی خاک بھی چھانیں گے۔ امید ہو نہ ہو' انہیں حق نمک ادا کرنے کے لیے اتنا وقت ضرور گزارنا ہے کہ ملک شاہنواز مطمئن ہوجائے۔ وہ کہہ سکیں کہ ملک صاحب' ہم نے تو سارا علاقہ دیکھ لیا۔ ہر بندے سے پوچھ لیا جو نظر آیا۔ وہ تو چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔

بالآخر شامت آئے گی چوکیدار کی جس نے دیکھے بغیر مجھے نکل جانے دیا۔ اگر پہلے کبھی اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا تو روکا کیوں نہیں؟ اس کا زیادہ سنگین جرم یہ کوتاہی ثابت ہوگی کہ وہ خالی ہاتھ تھا۔ کلاشنکوف آخر کس لیے دی گئی ہے اسے؟ کرسی کے ساتھ کھڑا کرنے کے لیے۔ اس کا بوجھ اٹھائے کھڑا رہنا اسے مشکل لگتا ہے تو چھٹی کرے۔ کلاشنکوف ریڈی ہوتی تو وہ بچ کے جاسکتا تھا؟ چھلنی ہوکے اس کی لاش گرتی گیٹ کے باہر۔

لیکن اصل مصیبت میں پڑے گا نیکے۔ میں نے ملک کے سامنے اس کا نام لیا تھا۔ اب اسے جواب دینا پڑے گا ہر سوال کا کہ اس کی گاڑی میں سوار ہوکے اندر آنے والا کون تھا۔ اسے میرا ناک نقشہ اور حلیہ بتانے والے پولیس کے انداز میں تفتیش رات بھر جاری رکھیں گے۔ اس کے انکار کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ چوکیدار سوبار حلف اٹھائے گا کہ گیٹ سے بندہ تو کیا چوہے کا بچہ تک نہیں گزرا۔ دیوار پھاند کے کسی اجنبی کے اندر داخل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس نے ملک صاحب کے سامنے صرف نیکے کا نام لیا تھا تو صاف ظاہر ہے کہ وہ نیکے کو جانتا تھا۔

شبنم نے کچھ دیر بعد مجھے کہنی ماری "تھک گئی ہوں میں یہاں بیٹھے بیٹھے۔"

میں نے کراہ کے کہا "اچھا۔"

"اچھا کیا۔ ابھی کوئی نکل آئے گا اندر سے۔"

میں نے پھر کہا "اچھا۔"

"یا میرے خدا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو منہ اٹھا کے اُدھر۔"

میں نے کہا "وہ آگئے۔ انہی کا انتظار تھا مجھے۔"

سڑک کی طرف سے ایک جیپ اندر آئی۔ جیپ چل نہیں رہی تھی' رینگ رہی تھی۔ پھر اچانک اندر سے گیٹ کھول کے کچھ لوگ باہر آگئے۔ ان میں دو مرد تھے۔ دو عورتیں اور دو بچے۔ سب سے پیچھے آنے والے مرد اور عورت میزبان تھے جو اپنے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے آئے تھے۔

"یہ کھٹارا کس نے کھڑا کردیا ہے سامنے۔۔۔" شاندار نسان کے مالک نے ناگواری سے کہا۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور اسے کہنی ماری۔ اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی کو کھٹارا ہونے کی سند مل گئی تھی۔ میزبان نے معذرت کی "آیا ہوگا کوئی..... کسی کے گھر۔ گاڑی یہاں چھوڑ دی میرے گیٹ پر۔"

"بداخلاقی نہیں' بدتمیزی ہے سراسر۔ اسے ایٹی کیٹس ہونے چاہئیں کہ گیٹ چھوڑ دیا جائے۔ اب تم کیسے نکالو گے گاڑی اگر کہیں جانا پڑے تو۔"

میزبان اپنے مہمان کی طرح زود رنج نہیں تھا "میں تو نوکروں سے کہوں گا کہ اسے اٹھا کے رکھ دیں سڑک کے بیچ میں' چھوٹی سی چیز ہے۔"

نسان کار کو مالک نے تھوڑا سا آگے پیچھے کر کے نکال لیا۔ دراصل اس کے بالکل سامنے ٹیلی فون کا کھمبا تھا اور پیچھے شبنم نے جلدی میں گاڑی کو ترچھا لگا دیا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی گاڑی بالکل گیٹ کے سامنے آگئی ہے اور دوسری طرف نسان سے صرف ایک فٹ دور ہے۔

نسان کے روانہ ہونے تک جیپ ہمارے بالکل سامنے آگئی تھی۔ اسے چلانے والا سامنے سے زیادہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص مسلح تھا اور اس نے ریوالور ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے نشانہ لے کر فائر کرنے والا ہے۔

صاحب خانہ کو دیکھ کے اس نے آواز دی "صاحب جی!"

گھر کا مالک اور اس کی بیوی رک گئے "کیا بات ہے؟"

"آپ نے ادھر کسی بندے کو تو نہیں دیکھا؟" وہ کود کے نیچے اترا۔

گھر والا گرم ہوگیا "ان سنس۔ سب بندے ہی رہتے ہیں یہاں اور دیکھ تو میں تم کو رہا ہوں' تم کیا ہو؟"

"وہ جی..... بندہ ذرا جوکر ٹائپ ہے۔" اس نے میرا حلیہ بیان کرنا شروع کیا "اپنے ملک شاہنواز صاحب کی کوٹھی میں گھس گیا تھا۔ گاڑی لے گیا۔ گاڑی تو خیر سے مل گئی مگر۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی گھر والی نے گھر والے کو اندر کھینچ لیا اور "ہمیں نہیں معلوم" کہہ کے گیٹ بند کر دیا۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے لمبی مونچھوں والے نے اسے واپس بلا لیا "اوئے' ایسے کیا ہر دروازے پر جا کے پوچھے گا پاگل دے پتر۔ خواہ مخواہ بے عزتی کرائے گا۔"

اندر سے میں نے گھر والی کی آواز سنی "مجھے تو یہ لوگ مشکوک نظر آرہے تھے۔ صورت سے ہی ڈاکو لگتے تھے۔ کیا ضرورت تھی ان سے لمبی بات کرنے کی۔ وہ اندر آجاتے پھر؟"

گھر والا ہنسا "سب سے قیمتی چیز تم خود ہو۔ میں کہتا کہ یہ لے جاؤ۔"

گھر والی مزید خفا ہوگئی "صاف کہو نا کہ پیچھا چھڑانا چاہتے ہو مجھ سے۔"

"میرے چاہنے سے کچھ ہوتا بیگم تو رونا ہی کس بات کا تھا۔"

غالباً وہ دیوار کے بالکل پیچھے باغ میں ٹہل رہے تھے یا لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ جیپ اتنی دیر میں رینگتی ہوئی کافی آگے نکل گئی تھی اور زیادہ امکان یہی تھا کہ مجھے تلاش کرنے والے دائیں بائیں کسی گلی میں مڑ جائیں گے۔ سکون کا گہرا سانس لے کر میں نے شبنم کو اپنے ساتھ اٹھایا۔ آدھے گھنٹے تک ایک ہی پوز میں بیٹھے رہنے سے میری ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ شبنم کا کیا حال ہوگا۔

"آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے تمہیں بھی خوار ہونا پڑا..... تم سے چلا نہیں جا رہا ہے۔ گاڑی چلا لوگی۔ یا میں چلاؤں۔"

"ایک پیر سو گیا ہے کچھ..... ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ایک پاؤں کو جھٹکا "یہ لو جا بی۔"

میں نے سر کھجایا "وہ..... دراصل میں نے رسّا اور اخلاقاً پوچھا تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو بہت نمایاں ہو جاؤں گا۔"

اس نے مسکرا کے چابی لے لی "تمہارے معاملات انتہائی پُراسرار ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر کب تک مجھے نہیں بتاؤ گے تم کہ یہ سب کیا ہے..... تم یہ مضحکہ خیز حلیہ کیوں بنائے پھر رہے ہو۔ ہم کھانا کھانے نکلے تھے۔ اگر تمہیں یاد ہو..... اور دریا کی طرف جانا تھا ہمیں۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی "کھانا؟ کہاں ہے کھانا..... اُف مس شبنم! اگلے چند منٹ میں ہمارا انتقال ہو جائے گا بھوک سے۔"

وہ گاڑی چلاتی رہی "پہلے تم صاف کہہ دیتے تھے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ میں بھی کوئی سوال نہیں کرتی تھی۔"

میں نے کہا "میں آج رات کی صبح ہونے سے پہلے ہی سب بتاؤں گا تمہیں۔ PROMISE۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا تم سے شبنم اور کچھ انکشافات بہت SHOCKING ہوں گے تمہارے لیے۔"

"میرے اعصاب صدمات اٹھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ جو SHOCKS میں برداشت کر چکی ہوں..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "بھول جاؤ پچھلی باتیں۔ اب تم کو ایک مشکل کا سامنا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنا مستقبل چھوڑنا پڑے۔ اور میرا مستقبل اپنانا پڑے۔ کیا تم میں ہمت ہے...؟"

"حامی' میں اس کے لیے تیار ہوں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ تمہارے ساتھ میں ہر مستقبل کو اپنا سکتی ہوں" وہ جذباتی ہونے لگی۔

"مستقبل ایک دنیا ہوتی ہے۔ اپنی اپنی امیدوں' اپنے اپنے مقاصد اور خوابوں کی۔ ہر شخص یہ دنیا خود بناتا ہے اور اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم انسان اس زمین کو چھوڑ کے کہیں نہیں جا سکتے۔ پھر تم کیسے یہ دعویٰ کر سکتی ہو؟"

"مجھے آزماؤ..... جیسے تم چاہو۔ اگر میری زبان اور میرے الفاظ تمہیں ناقابل اعتبار لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔"

اس نے حیرانی سے کہا "کون سے گھر؟"

"گھر..... جہاں میں رہتا ہوں۔ ناصر عظیم کے ساتھ۔"

وہ حیرانی سے بولی "یہ ناصر عظیم کون ہے؟"

"میرا ہم زاد۔ تم جانتی ہو اسے؟"

"مذاق مت کرو۔ میں کسی ناصر عظیم کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔"

میں نے کہا "نام..... نام میں کیا رکھا ہے۔ بہت پرانا قول ہے یہ اور بالکل سچ ہے۔"

"اُف عالی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ کھانا گاڑی میں رکھا ہے۔ اور تم پتا نہیں کیا پہیلیاں بجھا رہے ہو۔" وہ جھنجلا گئی۔

میں نے کہا "چلو پھر پہلے کھانا کھالیں۔ گاڑی روک لو کہیں بھی یا پھر... میرے ساتھ نیشنل اسٹیڈیم چلو۔"

"نیشنل اسٹیڈیم؟ اس وقت....."

"تمہیں کیا معلوم وہاں اس وقت کیا زبردست معرکہ جاری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ دیکھنے کو مل جائے" میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

وہ چکرا گئی "عمران خان..... گواسکر..... کیا کہہ رہے ہو تم۔ میں خود کرکٹ CRAZY ہوں مگر میں نے تو نہیں سنا' ایسے کسی مقابلے کا۔"

"اجی ہم جو کہہ رہے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم۔" میں نے کہا۔

"یعنی میں اخبار کی نمبر ون رپورٹر ہوں اور مجھے نہیں معلوم۔" وہ جل کے بولی۔

"ہاں ہاں تمہیں نہیں معلوم۔ ہم دکھاتے ہیں تمہیں مقابلہ۔"

"عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ..... کوئی ڈبل وکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تو سارا شمراہ آتا۔ اس میں بھی اکیلا عمران خان کیسے کھیلتا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا۔ گواسکر کا پارٹنر الگ ہوتا۔" وہ کنفیوز ہوگئی۔

میں نے کہا "یہ ایک سے ایک کا مقابلہ ہے۔ عمران خان بمقابلہ گواسکر۔"

"اور مقابلہ ہوگا اندھیرے میں' آنکھوں پر پٹی باندھ کے۔ نیشنل اسٹیڈیم میں کون سی فلڈ لائٹس لگی ہیں ابھی۔ دماغ چل گیا ہے تمہارا۔"

"ابھی دیکھ لینا اپنی آنکھوں سے۔ سب کے سامنے مقابلہ ہوگا اور انشاء اللہ جیت ہمارے عمران خان کی ہوگی۔ ارے ادھر کہاں جا رہی ہو۔"

وہ بھنا کے بولی "نیشنل اسٹیڈیم۔ ہم وہاں بیچ پر بیٹھ کے کھانا کھائیں گے۔ مکمل تاریکی' تنہائی اور خاموشی میں۔ کیا آئیڈیا سوجھا ہے جناب کو۔ پندرہ کلومیٹر ہوگی وہ جگہ۔"

میں نے ہنس کے کہا "LET ME DRIVE"

شبنم کا موڈ میرے پُراسرار اور ناقابل فہم رویے' سمجھ میں نہ آنے والے واقعات اور میری بے سروپا باتوں نے خراب کر دیا تھا۔ وہ منہ پھلائے میری جگہ آگئی اور میں ڈرائیونگ کرنے لگا۔ مجھ سے کوئی ڈھنگ کا جواب ملنے کی امید نہیں تھی چنانچہ اس نے بات کرنا ہی چھوڑ دیا اور شاہ عالمی پہنچنے تک باہر دیکھتی رہی۔ پھر بھی جب میں نے گاڑی بس اڈے کے احاطے میں روکی تو اس سے برداشت نہ ہوا۔

"یہ کیا جگہ ہے۔ ہم کیوں آئے ہیں یہاں؟"

میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ "تشریف لائیے۔ یہی ہے نیشنل اسٹیڈیم اور یہاں بڑا زبردست مقابلہ ہے آج۔"

"عمران خان اور گواسکر کا؟" وہ طنزیہ تلخ لہجے میں بولی۔

"یس میڈم۔ آپ ادھر آئیے۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کے اس طرف لے گیا جہاں بہت سی خالی بسیں کھڑی تھیں۔ انہی میں سے کسی ایک کی چھت پر تیسں مار خان کا اپنی محبوبہ چار سو بیس کے ساتھ نظر آنا یقینی تھا۔

جہاں مرغے لڑ رہے تھے وہاں تقریباً دو سو افراد ایک حلقے میں کھڑے تھے یا بیٹھے ہوئے تھے اور سب ایک ساتھ گلا پھاڑ کے چیخ رہے تھے۔

"چل ہیرو۔ شاباش شیر دے پتر۔ مار..... اور مار..... آگے بڑھ راجا۔ شاباش ہیرو' راجا کا بجاوے باجا۔ اوئے صدقے جاواں۔ راجا پر ہزار۔ سو کے ہزار..... ہیرو پر سو کے بارہ سو۔ اوئے بلے بلے ہیرو کو کردے زیرو میرے راجا۔"

میں شبنم کے ساتھ ایک بس کی پچھلی طرف گیا اور چھت پر چڑھا۔ شبنم کو اس وقت تک اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں مرغے لڑائے جا رہے ہیں اور اس کی مجھ سے بیزاری اچانک ایک نئی قسم کی دلچسپی میں بدل گئی تھی۔ میں نے اسے اوپر کھینچ لیا اور وہ لوہے کی چھوٹی سی سیڑھی پر قدم رکھتی چھت پر پہنچ گئی۔

چھت پر ایک فٹ اونچا لوہے کا جنگلا سا بنا ہوا تھا جس کے درمیان مسافروں کا سامان رکھا جاتا تھا۔ بالکل آگے والے حصے سے مقابلے کا منظر اتنا ہی واضح تھا جتنا کمنٹری بکس سے کرکٹ میچ صاف نظر آتا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک بس کی چھت پر مجھے تیسں مار خان بھی نظر آگیا۔ وہ اور اس کی عیار محبوبہ مرغوں کی طرح اچھل رہے تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے کون کس کی طرف تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ تیسں مار خان کی جیب آج پھر خالی ہوگی۔ بازی وہی مرغ جیتے گا جس پر اس کی محبوبہ چھوٹی نے رقم لگائی ہوگی۔

شبنم حیرت زدہ بس کی چھت پر کھڑی مرغوں کی لڑائی اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھتی رہی۔ ابھی جو مقابلہ جاری تھا' وہ ہیرو اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راجا نام کے مرغ تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آخری کانٹے کا مقابلہ جو ہمیشہ عمران خان اور گوا سکر کے درمیان ہوتا تھا' باقی ہے۔

میں نے کہا "یار بیٹھ جاؤ آرام سے اور کھانا نکالو۔"

شبنم نے کھانے کا بیگ مجھے دے دیا "کمال ہے۔ مجھے آج تک اس ..... اسٹیڈیم اور یہاں ہونے والے مقابلوں کا پتا ہی نہیں تھا۔"

"اور یہ پھرتی ہو رپورٹر نمبر ون" میں نے رومال بچھا کے کھانا نکال لیا۔ شبنم نے نعمت کدے سے تندوری مرغ اور نان لیے تھے۔ اس کی خوشبو سے میری بھوک چمک اٹھی مگر اب شبنم کی ساری دلچسپی مرغوں کی لڑائی اور انہیں لڑانے والوں کی دیوانگی پر مرکوز ہو چکی تھی۔ شرطیں لگانے والے مرغوں سے زیادہ جوش میں تھے۔ گھٹنوں کے بل چاروں طرف گھوم رہے تھے اور زمین پر زور زور سے ہاتھ مار کے چلا رہے تھے۔

"یہ عمران خان اور گوا سکر بھی مرغے ہیں؟" شبنم نے کہا۔

"عمران خان میرے دوست رئیس کا مرغا کہلاتا ہے۔ دوسرا گوا سکر ہوتا ہے۔ ہر لڑائی میں مرغ کوئی بھی ہو' ان کے نام یہی ہوتے ہیں۔ ہارنے والے مرغ کو مرنے سے پہلے ذبح کر کے جیتنے والی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اسے بڑے مزے سے روسٹ کر کے کھاتے ہیں۔"

"ہارنے والوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔" شبنم نے افسوس سے کہا۔

"یہی تو ہار جیت کی سنسنی ہے۔ عزت داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ یہ پیسے کی بات نہیں' جذبات کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "کھانا جاری رکھو میڈم۔ مقابلے تو چلتے رہیں گے۔"

ابھی ہم نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ عمران خان اور گوا سکر میدان میں آ گئے۔ یہ تماشا میں نے پہلے بھی بارہا دیکھا تھا۔ اس میں میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر شبنم اس کھیل میں ایسی محو ہوئی کہ کھانا بھی بھول گئی۔ تیس چالیس گز کے فاصلے پر دوسری بس کی چھت پر تیس مار خان اپنی دس نمبری محبوبہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ یہ الگ محفوظ اور باعزت مقام تھا ورنہ اس ماحول میں جہاں ہر طرف بسیں' ان کے ڈھانچے' پرانے ٹائر' ٹیوب اور ازار اور غالتو پرزے۔ ڈیزل اور انجن آئل کے سیاہ اور بدبو دینے والے ڈرم پڑے تھے اور مرغ بازی کے جوشیلے شائقین منہ سے ہر طرح کی جائز اور ناجائز آوازیں نکال رہے تھے' کسی عورت کا پایا جانا ہی غلط تھا۔

مرغے لڑانے والے بیشتر جاہل اور دیوانگی میں حد سے گزر جانے والے لوگ تھے۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ کسی اعتراض پر تکرار بڑھ جاتی تھی۔ کوئی الزام سنگین اختلاف کی صورت اختیار کر لیتا تھا اور دیکھتے دیکھتے مرغوں کی جگہ ان کے مالک میدان میں اُتر آتے تھے۔ گالی گلوچ کے بعد مار پیٹ شروع ہو جاتی تھی اور خود تماشائی کسی نہ کسی طرف سے فریق بن کے اس جنگ میں کود پڑتے تھے۔

شبنم کو یہاں لانے کا مقصد میرے لیے اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں کچھ دیر کے لیے دن بھر کے واقعات کو ذہن سے خارج کر کے سکون کے ساتھ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ چھوٹے ملک سے اچانک ملاقات نے مجھے پریشانیوں کے اور خطرات کے ایک ایسے جنگل میں دھکیل دیا تھا جہاں دس برس کی اجنبی راہوں کا سلسلہ پھر ایک پرانے وقت کے راستے سے جا ملا تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ ایک بار پھر میں اور ملک آمنے سامنے ہوں گے تو پرانی دشمنی کے زخم بھی ہرے ہو جائیں گے۔ بے شک شادو کی قسم سے مجبور ہو کے میں نے چھوٹے بڑے ملک کے خلاف اپنے انتقامی جذبات کو بھی اسی طرح دفن کر دیا تھا جیسے شادو کی محبت کو لیکن میں یہ کیسے بھول سکتا تھا کہ ان دو بھائیوں نے میرے ساتھ اور میری مدد کے جرم کی سزا کے طور پر شادو کے ساتھ کیسا وحشیانہ اور ننگِ انسانیت سلوک روا رکھا تھا۔ آج میں اس کے سامنے بھیس بدل کے گیا تھا اور ممکن ہے آئندہ بھی وہ مجھے اپنی اصل صورت میں نہ دیکھے مگر یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ کسی موقع پر وہ شاہ عالم کو نہیں ناصر عظیم کو پہچان جائے۔

موجودہ حالات میں شبنم کی رفاقت میری ضرورت بن گئی تھی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں شبنم کا اعتماد حاصل کروں۔ وہ بدستور مجھے شاہ عالم تسلیم کرتے ہوئے میری خاطر ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی اور پہلے کی طرح آج بھی شاہ عالم کے لیے راہِ عشق میں فنا ہو جانا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ ایسی ہی محبت میں نے چندا سے کی تھی لیکن بھٹک جانے کے باعث میں نے اپنی منزل گم کر دی تھی۔ اور اب بقول علامہ اقبال۔

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تُو
میرے بھی صنم فانی تیرے بھی صنم فانی

فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنی منزل سے بھٹک جانے کا علم تھا اور شبنم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جسے وہ پورے یقین کے ساتھ شاہ عالم سمجھتے ہوئے جسم و جاں کا مالک تسلیم کیے بیٹھی ہے' وہ درحقیقت ناصر عظیم ہے۔ اس یقین کی بنیادیں ایک شدید صدمے سے عارضی طور پر ہل گئی تھیں مگر اپنے آپ سے لڑ کے شبنم نے جذبات کی دنیا کو تباہی سے بچا لیا تھا۔

اب میرے لیے فیصلے کا مرحلہ زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔ اگر میں اپنے جذباتی اور حقیقی مسائل کا منطقی تجزیہ کرتا اور اسے ریاضی کے سوال کی طرح مرحلہ وار حل کرنے کے امکانات کا جائزہ لیتا تو صورتِ حال کچھ اس طرح سامنے آتی تھی۔

1۔ ناصر عظیم کو چندا سے عشق تھا۔ شاہ عالم بن کے اس نے چندا کو گنوا دیا۔

2۔ اب چندا یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی کہ شاہ عالم پھر ناصر عظیم بن سکتا ہے۔

3۔ شبنم صرف شاہ عالم سے پیار کرتی تھی اور اس کی جگہ کسی ناصر عظیم کو نہیں دے سکتی تھی۔

4۔ شاہ عالم کی جسمانی موت کے بعد اب وہ سیاسی اور عملی طور پر بھی ختم ہو گیا تھا اور دنیا اسے بھول چکی تھی۔

5۔ چنانچہ ناصر عظیم کے لیے اب شاہ عالم بن کے رہنا ناممکن ہو گیا تھا اور وہ ناصر عظیم بننے پر مجبور تھا۔

6۔ ناصر عظیم بن کے چندا تو اسے نہیں مل سکتی تھی مگر اس کا شبنم کو گنوا دینا یقینی نظر آتا تھا۔

یہ بڑی پُراختشار' قوتِ فیصلے کو مفلوج کر دینے والی اور متضاد امکانات کی حامل صورتِ حال تھی مگر میرے لیے فیصلہ ناگزیر تھا اور میں سوچ بچار کی بے یقینی میں وقت گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جیسا کہ رئیس خان نے فرمایا تھا' میں اپنے ماضی اور حال کو ملانے والے پُل پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ جاؤں کدھر کو میں۔

یہ دیکھنے میں ایک فلمی سچویشن لگتی تھی۔ محبت اور نفرت کی ابدی ازلی کشمکش۔ اے کو محبت ہے بی سے مگر بی کو بدگمانی ہے سی کے سبب اور وہ اے کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی۔ سی کو محبت ہے اے سے مگر اے کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بی کی وجہ سے سی کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ بظاہر ایک حل نہ ہونے والا مسئلہ۔ جو کسی پرانی بس کی چھت پر بیٹھ کے مرغوں کی لڑائی دیکھتے ہوئے بہرحال حل نہیں کیا جا سکتا تھا مگر زندگی کوئی فلمی کہانی نہیں جسے مصنف یا ہدایت کار اپنی مرضی سے جدھر چاہے ڈرامائی انداز میں موڑ دے۔

شبنم کا ہنس ہنس کے بُرا حال تھا کیونکہ وہ مرغوں کی لڑائی کے ماہرانہ اسرار و رموز کو سمجھنے سے زیادہ انہیں لڑانے والوں کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے متوجہ کیا اور کہا کہ دیکھو کیا زبردست تماشا ہے۔ میں اپنے خیالات کی گرداب میں غوطہ زن تھا مگر میں نے مسکراتے ہوئے یہ ظاہر کیا جیسے میں بھی محوِ تماشا ہوں۔

دوسرے راؤنڈ میں اچانک عمران خان نے پسپائی کا انداز اختیار کیا اور گوا سکر کی جارحانہ پیش قدمی میں خطرناک شدت آ گئی تو رئیس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے چلا چلا کے عمران خان کا حوصلہ بڑھایا اور اس پر شرط کی بولی بڑھا دی مگر اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ بولی گھٹنے لگی۔ رئیس کی غیرت اور قومی حمیت کو چرکے پر چرکا لگ رہا تھا۔ پاکستان کے عمران خان پر گوا سکر بھاری پڑنے لگا تھا۔ دیکھنے والے عام تماشائی تھے مگر ہارنے فن کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ..... تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

اچانک رئیس خان نے چیخ کر کہا کہ مقابلے میں حرامی پن ہوا ہے۔ گوا سکر کو چابی دی گئی ہے۔ ایسی ہی ایک اور اصطلاح تھی جو بڑی لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مرغے کو طاقت میں فوری اضافہ کرنے والی کوئی دوا دی گئی ہے جس سے وہ ہوش میں نہیں رہا اور جنونی کیفیت میں مرنے مارنے پر تل گیا ہے۔ قواعد و ضوابط کی رو سے یہ فاؤل تھا۔ مرغوں کو بقائمی ہوش و حواس اپنی طاقت کے بل بوتے پر اور مہارت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔

یہ بین الاقوامی ضابطے کی بات تھی۔ تمام EVENTS میں حصہ لینے والے کھلاڑی فوری توانائی والی دوا کھانے کے کسی مقابلے میں شریک نہیں ہو سکتے اور یہ شک ہو جائے تو ان کا DOPE ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اگر اس سے ثابت ہو جائے کہ مقابلے سے پہلے انہوں نے کوئی دوا کھائی تھی تو وہ مقابلے سے خارج سمجھے جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے جیتے ہوئے میڈل بھی واپس لے لیے جاتے ہیں۔

رئیس کے اعتراض نے اس کے مخالفین کو چراغ پا کر دیا اور فوراً شائقین و ماہرین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک الزام کو درست قرار دیتا تھا دوسرا اسے بہانہ کہتا تھا' شکست کی ندامت سے بچنے کا۔ دونوں ایک دوسرے کو بے ایمان کہہ رہے تھے اور بے عزت کرنے کے لیے صرف زبان ہی نہیں چلا رہے تھے' ہاتھ کے اشاروں سے بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے جو یہاں بیان نہیں ہو سکتا۔

مرغے جم کر لڑ رہے تھے اور لہولہان ہو چکے تھے مگر پہلے راؤنڈ میں جیتنے والے عمران خان کی ہار کے آثار واضح ہونے لگے تھے چنانچہ رئیس خان اور اس کے حمایتی مقابلہ روکنے کے لیے گلا پھاڑ رہے تھے۔ تاہم ریفری ابھی تک شش و پنج میں تھے۔

شبنم نے شاید دسویں بار مجھ سے پوچھا "عالی اب کیا ہوگا؟"

میں نے جھنجھلا کے کہا "بابا دیکھتی رہو۔ جو ہوگا تمہارے سامنے ہوگا۔ وہی ہوگا جو ہمیشہ ہوتا ہے۔"

"یہاں تو لڑائی ہونے والی ہے۔"

"تم تصویریں بناؤ' خبر بناؤ۔ فون کرو تھانے میں کہ اندیشۂ نقضِ امن ہے۔ ایس ڈی ایم سے بات کرو" میں نے کہا۔

"تو کیا یہ غلط ہے" شبنم کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی "خدانخواستہ آپس کے جھگڑے میں کوئی زخمی ہو گیا یا مر گیا تو..."

میں نے کہا "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ آج تک کوئی نہیں مرا۔ لڑائی ہمیشہ ہوتی ہے۔ پہلے مرغوں میں پھر مرغے لڑانے والوں میں پھر شرطیں لگانے والوں میں۔ تھوڑی سی ہاتھا پائی ہوگی سب ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑیں گے۔ مکے ماریں گے۔ معمولی چوٹیں ضرور آئیں گی۔ اس کے بعد بیچ بچاؤ ہو جائے گا اور لوگ اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ سب کھیل ہے۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکایت۔ نہ بدلہ نہ دشمنی۔ اگلی بار پھر یہی لوگ ہوں گے' یہی جذبہ اور یہی کھیل۔"

میری پیش گوئی کے عین مطابق جب فری اسٹائل دنگل شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوا تو لوگ آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ میں نے رئیس خان کو پنجے زیادہ دیکھا۔ اسے ایک پہلوان ٹائپ شخص فٹ بال کی طرح اچھال دیتا تھا مگر وہ پھر اس کی توند میں گھس جاتا تھا۔ بیشتر تماشائی بھاگ لیے تھے یا پھر لڑنے والوں کو الگ کرنے کی کوشش میں دونوں سے مار کھا رہے تھے مگر ان کی امن قائم کرنے کی لگن میں فرق نہیں آیا تھا۔

بالآخر ہنگامہ فرو ہوا۔ فریقین اب اپنی اپنی دھوتیاں اور لنگیاں باندھ رہے تھے یا کس رہے تھے۔ جوتے تلاش کر رہے تھے اور ہائے ہائے کرتے ہوئے پھٹے کپڑوں میں سوجی ہوئی ناک یا چہرے کے نیل لئے رخصت ہو رہے تھے مگر جاتے جاتے اعلان کر رہے تھے کہ "پتر اگلی مرتبہ دیکھنا۔ تمہاری تو۔۔۔" اور انہیں جواب دینے والے بھی سینے پر ہاتھ مار کے کہتے تھے کہ چل۔۔۔ دیکھ لیں گے ہم بھی۔ ان کے تمام دعوے، چیلنج، اعلانات اور عزائم کا اظہار انتہائی فحش گالیوں اور اشاروں کی ناقابلِ اشاعت زبان میں ہو رہا تھا۔

شبنم ہکا بکا اور کسی قدر افسوس زدہ انداز میں سب کچھ دیکھتی رہی تھی "یہ کتنا INHUMANE ہے۔ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔"

"اس لیے کہ وہ مرغے لڑتے لڑتے زخمی ہو گئے۔" میں نے کہا "زیادہ قنوطی اور PHILOSOPHICAL ہونے کی ضرورت نہیں۔ لاکھوں مرغے روز ہاک پر بھون کے کھا جاتے ہیں لوگ۔"

"وہ اور بات ہے۔ انسانوں کا یہ جذبہ کتنا وحشیانہ اور اذیت پسند ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ جیسے رومن عہد میں غلام لڑائے جاتے تھے اور بھوکے شیر کا مقابلہ GLADIATORS کرتے تھے۔ یہ رومن شہریوں کی تفریح تھی۔"

میں نے کہا "اور فٹ بال، باکسنگ جو اسپین کا قومی کھیل ہے۔ یا ریسلنگ اور فری اسٹائل ریسلنگ۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ سب کھیل ہیں۔"

میں نے کہا "یہ بھی کھیل ہے۔ INHUMANE تو وہ کھیل ہے، جو انسانوں کو لڑانے والے کھیلتے ہیں۔ مذہبی منافرت کے جذبات کو ہوا دے کر یا نسلی فساد کا بیج بو کر۔ اسرائیل یا مسئلہ کشمیر کو بنیاد بنا کے۔۔۔"

"اب PHILOSOPHICAL کون ہو رہا ہے۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "او کے۔ کھیل ختم ہوا۔ کھیل ختم ہوا۔ آؤ اب چلیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میں شدید اعصابی اور ذہنی دباؤ میں تھا۔"

"I FEEL MUCH BETTER TOO" شبنم نے تسلیم کیا۔

رزم گاہ میں اب بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ رئیس خان بڑی محبت کے ساتھ زخمی عمران خان کو گود میں لیے ایک طرف کھڑا تھا۔ ان کا حریف گواسکر کا مالک ماہرین فن کی ایک جیوری کے سامنے بیان دے رہا تھا۔ رئیس نے چاقو دینے یا بیڑی لگانے کا الزام بے سبب اور اس لیے عائد نہیں کیا تھا کہ اس کا مرغا ہار رہا تھا۔ رئیس کے لیے یہ صرف کھیل تھا۔ لہو گرم رکھنے کا بہانہ۔ اسے وہ پورے اہتمام اور اسپورٹس مین اسپرٹ کے ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ پیشہ ور مرغبازوں کی طرح صرف جیتنے اور پیسہ کمانے کے لیے بے ایمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا چنانچہ بے ایمانی برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم تحقیقاتی کمیشن کی کارروائی میں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے چنانچہ میں نے شبنم کو آگے نہیں جانے دیا ورنہ اس کی رگِ صحافت پھڑک رہی تھی اور وہ لڑنے اور لڑانے والوں کے تاثرات لینا چاہتی تھی۔ ماہرین سے انٹرویو کرنا چاہتی تھی اور اس کھیل پر ایک فیچر مرتب کرنے فکر میں تھی۔ میں نے اسے یہ سب نہیں کرنے دیا۔ اس سے کھیل کی اصل اسپرٹ متاثر ہوتی۔ یہ جوا تھا اور غیر قانونی کھیل تھا مگر رئیس جیسے لوگوں کے لیے اس میں EXCITEMENT کا پورا سامان تھا۔ تفریح تھی اور وہ خوشی تھی جو میدان میں فتح سے حاصل ہوتی ہے خواہ وہ جنگ کا میدان ہو یا کھیل کا۔ ایسے ہی کھیل پتنگ بازی اور آتش بازی ہیں جو قانون اور ضابطۂ اخلاق کی زد میں آ کے جرم بھی ہو جاتے ہیں مگر ان کی سنسنی خیزی انہیں عوام میں ہمیشہ مقبول بنائے رکھتی ہے۔

رئیس نے جو لباس فاخرہ اس موقع کے لیے بطور خاص زیب تن کیا تھا، اس کا حشر نشر ہو گیا تھا۔ ریشمی کرتے کی ایک آستین شانے سے جدا ہو چکی تھی اور سامنے سے گریبان اتنا نیچے تک چاک تھا کہ سرخ ازار بند کا ایک حصہ دامن پر خونی لکیر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ رئیس ایک ہاتھ سے گردن کو سہلا رہا تھا اور اس کی دائیں آنکھ کے نیچے ایک نیل تھا۔ فریق ثانی کی حالت بھی ابتر تھی۔ اس کی دھوتی ایسے پھٹی تھی کہ وہ باادب بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ رئیس خان کئی بار دوڑ دوڑ کے اس کے پرگوشت مٹکے جیسے پیٹ میں گھسے تھے۔ اس سے غالباً اندر کے حصے بھی متاثر ہوئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑے کراہ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بار بار ناک کو چھو کے دیکھتا تھا کہ اب کتنی سوج چکی ہے۔

بالآخر جیوری نے گواسکر کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا کہ اس کو بیڑی لگائی گئی تھی۔ عمران خان اس فیصلے کے نتیجے میں فاتح قرار دیا گیا تو رئیس نے نعرہ لگایا اور منہ پر ہاتھ رکھ کے حلق سے وہ آوازیں نکالیں جو فتح کی خوشی میں اور دشمن کی تذلیل کے لیے مخصوص ہیں۔ پھر اس نے بھنگڑا ڈالا اور اس کے چار پانچ ساتھیوں نے بھی رئیس کا ساتھ دیا۔ شکست خوردہ حریف نے واجبی سا احتجاج کیا۔ پھر وہ سوگوار چہروں کے ساتھ ہارے ہوئے گواسکر پر الوداعی نظریں ڈال کے رخصت ہو گئے۔

رئیس نے فوراً جیب سے چھری نکالی اور گواسکر کے گلے پر

پھیر دی۔ جیوری کے فیصلے میں تاخیر ہوتی تو شاید وہ حرام موت مرجاتا کیونکہ نشہ اترنے کے بعد وہ ویسے ہی نیم مردہ ہو گیا تھا۔ انعامی رقم دس فیصد کرنے کے بعد باقی شرط لگانے والوں میں تقسیم کر دی گئی تو میں نے رئیس کو آواز دی۔

وہ چونکا اور پھر بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے عید ملنے لگا "اے بازی جیت لی عمران خان نے۔ تو نے دیکھا۔۔۔ کب آیا تو۔"

میں نے کہا "میں نے ہی نہیں، شبنم نے بھی پورا مقابلہ دیکھا۔"

شبنم کو دیکھ کے رئیس جھینپا "اچھا جی۔۔۔ آپ بھی ہو۔۔۔ خیر سے صحافی بھی موجود تھے۔ کیسی لگی آپ کو فائٹ۔"

شبنم نے کہا "کس فائٹ کی بات کر رہے ہو؟ مرغوں کی یا انسانوں کی؟"

رئیس نے جاے سے باہر ہونے والے ازار بند کو واپس سیٹ کرنیفے میں اڑسا "قسم اللہ کی آج تو بڑا خون خرابا ہو جاتا۔ سالے بے ایمان۔ استادی کرتے ہیں استادوں سے۔ وہ کیا شعر ہے، عمرا سی جنگل میں بھٹکتے گزری ہے۔"

میں نے کہا "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔"

شبنم نے کہا "مگر تم کو اندازہ کیسے ہوا آخر کہ دوسرا مرغا۔۔۔ یعنی گواسکر نشے میں ہے۔"

"جی۔ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہو گا کہ بندہ ہوش میں بات کر رہا ہے یا نشے میں بول رہا ہے۔ آپ لوگ کہاں تھے؟"

میں نے بس کی طرف اشارہ کیا "اس کی چھت پر بیٹھ کے ہم نے ڈنر بھی کیا اور ایک ٹکٹ میں دو مزے لیے۔ سچی بات ہے مرغوں کی لڑائی میں اتنا لطف نہیں آیا جتنا بعد میں ہونے والے فری اسٹائل دنگل میں مزہ آیا۔"

رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا "اے یار وہ کہاں گئے۔ میں نے انہیں بھی دیکھا تھا۔ تمیں مار خان اور اس کی دس نمبری محبوبہ کو۔"

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے آپس میں کوئی شرط ضرور لگائی تھی۔ بہت اچھل رہے تھے دونوں" میں نے کہا۔

رئیس نے افسوس سے سر ہلایا "سالا پھر ہارا ہو گا۔ اور اب رو رہا ہو گا۔ خیر چلتے ہیں باہر۔"

رئیس نے عمران خان کو ایسے گود میں اٹھا رکھا تھا جیسے ماں بچھڑے ہوئے بچے کو کلیجے سے لگاتی ہے۔ اس نے ذبح کیے ہوئے گواسکر کی لاش کو ایک ٹانگ سے پکڑ کے لٹکایا اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔

شبنم نے پھر اس مقابلے کے اخلاقی پہلو پر تبصرہ کیا "ایک تو یہ بے زبان جانوروں پر ظلم ہے اور پھر کھیل کے بعد انسانوں کا جانوروں کی طرح لڑنا۔"

"جی، یہی تو مزہ ہے سارا۔ اگر یہ سب نہ ہو تو مقابلہ ہی پھس پھسا ہو جائے۔ جیسے وہ ٹینس کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک نے ادھر سے گیند کو مارا۔ دوسرے نے دوسری طرف سے۔ اور گیند کے ساتھ تماشائی الو کی طرح دیدے گھما رہے ہیں اِدھر سے اُدھر۔ گیند گر گئی تو تالی بجا دی۔"

نیشنل اسٹیڈیم یعنی اس بس اسٹینڈ کے احاطے کے باہر گاڑی کے پاس تمیں مار خان اور اس کی گرل فرینڈ دونوں موجود تھے مگر ایک دوسرے سے دور اور دو مخالف سمتوں میں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھا چکے ہیں۔ ان کے تیور بتاتے تھے کہ مرغوں سے زیادہ لڑائی ان کے درمیان ہوئی ہے۔

رئیس کو دیکھتے ہی تمیں مار خان لنگڑاتا ہوا آگے آیا "صاب۔۔۔ اوئی ام مرگئی۔ ایلی آپ ام کو معاف کرتی۔"

"ابے تو مر گیا ہے تو میں کیسے معاف کروں۔ اللہ معاف کرے گا اگر تیرے اعمال اچھے ہوئے۔" رئیس نے کہا۔

"اوجی۔۔۔ ام مانی مانگتی۔۔۔ روتی۔۔۔ ام آج ہیگا ڑی نہیں چلاتی۔ امارا ٹانگ ایک دم ٹوٹ کے چکنا چور ہوتی' اوئی۔"

میں نے کہا "ٹانگ ٹوٹی ہوتی تو تم سیدھے کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک قدم چلنا تو دور کی بات ہے۔ آخر ہوا کیا تمہارے ساتھ؟"

"اور یہ کیا اوئی اوئی لگا رکھی ہے تو نے۔ سیدھی طرح بات کر۔" رئیس نے اسے ڈانٹا۔

اس نے مظلوم صورت بنا کے دردناک لہجے میں فریاد شروع کی۔ "صاب جی' یہ ظالم جلاد کا بچی۔ ام اس کو عزت سے لاتی۔ اوپر بٹھاتی۔ تھلی کھلاتی اور چھوڑے۔۔۔ عمران خان کا فائٹ دکھاتی' یہ ظالم جلاد کا بچی' اوئی۔"

چھوٹی ایک دم آگے آئی "ارے خبردار جو میرے باپ کو ظالم یا جلاد کہا۔ ابھی ایک ٹانگ ٹوٹی ہے۔ دوسری بھی توڑ کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی۔ جھوٹے زمانے بھر کے۔ مجھے الزام دیتا ہے۔"

"ہاں۔ تم ام کو دھکا دیتی۔ ام دھڑام سے ۔۔۔ اوئی۔۔۔ نیچے گرتی۔۔۔ امارا ہوش اڑ جاتی۔"

اب چھوٹی نے زبان کو لگام کی قینچی کی طرح چلانا شروع کیا۔ "ارے خدائی خوار' لپاڈیئے' کچھ شرم حیا کر۔ اتنا جھوٹ بولے گا تو منہ ہو جائے گا سؤر کا۔ پہلے ہی کم نحوست نہیں برستی شکل پر۔۔۔ میں نے کب دھکا دیا تجھے۔۔۔؟"

"تو نے دھکا نہیں دیا تو کیا یہ خود کشی کرنا چاہتا تھا؟ اوپر سے کیلے ٹپک گیا۔ شور مت کر خواہ مخواہ۔ آہستہ نہیں بول سکتی" رئیس نے چھوٹی کو بھی ڈانٹ لگائی۔

مگر وہ رئیس کو خاطر میں نہیں لائی "اوجی' آپ بھی مجھے دباتے ہو۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے۔ جو سچ ہے وہ تو سارے زمانے کو چلا چلا کے بتاؤں گی۔ یہ جھوٹا ہی نہیں بے ایمان بھی ہے۔"

تمیں مار خان نے احتجاج کیا "صاب جی' یہ ایک دم بکواس فراتی۔۔۔ خود جھوٹ بکتی۔۔۔ یہ ام کو دھکا دیتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹی چلانے لگی "ارے کچھ شرم کرڈھائی فٹیے۔ منہ پر ہاتھ بھر لمبی مونچھیں چپکائے ہوئے پھرتا ہے۔ یہ نقلی ہیں کیا؟ مردوں والی مونچھ ہے تو منڈوالے۔ تو خود اچھل رہا تھا فٹ بال کی طرح۔ نیچے گر گیا تو مجھے الزام دیتا ہے۔"

رئیس نے دہاڑ کے کہا "چوپ..... بند کرو اپنی بکواس دونوں۔ کیوں بے تمیں مارخان' آج کتنی رقم ہاری ہے تو نے؟"

وہ مردہ آواز میں بولا "صرف دو سو روپیہ نقد جناب..... اوئی۔"

"سالے' اوئی کے بچے۔ نمک حرام' غدار!" رئیس آگ بگولا ہوگیا۔ "تو نے گواسکر کی جیت پر رقم لگائی تھی۔ تو چاہتا تھا کہ عمران خان ہارے۔"

"صاب..... ام کو یہ مجبور کرتی..... اپنا قسم دیتی..... پھر ام کیا کرتی۔ آپ جانتی ام عمران خان کا واسطے جان قربان کرتی۔ ام آپ کا لحاظ کرتی۔ اور کوئی ام کو غدار بولتی تو ام اس کو قتل کرتی..... ام سچا خالص پاکستانی ہوتی۔ اوئی۔"

میں سمجھ گیا کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اپنی محبوبہ دلنواز کے حکم کی تعمیل میں تمیں مارخان نے گواسکر کی جیت پر دو سو روپے لگادیئے۔ ایک تو ویسے ہی دل ہارنے کے بعد دو سو روپے ہارنا اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ زیادہ اہم تھی اس کی دلداری۔ پھر جتنا اس کی دس نمبری محبوبہ لوٹنا چاہتی تھی' اس سے زیادہ لٹنے پر خود تمیں مارخان کمربستہ تھا۔ وہ جتنی عیار تھی یہ اتنا ہی احمق تھا۔ گواسکر کی جیت کا امکان بہت کم تھا چنانچہ خود اس نے عمران خان پر پیسے لگائے اور تمیں مارخان سے ایک ادائے ناز کے ساتھ مسکرا کے کہہ دیا کہ اب تم میرا دل رکھنے کے لیے ہی گواسکر پر شرط لگاؤ تو بات ہے۔ اور ظاہر ہے' تیر نگاہِ ناز کا گھائل انکار نہ کرسکا۔ شرط ہارنے کے بعد اس نے دو سو روپے دینے میں لیت و لعل سے کام لیا تو چھوٹی نے اسے غصے میں دھکیلا کہ جاؤ دفع ہو۔ میں تیری صورت نہیں دیکھوں گی آئندہ۔ اور وہ بدقسمتی سے خود کو سنبھال نہ سکا۔ لڑکھڑایا تو جنگلے سے الجھ کے نیچے جا گرا۔

بالآخر میں نے تمیں مارخان کی طرف سے دو سو روپے کا تاوان چھوٹی کو ادا کیا۔ اس کے پاس جو سو روپے تھے' وہ تمیں مارخان پہلے ہی خاطر مدارات پر صرف کرچکا تھا۔ اس کے بعد ایک نیا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ چھوٹی نے مطالبہ کیا کہ مجھے گھر سے لائے تھے تو گھر چھوڑ کے آؤ۔ تمیں مارخان کے پاؤں میں موچ آئی تھی یا واقعی فریکچر ہوا تھا۔ وہ گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ نہ وہ رئیس سے کہہ سکتا تھا اور نہ مجھ سے کہ اب آپ ہی تکلیف کریں۔ اس کی جیب میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے۔ رئیس نے دو سو روپے دے کے یہ مسئلہ حل کیا۔ عادت کے مطابق تمیں مارخان نے احسان مندی کے جذبات کا اظہار ایک رقت انگیز تقریر سے کیا۔

"سالے دونوں ڈرامے باز ہیں" رئیس نے کچھ دور آنے کے بعد کہا "الو بناتے ہیں رئیس خان کو۔ وہ بھی صرف دو سو روپے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟" شبنم کچھ حیران ہوئی۔

"مطلب ابھی دیکھ لو جی" رئیس نے گاڑی ایک طرف پارک کردی "قسم اللہ کی دل کا معاملہ ہے اس لیے ہم نے کہا کہ جاؤ عیش کرو۔"

رئیس کی بات پر تعجب مجھے بھی ہوا تھا مگر کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو تمیں مارخان اور اس کی دس نمبری محبوبہ ہنستے مسکراتے چلے آرہے تھے۔ تمیں مارخان جس ٹانگ کے بارے میں واویلا کررہا تھا کہ چکنا چور ہوگئی ہے' اس میں نام کو بھی لنگڑاہٹ نہیں تھی اور وہ دونوں محبت کے متوالے اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ یہ پاکستان نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے نظر آتے۔ مجھے اور شبنم کو ان کی چالاکی پر ہنسی آئی "تو نے خوب پہچانا یار۔"

رئیس نے غیر موجود مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "ابے' ہم آدمی کے حرامی پن کو فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ سالا اب اسے کھانا کھلائے گا کہیں' چکن تکے اور پراٹھے۔ پھر آدھی رات کو جائے گا گھر چھوڑنے۔ رات کو وہیں فرید عباسی کے گھر پر رکے گا اور صبح آئے گا تھوڑا بہت لنگڑاتا ہوا کہ ابھی ٹانگ کچھ ٹھیک ہوتی۔ ام ڈاکٹر کو دکھاتی' وہ دوا دیتی۔ اوئی' شام تک کہے گا کہ بالکل ٹھیک ہوں۔"

شبنم کے لیے وہ تہ خانہ اور وہاں تک پہنچنے کا پُرپیچ راستہ دلچسپی سے زیادہ حیرانی کا سبب بنا۔ گاڑی میں چلا رہا تھا چنانچہ رئیس نے ادھر ادھر دیکھ کے گیراج کا تالا کھولا اور شٹر اٹھایا۔ میں گاڑی کو اندر لے گیا تو اس نے شٹر فوراً گرادیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا پھر رئیس نے بٹن دبا کے بلب جلایا۔

میں نے کہا "تشریف لائیے۔ رئیس خانہ آگیا۔"

رئیس نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیے۔"

میں نے کہا "قدم رنجہ..... جاہل کی اولاد۔"

وہ جھینپ کے بولا "ابے ہاں وہی' تو ہم سے کہتے ہیں کہ رئیس خانے میں قدم رنجہ فرمائیے۔"

شبنم اتر آئی "تم..... یہاں رہتے ہو عالی!"

"ہاں۔ کیا جگہ پسند نہیں آئی تمہیں۔"

"یہاں جگہ ہے بھی کہاں۔ اور تم نے تو کہا تھا کہ کوئی تہ خانہ ہے۔" شبنم نے گیراج کی بے سروسامانی کو دیکھا جہاں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد ہر طرف مشکل سے تین تین فٹ جگہ رہ گئی تھی۔

میں نے کہا "یہ شہرِ طلسمات کا پہلا در ہے۔ آگے آگے دیکھئے' ہوتا ہے کیا۔"

رئیس نے زینے کے دروازے کا قفل کھولا۔ ہم اوپر گئے' گیراج اس گھر کا ایک حصہ تھا جو رئیس کے اصل گھر' خانے کے پہلے حصے میں واقع تھا۔ اس کا دروازہ بھی پیچھے والی دوسری گلی میں کھلتا تھا۔ رئیس نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے خرید لیا تھا اور پھر ایک دروازہ نکال کے دونوں کو آپس میں ملادیا تھا۔ آج کل ہم اسی گھر سے آتے جاتے تھے۔ رئیس خانے کا سامنے والا مین گیٹ جو دوسری گلی میں تھا اور رئیس خانے کا اوپر والا حصہ عرصے سے بند پڑا تھا۔ لوگ قسم کھا کے کہہ سکتے تھے کہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔

اس گھر کے اسٹور روم میں رئیس نے ایک الماری کے دو پٹ کھولے۔ یہاں وہ زینہ تھا جو رئیس خانے کے دو کمروں والے تہ خانے میں اترتا تھا۔ شبنم کے لیے یہ سب بہت پُراسرار اور عجیب تھا۔ تہ خانے کے دونوں کمرے پوری طرح آراستہ تھے اور وہاں ضرورت کی ہر چیز نظر آرہی تھی۔ پُرتکلف بیڈ روم میں قالین اور پردوں کے علاوہ فون' ٹی وی اور وی سی آر تک موجود تھے۔ کمرے کی فضا میں حبس تھا اور گھٹن تھی۔ رئیس نے اسپلٹ اے سی کو آن کردیا تو چند منٹ میں ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہونے لگا۔

شبنم ہر چیز کا جائزہ لینے کے بعد صوفے پر بیٹھ گئی۔ "عام طور پر لوگ اپنے گھروں میں اتنے اہتمام سے تہ خانے نہیں رکھتے۔"

رئیس ہنسا "اوئی۔ اپن عام لوگ نہیں ہیں نا۔"

میں نے کہا "کیسی لگی یہ جگہ؟"

"بہت۔ محفوظ۔ مگر کچھ عجیب سا احساس ہوتا ہے مجھے۔ کہ ہم زمین کے نیچے دس فٹ کی گہرائی میں ہیں اور اوپر ہے وہ دنیا۔"

"زندہ انسانوں کی دنیا۔ یہ جگہ کسی فرعون کے اہرام کی طرح لگتی ہے۔ یہاں بہت خاموشی ہے۔ اوپر کی دنیا کی کوئی آواز یہاں سنائی نہیں دیتی۔ شروع شروع میں مجھے بھی بہت عجیب لگا تھا یہ سب۔ پھر میں عادی ہوگیا۔ اب یہاں مجھے دم گھٹتا محسوس نہیں ہوتا۔ آؤ اب باقی شہرِ طلسمات کا نظارہ بھی کرلو۔"

رئیس کو اپنی حالت سے زیادہ عمران خان کی دوا دارو اور مرہم پٹی کی فکر تھی۔ تن جانی گواسکر نے نشے کی مستی میں اپنی جان تو گنوائی تھی مگر عمران خان کو بھی بری طرح زخمی کردیا تھا۔ مجھے اس کا آئندہ کوئی مقابلہ جیتنا تو کیا زندہ رہنا بھی مشکل نظر آتا تھا مگر میں نے اس خیال کا اظہار کیا تو رئیس آبدیدہ ہوگیا۔

"ایسا مت کہہ پیارے۔ یہ علاج سے ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "اللہ کرے ہوجائے مگر اسے آئی سی یو میں رکھنا پڑے گا۔"

شبنم نے کہا "جانوروں کے اسپتال میں بھی آئی سی یو ہوتا ہے۔ انتہائی نگہداشت کا شعبہ۔"

رئیس نے افسوس سے سر ہلایا "علاج یہیں ہوگا جی۔ اپنے مرغی خانے میں۔ اور آپ دیکھنا' صبح استاد مولا داد کی دوائی کا جادو۔ وہ بہت بڑا اسپیشلسٹ ہے۔"

میں نے کہا "میری دلی دعا ہے کہ عمران خان کو عمرِ خضر ملے۔ لیکن فرض کرو یہ ٹرننے کے قابل نہ رہا۔"

"تو پھر اسے چھوڑیں گے کسی پولٹری فارم میں مرغیوں کے ساتھ۔ جب تک جئے عیش کرے" رئیس بولا "پہلے بھی بہت چھوڑے ہیں۔"

"اور وہ سب اپنے اپنے حرم میں خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ تجھے یاد نہیں آتی ان کی؟"

"ابے ایک مرغا کتنی بازیاں جیت سکتا ہے آخر؟ اپن جسے عمران خان کا نام دے کے مقابلے پر لاتے ہیں تو اس نام کی عزت کا زیادہ خیال ہوتا ہے۔ ہر مرغا اس قابل نہیں ہوتا۔ اب یار کیا پتا چھ مہینے لگ جائیں یا سال بعد کوئی اس کا جانشین بننے کے لائق ہو۔" اس نے ایک سرد آہ بھری "ویسے ایک پٹھا تیار کیا ہے میں نے۔"

شبنم نے کہا "خدانخواستہ۔ آج اگر گواسکر سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ کام آجاتا؟"

میں نے کہا "تو ہم دو مرغ روسٹ کرکے کھاتے۔"

"ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کرالو کے پیچھے۔" رئیس کا صدمے سے بُرا حال ہوگیا "اپنے انہی ہاتھوں سے تین کو دفنا چکا ہوں۔ باغ جناح میں۔ عمران خان کو خود روسٹ کرکے کھا جاؤں میں' توبہ توبہ۔ ایسا خیال بھی کیسے آیا تجھے۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میرا مقصد تیرے جذبات کو مجروح کرنا نہیں تھا۔ لوگ بڑے شوق سے جانور پالتے ہیں اور بہت محبت کرتے ہیں ان سے مگر آخری وقت آجائے تو یہی کرتے ہیں۔ ذبح کرکے کھا جاتے ہیں۔"

"ویسے تو گواسکر بھی مرغا ہی ہے۔" شبنم نے کہا۔

"لوجی۔ اس کا عمران خان سے کیا مقابلہ۔ وہ مالِ غنیمت ہے اور حلال ہے" رئیس بولا۔

سارا مسئلہ جذبات کا تھا۔ رئیس کے لیے فتح و کامرانی کا نشان ہر عمران صرف ایک مرغ نہیں تھا جسے بھون کے کھاتے ہوئے اسے دکھ نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے سونے کا گولڈ میڈل جیتنے والا کوئی ایتھلیٹ اگر پیٹ بھرنے کے لیے اسے سنار کے حوالے کرنے پر مجبور ہو تو اسے صدمہ ضرور ہوتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک وہ سونا نہیں' اس کی ذاتی فتح و نصرت کی سند اور علامت ہوتا ہے جس کا کوئی مول نہیں ہوتا۔

میں شبنم کو اوپر لے گیا۔ تہ خانے کو پیچھے والے مکان سے ملانے میں رئیس خان ڈیزائننگ اور انجینئرنگ کا کوئی کمال دکھانے سے قاصر رہتے ہیں کیونکہ دونوں مکان الگ تھے اور پہلے حصے نقشے پر بنائے گئے تھے اس کے باوجود زینے کو بڑی صفائی سے کپڑوں کی الماری نظر آنے والے دروازے کے پیچھے چھپادیا گیا تھا۔

رئیس خانہ اس کی ذہنی اپج اور اختراع کا شکار تھا۔ اس کے مختلف حصوں کے نام بھی الگ الگ تھے جو ضرورت اور استعمال کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدنظر رکھتے ہوئے رکھے گئے تھے۔ زنان خانہ مستقبل میں کسی برنی' رس ملائی یا جلیبی کے لیے وقف تھا جو اتنی ثابت قدم ہو کہ بالآخر محبوبہ سے منسوبہ اور پھر زوجہ رئیس خان کے منصب پر فائز ہو جائے۔ دوسو پاؤنڈ اوسط وزن رکھنے والی تیرہ مگیریں یہ اعزاز حاصل کرنے سے محروم رہی تھیں اور گھر میں گھر والی کی جگہ خالی تھی۔

ایسے ہی مردان خانہ تھا جہاں رئیس کے دوست احباب مہمان اور ہر چنڈال چوکڑی کے اراکین ڈیرا ڈال سکتے تھے اور ان کے غل غپاڑے یا لہو لعب پر مبنی سرگرمیاں بلا روک ٹوک جاری رہ سکتی تھیں۔ مرغ خانے میں حال اور مستقبل کے عمران خان زیر تربیت اور رہائش پذیر تھے۔ اس گھر کو ایک ماہر تعمیرات فنی اعتبار سے ناقص قرار دے کر مسترد کر سکتا تھا یا سرے سے گھر ہی نہ مانتا مگر رئیس خوش تھا کہ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔

رئیس کے مشاغل اور وسائل روزگار کبھی شریفانہ نہیں رہے۔ اب بھی وہ سیاست میں انتشار پیدا کرنے اور کامیابی کے لیے ناجائز حربے اختیار کرنے والوں کا آلۂ کار تھا اور کچھ مخصوص نوعیت کے کام کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ گزشتہ دو سال سے وہ خدا بخش مندرال کے ساتھ تھا چنانچہ اس کے سیاسی حریفوں کے جلسے ناکام بنانا' انتخابی مہم میں اس کے پوسٹر اور بینر اتارنا' اس کے خلاف مظاہرے کرانا۔ اس کے پتلے نذر آتش کرانا اور اس کے چمچوں سے مقابلہ کرنا' اس کے عمومی فرائض میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ کبھی ہیرا پھیری اور خفیہ نوعیت کے ذاتی کام ہوتے تھے جن میں خدا بخش اس کے سوا کسی کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتا تھا مگر یہ سارے شریفانہ اور اخلاقیات کے معیار پر پورا اترنے والے کام بہرحال نہیں ہوتے تھے۔

اس سے پہلے وہ چنڈال چوکڑی میں برسوں ایسے دھندے کرتا رہا جن سے کمائی تو خیر اچھی ہو جاتی تھی مگر اس کا نام بدنام تھا۔ ایک زمانے میں رئیس خان کو ہسٹری شیٹر سمجھا جاتا تھا جب کہ تھانے میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ کبھی جیل نہیں گیا تھا اور کبھی سنگین نوعیت کے جرائم میں ملوث نہیں ہوا تھا۔ چوری ڈکیتی' قتل یا اغوا جیسے جرائم نہ کرنے کے باوجود وہ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رابطے کے باعث اور انہی کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے بدمعاش سمجھا جانے لگا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب اس نے مکان بنایا تو اندر جانے کے راستے سے زیادہ اہمیت باہر نکلنے کے راستے کو دی اور رہائش سے زیادہ روپوشی کے لیے یہ خانے کا بندوبست کیا۔ اس کے دوست شریف نہیں تھے تو دشمن بھی بدمعاش ہی تھے۔ جو کچھ وہ دوسروں کے ساتھ کرتا تھا وہی اس کے ساتھ ہوتا تھا اور پولیس کی نظر میں مشتبہ ہونے کی وجہ سے تھانے جاتا اور پھر کسی کی سفارش سے رہائی پا کے نکل آتا اس کے معمولات میں شامل رہا۔

رئیس خانے میں یہ خانہ اسی ضرورت کے تحت بنایا گیا تھا اور اس خفیہ حصے تک رسائی کا نظام بھی خفیہ رکھا گیا تھا۔ نیچے اترنے کا راستہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ تعمیراتی فن کا نمونہ تھا۔ یہ ایک ایسے حصے میں واقع تھا جس کی طرف کسی کا خیال نہیں جا سکتا تھا اور ایک نظر میں کوئی اس کا سراغ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک خفیہ بٹن دبانے سے دیوار کا ایک حصہ شق ہوتا تھا اور زینہ نمودار ہو جاتا تھا۔ اس حصے کو پھر اندر سے بٹن دبا کے برابر کیا جا سکتا تھا۔ ایسا ہی دوسرا دروازہ زینے کے آخر میں آتا تھا۔

جب رئیس کو پیچھے والا مکان مل گیا تو اس کی پناہ گاہ حفاظتی نقطۂ نظر سے مکمل ہو گئی۔ اب مدت سے اوپر کی منزل میں کسی کو آتے جاتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ رئیس خانے کے مین گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سارے کھڑکی دروازے بند تھے اور اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی شیراڈ کار بھی کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ اس پر گرد و غبار جما ہوا تھا۔ گیٹ پر چوبیس گھنٹے کھڑی مونچھوں کے ساتھ مستعد کھڑا تیس مار خان بھی غائب تھا اور باہر کے باغ کے گل بوٹے بھی عدم توجہی سے مرجھائے ہوئے نظر آ رہے تھے' بزبانِ شاعر۔ ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر۔ اداسی بال کھولے سو رہی ہے۔

شبنم کا یہ سب دیکھ کے حیران ہونا فطری تھا۔ اخباری رپورٹر ہونے کی وجہ سے وہ شہر کی سب نیک نام اور بدنام ہستیوں کے ماضی اور حال سے کسی حد تک واقف تھی۔ رئیس کی حیثیت نہ عزت داروں میں بہت نمایاں تھی اور نہ وہ ایسا خطرناک مجرم تھا جس کے تذکرے اخباری سرخیوں میں آتے۔ اس کے لیے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ رئیس کو کبھی اس نے اصلی شاہ عالم کے ساتھ نہیں دیکھا تھا حالانکہ خود اس کے پاس رئیس جیسے کارکن بہت تھے۔ شاہ عالم کی گھر سے باہر والی زندگی کے بیشتر معاملات سے وہ بے خبر اور لاعلم تھی مگر اسے دوستوں اور دشمنوں کا اندازہ ضرور تھا۔

میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے اچانک پوچھ لیا "عالی۔ یہ رئیس تمہارا بچپن کا دوست ہے؟"

"ہاں۔ ایک ایسا دوست جس نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جس پر میں خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا کر سکتا ہوں۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ میری اور اس کی دوستی کی بنیاد کیا ہے۔ اس کی اور میری فطرت اور عادت میں کوئی بات مشترک نہیں۔ نہ وہ تعلیم یافتہ ہے نہ کوئی خداداد صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ شہرت بھی اچھی نہیں۔ لیکن دوستی کے لیے یہ سب غیر ضروری ہے۔ اصل چیز ہے خلوص۔"

شبنم نے سرسری انداز میں کہا "میں نے اسے پہلے کبھی تمہارے ساتھ نہیں دیکھا' نہ کبھی تمہاری زبان سے اس کا تذکرہ بھی سننے میں آیا۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں ایک غیر ارادی غلطی کر بیٹھا ہوں لیکن بروقت مجھے ایک جواب سوجھ گیا "دراصل... آج تم میری زندگی کا دوسرا رخ دیکھ رہی ہو جو بہت مختلف ہے۔ خود تم نے بارہا یہ محسوس کیا ہے کہ کل کے اس شاہ عالم میں جسے تم نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور آج کے شاہ عالم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صورت شکل کے علاوہ ہر معاملے میں۔"

"ہاں... ایسا تو ہے۔ تم کچھ بدل گئے ہو" وہ بولی۔

"کچھ نہیں' میں بالکل بدل گیا ہوں۔ میرا رویہ' عادات و اطوار' مزاج اور طبیعت سب میں یہ فرق تمہیں یقیناً محسوس ہوگا" میں نے کہا "اب یہ وضاحت میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ اس تبدیلی کی فوری وجہ کوئی نہیں۔ میں کسی ضرورت کے تحت یا مجبوری کے باعث نہیں بدلا۔ شاید میرے لاشعور میں یہ احساس موجود تھا کہ میں جو زندگی گزار رہا ہوں' اس میں منافقت ہے۔ جو کچھ میں کرتا ہوں' اس میں خود میرے لیے کوئی ایسی بات نہیں جو میرے لیے باعثِ طمانیت ہو' جس سے مجھے حقیقی خوشی ملے۔ میں دہرے معیاروں والے فلسفۂ حیات پر عمل کرتے ہوئے ضمیر کی خلش محسوس کرتا تھا۔ شاید یہی اسباب تھے کہ بالآخر میں نے ناجائز دولت' جھوٹی عزت' نمود و نمائش کے لاحاصل غرور' مصنوعی خوشی اور دوغلے پن کی مجبوری سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کو اہم سمجھا اور بس پھر اس کے بعد خدا نے مجھے توفیق دی تو میں خود بخود بدل گیا۔ اپنے اصل روپ میں اور اپنی شخصیت کے حقیقی سانچے میں ڈھل گیا اور وہ شاہ عالم بن گیا جو آج تمہارے سامنے ہے تو تمہیں یقین نہیں آتا کہ میں وہی کل والا شاہ عالم ہوں۔"

"اب یقین آ گیا ہے مجھے کہ دنیا معجزات سے خالی نہیں ہوئی۔ قدرت کے ایسے کرشمے بہت ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں صرف سنا تھا۔ تمہیں اب دیکھ کے یقین آیا کہ لوگ راتوں رات کیسے بدل جاتے ہیں" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہارا سوال کچھ اور تھا۔ تم نے رئیس کے بارے میں پوچھا تھا کہ ایک بچپن کا دوست جو میرے لیے دائیں ہاتھ کی طرح ہے' آج تک کہاں تھا۔ تو جواب اس کا یوں ہے کہ میں شبنم کہ سیاست داں شاہ عالم ایک عزت دار آدمی تھا۔ سمجھا جاتا تھا یا اسے خوش فہمی تھی کہ اس کی بڑی عزت ہے۔ حالانکہ اسے عزت دینے والے سب مطلب پرست خود غرض اور جھوٹے تھے۔ وہ عزت بھی خود فریبی کا طلسم تھی۔ عزت جب خدا دیتا ہے تو وہ لازوال اور دائمی ہوتی ہے۔ عزت ہے سقراط کی اور آئن اسٹائن یا شیکسپیئر اور غالب کی یا قائداعظم اور مدر ٹریسا کی۔ جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور رہے گی۔ تو خود کو عزت دار سمجھنے والا شاہ عالم دوست رکھتا تھا اپنے جیسے عزت داروں کو۔ دولت مندوں یا شہرت اور اقتدار و اختیار رکھنے والوں کو۔ اس وقت میں رئیس جیسے دوستوں کی دوستی پر ناز کیسے کر سکتا تھا۔ میں تو اسے سب کے سامنے شناسا ہی تسلیم کرتے ہوئے شرماتا تھا۔ اس سے ملتا تھا تو اپنی غرض سے اور سب سے چھپ کے لیکن اب میں نہ سیاست داں ہوں اور نہ جھوٹی عزت کے غرور کا شکار۔ میں ایک عام آدمی ہوں جس سے دوستی ہے' انہیں دوست کہتا ہوں۔ اور ان سے محبت کرتا ہوں۔"

شبنم کی آنکھوں میں امیدوں کے اور ارمانوں کے دیے جلنے لگے۔ "ان کے سامنے اعتراف کر سکتے ہو یا اس معاملے میں ابھی تمہارے جذبات کی کوئی سمت نہیں۔"

میں پھر اپنے الفاظ کے جال میں پکڑا گیا تھا "نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ محبت ہو تو اس کا اعتراف بھی اسی طرح کر لینا چاہیے جیسے آدمی نفرت کا اظہار کرتا ہے مگر محبت اور نفرت کے جذبات کی نوعیت۔"

"تم رخشی سے محبت کرتے تھے؟" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں... وہ بیوی تھی میری۔"

"میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا نام رخشندہ تھا۔ تم ان میں سے نہیں تھے جو بیوی کے سوا کسی سے محبت کرنے کو گناہ سمجھتے ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس سے انکار نہیں کر سکتا... اس سے محبت نہ ہوتی تو میں اس سے شادی ہی کیوں کرتا۔"

"مگر اب تم اس سے نفرت کرتے ہو۔"

"نفرت؟ میرا خیال ہے نہیں... دراصل شادی سے پہلے ایک جذباتی کیفیت ہوتی ہے جو شادی کے بعد ایک ذمے داری کی رفاقت میں بدل جاتی ہے۔ اور میری فطرت میں یہ ذمے داری نبھانے کی صلاحیت نہیں تھی۔ پھر رفاقت یکطرفہ طور پر کیسے چل سکتی تھی۔ رخشی کے ردعمل نے مجھے بالآخر مجبور کر دیا۔ کہ اسے آزاد کر دوں۔"

"کیا وہ بھی یہی چاہتی تھی... آزادی... یا اس کی محبت بھی تمہارے رویے کی وجہ سے نفرت میں بدل گئی تھی؟"

"یہ بڑا عجیب سوال ہے۔ اس کا جذباتی ردِعمل بالکل فطری تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنے رویے سے جس انداز میں کرتی رہی' اس سے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں اور یہ رفاقت لاحاصل ہے۔"

ہم اوپر والے حصے کو گھوم پھر کے دیکھ چکے تھے اور بہت دیر سے ڈرائنگ روم کے باہر کھڑے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ شبنم کے سوالات کا مقصد کچھ اور تھا مگر پھر کسی وجہ سے اس نے آخری سوال کو ملتوی کر دیا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ میں جذباتی رویوں کو اتنا سمجھتا ہوں اور اپنی سوچ میں اس حد تک معقولیت پسند ہوں تو اس کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟ اگر میں محبت کے جواب میں محبت اور نفرت کے جواب میں نفرت کی منطق کو سمجھتا ہوں تو مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبنم کی محبت کا جواب بھی محبت سے ہی دینا چاہیے۔ اس کی بے غرض' واضح اور مکمل اختیار دینے والی محبت میری سمجھ میں کیوں نہیں آتی اور میں اسے اپنانے کی بات کیوں نہیں کرتا؟

"آؤ' ہم نیچے چلیں" میں نے کہا "رئیس خانہ تم نے دیکھ لیا۔"

"تم یہاں مجھے رئیس خانہ دکھانے تو نہیں لائے تھے؟" وہ بولی۔

"بہت صحیح سوال کیا تم نے..."

"اس کا صحیح جواب بھی ملے گا؟" وہ آگے چلنے لگی۔

میں نے کہا "ہاں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ اللہ میری مشکل آسان کرے اور میں تمہیں وہ سب بتا سکوں جو بتانا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ کچھ تم بتا چکے ہو' کچھ میں سمجھ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے جس کا تعلق میرے ماضی سے ہے اور ماضی سے زیادہ سوال میرے مستقبل کا ہے۔"

رئیس خان اپنے چیپئن فائٹر کے علاج معالجے سے فارغ ہو چکے تھے مگر کچھ متفکر نظر آتے تھے۔ اس نے مالِ غنیمت یعنی آنجہانی گوا سکر کی کھال کھینچنے کے اس کی ٹکا بوٹی شروع کر دی تھی۔

میں نے کہا "اتنی جلدی ہے تجھے جیسے ابھی اسے بھون کر کھا جائے گا۔"

"اور کیا کروں؟ اسے سنبھال کے رکھ دوں اور خود بھوکا سو جاؤں۔ سرِشام سے یہ وقت ہو گیا" اس نے آلاتِ قصابی کا استعمال پورے انہماک سے جاری رکھا۔

"کس نے کہا تھا کہ مقابلے کے دن روزہ رکھو۔"

وہ بولا "روزہ رکھنے کی بات یہ ہے پیارے کہ پہلے تو کسی سے بھی کچھ کھایا نہیں جاتا' نیند بھوک کا ہوش ہی نہیں ہوتا۔ اور بعد میں جیتنے والا روایت کے مطابق مالِ غنیمت بھی کھاتا ہے' اس چکن روسٹ کی بات ہی اور ہوگی قسم اللہ کی۔ سارے لاہور میں کہیں یہ مزہ نہیں آتا۔"

"اور جو ہار گئے تھے' ان سے غم اور صدمے کی وجہ سے کچھ کھایا نہیں گیا ہوگا" شبنم نے کہا۔

"ابھی سالے رو رہے ہوں گے اپنی تقدیر کو۔ بے ایمانی سے بازی جیتنے چلے تھے۔ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔ مگر یار' اس سالے گوا سکر نے نشے میں پاگل ہو کے اپنے عمران خان کو بڑا زخمی کر دیا۔ آج کی رات اس پر بھاری ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو پھر اس کے سرہانے بیٹھ کے سورہ یٰسین پڑھ۔"

شبنم نے کہا "تم بتاؤ دیکن کہاں ہے' میں چکن روسٹ کرتی ہوں۔"

"امی نہیں۔ آپ مہمان ہو۔ ویسے بھی یہ کام اپنے ہاتھ سے کر کے دل کو سکون ملتا ہے۔ ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے کلیجے میں" وہ بولا۔

"تیرے انتقامی جذبات نادر شاہ اور ہلاکو خان جیسے ہیں۔ وہ لشکر کو شکست دے کے فتح سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ شہر کی اور شہریوں کی بھی ایسی تیسی کر دیتے تھے۔ خیر تو اپنا کام کر' ہمیں بھی چکھا دینا۔"

وہ ہنسا "کیوں نہیں۔ یہ تو اسپیشل ڈش ہے پیارے اور مہمان بھی آج اسپیشل ہیں۔"

بیڈ روم کے کنارے پر بیٹھ کے شبنم نے گھڑی دیکھی۔ "بارہ بج گئے۔"

میں نے کہا "کیا نیند آ رہی ہے تمہیں۔"

"نہیں۔ آزاد صاحب کا خیال آیا تھا۔ وہ فکر مند ہوں گے۔"

میں نے کہا "انہیں فون کر دو... لیکن یہ مت بتانا کہ تم کس کے ساتھ ہو اور کہاں ہو؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھ کے سر ہلایا اور فون گھمانے لگی۔ شبنم کی یک طرفہ گفتگو سے بھی مجھے پتا چل گیا کہ آزاد صاحب خفا ہیں۔ شبنم نے پہلے اپنی صحت کا خود اپنے ہاتھوں بیڑا غرق کیا اور اب وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی طرف سے غفلت برت کے صحافت کا بیڑا غرق کر رہی ہے۔ شبنم نے کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیا کہ غرق ہونے والے سب بیڑے بالآخر کنارے پر پہنچ جائیں گے۔

ریسیور رکھ کے وہ مسکرائی "آزاد صاحب تمہیں پوچھ رہے تھے کہ وہ مسٹر اصلی نقلی فی زمانہ کون سے جہان میں ہیں' کہو یا' زندہ ہیں یا پھر فوت ہو گئے خدانخواستہ۔"

میں نے کہا "ان سے کہنا تھا کہ دعا کریں شاہ عالم کی مغفرت کے لیے۔ اب نہ اصلی شاہ عالم ہے کہیں نہ نقلی۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "یہ بات تم نے مذاق میں کہی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو تمہارے سامنے ہے وہ بھی اصلی شاہ عالم نہیں ہے۔"

"پھر کون ہے؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ناصر عظیم۔ میرا اب یہی نام ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اسی کے ساتھ رہتا ہوں آج کل۔ وہ میرا ہمزاد ہے۔"

شبنم کے چہرے پر ایک سایہ سا پھیل گیا۔ اس کے چہرے کی فطری شگفتگی پر سنجیدگی غالب آ گئی جس میں حیرت اور تجسس سے زیادہ خوف کے جذبات کی گرفت مضبوط لگتی تھی "میں کچھ نہیں سمجھی عالی!"

میں نے اٹھ کے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا "دیکھو شبنم' میرے اور تمہارے درمیان دو رشتے تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ایک سیاست داں شاہ عالم اور نامور صحافی خاتون شبنم کا رشتہ بھی سب کے سامنے تھا اور وہ ذاتی رشتہ جو ایک شاہ عالم جیسے مرد اور تم جیسی عورت کے درمیان تھا۔ اس سے بھی سب واقف تھے۔ دونوں حوالوں سے تم شاہ عالم کو سمجھتی تھیں۔ تم نے اس سے ٹوٹ کے محبت کی۔ کسی غرض کے بغیر اور زمانے کی پروا کیے بغیر۔ بدنامی سے ڈرے بغیر۔ شاہ عالم بھی تمہارے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے تمہارے جذبات کا بھرپور استحصال کیا اور تمہیں اپنی مقصد برآری کے لیے ہر طرح سے استعمال کیا۔ ذہنی طور پر بھی اور..... جسمانی طور پر بھی۔ اس نے تمہیں جیسے چاہا حاصل کیا۔ لیکن تم اسے حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا۔ وہ صرف تمہارا کبھی نہیں ہوا۔"

"وہ اپنی شرعی اور قانونی بیوی کا بھی نہیں ہوا" وہ تلخی سے بولی۔

"رائٹ۔ اس نے رخشندہ کو بھی مکمل طور پر حاصل کیا اور تمہیں بھی..... اوروں کی بات میں نہیں کرتا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جب کوئی خود کو مکمل طور پر دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے اور خود کسی کو مکمل طور پر اپنا لیتا ہے' تو اسے محبت کی تکمیل کہا جا سکتا ہے۔ تمہاری محبت ادھوری رہی۔"

"کتنی ڈھٹائی سے تم یہ سب کہہ رہے ہو میرے سامنے شاہ عالم۔ میری تذلیل کر رہے ہو۔" اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"پلیز شبنم! اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو کیونکہ ابھی تو میں نے صرف تمہید باندھی ہے۔ اصل بات ابھی باقی ہے۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں' وہ تمہیں صبر کے ساتھ اور حوصلے سے سننا ہوگا۔ اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو میں اتنا تردد کیوں کرتا لیکن میں تمہیں اور صرف تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم ابھی تک میرے لیے کتنی اہم اور ناگزیر ہو گئی ہو۔ تم کتنی حسین ہو' یہ تمہیں یقیناً معلوم ہوگا۔ تمہاری قوتِ تسخیر کیا ہے' یہ بھی تمہیں معلوم ہوگا۔ ہر جگہ ہر قدم پر دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ملنے والوں نے تمہیں اس کا احساس دلایا ہوگا۔ تمہاری غیر معمولی ذہانت کا معترف ایک زمانہ ہے لیکن مرد کے لیے عورت کی ذہانت نہیں' اس کے حسن و شباب کی دلکشی جان لیوا ہوتی ہے۔ میں وہی مرد ہوں۔ شاہ عالم اور اس وقت تم میرے ساتھ ہو۔ یہاں مکمل خلوت ہے اور میرا مقصد ایک رات گزارنا ہوتا تو مجھے تم سے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تمہاری جگہ کوئی دوسری عورت بھی میری ضرورت پوری کر سکتی تھی۔"

"رخشندہ جیسی بیوی یا کوئی اور...؟"

"ہاں۔ ہر بڑے شہر کے بڑے ہوٹل میں میری ان گنت راتوں کی بہت سی ان کہی کہانیاں ہیں۔ انہیں دہرانے سے کیا فائدہ۔ بات اس وقت کے اس لمحے کی ہے جب تم میرے ساتھ ہو اور میں پوری نیک نیتی اور یقین کے ساتھ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں کہ تم صرف تم اہم ہو' ناگزیر ہو۔ مجھے تمہاری رفاقت چاہیے' اعتماد چاہیے اور سہارا چاہیے۔"

جذبات کی بے خودی نے شبنم کو بے اختیار کر دیا اور وہ ایک دم اٹھ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ "ہاں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری ہوں' میرے لیے سب کچھ تم ہی ہو۔ تم جیسے چاہو اپنی ضرورت پوری کرو۔ جیسے چاہو مجھے استعمال کرو۔"

میں نے بڑی مشکل سے خود کو چھڑایا۔ "خدا کے لیے شبنم..... میں تمہارے سامنے نئے سرے سے اظہارِ عشق نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ جذبات کا نہیں' عقل کا ہے۔"

وہ کچھ خجل ہو کے سیدھی بیٹھ گئی۔ "کبھی کبھی مجھے تمہاری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ میرا شک صحیح تھا اور یقین غلط ہے۔ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

"میں بھی تسلیم کر چکا ہوں۔"

"نہیں۔ تم کہتے ہو کہ تبدیلی تمہارے خیالات اور نظریات میں آئی ہے لیکن مجھے تمہارے قرب میں جس دوری کا احساس ہوتا ہے' اس میں بڑی اجنبیت ہے۔ تمہاری باتیں' تمہاری سوچ' تمہارا رویہ سب بالکل مختلف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تم ڈبل رول کر رہے ہو۔ پہلے جو تھا وہ بھی اداکاری تھی' آج بھی اداکاری ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے۔" میں نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا "تم کو یہی بات بتانے کے لیے میں یہاں لایا تھا مگر بات صرف اعتراف کی نہیں ہے۔ گزشتہ کئی سال سے میں یہ ڈبل رول کر رہا ہوں اور دہری زندگی جینے کا یہ عذاب میں نے جانتے بوجھتے قبول کیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟"

شبنم کی صورت پر اب بے یقینی اور تذبذب کی دھند محبت کے جذبات کی روشنی پر غالب آنے لگی تھی "عالی' زیادہ سسپنس مت پیدا کرو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈر مجھ سے لگ رہا ہے؟ کیا تمہارے ساتھ میرا رویہ ایسا ہے؟ یا میری فطرت کا یہ بدلا ہوا روپ اتنا قابلِ نفرت ہے..... جو آج تم دیکھ رہی ہو۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے..... جیسے کوئی اجنبی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے شاہ عالم سمجھ لو اور..... میرا ساتھ اسی طرح دو..... اتنی ہی محبت دو مجھے کیونکہ میں ویسا ہی بلکہ اس سے اچھا ہوں۔"

میں نے محسوس کیا کہ پرانے خدشات اسے کمزور کرنے لگے ہیں۔ اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے میں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "میں اور تم زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے والے ہیں شبنم اور کوئی بات نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ چلائی "ناصر عظیم... ناصر عظیم' آخر کون ہے یہ ناصر عظیم۔ کیوں یہ نام بار بار تمہاری زبان پر آتا ہے؟"

میں نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جذباتی طور پر تم اتنی INMATURE ہو۔ اتنا کنٹرول بھی نہیں ہے تمہیں اپنے اعصاب پر تو میں یہ بات شروع ہی نہ کرتا۔ مجھے مایوسی ہوئی شبنم تمہارے طرزِ عمل سے۔ میرا خیال تھا کہ تم بہت پریکٹیکل ہو۔ ہر چویشن کو فیس کر سکتی ہو۔"

"میں ہوں پریکٹیکل' آج بھی۔"

"پھر ایک TEEN AGER کی طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہو جو بڑے شوق سے ہارر موویز دیکھتی ہے اور بہت بہادر بنتی ہے مگر جن بھوت سے۔ اندھیرے سے اور کاکروچ سے ڈرتی ہے۔"

"تم جانتے ہو میری گڈوِل کیا ہے۔ ایک کمزور عورت سمجھ کے مجھے بہت سے شہ زوروں نے ڈرانے کی کوشش کی۔ میں نے کبھی گندی ذہنیت رکھنے والوں کی گندی زبان کی پروا نہیں کی۔"

"شاید تمہیں شہرت کے لیے یہ سب کرنا پڑا۔ ورنہ اندر سے تم بزدل اور کمزور تھیں" میں نے اپنے جارحانہ انداز کے ری ایکشن کا اثر دیکھا۔

وہ مشتعل ہونے لگی "غلط بات مت کرو۔"

"کیا بات غلط ہے اس میں شبنم! میری پوری بات سنے بغیر ہی تم HYSTERICAL ہو رہی ہو۔ تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گی۔ تم محبت' شادی' گھر اور بچوں کے خواب کی تعبیر کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں۔ جبکہ رفاقت سے میری مراد کچھ اور تھی۔ مجھے رخشی کی جگہ دوسری بیوی کی تلاش نہیں ہے۔ ایک ساتھی چاہیے جو اس مشکل سفر پر میرے ساتھ چل سکے۔ جس پر میں قدم رکھ چکا ہوں۔"

وہ کافی شرمندہ ہو چکی تھی۔ میری مایوسی سے اس پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ اعتماد کے معاملے میں میری توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہی ہے اور ایک جذباتی طرزِ عمل اختیار کر کے اس کی غلطی بن گیا ہے۔ میری خاموشی سے وہ ڈر گئی کہ شاید میں نے بات ہی ختم کر دی ہے۔ اب الٹا وہ مجھے منانے لگی "دیکھو عالی۔ آئی ایم سوری۔ میں واقعی جذباتی کمزوری کا شکار ہو گئی تھی۔ میرے اعصاب ابھی تک پھر کوئی بڑا شاک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔"

"SHOCK کیسا جب میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ جو بات میں بتانے جا رہا تھا' وہ SHOCKING بلکہ کچھ SURPRISING ہو سکتی تھی۔ اب میرا خیال ہے کہ مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ تمہارے اعصاب اچھی بُری ہر بات کو نارمل طریقے پر لینے کے لیے تیار ہیں۔ یا مجھے یہ امید چھوڑ کے متبادل تلاش کرنا چاہیے۔"

"متبادل کس کا' میرا..... شبنم کی جگہ کسی اور کو دینے کا سوچو گے تم؟ میں جان سے مار دوں گی تمہیں" وہ مسکرانے لگی "ناؤ کم آن۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ذاتی جذبات کو الگ رکھ کے تمہاری بات سنوں گی۔ مجھے بتاؤ کون ہے ناصر عظیم؟"

میں نے اس پر نظر جما کے کہا "میں ہوں ناصر عظیم۔"

"وہ کیسے؟ تم نے نام بدل لیا ہے اپنا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میرا یہی نام ہے۔ یقین نہیں آتا تو رئیس سے پوچھ لو۔"

رئیس بھی ایسے کمرے میں داخل ہوا جیسے اسٹیج پر ایک ایکٹر اینٹری دیتا ہے۔ کسی کردار کے ایک جملے کی ادائیگی کے انتظار میں وہ پردے کے پیچھے کھڑا رہتا ہے اور اپنا ڈائیلاگ یاد رکھتا ہے۔

رئیس بڑے اسٹائل سے ایک ٹرے اٹھائے گاتا ہوا اندر آیا۔ "تم نے بلایا اور ہم چلے آئے۔ کیا پوچھنا چاہتی ہیں یہ خاتون ہم سے۔ ہم ضرور بتائیں گے لیکن ابھی نہیں' پہلے نوش فرمایئے اسپیشل گوا اسکرانڑی' اور گرما گرم چائے۔"

میں نے کہا "یہ تو کمال کر دیا تو نے۔ خود کیا سارا کام؟"

"پیارے' خود ہی کرنا پڑے گا سب کچھ۔ جب تک گھر میں گھر والی نہیں آ جاتی۔"

میں نے کہا "شادی کی لکیر ہی کہاں ہے تیرے ہاتھ میں۔"

وہ ہاتھ صاف کر کے بولا "ابے کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ' یہی ہے زندگی۔"

میں نے کہا "رئیس..... میرا نام کیا ہے؟"

رئیس بڑے جوش و خروش اور خشوع و خضوع سے مالِ غنیمت پر ہاتھ صاف کرنے میں لگا ہوا تھا' ایک دم جیسے بوٹی اس کے حلق میں پھنس گئی۔ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر ناک صاف کی "یار' مہیں کچھ زیادہ ہو گئیں۔ تو نے کچھ پوچھا تھا مجھ سے؟"

"شبنم کو بتا میرا اصل نام کیا ہے؟"

اس نے سر کھجا کے مجھے اور پھر شبنم کو دیکھا "نام..... کیا انہیں معلوم نہیں... اور تو خود بتا سکتا ہے اگر یہ بھول گئی ہیں۔"

میں نے کہا "اس کو میرے کہے پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ تو ڈر مت' سچ بتا دے۔"

اس نے شبنم کے چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی اور میرے عجیب و غریب سوال پر غور کیا "آخر معاملہ کیا ہے' قسم اللہ کی۔ کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے مجھے۔"

شبنم نے کہا "تم کوئی عدالت کے کٹہرے میں نہیں کھڑے ہو رئیس!"

"اصل نام تو اس کا ناصر عظیم ہی تھا....." رئیس نے کہا۔

شبنم نے اپنا پُرسکون انداز برقرار رکھا "اب میں سمجھ گئی۔ نام بھی ماں باپ نے رکھا ہو گا۔"

میں نے کہا "مفروضات اور قیاس آرائیوں کے چکر میں مت پڑو۔ اصل بات یہ ہے شبنم کہ بہت عرصے سے میں دہری زندگی گزار رہا ہوں۔ میں بیک وقت ناصر عظیم بھی تھا اور شاہ عالم

بھی۔"

شبنم ایک دم سنجیدہ ہو گئی "لیکن کیوں؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اب تم نے ایک صحیح سوال کیا ہے۔ بلا ضرورت ایسا کون کرتا ہے۔ موت کے خوف سے روپوشی کی زندگی گزارنے والے کی بات اور ہے جو کسی نامعلوم جگہ پر اپنا نام اور شخصیت سب بدل کے اپنی پرانی شناخت کے سارے سراغ مٹا دے۔ کچھ نفسیاتی کیس بھی ہیں دہری شخصیت کے لیکن میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

رئیس کا کھانا پینا حرام ہو گیا "ابے یار' یہ سب بتانا کیا ضروری ہے ان کو ابھی اور اسی وقت....."

میں نے کہا "شبنم۔ تم مجھے کب سے جانتی ہو۔"

اس نے جیسے بے خیالی میں کہا "کب سے جانتی ہوں..... چار سال ہو گئے مجھے اس اخبار میں..... نام تو پہلے بھی سنا تھا مگر تمہارے قریب آنے کا موقع چار سال پہلے ہی ملا تھا۔"

"نام کب سے جانتی ہو میرا۔"

"کچھ..... ٹھیک سے یاد نہیں۔ چھ سات سال سے۔ تم نے اپنی سیاسی جماعت کب قائم کی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے تم کتنا قریب سے جانتی تھیں۔"

اس کا چہرہ اس سوال پر سرخ ہو گیا "تم میری زبان سے کیا کہلوانا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "سوری۔ میرا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ ٹھیک ہے کہ شاہ عالم کی نجی زندگی کا کوئی گوشہ تم سے اوجھل نہیں تھا مگر خود اس نے تمہیں اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟ تمہیں یقیناً علم تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے۔ وہ اسی کے ساتھ رہتے تھے۔ تم کو معلوم ہو گا کہ رخشی اس کی بیوی تھی۔ اس کی شادی کب ہوئی تھی اور کن حالات میں۔ تمہیں شاید اندازہ ہو گا یا خود شاہ عالم نے بتایا ہو گا کہ اس کی ازدواجی زندگی ناکامی کے خطرے سے دوچار ہے مگر اس کا وہ ماضی جو سیاسی افق کے پیچھے گمنامی کے اندھیرے میں تھا' اس کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟"

شبنم نے میری توقع کے مطابق نفی میں سر ہلایا "وہ غیر اہم تھا میرے لیے۔ اتنا ضرور معلوم کر لیا تھا میں نے کہ وہ پہلے سوشل ورکر تھا' سماجی کارکن۔ خدمتِ خلق کے چکر میں اپنا النوسید حا کرتا تھا اور وہیں سے اس نے پبلسٹی حاصل کی۔ وہ کام کم کرتا تھا۔ ڈھول زیادہ پیٹتا تھا۔ کچھ اخبار والے اس کے دوست تھے۔ ان کو وہ خوش رکھتا تھا۔ وہ دوست بنانا بھی جانتا تھا۔ اس کے امیج کو بڑھا چڑھا کے پبلک کے سامنے لانے میں انہی دوستوں اور صحافیوں کا بڑا کردار تھا۔ یہ شہرت ہی بالآخر اس کے سیاست میں آنے کا سبب بنی۔"

"رائٹ۔ یہ سب زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ شاہ عالم کو لوگوں نے اس وقت جانا جب اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کا نام اخباروں میں شائع ہونے لگا۔ اس وقت وہ بیس بائیس برس کا نوجوان تھا لیکن اس سے پہلے وہ کیا تھا؟ اس کا خاندانی پس منظر۔ اس کے بچپن کے حالات' وہ کہاں پیدا ہوا اور بڑا ہوا۔ اس نے کہاں تعلیم حاصل کی۔ یہ سب کچھ کتنے لوگ جانتے ہیں؟ کیا تم جانتی ہو' تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔ تھوڑا بہت جو تم نے بتایا۔"

میں نے کہا "اپنے بارے میں جو بھی میں نے پبلک کو بتایا سب سچ نہیں تھا۔ میں نے اپنے ماضی کو ایسے ڈیزائن کیا تھا جیسے کوئی گندے نالے کو پاٹ کے اس پر ایک محل تعمیر کرے اور کوڑے کرکٹ کو دبا کے گرد و پیش کو سبزے کی ہریالی سے بھر دے' پھولوں کے رنگوں سے سجا دے اور ہر طرف درخت لگا دے پھر اس کے گرد ایک فصیل کھڑی کر دے تاکہ اس خواب نگر میں آنے والے کی نظر صرف حسن دیکھے' نیچے اور آگے پیچھے چھپی ہوئی غلاظت کی طرف کسی کا خیال تک نہ جائے۔ وہ سب جو زندگی میں عزت کے مرتبے تک پہنچ جاتے ہیں' علم و فضل کی بدولت نہیں' دولت اور صرف دولت کے بل پر۔ اس سے قطع نظر کہ دولت ان کے پاس جائز ذرائع سے آئی یا ناجائز طریقے سے کیونکہ اس سے فرق کوئی نہیں پڑتا پھر وہ اپنے ماضی کو بھی RENOVATE کرتے ہیں۔ خوب صورت بناتے ہیں تاکہ وہ ان کی قوتِ خرید میں آ جانے والی زندگی کی خوب صورتی سے میچ کر سکے۔"

وہ دلچسپی سے سنتی رہی "تم نے آج تک اس سچائی کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کی تو آج اعترافِ جرم کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے اپنی بات جاری رکھی "ایک موقع اس وقت بھی آیا تھا جب ملک آزاد ہوا تھا اور پاکستان وجود میں آیا تھا۔ موقع پرست ہر دور میں ہوتے ہیں۔ جو ہجرت سے پہلے کئی نسلوں سے گمنام اور غیر معروف تھے' کسان یا کلرک یا لوہار تھے' ان کو موافق حالات نے یہاں جاگیردار' افسر اور فاؤنڈری کا مالک بنا دیا تو دولت مندی کی شان و شوکت کے سامنے ان کو اپنا ماضی بہت حقیر اور باعثِ شرم لگا اور انہوں نے ایک نئے وطن میں اپنے لیے خاندانی نجابت یا رئیسی کی طرح شاندار نیا ماضی بھی بنا لیا۔ ان کے باپ دادا خان بہادر فلاں فلاں ہو گئے۔ تحریکِ آزادی کے روحِ رواں ہو گئے یا ان کا تعلق کسی ممتاز علمی و مذہبی گھرانے سے ہو گیا۔ بڑا آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ ان کو کسی نے جھوٹا کہنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوبارہ یہ موقع لوگوں کو اس وقت ملا جب یہ ملک ٹوٹا اور ہجرت کر کے مشرقی پاکستان جانے والے پھر مہاجر بن کے مغربی پاکستان پہنچے لیکن ایک طبقہ اور بھی پیدا ہو گیا جس نے اپنے ماضی کو پرانے جوتوں کی طرح اٹھا کے پھینک دیا۔ تقریباً پچاس سال ہونے کو آئے' تیسری نسل جو پاکستان میں عزت دار ہوئی' اس میں جبرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے بہت تھے۔ انہوں نے اخلاقی قدروں کا پیمانہ صرف دولت کو مقرر کیا۔ انہوں نے خون کے رشتوں کو بھلا دیا اور صرف پیسے کے رشتے کو اہم جانا۔ دولت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انہوں نے ہر راستہ اختیار کیا۔ خواہ وہ گناہ کا ہو یا جرم کا۔ جو زیادہ باہمت زیادہ ذہین اور زیادہ بے ضمیر تھے' وہ میری طرح کامیاب بھی ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے بارے میں ویسی ہی باتیں پھیلانی شروع کر دیں جو عام طور پر بڑے لوگوں سے منسوب ہوتی ہیں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والا محاورہ ان کے کام آیا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے آباؤ اجداد میں کیسے کیسے قابلِ عزت لوگ تھے۔ خود ان کا بچپن ان کے مستقبل کا آئینہ دار تھا۔ وہ کتنے ذہین' کتنے محنتی' پڑھاکو' ایماندار' فیاض اور بلند خیال تھے۔ انہیں تو ایک دن بڑا آدمی بننا ہی تھا۔ سب پیش گوئی کرتے تھے۔ تو ایسی ہی ہوا اس میں نے بھی فرمائی اور سب نے یقین کیا کیونکہ تردید کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے اصل ماضی کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اب اگر میں زیادہ تفصیل میں گیا تو رات ختم ہو جائے گی' بات ادھوری رہ جائے گی اس لیے میں تمہیں وہ سچ بتاتا ہوں جس سے آج تک صرف رئیس آشنا تھا۔"

"کیا اس پرانی قبر کو کھولنا ضروری ہے؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ میرے اور تمہارے درمیان پُراعتماد مستقبل کی بنیاد کو سچ پر استوار ہونا چاہیے۔ تم نے میرے جھوٹ پر یقین کیا۔ میرا سچ بھی سنو۔ اس سے فرق کوئی نہیں پڑے گا تمہیں مگر میری ضرورت کو سمجھنا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا۔ تم فیصلہ کر سکو گی کہ کیا تمہارے لیے اس شخص کی رفاقت ممکن ہے جو شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہے۔ وہ پہلے ناصر عظیم ہی تھا پھر شاہ عالم بن گیا۔ اب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹنا چاہتا ہے کیونکہ اسے اپنی مصنوعی دوغلی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے اور شاید اب وہ شاہ عالم بن کے زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے حصار میں ہے۔ اس کی اپنی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف بھاگ جائے۔ اس کے علاوہ ساری دنیا میں شاہ عالم کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی۔ فرار کے سارے دوسرے راستے بند ہو چکے ہیں۔"

میری بات کو شبنم نے پہلے مذاق سمجھ کے اہمیت نہیں دی تھی مگر پھر اس کا خوف عود کر آیا اور اس کا یقین متزلزل ہونے لگا کہ اسے یقین کی کس منزل پر آ کے شکست کا سامنا ہے۔ جسے' اس نے شاہ عالم نہیں مانا تھا' وہ واقعی شاہ عالم نہیں تھا۔ وہ ناصر عظیم تھا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے اب وہ اتنا آگے نکل آئی تھی کہ واپسی بھی اس کے اختیار کی بات نہیں رہی تھی اور شاید پیچھے دیکھنے سے اس کو اپنے گرد یا گل خانے کی فصیل نظر آتی تھی یا حرام موت کہ اس نے میری بات پر دھیان دیا اور بے خوفی سے میرا سچ سنا۔

وہ بھی سارا سچ اور صرف سچ نہیں تھا جو میں نے اسے بتایا' وہ خالص سچ کو برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی چنانچہ میں نے سچ میں مصلحت آمیزی کا جھوٹ بھی شامل کیا اور ناصر عظیم کے ماضی کو بڑی فنکارانہ مہارت اور ذہنی انجینئرنگ کے کمال سے شاہ عالم کی زندگی سے ایسے جوڑ دیا جیسے ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے اصل دل کی جگہ دوسرا دل لگا دیا تھا مگر جسم کو خبر نہ ہوئی تھی۔ جیسے اسوان ڈیم بناتے وقت ماہرین نے ابوسمبل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھایا اور اپنی اصل جگہ سے اٹھا کے بہت بلندی پر پھر ایسے جوڑ دیا جیسے وہ ہزاروں سال سے وہیں تھا۔ یہ مثالیں بہت بڑی ہیں۔ میرا کارنامہ بہت چھوٹا تھا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے کہ جیسے ویلڈ کرنے والے ٹانکا لگاتے ہیں کہ غور سے دیکھنے پر بھی جوڑ نظر نہیں آتا یا دل کے بائی پاس آپریشن میں ڈاکٹر ٹانگ کی رگ سے دل کو خون کی فراہمی کا متبادل راستہ فراہم کر دیتے ہیں تو دل کو فرق پڑتا ہے نہ ٹانگ کو۔

ایسے ہی میں نے ناصر عظیم اور شاہ عالم کی زندگی کے ٹکڑے جوڑ کے ایک ایسی کہانی بنائی جو شبنم کے لیے قابلِ قبول ہو اور یہ سمجھنے کے بعد کہ میں ناصر عظیم بن کے زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہوں' اس کے دل میں میرے لیے وہی جذبات رہیں جو شاہ عالم کے لیے تھے۔ وہ سمجھتی رہی کہ میں کوئی اور نہیں' شاہ عالم نے حالات کی ضرورت کے تحت اپنا نام بدلا ہے اور ناصر عظیم کی شخصیت اختیار کر لی ہے جبکہ حقیقت میں جو ہوا تھا' اس کے برعکس تھا۔ ناصر عظیم نے مجبوری حالات کے تحت شاہ عالم بننا قبول کیا تھا۔

میں نے شبنم کے سامنے اعتراف کیا کہ میری اور رئیس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی تھی اور وہاں میرا نام ناصر عظیم ولد محمد عظیم لکھا ہوا تھا۔ مجھے نہ اپنے اصل والدین کا علم تھا کہ وہ کون تھے اور کہاں رہتے تھے۔ نہ یہ معلوم تھا کہ یتیم خانے میں مجھے کس نے داخل کرایا اور اس وقت میری عمر کیا تھی۔ جو دنیا کی نظر میں میرے ماں باپ تھے' وہ کسی طرح بھی میری پیدائش کے ذمے دار نہیں تھے۔

اگر یہ بات خود شاہ عالم کہتا تو ایک شرمناک جھوٹ ہوتی مگر میں نے ایسا کہا تو یہ جھوٹ نہیں تھا۔

"تم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

میں نے کہا "میں کیا معلوم کرتا۔ کس سے پوچھتا اور کون بتاتا مجھے۔ تمہیں اندازہ نہیں شبنم کہ بیشتر یتیم خانے معصوم بچوں کے لیے عقوبت خانے ہیں۔ ان پر وہاں جو ظلم ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ جو غیر انسانی رویہ رکھا جاتا ہے' اس کی تفصیل سنو تو تمہاری انسانیت کا سر شرم سے جھک جائے۔"

"مجھے معلوم ہے عالی۔ میں نے خود جا کے دیکھا ہے۔"

"میں بہت چھوٹا تھا۔ اتنا چھوٹا کہ مجھے ٹھیک سے بات کرنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں اکثریت چھوٹے بچوں کی تھی۔ ان کو ماں باپ کے مرنے کے بعد منحلے دار یا کوئی ہمدرد وہاں چھوڑ جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ بچوں کی خرید و فروخت کرنے والوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ان میں وہ بدقسمت بھی ہوتے تھے جن کو اپنے سگے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چچا آیا اور خالہ ماموں بھی رکھنے پر راضی نہ تھے۔ ان کے ماں باپ سے خون کا رشتہ رکھنے والے ان کی پرورش کے بار کو عذاب سمجھتے تھے لیکن سب سے بڑھ کر وہ مظلوم تھے جن کو ان کے اپنے ماں باپ اس لیے یتیم خانے میں چھوڑ جاتے تھے کہ وہاں کم سے کم دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو ملے گی۔ وہ خود بے گھر اور فاقہ کش لوگ ہوتے تھے۔ رئیس نے اور میں نے بڑی بے عزتی کے ساتھ وہاں دو وقت کی روٹی کھائی۔ اس سے زیادہ ہم نے گالیاں کھائیں اور مار کھائی۔ اس ماحول میں نفرت اور بغاوت کا ردِعمل ایک فطری بات تھی۔ بیشتر بچے آٹھ دس سال کی عمر میں وہاں سے بھاگ جاتے تھے۔ ہم اس عمر کے پہنچنے سے پہلے ہی فرار ہو گئے۔ یتیم خانہ عذاب کا ایک جہنم تھا۔"

"کچھ یاد ہے کہ وہ یتیم خانہ کہاں تھا؟"

"نہیں۔ ہم بہت چھوٹے تھے۔ چھ سات سال کی عمر کی یادوں کے بہت ہلکے سے نقوش رہ گئے ہیں۔ وہ کوئی بہت چھوٹا قصبہ بھی نہیں تھا اور لاہور یا پنڈی جیسا بہت بڑا شہر بھی نہیں تھا۔ ممکن ہے گجرات ہو یا گوجرانوالہ۔ سیالکوٹ ہو یا سرگودھا۔ بیس بائیس سال میں ہر جگہ بدل گئی ہے۔ کیا پتا اب وہاں کوئی کوٹھی کھڑی ہو یا کارخانہ لگ گیا ہو۔ کسی نے کمرشل پلازا بنا دیا ہو۔"

یہ جھوٹ بولنا بھی ضروری تھا ورنہ شبنم جو پیدائشی طور پر ایک صحافی کی تجسس پسند فطرت اور شک کرنے والی اور سچ کی کھوج لگانے والی عادت رکھتی تھی' اس یتیم خانے کا سراغ لگانے کے چکر میں پڑ جاتی۔

"یتیم خانے سے نکل کے تم کہاں گئے؟"

"یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اچھے لوگ ملے۔ ورنہ اتنے چھوٹے بچوں کا غلط ہاتھوں میں پڑ جانا عین ممکن تھا۔ ہم نے دنیا کا ہر کام کیا۔ گھروں میں ملازمت کی' ہوٹلوں میں برتن دھوئے' گیراجوں میں رہے۔ ذلت و خواری ہر جگہ اپنا نصیب رہی مگر ہم نے سب برداشت کیا۔ کہیں سے ہم ٹھوکریں مار کے نکالے گئے تو کہیں ہم خود نہ ٹھہرے۔ جو کماتے تھے وہ کھانے کو ہی پورا نہیں ہوتا تھا۔ ہم چھوٹی موٹی چوریاں کرتے رہے اور قسمت اچھی تھی کہ پکڑے نہیں گئے۔"

اپنی زندگی کی کہانی کو میں نے پورے سچ کے ساتھ شاہ جی کے ڈیرے سے شروع کیا "سولہ سترہ سال کی عمر تک ہم زمانے کی ٹھوکریں کھا کے بہت ڈھیٹ اور سخت جان ہو گئے تھے۔ ہم نے حالات کا مقابلہ کر کے جینا سیکھ لیا تھا لیکن بچپن کے کمپلیکس میرے ساتھ تھے۔ مجھے اپنی محرومیوں کا شدت سے احساس تھا۔ مجھے ماں باپ نہیں ملے۔ ان کی شفقت اور محبت نہیں ملی۔ میں بہن بھائی کے رشتے سے محروم رہا۔ مجھے میرا گھر نہیں ملا۔ محبت نہیں ملی۔ بے بسی اور بے چارگی کی بات یہ تھی کہ اس احساسِ محرومی کا مداوا نہیں تھا۔ یہ سب دنیا کے بازار میں ملنے والی چیزیں نہیں تھیں کہ میں اپنی ہمت اور محنت سے حاصل کر لیتا۔ ہاں ایک چیز جو میں حاصل کر سکتا تھا' عزت تھی۔ جو مجھے کسی نے نہیں دی تھی۔ بہت کم عمری میں ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ عزت صرف دولت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ میں بڑا آدمی بن سکتا ہوں اور اس کے لیے مجھے تعلیم ضروری حاصل کرنی چاہیے۔ رئیس کو یاد ہے یہ بات جس پر میرا بہت مذاق اڑایا جاتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ بڑا ہو کے میں وزیرِ اعظم بنوں گا۔ حالانکہ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس لفظ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

رئیس جو خاموش اور سنجیدہ بیٹھا میری صورت دیکھ رہا تھا' سہلانے لگا "قسم اللہ کی۔ اپن بھی اسے پاگل کہتے تھے۔"

میں نے کہا "سب جینیئس پاگل ہی کہلاتے ہیں۔ خیر' میری زندگی میں پہلا اہم موڑ اس وقت آیا جب میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ رئیس ایک فقیر زادی کے ڈیرے پر تھا جس کا مالک شاہ جی تھا۔ وہ فقیروں کا ٹھیکے دار تھا اور رئیس اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ اس وقت تک میں نے تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کر لی تھی اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دینا ہے۔ کچھ محنت اور کچھ ہیرا پھیری سے میں نے تھوڑا بہت سرمایہ بھی پس انداز کر لیا تھا۔"

شاد کی موت تک میری کہانی میں صرف سچ ہی شامل رہا۔ شبنم کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ دم بخود بیٹھی تھی اور میری طرح اسے بھی وقت کے گزرنے کا کوئی احساس نہ تھا۔ کسی کی آنکھوں میں نیند کے خیال کا گزر بھی نہ تھا۔ رئیس دو بار اٹھ کے چائے بنانے گیا مگر چائے صرف خود اس نے پی۔ میں نے اور شبنم نے کافی کو ترجیح دی۔

"یہ سب کچھ آج تک تم نے کسی کو نہیں بتایا؟" شبنم نے کہا۔

"نہیں۔ یہ میرے ماضی کی وہ کتاب ہے جسے خود میں نے ناصر عظیم کی عبرگزشتہ کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔"

"رخشی تمہاری بیوی تھی؟"

"ہاں۔ وہ میری پسند تھی لیکن بعد میں حالات نے ہمارے درمیان بدگمانیوں کی خلیج پیدا کی.... اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔"

"ایک وجہ میں بھی رہی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ شاید تم ہی سب سے بڑی وجہ تھیں۔ وہ میرے لیے تمہارے جذبات کو سمجھ نہیں سکتی تھی چنانچہ برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ کیا' دنیا کی ہر بیوی اپنے شوہر کی چاہت پر مکمل تصرف اور اختیار چاہتی ہے پھر میری مصروفیات کی نوعیت بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھی۔ میری مراد صرف سیاسی مصروفیات سے نہیں ہے۔ میرا بیشتر وقت گھر سے باہر گزرتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ کیسے گزرتا ہے اور کس کے ساتھ گزرتا ہے۔

اس کے لیے آج میں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہوں لیکن میں اس کا شکر گزار بھی ہوں کہ اس نے ایک خالص مشرقی عورت کی طرح بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمے داری نبھائی اور جب بالآخر حالات نے میرے خلاف سازش کی اور شاہ عالم کے لیے زندہ رہنا بھی ناممکن کر دیا تو رخشی نے میری پوری مدد کی اور مجھے پھر ناصر عظیم کی زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بدلے میں رخشی نے مجھ سے صرف اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی آزادی مانگی تھی جو میں نے اسے دے دی۔ اب ہم دونوں خوش ہیں اور مطمئن ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سال کے حالات نے مجھے اچھا سبق سکھایا ہے۔ زندگی کے تجربات سے جو سبق حاصل ہوتا ہے' وہ کتابوں سے نہیں ہوتا۔ میں نے زمانے کے ساتھ جو سلوک کیا تھا زمانے نے وہی میرے ساتھ کیا۔

"حال۔ یہ بات تم نے شروع کی ہے تو پوری بھی کرو۔" شبنم نے میری بات کاٹ کر کہا "اگر آج تم شاہ عالم کی زندگی ترک کر کے پھر ناصر عظیم بننا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ خصوصاً یہ سچ لینے کے بعد کہ وہ ناصر عظیم ہی تھا جو شاہ عالم بن کے دنیا کے سامنے آیا۔"

رئیس خان نے بڑے معنی خیز انداز میں سہلایا "لو جی' اس میں کون سی شک کی بات ہے۔"

"میں شک نہیں کر رہی ہوں۔ بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ناصر عظیم کو آخر شاہ عالم بننے کی کیا ضرورت تھی؟" شبنم نے کہا۔

رئیس نے میری وکالت جاری رکھی "نام تو بہت لوگ بدلتے ہیں جی۔"

"ناصر عظیم کیا برا نام تھا؟ یا کسی علم الاعداد کے ماہر نے کہا تھا کہ یہ نامبارک نام ہے۔ نام بدلو گے تو تقدیر بھی بدل جائے گی تمہاری۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس قسم کی خرافات میں یقین نہیں رکھتا۔ آدمی خود اپنی نیت اور اپنے عمل سے تقدیر کو بناتا یا بگاڑتا ہے۔ خدا کی خدائی میں مکافاتِ عمل کا قانون سب پر یکساں لاگو ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میرا نام خراب ہے اور اس سے میری زندگی میں خرابی کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں لیکن اس نام کے ساتھ جو ماضی منسوب تھا' وہ ایک مرحلے پر میرے لیے باعثِ شرم ہونے لگا۔ اسے تم میرا کمپلیکس بھی کہہ سکتی ہو۔ میرا احساسِ کمتری۔ نیک نامی اور شہرت کے راستے پر قدم رکھنے سے پہلے میں اپنے ماضی کا ہر نقش مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سے تعلق ختم کرنا ضروری سمجھنے لگا تھا جو میں نے یتیم خانے میں گزارا اور اس کے بعد در در کی ٹھوکریں کھاتے' دو وقت کی روٹی کے لیے گھٹیا کام کرتے۔ گالیاں کھاتے' بھیک مانگتے اور چوریاں کرتے گزارا۔ چھوٹی چھوٹی چوریاں۔ کسی گھر میں کام کرتے ہوئے موقع پا کے دس بیس روپے مار لیے۔ کبھی سودے میں سے تو کبھی ہوٹے میں سے۔ ایک دفعہ گھڑی چرائی اور عقلمندی کا یہ حال تھا کہ سیکڑوں کی نہیں ہزاروں کی رسٹ واچ تھی جو خوف اور گھبراہٹ میں صرف دو سو میں کسی کو دے دی۔ ہم نے گاڑیوں کے وہیل کیپ نکالے۔ ایک بار بیٹری نکال لی پھر آسان کام پکڑ لیا۔ گاڑیوں کی ڈکی آسانی سے کھل جاتی تھی۔ پرانی چابی جس کے کنارے گھسے ہوئے ہوں پرانے تالے کھول دیتی تھی۔ ہر ڈکی سے ہمیں جیک مل جاتا تھا۔ وہ پچاس روپے میں بک جاتا تھا۔ یہ چیزیں ہم سے ایک کباڑیا خریدتا تھا۔ اس نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ صرف جیک کیوں اٹھاتے ہو' ڈکی کھول لی تو اسپیئر وہیل بھی نکال لو۔ سو ڈیڑھ سو اس کے ملیں گے۔ ہم یہ بھی کرنے لگے۔ کباڑیا تو ہمیں باقاعدہ چور بنا کے چھوڑتا۔ اس کا مخلصانہ مشورہ تھا کہ چھوٹی چوریاں چھوڑو۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ بڑے ہاتھ مارو۔ گاڑی میں ٹیپ ریکارڈر ہوتا ہے اور اے سی ہوتا ہے۔ ہزاروں کما سکتے ہو تم مگر ایک اتفاق نے ہمیں عادی چور اور مجرم بنانے سے بچا لیا۔ ایک بار ہمارے سامنے پولیس نے ہماری عمر کے ایک لڑکے کو پکڑ لیا جو کار سے ٹیپ نکال رہا تھا۔ شاید اس واقعے کا بھی ہم پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا۔ ہم خود کو بہت چالاک سمجھتے تھے کیونکہ کبھی ہم پکڑے نہیں گئے تھے لیکن اس واقعے کے چند دن بعد ہم نے ایک اخبار دیکھا۔ ایک شور والے نے اخبار کے ٹکڑے میں روٹیاں لپیٹ کر دی تھیں شاید۔ اس میں ہم نے اس لڑکے کی تصویر دیکھی۔ رئیس نے بھی اسے پہچان لیا کہ یہ تو وہی لڑکا ہے جو ہمارے سامنے پکڑا گیا تھا۔ تھانے میں پولیس نے اس سے مزید چوریوں کا اعتراف کرانے کے لیے اسے مارا اور تشدد کی تاب نہ لا کے وہ مر گیا۔ تھانوں میں یہ ہوتا ہی رہتا ہے اور پولیس ایسے واقعات پر آسانی سے خودکشی کا کیس بنا کے پردہ ڈال دیتی ہے لیکن خبر میں اس وحشیانہ تشدد کی تفصیلات اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ذکر بھی تھا۔ ہم سخت دہشت زدہ ہوئے اور قصہ مختصر۔ یہ چوری چکاری کا سلسلہ بند کر دیا جو شاید ہمیں ایک دن ڈاکو بنا دیتا۔ اب ایسے ماضی کے ساتھ نیک نامی کے سفر کا تصور بھی مشکل تھا اور جب مجھے یہ راستہ نظر آیا تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ پرانی بدنامیوں کے داغ دھونے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں ایک نیا آدمی بن کے دنیا کے سامنے آؤں جس کا اپنے ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ اندیشہ نہ رہے کہ کسی موڑ پر کوئی مل جائے گا تو کہے گا کہ شاہ عالم۔ تم وہی ناصر عظیم ہو نا۔ یتیم خانے والے۔ جو فلاں گیراج میں تم سے بڑے لڑکے تمہارے ساتھ کیا کرتے تھے اور تم ہوٹل میں برتن اٹھاتے تھے۔ گالیاں دھوتے تھے۔ چوریاں کرتے تھے۔ آج بڑے شریف اور معزز بنے پھر رہے ہو نام بدل کے لیکن ہم جانتے ہیں تمہیں۔"

میں نے کوشش کی تھی کہ اپنی داستانِ حیات کے ایک باب کا ذکر ہی نہ کروں جو درحقیقت میری کتابِ زندگی کا سب سے اہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حصہ تھا۔ میں نے خان اعظم اور چندا کے ساتھ ان کے گھر میں گزارے ہوئے وقت کا حوالہ دینے سے بھی گریز کیا تھا مگر شبنم کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ وہ وقت کی ترتیب CHRONOLOGY کے ساتھ اس کتاب کو پڑھ رہی تھی۔

"تم نے یہ سوشل ورک اور خدمتِ خلق کا سلسلہ کب شروع کیا تھا اور اس کا خیال خود تمہیں آیا تھا یا تمہیں اس کی طرف راغب کرنے والا کوئی اور تھا؟" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "بتاتا ہوں۔ جب شادو مرگئی تو میری زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ خلا میرے یقین اور اعتبار میں پیدا ہوگیا تھا۔ زندگی کے ساتھ میرے رشتوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ میری شخصیت میں پیدا ہوگیا تھا اور میرے شعور میں پیدا ہوگیا تھا۔ وہ خود فراموشی کا زمانہ تھا جب میں اس شعر کی تفسیر بن کے رہ گیا تھا۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اور میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا کیونکہ اسے یاد رکھنے کی قوتِ برداشت مجھ میں نہ تھی۔ خود فراموشی کی یہ کیفیت مجھ پر کتنا عرصہ مسلط رہی' مجھے نہیں معلوم۔ جب بالآخر انسان کی صورت میں ایک فرشتہ غیب نے میری مدد کی تو میں پھر زندگی کی طرف لوٹا مگر اس طرح کہ میری خواہشات کا سینے میں اٹھنے والا آتش فشاں سرد پڑ چکا تھا۔ حرکی اور کامیابی کے آخری افق تک میری قوتِ پرواز دم توڑ چکی تھی۔ مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ کوئی خوشی میرے دل کو راس نہیں آتی تھی۔ عورت کا لفظ ہی میرے لیے بے معنی ہو کے رہ گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔"

"کون تھا وہ فرشتہ غیب؟"

میں نے اس وقت تک طے کرلیا تھا کہ یہاں سے کہانی کو کیا موڑ دینا ضروری ہوگا "وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔ کرنل خان۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں دنیا کے ہر محاذ پر لڑچکا تھا اور شجاعت کے سارے تمغے حاصل کرچکا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میری ٹکر ایک گاڑی سے ہوگئی تھی اور میں سڑک پر بے ہوش پڑا تھا۔ حادثہ میری اپنی غلطی کا نتیجہ تھا اور وہ گاڑی خود کرنل خان چلا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی جیپ میں ڈالا اور ایک اسپتال لے گئے۔ میری یادداشت اس حادثے میں متاثر ہوئی تھی۔ جسمانی طور پر شفایابی کے بعد بھی میں بہت عرصہ ذہنی طور پر دنیا سے لاتعلق رہا۔ آہستہ آہستہ میری باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگیں۔ ان سب باتوں کا تعلق میرے ماضی سے تھا جس کی یادیں میرے ذہن میں اس طرح محفوظ تھیں جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے کے ٹکڑے۔ میرا علاج جاری رہا اور ایک وقت آیا' جب اس آئینے میں میرے ماضی کا عکس ایک مکمل تصویر کی صورت میں واضح ہوگیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ لاوارث گمنام اور دل شکستہ ہونے کے باوجود میں ناکام نہیں ہوں۔ میرے پاس اپنا بھی بہت کچھ تھا اور شادو اس سے کہیں زیادہ میرے لیے چھوڑ گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میری صحت کی مکمل بحالی میں ایک سال گزر گیا تھا۔ کرنل خان بہت شفیق اور انتہائی ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے بڑھ کر میری زندگی کی تعمیرِ نو میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان کی بیوی نہیں تھی' ایک پوتی تھی چاندنی نام تھا اس کا۔"

شبنم معنی خیز طریقے پر مسکرائی "بڑی دیر بعد نام لیا تم نے اس کا۔"

"اب تمہارا اگلا سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ بہت خوب صورت تھی؟ کیا میں اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا تھا۔ تو ان دونوں سوالوں کا جواب ہے' ہاں۔ کرنل خان کی بیوی نہیں تھی۔ اس خاندان میں دو ہی افراد تھے۔ تیسرا فرد میں ہوگیا۔ خان اعظم' میں کرنل خان کو اسی نام سے پکارتا رہا بعد میں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فی الحال اپنی پرانی زندگی کی تباہیاں بھول جاؤ۔ اصل زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اس کی فکر کرو۔ ایک ناکامی یا ایک حادثہ تمہارے مستقبل کو بھی تباہ کردے' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے کہنے سے میں نے تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کیا۔ میں نے انٹر کیا' پھر بی اے۔ اس کے بعد ایل ایل بی اور ایم اے کا امتحان ساتھ ساتھ دیا۔ بی اے میں میرے مضامین معاشیات اور پولیٹیکل سائنس تھے۔ ایم اے میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں کیا۔ عام طور پر یہ سب کرنے میں چھ سال لگ جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے میٹرک کے بعد لیکن میں نے بی اے میں اضافی ڈگری قانون کی لے لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی محنت میں نے کی اس سے کہیں زیادہ محنت مجھ پر کرنل خان نے کی۔ ان کی پوتی چندا نے ذرا مختلف انداز میں کی۔ اس نے میری ذہنی رو کو بھٹکنے نہیں دیا اور ایک مثبت سمت میں رواں رکھا۔ اس نے اپنی محبت کے اور میرے درمیان بہت سے چیلنج حائل کردیے اور اپنے حصول کو میری کامیابی سے مشروط کردیا۔ وہ مسلسل مجھے ترغیب دیتی رہی اور قائل کرتی رہی کہ میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ کرنل خان نے مجھے مارشل آرٹ بھی سکھائے۔"

شبنم چونکی "مارشل آرٹ مگر شاہ عالم تو یہ سب نہیں جانتا تھا۔"

میں نے ہنس کے کہا "میں نے کبھی کسی پر ظاہر نہیں کیا کہ میری حقیقت کیا ہے۔ میرے استاد محترم نے یہی کہا تھا کہ بیٹا' اس صلاحیت کو کبھی کسی کے خلاف استعمال مت کرنا۔ یہ تمہارے دفاع کے لیے ہے۔ یہ ہتھیار نہیں ہے۔ ڈھال ہے۔ کرنل خان نے مجھے وہ بتایا جو میں آج ہوں لیکن میرے لیے بڑے شرم اور دکھ کی بات ہے کہ میں ان کے ساتھ سیدھے راستے پر چلتے چلتے بھٹک گیا۔"

"اگر وہ تمہارے گاڈ فادر تھے اور چندا تمہاری گارجین اینجل تھی تو تم کیسے بھٹک گئے؟" شبنم نے کہا۔

"تم GOD FATHER کی بات کرتی ہو' حقیقی باپ اپنی طرف سے اولاد کی پرورش میں کوتاہی نہیں کرتا مگر اولاد گمراہ ہوجاتی ہے۔"

"تم کو چندا کی محبت بھی نہ روک سکی؟"

"تم نے اسے GUARDIAN ANGEL کہا تھا لیکن کسی پر شیطان سوار ہو تو اسے غلط راستے پر چلنے سے کون روک سکتا ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں' دولت مند بھی ہوں تو میرا دماغ خراب ہوگیا۔ کرنل خان کے گھر میں میری ملاقات ڈاکٹر کمال فاروقی سے ہوئی تھی جو کمال کلینک چلاتے تھے اور اب کمال اسپتال کے مالک ہیں۔"

شبنم کچھ حیران ہوئی "ان کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی۔"

"رائٹ۔ کمال کی بیوی قمر میری بہن بنی ہوئی تھی اور ہے آج بھی۔"

شبنم نے کچھ سوچ کے کہا "تم اس شادی میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ بہت ڈھیٹ بن کے گیا تھا میں اور بہت بے عزت ہو کے آیا تھا۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا بلاشبہ میں اس کا مستحق تھا۔"

"کرنل خان تم سے ناراض تھے اور چندا بھی؟"

"ظاہر ہے۔ وہ اس حد تک بدظن ہوچکے تھے .... کہ میری صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ جو چندا میری محبت میں دنیا کو بھولی ہوئی تھی' وہ آج نفرت کرتی ہے مجھ سے۔"

شبنم نے کہا "آخر ایسا کیا جرم تھا تمہارا؟"

اس سوال کے لیے میں نے بہت پہلے سے تیاری کرلی تھی۔

"میرا جرم تھا رخشی۔"

"رخشی!"

"ہاں رخشی۔ اس سے شادی اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس تمام نیکی اور خیرخواہی کے جواب میں جو میرے ساتھ کرنل خان نے اور چندا نے روا رکھی' میرا رخشی سے شادی کرنا احسان فراموشی' خودغرضی بلکہ کمینہ پن تھا۔ ناقابلِ معافی جرم تھا اور ایسا گناہ تھا جس کی سزا مجھے قدرت نے دی۔ مجھے دھوبی کے کتے سے بدتر کردیا۔ میں نہ چندا کا رہا اور نہ ہی رخشی کو اپنا سکا۔"

"لیکن ... تم چندا کو چاہتے تھے تو پھر رخشی سے شادی...؟"

میں نے کہا "شامتِ اعمال' بدبختی' دماغ کی خرابی۔ اسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ جب میری زندگی میں کچھ خود غرض لوگ آئے جو یہ جان گئے تھے کہ کرنل خان میرے والد نہیں ہیں۔ میں دنیا میں اکیلا ہوں اور اتنا دولت مند بھی ہوں تو انہوں نے دوستی کے نام پر میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کیا۔ مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے ان ٹھگ قسم کے دوستوں کی بات مانتے ہوئے ایسی جگہ سرمایہ کاری کی جہاں میرا سارا پیسہ ڈوب گیا۔ میں ایسے لوگوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا تو قدرتی طور پر میری سرگرمیاں بھی اخلاقی حدود کو تجاوز کرنے لگیں۔ اس عمر میں جب آدمی پر جوانی دیوانی کا غلبہ ہو اور ساتھ ہی دولت کا غرور سوار ہو اور اس کو راستہ دکھانے والے بھی کثیر ہے ہوں تو اس کی عقل غلط اور صحیح میں تمیز کیسے کرسکتی ہے۔ کرنل خان کس رشتے سے میرے اخلاق و کردار پر قدغن لگاتے۔ انہوں نے واجبی حد تک مجھے سمجھایا اور جب یہ محسوس کیا کہ ان کی کوشش کا مجھ پر الٹا اثر ہو رہا ہے تو انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا حالانکہ مجھے نئی زندگی دینے والے وہی تھے اور مجھے آدمی سے انسان بنانے میں سارا دخل انہی کی کوشش کا تھا لیکن میں اتنا گر گیا تھا کہ الٹا میں نے ان کی نیت پر شک کیا۔ میں نے ایک دن ان سے کہہ دیا کہ میری پرورش اور تربیت کے معاملے میں وہ مخلص نہیں تھے۔ ان کے پیشِ نظر ایک ذاتی مفاد تھا اور جس غرض کی خاطر انہوں نے یہ سب کیا' وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ بالآخر وہ مجھے گھرداماد بنالیں۔ میرے جیسا خوبرو' اعلیٰ تعلیم یافتہ' دولت مند اور لاوارث شخص انہیں دنیا میں دوسرا کہاں ملے گا۔"

"اتنی گھٹیا بات کی تم نے؟"

"ہاں اور جواب میں کرنل خان نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ چندا نے یہ بھی نہیں کیا۔ اس نے مجھ پر تھوک دیا۔ وہ میرا اس گھر میں آخری دن تھا۔ اس کے بعد میں پھرے گھر اور لاوارث ہوگیا۔ مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ رہا۔ نتیجہ یہ کہ میرے چاروں طرف لالچی گدھ جمع ہوگئے جو زبان کے اتنے میٹھے تھے کہ میں ان کی دوستی پر ناز کرتا تھا اور مجھے کسی دکھ کا احساس تک نہیں تھا کہ کرنل خان اور چندا سے رشتہ توڑ کے میں کس جہنم کی پستی میں گر چکا ہوں۔ اس کے عذاب کا احساس مجھے بعد میں ہوا' جب میری دولت ایسے اڑ گئی جیسے دھوپ پڑتے ہی شبنم غائب ہوجاتی ہے۔ معاف کرنا' میری مراد تم سے نہیں تھی۔"

شبنم ہنسی "یہ وہ شبنم ہے جو پانی کی بوند جیسی لگتی ہے مگر ایلفی ہے۔ ایسی چپکے گی کہ چھڑائے نہ چھوٹے گی۔"

"چپکے گی کیا مطلب۔ چمٹ گئی ہے اور اب چھڑانا بھی کون چاہتا ہے۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ یہ تمہارے لیے ہی کہا گیا تھا۔"

"یہ کافی کے بارے میں بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں رئیس خان صاحب!"

رئیس سمجھ گیا "ٹھیک ہے جی۔ آج اپن خانساماں گیری نہیں کریں گے تو کیا کریں گے۔ وہ تمیں مار خان جو نہیں ہے۔"

ساتھ کے کسی گھر میں کلاک نے چار سریلے گھنٹے بجائے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ ایک پوری رات میں نے ناصر عظیم کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماضی کو شاہ عالم کے حال سے ملاتے گزاری تھی مگر یہ میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اپنی کامیابی پر بہت مطمئن تھا۔ میری کہانی میں کوئی جھول نہیں تھا۔ میں مستقبل کے اندیشوں سے محفوظ ہوگیا تھا۔ اب مجھے یہ خطرہ بھی لاحق نہیں رہا تھا کہ میری اصلیت کا پتا چل جانے کے بعد شبنم ایک ردِعمل کے طور پر مجھ سے متنفر ہوجائے گی اور ممکن ہے پاگل پن کے انتقامی جذبات کا شکار ہوکے کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔ اب شبنم اور چندا کے آمنے سامنے ہوجانے کے امکان سے ڈرنے کی وجہ بھی نہیں رہی تھی۔ جھوٹ اور سچ کی یہ آمیزش ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اب میرا ذہن بالکل صاف تھا۔

میں نے کہا "جب قارون کا خزانہ خالی ہوگیا تو قارون اکیلا رہ گیا۔ اس کے کھیت سے دانہ چگنے والے پنچھی اڑ گئے تھے اور قارون دانے دانے کا محتاج ہوگیا تھا۔ میری دوستی کا دم بھرنے والے پورا فائدہ اٹھا کے الگ ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے پیسے سے پراپرٹی ڈیلر کا بزنس شروع کیا تھا۔ اس کی خوب کمائی ہورہی تھی مگر اپنا شریکِ کار تو کیا' اس نے مجھے ملازم تک رکھنا گوارا نہ کیا۔ ایک اور امپورٹر ایکسپورٹر بن گیا تھا۔ اس نے مجھے استعمال کرنے کا سوچا۔ میں اس کا مال لے کر دو چار بار بانگ کانگ اور سنگاپور گیا تو مجھے بھی فائدہ ہوا لیکن اسے مجھ سے خطرہ لاحق ہوگیا۔ میں بے وقوف نہیں تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ میرا رابطہ رہتا تو اس کے کاٹک میرے کاٹک ہوجاتے اور میں اس کے کاروبار میں گھس جاتا۔ اس نے میرا پتا صاف کرنے کے لیے مجھے پکڑوا دیا۔ میں کچھ دن کسٹم کی حوالات میں رہا پھر کچھ مار کھا کے اور کچھ دے دلا کے رہا تو ہوگیا مگر مجھے میرا پاسپورٹ نہیں ملا۔ وہ ضرور کسی اور کے کام آیا ہوگا۔ اس پر تصویر بدل کے کسی کو ٹرانزٹ ایسٹ یا امریکا بھجوانے کے لیے لاکھوں ملے ہوں گے۔ مجھے اپنی ذلت کا زیادہ احساس ہوا۔ کسٹم والوں کی نظر میں ناصر عظیم ایک کھیپی تھا۔ تم کھیپی کا مطلب سمجھتی ہو نا؟"

"بالکل سمجھتی ہوں۔ وہ ایسے ہی نوجوان ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ تھوڑا بہت سامان لے کر دبئی بانگ کانگ' بنکاک آتے جاتے رہتے ہیں۔ اپنی تفریح کے اخراجات پورے کرکے بھی خاصا پیسا انداز کرلیتے ہیں اور انہی کے ذریعے پکتے رہتے ہیں جن کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔"

"تو میں بھی اپنی اس حیثیت پر بہت شرمندہ ہوا۔ مجھے اپنے کروڑوں یاد آئے جو مالی مفت کی طرح دوسروں کی جیب میں چلے گئے تھے۔ مجھے گزرا ہوا وقت یاد آیا۔ یہ یاد آیا کہ شادو نے مجھ سے مرتے وقت کیا کہا تھا۔ وہ کیا چاہتی تھی اور میں کیا بن گیا۔ وہ مجھے عزت اور شہرت کی بلندیوں پر فائز دیکھنے کی آرزو لیے مرگئی اور میں بدنامی کی راہ پر چل پڑا ہوں۔ دولت تو ہر صورت میں آجاتی ہے۔ چور' اچکا' اسمگلر اور دلال سب کما لیتے ہیں۔ شادو نے میرے لیے بڑی قربانی دی تھی اور میرے لیے کامیابی کے سفر کے لیے بنیادی وسائل فراہم کرگئی تھی۔ سالوں بعد جب میں نے ان وسائل کو بروئے کار لانے کا سوچا تو ان کی مجموعی مالیت ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ اس میں وہ رقم شامل تھی جو مجھے لیگل فرم کی فروخت سے' کوٹھیوں اور کاروں کے عوض اور کیش کی صورت میں ملی تھی مگر ڈھائی کروڑ ختم ہونے میں ڈھائی برس بھی نہیں لگے تھے۔ میں پھر مفلس و قلاش تھا۔ اگر میں نے کرنل خان کے مشورے اور رائے کو شامل رکھا ہوتا تو بزنس میں کبھی نقصان نہ ہوتا۔ خیر' جب یہ احساس ہوا تو میں نے اپنی زندگی کا رخ بدلا اور اپنے باقی ماندہ اثاثے فروخت کرکے ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی۔"

شبنم طنز سے مسکرائی "یعنی کام بھی وہ کیا جس میں ہیرا پھیری کی پوری گنجائش تھی۔"

میں نے کہا "تم کہہ سکتی ہو کہ میں رہا وہی چندے مانگنے والا۔ آغاز کیا تھا یتیم خانے کے لیے چندہ مانگ کے۔ مودی بن جاتا تو ساری عمر مسجد کے لیے چندے مانگتا۔ فلاحی کام بھی بہانہ ہی تھا' چندے مانگنے کا۔ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ملازمت میرے مزاج کو راس نہ آتی اور مجھے مل بھی نہیں سکتی تھی۔ صرف ڈگری کو پوچھتا کون ہے۔ میں پریکٹس کرکے وکیل بن جاتا مگر ایک تو میرے پاس لائسنس نہیں تھا' میں کسی وکیل کا APPRENTICE نہیں بنا تھا اور اگر میں یہ شرط بھی پوری کرلیتا تو وکالت کے چلنے تک کہاں سے کھاتا۔ ڈاکٹر اور وکیل کی پریکٹس چلنے میں تقدیر کا بہت دخل ہوتا ہے اور اس میں وقت لگتا ہے۔ تو بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک ایسا راستہ منتخب کیا جس پر چل کے میں ایک ساتھ دو منزلوں تک پہنچ سکتا تھا۔ ہم خرما و ہم ثواب والا راستہ۔ لگن اور ذہانت میرا اصل سرمایہ تھی۔ میں بات چیت کے فن میں ماہر تھا۔"

"GOOD CONVERSATIONALIST" شبنم نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں۔"

"بس ایسی ہی صفات نے مجھے کامیاب کیا۔ میں لوگوں کو قائل کرسکتا تھا اور وہ میری نیک نیتی سے متاثر ہوجاتے تھے۔ میری رفاہی تنظیم نے بہت جلد شہرت حاصل کی اور مجھے عطیات ملنے لگے۔ یہ سب تم جانتی ہو۔"

"سب تو نہیں مگر ہاں' مجھے معلوم ہے کہ تم نے غریبوں کے ہمدرد بن کے کیا کام کیے تھے۔ اس وقت میں نے عملی صحافت کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سب میں نے سنا ہے۔"

"ایک وقت آیا جب میری گڈوں نے مجھے الیکشن میں کھڑا ہونے کے قابل کردیا۔ میں نے خود پر بہت پھر خاصا مال کمالیا تھا اور اس فیلڈ میں رہ کے رائے عامہ کو متاثر کرنے کے سارے حربے بھی سیکھ لیے تھے۔ پہلا الیکشن لوکل باڈیز کا تھا جو میں شاید ہار جاتا کہ ابھی میں پبلک لیڈر کے طور پر اتنا مقبول نہیں تھا اور

سیاست کے داؤ پیچ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ میرے مقابل دو پرانے پاپی تھے جو روایتی طور پر ایک دوسرے کے حریف ہوتے تھے۔ انہیں ڈر یہ پیدا ہوا کہ تیسرا فریق یعنی میں ان کے ووٹ توڑ لوں گا۔ یہ ووٹ ضائع ہوجائیں گے۔ ان دونوں نے مجھے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا اور میں نے دونوں سے سودے بازی کی۔ بالآخر مجھے زیادہ قیمت دینے والا کامیاب ہوگیا۔ میں ایک کے حق میں بیٹھ گیا۔ اس طرح مجھے اچھی خاصی قیمت مل گئی اور بعد میں وہ فریق کامیاب ہوا تو مزید فائدے حاصل ہوئے۔ مجھے ٹھیکے ملے' کچھ سپلائی کے اور کچھ تعمیرات کے۔ قصہ مختصر' میں پہلے دولت مند بنا یا پہلے مشہور ہوا' یہ کہنا مشکل ہے۔ یہ دونوں مقصد ایک ساتھ حاصل ہوئے اور ایک وقت آیا کہ میں نے اسی حریف کو الیکشن میں چت کیا جس نے مجھے دستبرداری کی قیمت ادا کی تھی۔ بس اس کے بعد سارے راستے کھلتے چلے گئے۔ میں ایک کے بعد ایک کامیابی حاصل کرتا گیا' یہاں تک کہ میں نے خود اپنی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی اور باقاعدہ سیاسی لیڈر بن گیا۔ میری زندگی کے اس دور کی تم چشم دید گواہ ہو لیکن اب آتی ہے پھر وہی مکافاتِ عمل کی بات۔ خدا نے میری رسی بھی بہت دراز کی اور سیاست کے نام پر میں نے وہی کیا جو اس ملک کے بیشتر سیاست دان کررہے تھے بلکہ سب کررہے تھے۔ ایک دو کو چھوڑ کے اور جن کے کالے کرتوتوں کے باعث آج ملک اس حال کو پہنچا ہے کہ اس کی بقا اور سلامتی بھی غیر یقینی ہوگئی ہے۔ وہ یقین جو اس ملک کی بنیادوں میں شامل تھا' اٹھ گیا ہے۔ اب صرف قدرت کے کسی معجزے کا انتظار باقی ہے۔

میری اپنی پارٹی کا حال بھی وہی تھا جو ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کا تھا۔ جمہوری مزاج پارٹی کے لیڈر کا نہ ہو تو پارٹی خاک جمہوری ہوگی۔ ہاں منشور کی حد تک سب جمہوریت اور انصاف کے علمبردار ہیں مگر منشور کی حیثیت ایک کاغذی تحریر کے سوا کیا ہے۔ بدقسمتی سے یہی حال ملک کے قانون کا ہے اور یہی حشر ہم نے آئین کا کردیا ہے کہ وہ صرف کتابوں میں لکھے ہوئے ضابطے ہیں جن پر عمل کسی نے نہیں کیا۔ میری اپنی جماعت کا منشور 'امن' انصاف اور آزادی کے موضوع پر ایک متاثر کرنے والی تحریر تھا۔ اسے ملک کے ممتاز دانشوروں نے اور وکیلوں نے تحریر کیا تھا مگر اس کی حیثیت اور اہمیت ردی کاغذ جیسی رہ گئی تھی۔ میں بھی ہر جماعت کے سربراہ کی طرح مکمل اختیارات اپنے پاس رکھتا تھا اور جماعت دن میں شو تھی' جیسے کہ سب سیاسی جماعتیں تھیں اور ہیں۔ ہر پارٹی میں کچھ لوگ مخلص بھی ہوتے ہیں اور سازش کرنے والے بھی۔ میرے خلاف سازشی عناصر کامیاب ہوئے اور میری پارٹی مجھ سے چھن گئی۔ یہ سب تمہیں معلوم ہے۔ انتہا یہ ہوئی کہ مجھے مار دیا گیا' جب کہ میں زندہ تھا۔ مجھے شہید کرنے والوں نے میرا مزار تک بنا دیا اور مجھے یہ ثابت کرنا مشکل ہوگیا کہ میں اصل شاہ عالم ہوں اور زندہ ہوں۔"

شبنم ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔ یہ ذکر اس کے لیے ذہنی اور روحانی اذیت کا سبب تھا مگر آج اظہارِ حقیقت کا وقت آیا تھا تو وہ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی "عالی۔ تم اسے جانتے تھے؟"

"تم کس کی بات کررہی ہو؟"

"وہ جو تمہارا ہم شکل تھا اور تمہارے دھوکے میں مارا گیا؟"

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اسے آگے لانے والے میرے دو نائب صدور تھے۔ شمس اور قریشی۔ ان دونوں پر میں بہت اعتبار کرتا تھا لیکن پھر مجھے ایسی خبریں ملنے لگیں کہ وہ اندر ہی اندر میرے خلاف لوگوں کو اکسا رہے ہیں۔ میرے اپنے ذرائع تھے' مخبر تھے جو مجھے ہر شخص کے بارے میں خفیہ اطلاعات فراہم کرتے تھے مگر ظاہر ہے وہ بھی فرشتے نہیں تھے۔ اگر میرے حامی اراکین کی وفاداریاں خریدی جاسکتی تھیں تو مخبر بھی خریدے جاسکتے تھے۔ میں طاقت کے نشے میں اتنا بدمست تھا کہ مجھے اپنی ناک کے نیچے ہونے والی گڑبڑ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ان اطلاعات کو اہمیت ہی نہیں دی کہ پارٹی میں میرے خلاف کوئی بغاوت کامیاب ہوسکتی ہے اور میری جگہ کوئی اور بھی لے سکتا ہے۔ میرا ہم شکل میری جگہ بٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ خیال تو مجھے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین حد تک فلمی آئیڈیا تھا۔"

"PRISONER OF ZENDA والی سچوئشن۔" شبنم بولی۔

"رائٹ۔ یہ بالکل صحیح مثال ہے مگر جو ناممکن تھا وہ ممکن ہوا۔ کیسے ہوا' یہ مجھے معلوم نہیں۔ وہ کون تھا جو اس ڈبل رول کے لیے تیار ہوا اور استعمال ہوا۔ خود میری عقل آج تک حیران ہے کہ ایسا آدمی انہیں ملا تو کہاں سے اور کیسے انہوں نے اتنی رازداری برتی کہ میرے قتل کا منصوبہ مکمل ہوگیا مگر مجھے پتا نہ چلا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر میں تقدیر کا پانسا میرے حق میں پلٹ گیا جس کی میرے مخالفین کو امید نہ تھی۔ میں بچ گیا اور وہ مارا گیا جو میری جگہ لینے والا تھا لیکن ایسا ہوجاتا تو سوچو' کتنی گڑبڑ ہوجاتی۔"

"مجھے عملی اور عقلی طور پر یہ منصوبہ ناقابلِ عمل لگتا ہے... آج بھی۔"

"وہ تو یقیناً ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ اس کے نتائج کیا ہوتے تو میری عقل چکرا جاتی ہے۔ وہ شاہ عالم بن جاتا' پارٹی کے چیئرمین کی جگہ بیٹھ جاتا اور پھر اسے لانے والے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے۔ وہ ایک PUPPET ہوتا۔ کٹھ پتلی' مگر کیا اس طرح پارٹی چل سکتی تھی؟ وہ شاہ عالم ہاؤس میں پہنچ جاتا اور رخشی کا شوہر بن بیٹھتا۔ یہ سب تمہارے سامنے کی بات ہے مگر میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ پس پردہ ہونے والی بہت سی باتوں کا کسی کو علم نہیں۔ کہتے ہیں' مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زبردست ہوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ میرے ساتھ وفاداری کا حق تیمور نے ادا کیا۔ وہ سینئر نائب صدر تھا اور میرا دستِ راست تھا۔ اس نے بہت پہلے مجھے خبردار کیا تھا کہ میری ملک سے مسلسل غیر حاضری اور پارٹی کے معاملات سے عدم دلچسپی بہت سی خرابیوں کو جنم دے رہی ہے۔ میرے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے کہ میں عیاش اور بدکردار ہوں۔ ظالم اور خوئیں پرور ہوں۔ وفادار اور مخلص کارکنوں پر خوشامدیوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے پارٹی کے مستقبل سے زیادہ اپنے کاروبار کی فکر رہتی ہے اور میرے کاروبار کے بارے میں بھی یہ بات خوب اچھالی جارہی ہے کہ میرا تعلق اسمگلروں سے ہے۔ میں جن ملکوں کے دورے کرتا ہوں' وہاں میرے تعلقات بدنامِ زمانہ غیر قانونی کاروبار میں ملوث افراد سے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ تیمور کی تشویش غلط نہیں اور ان افواہوں میں کچھ حقیقت ضرور ہوگی لیکن یہ تو خود تیمور کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مجھے ختم کرنے کا خوفناک منصوبہ مکمل ہوگیا ہے اور اس پر عمل درآمد کا وقت بھی مقرر ہے مگر اس سازش کا پورا پلان تیمور کو بالکل آخری وقت میں معلوم ہوا اور پھر بلاشبہ اس نے بڑی تیزی سے اس پلان کو ناکام بنانے کے لیے دوسرا پلان بنالیا۔ بیرونِ ملک واپسی پر مجھے اغوا کرکے قتل کرنے اور میری لاش کو غائب کرا کے میری جگہ میرے ہم شکل کو لانے والے منہ دیکھتے رہ گئے۔ تیمور نے پورے پلان کو اچانک سوئچ اوور کردیا۔ ادھر سے ادھر۔ نقلی شاہ عالم کو پلان کے مطابق ماردیا گیا مگر میں بچ گیا۔ مجھے بطور خاص سڑک کے راستے لایا جاتا اور ایک مشتعل ہجوم مجھے قتل کردیتا لیکن تیمور نے مجھے کراچی ایئرپورٹ سے غائب کردیا اور میں نے لاہور تک ٹرین میں سفر کیا۔ نقلی شاہ عالم کے ساتھ وہ ہوا جو میرے ساتھ ہوتا۔ یہ سازش بڑے منظم طریقے پر کی گئی تھی۔ اس کے لیے پیشہ ور قاتلوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں اور اس امکان کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں میرا پلان بدل جائے تو میرے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر بھی فرشتۂ اجل ملاقات کے لیے موجود ہو۔ تیمور نے میرے وفادار کارکنوں کو استقبال کے لیے راتوں رات لاہور کے اسٹیشن پر بلالیا تھا اور حفاظتی انتظامات بھی سخت کردیے تھے۔ جب میں لاہور پہنچا تو وہاں میرے قتل پر مامور پروفیشنل لوگ تیار تھے۔ وہ سمجھے کہ انہیں جس مقصد کے لیے وہاں تیار رہنے کو کہا گیا تھا' یعنی میرے قتل کے لیے وہ پورا کرنے کا وقت آگیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا جس میں تیمور کی وجہ سے میں صاف بچ گیا۔ قاتلانہ حملہ کرنے والے کو وہیں ماردیا گیا۔ یہ بھی سازش کرنے والوں کے پلان میں شامل تھا۔ ایسا نہ کیا جاتا تو پولیس ان سے سب کچھ اگلوالیتی۔ مجھے بحفاظت نکال کے غائب کردیا گیا۔ یہ اندیشہ بہرحال تھا کہ ناکامی کا شکار ہونے والے کہیں دوسرا وار نہ کردیں۔

"پلان الٹا ہوجانے سے بڑی افراتفری پھیلی۔ باغیوں کے راہنما شمس اور قریشی تھے۔ وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ یہ گڑبڑ کیسے ہوئی۔ انہوں نے تو اپنی طرف سے شاہ عالم کو ماردیا تھا۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا تھا اور اس کا شاندار مزار بنانے کے لیے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس تک طلب کرلیا تھا مگر شاہ عالم غائب تھا۔ اگر میں ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ مجھے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے۔ پریس کانفرنس میں وضاحت کردی جاتی کہ مشتعل ہجوم نے غلط فہمی میں کسی اور کو شاہ عالم سمجھ کے ماردیا جس کی شکل ان سے بہت ملتی تھی اور ہمارے چیئرمین صاحب الحمدللہ خیروعافیت کے ساتھ ہیں۔ پھر نقلی شاہ عالم ان کے لیے ایک چابی کا کھلونا ہوتا۔ اسے وہ اپنی مرضی سے چلاتے اور جب اس سے سارے کام کرالیتے تو ایک دن اسے دنیا سے رخصت کردیتے۔ شاہ عالم کا مرنا طے تھا۔ کچھ دن بعد جب یہ معاملہ کھلا تو ساری دنیا کی طرح میرے مخالفین بھی چکرا گئے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ جسے مارنا تھا' وہ تو زندہ سلامت ہے اور پریس کانفرنس میں اعلان کرتا پھر رہا ہے کہ مرنے والا میں نہیں تھا۔ یہ دوسرا شاہ عالم بھی اصلی ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے مگر ایسا تھا۔ تیمور نے اصل کو بچالیا تھا اور نقل ضائع ہونے سے سازشی عناصر ناکام ہوگئے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی شکست کو تسلیم نہیں کیا۔ پہلے تو تیمور کو وفاداری کے جرم میں ٹھکانے لگایا گیا پھر ہنگامہ برپا کردیا گیا کہ خود کو شاہ عالم کہنے والا جھوٹا ہے اور جعلساز ہے۔"

شبنم ہکا بکا بیٹھی یہ طلسم ہوشربا سن رہی تھی "سب سے زیادہ ہنگامہ میں نے کیا تھا۔"

"ہاں لیکن ہنگامے سے سیاہ کو سفید اور دن کو رات نہیں ثابت کیا جاسکتا۔ ایک بار نہیں دوبار پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل کی گئی۔ پہلی رپورٹ ایک معمولی ایم ایل او نے دی تھی۔ وہ کسی سرکاری اسپتال کا میڈیکو لیگل آفیسر ہی تھا۔ اسے خریدنا آسان تھا۔ اس نے منہ مانگی قیمت لے کر لکھ دیا کہ لاش شاہ عالم کی ہے۔ دوسرا پوسٹ مارٹم عدالت عالیہ کے حکم پر ایک بورڈ نے کیا تھا جس میں بہت بڑے ڈاکٹر شامل تھے اور انہیں دبانا یا خریدنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے پہلی رپورٹ کو غلط قرار دیا۔ اب اس مرحلے پر پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی زیادہ اہمیت میری بیوی کی گواہی اختیار کرگئی۔ رخشی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے اپنی آزادی کا سودا کیا۔ وہ میرے ساتھ خوش نہیں تھی اور اس جبر کی زندگی سے نجات چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ میرے حق میں گواہی دے گی اگر اس کے بعد میں اسے طلاق دے دوں۔ زندگی اور موت کے اس کھیل نے میرے اندر ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ میں جو اپنے آپ کو بہت چالاک اور ہوشیار' طاقتور اور مغرور سمجھتا تھا' بالکل بدل گیا۔ میں نے دوبارہ نقلی شاہ عالم کی لاش کو قبر سے نکالے جانے کا منظر دیکھا اور لاش کی حالت دیکھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے خود اپنا جنازہ اٹھتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے اپنوں کی بے وفائی اور دوستوں کی دشمنی دیکھی تھی اور ان سب نے مجھ پر ایسا

اثر ڈالا تھا کہ زندگی کے بارے میں میرے خیالات و نظریات سب بدل گئے تھے۔ مجھے نہ دولت کی ہوس رہی تھی' نہ اقتدار کی۔ اچانک مجھے زندگی کی قدروقیمت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ قسمت نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہ میری لاش ہوتی جو تماشائے عبرت بنتی۔"

"تمہیں بالکل معلوم نہیں ہوسکا کہ آخر تمہارا ہم شکل وہ مرنے والا کون تھا؟" شبنم نے کہا۔

"میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی ہوتی تو شاید معلوم ہوجاتا۔ ہوگا کوئی بدنصیب' مجبور اور لالچ کا مارا ہوا۔ اس کی شکل کچھ مجھ سے ملتی ہوگی جو کسی ہوگی' اسے میک اَپ سے پورا کردیا گیا ہوگا۔ اگر میں شمس یا قریشی کو اغوا کرالیتا تو ایک رات میں ان سے ساری حقیقت اگلوالیتا مگر میں اس سارے کھیل سے ہی متنفر ہوگیا تھا۔ مجھے موت کے خوف' موت کے احساس اور موت کے بعد کی حالت نے دہشت زدہ کردیا تھا۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ اب شاہ عالم کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اسے قسمت سے دوسری زندگی ملی ہے۔ وہ بھی اس کے دشمنوں کو گوارا نہیں ہوگی۔ اسے کسی نہ کسی بہانے ماردیا جائے گا۔ میں جینا چاہتا تھا اور سکون کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ میں نے رخشی سے وعدہ کرلیا کہ اگر اس نے میرے حق میں گواہی دی تو میں آزادی ہی نہیں' اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردوں گا۔ وہ جیسے چاہے' جس کے ساتھ چاہے خوش و خرم زندگی گزارے۔ میں سمجھوں گا کہ احسان اس نے مجھ پر کیا۔ بعد میں یہی ہوا.... عدالت عالیہ میں رخشی کی گواہی نے وہ کام کردکھایا جو شاید پوسٹ مارٹم رپورٹ نہ کرتی۔ فیصلہ میرے حق میں ہوا اور مجھے اصل شاہ عالم مان لیا گیا۔ جیت حق کی ہوئی۔ میں نے رخشی کو طلاق دے دی اور وعدے کے مطابق اپنا سب کچھ دے دیا۔"

اب صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ ایک پوری رات میں نے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ کسی کامیاب ہدایت کار کی طرح میں نے دو فلموں کی کہانی کو ملا کے ایک بنادیا تھا۔ اس میں کچھ حصے ناصر عظیم کی کہانی کے تھے اور کچھ شاہ عالم کی زندگی کے اور ان کی ایڈیٹنگ میں نے اس کمال سے کی تھی کہ کہانی میں کہیں جھول نہیں رہا تھا۔ میں نے شبنم پر ثابت کردیا تھا کہ جو ناصر عظیم تھا' وہی شاہ عالم تھا۔ اصل شاہ عالم کے بارے میں ساری تفصیل کو میں نے خارج کردیا تھا کیونکہ وہ "جعلی" تھا اور غیر اہم تھا۔ یہ سارا جھوٹ میں نے شبنم کے ساتھ ناصر عظیم بن کے رہنے کے لیے بولا تھا۔ میں نے اپنی مشکل آسان کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اب میں شاہ عالم بن کے نہیں رہ سکتا۔ اگر میں نے ناصر عظیم کی زندگی اختیار کی تو شبنم میرا ساتھ چھوڑ جائے گی اور میرے لیے مشکلات پیدا کرے گی۔ اگر میں یہ جھوٹ نہ بولتا اور صرف اتنا کہتا کہ میں نے اپنا نام بدل لیا ہے تو آگے چل کے میرے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہوجاتے۔ پھر میں ناصر عظیم کی زندگی نہ گزار پاتا۔ ناصر عظیم کا اصل ماضی صرف اس کے ذہن میں نہیں حقیقی صورت میں موجود تھا۔ اسی زمانے میں اسی شہر میں اور اس کے آس پاس ناصر عظیم کے وجود کی ہر علامت موجود تھی۔ اس کے سارے رشتے سلامت تھے اور وہ ثبوت موجود تھے جن سے وہ ناصر عظیم ثابت ہوتا تھا۔

اس کہانی کا آخری موڑ ابھی باقی تھا۔ اسے کہانی کا آخری جوڑ بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مجھے پوری امید تھی کہ یہ سوال شبنم ضرور کرے گی مگر اس کا جواب بہت آسان تھا۔ رئیس نے میری داستان طرازی میں برابر کی دلچسپی لی تھی اور اپنے طور پر شبنم کی نظر بچا کے پسندیدگی کے جذبات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا ماضی اور مستقبل ندی کے دو کنارے ہیں۔ ایک طرف چندا ہے اور دوسری طرف شبنم۔ میں ایک پل سے ان کے درمیان رابطہ نہیں رکھ سکتا اور بالآخر مجھے طے کرنا ہوگا کہ میں پل کے ایک طرف ہوں یا دوسری طرف۔ میں نے یہ فیصلہ یوں کیا تھا کہ نہ مجھے اپنے مستقبل کو چھوڑنا پڑا تھا اور نہ ماضی کو۔ میں نے انہیں ایک دھارے میں ایسے شامل کیا تھا جیسے دو دریا مل کے ایک ہوجائیں تو پانی بھی ایک ہی نظر آتا ہے۔

رئیس رات بھر میں تین بار چائے کافی بنانے کے لیے اٹھا اور اس نے درمیان میں عمران خان کا آئی سی یو میں معائنہ بھی فرمایا۔ وہ تیس مارخان کی چار سو بیسی سے خفا تھا لیکن اس کا ذمے دار وہ اس کی دس نمبری محبوبہ کو سمجھتا تھا جس نے سیدھے سادے اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح تیس مارخان کی عقل کو تکیل ڈال کے لگام اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

آخری بار رئیس خان کو ناشتے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھنا پڑا۔ اس درمیان میں شبنم نے اپنے باس جناب ابوبکر آزاد سے معذرت کی کہ وہ رات کو ڈیوٹی پر حاضر نہ ہوسکی۔ اس نے خرابیٔ طبیعت کا بہانہ کافی سمجھا اور آزاد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ خاموشی سے سن لی جن کا فرمانا تھا کہ دم آخر بھی مطلع فرمانے کی کیا ضرورت تھی گویا۔ دم آخر سے ان کی مراد تھی' ساری رات گزر جانے کے بعد۔

شبنم نے مجھ سے جتنے سوالات کیے ان سب کا جواب میں نے اطمینان اور اعتماد سے دیا۔ مثلاً اس نے پوچھا کہ آخر میں نے رخشی کو سب کچھ کیوں دے دیا۔ کیا اسے صرف حق مہر.... گزارے کے لیے معقول رقم اور رہنے کے لیے ایک مناسب گھر کافی نہیں تھا۔ میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔

میں نے کہا میں نے اسے وہ سب دے دیا جو شاہ عالم کا تھا۔ لیکن جو ناصر عظیم کا تھا وہ سب میرے پاس ہے اور بہت ہے۔"

"ناصر عظیم تو قلاش ہوگیا تھا۔ سب کچھ اپنی نادانی اور عیاشی میں لٹا بیٹھا تھا۔ یہی بتایا تھا تم نے۔ اس کے دوست نما دشمنوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا سب کچھ ہتھیا کے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں اس نے جو حاصل کیا شاہ عالم بن کے حاصل کیا تھا۔"

"رائٹ۔ شاہ عالم بننے کے بعد میرا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ جانتے بوجھتے میں نے ان رشتوں سے تعلق ختم کرلیا تھا تاکہ میرے لیے 'ایک مقتدر عزت دار حیثیت کے حامل پبلک لیڈر کو کسی حوالے سے شرمندگی کا سامنا نہ ہو۔ کوئی یہ نہ بوجھ سکے کہ مسٹر شاہ عالم۔ کیا تم ناصر عظیم نہیں تھے اور یتیم خانے کے پروردہ نہیں تھے۔ تم نے چھوٹے چھوٹے گھٹیا کام اور چوریاں کرتے اپنا بچپن نہیں بتایا تھا۔ کیا تم ایک کھیپی نہیں تھے؟..... اگر ایسا موقع آتا تو میں سوال کرنے والے سے سوال کرتا کہ کیا تم نشے میں ہو؟ جب میرے والدین زندہ ہیں تو یتیم خانے سے میرا کیا تعلق۔ اور میری داستانِ حیات تو میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔ تم کس کی بات کررہے ہو؟ کون ہے یہ ناصر عظیم۔۔۔؟ تم اسے جانتے ہو تو میرے سامنے لاؤ۔ ایسا سوال کسی نے نہیں پوچھا۔ ایسا وقت کبھی نہیں آیا جب میری شناخت کو کسی بھی حوالے سے چیلنج کیا گیا ہو۔ لیکن کئی سال بعد مجھے اچانک ناصر عظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"وہ کس لیے؟"

"اس کے ابتدائی اسباب مختلف تھے۔ میں نے ناصر عظیم کی شخصیت کو ایک نقاب کے طور پر استعمال کیا۔ یہ دہری زندگی میرے لیے بہت فائدہ مند رہی۔ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے میرا پاسپورٹ الگ تھا۔ اس پر میں شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف تھا اور بیرونِ ملک جاتا تھا تو علی الاعلان جاتا تھا۔ پارٹی کارکن مجھے نعروں کے ساتھ رخصت کرتے تھے اور زندہ باد کے نعروں سے واپسی پر میرا استقبال کرتے تھے۔ لیکن ایک کاروباری شخص کے طور پر میں ناصر عظیم بن کے سفر کرتا تھا۔"

"صورتوں کی مشابہت پر شک کبھی کسی نے نہیں کیا؟"

"شک کیا جاتا ہے مجرموں پر" میں نے کہا "مجرم نہ شاہ عالم تھا اور نہ ناصر عظیم۔ ایک بڑا سیاست داں تھا' دوسرا بڑا بزنس مین۔ ائیرپورٹ کے اہلکار سمجھتے تھے کہ ناصر عظیم کبھی اکیلا سفر نہیں کرتا اور خاموشی سے نہیں آتا۔ اس کے باوجود کئی بار یہ کہا گیا کہ سر' آپ کی صورت شاہ عالم صاحب سے کتنی ملتی ہے۔ یہ کبھی امیگریشن والوں نے کہا' کبھی کسی ائیرہوسٹس نے تو کبھی کسی ہم سفر نے۔ اور بزنس مین ناصر عظیم نے سنجیدگی سے حیرت کا اظہار کیا۔ شاہ عالم۔۔۔ وہ کون ہے۔ اور جب اسے بتایا گیا کہ وہ ایک معروف سیاست داں ہے تو ناصر عظیم نے حوصلہ شکن خشک لہجے میں کہا کہ سوری۔۔۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می۔ اس کے بعد میں کاروباری نوعیت کے کاغذات ایسے دیکھتے لگتا تھا کہ کسی کو دوسرا سوال کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک بات اور بھی تھی۔ ناصر عظیم کے پاسپورٹ پر میری تصویر میں مونچھیں اور ٹھوڑی کے نیچے ہولیمین اسٹائل کی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ جب میں ناصر عظیم بن کے جاتا تھا تو اپنے گیٹ اپ میں یہ معمولی سی تبدیلی کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چند فریبِ نظر میں مبتلا کرنے والی DECEPTIVE قسم کی تبدیلیاں مجھے شاہ عالم سے الگ بناتی تھیں مثلاً میرا لباس۔ شاہ عالم ہمیشہ سوٹ اور ٹائی والا مغربی لباس پہنتا تھا۔ ناصر عظیم سفید شلوار قمیص کے ساتھ بند گلے کی واسکٹ استعمال کرتا تھا۔ ایک سنہری کمانی والی عینک لگاتا تھا' دوسرا سیاہ فریم کا چشمہ استعمال کرتا تھا۔ شاہ عالم خوش باش اور گپ شپ کرنے والا آدمی تھا۔ ناصر عظیم خاموش طبع اور ریزرو رہنے والا۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے میں نے دونوں کی شخصیت کو الگ رکھا۔ اس سے مجھے بہت سے فائدے حاصل ہوئے۔ شاہ عالم کا سیاسی اثر رسوخ میرے کاروبار میں معاون ثابت ہوا۔ باہر تو خیر امتیازی قوانین نہیں چلتے مگر یہاں شاہ عالم کے سامان کو بلا روک ٹوک کلیرنس مل جاتی تھی۔ یہ بتا چکا ہوں کہ شاہ عالم کے کاروبار کی نوعیت کیا تھی۔ بیرونِ ملک ناصر عظیم کے مراسم ان سب لوگوں سے تھے جو نوادرات اور تاریخی اہمیت کی حامل اشیا کی غیر قانونی تجارت میں ملوث تھے۔ اس طرح جو مالی فوائد ناصر عظیم کو حاصل ہوتے تھے ان سے شاہ عالم کا تعلق نہیں ہوتا تھا۔ ایک پبلک لیڈر کی حیثیت سے اس کا حساب صاف تھا۔ ناصر عظیم کا سارا پیسہ اس کے پرانے بینک اکاؤنٹس میں جاتا تھا جہاں لوگ اسے بچپن سے جانتے تھے۔ میں نے پہلا پبلک اکاؤنٹ چودہ پندرہ سال کی عمر میں کھولا تھا چونکہ ایک نابالغ بچے کے لیے قانونی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے میری طرف سے یہ ذمے داری ایک مہربان بینک آفیسر نے قبول کرلی تھی۔ اس نے اپنے بینک میں میرا INTRODUCTION دیا اور بالغ ہونے تک میں اس کے ذریعے ہی لین دین کرتا رہا۔ شناختی کارڈ بنوانے کے بعد میں اپنا اکاؤنٹ خود آپریٹ کرنے لگا تھا۔ وہ اکاؤنٹ آج بھی موجود ہے۔ وہ شخص پتا نہیں کہاں ہے۔ بینک کا عملہ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ ریٹائر ہوگیا ہو۔ بعد میں میرے کئی بینک اکاؤنٹ ہوگئے۔ ایک میرا اور شاہد کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ باہر کی ساری رقوم میں انہی میں ڈالتا رہا۔ میرے پاس ناصر عظیم کے کریڈٹ کارڈ ہیں اور میرے اکاؤنٹ تقریباً دنیا کے سب بڑے شہروں میں ہیں چنانچہ باہر کہیں بھی مجھے کیش کی کمی کا مسئلہ درپیش نہیں ہوسکتا۔ شاہ عالم نے پارٹی چھوڑی۔ سیاست چھوڑی۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ بیوی کو چھوڑا۔ اپنی دولت جائداد چھوڑی۔ اب اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ دنیا چھوڑے۔ اس کے دشمن یہی چاہتے ہیں اور شاہ عالم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے خلاف ایک نہیں کئی طرح کے دشمن کھڑے ہوگئے ہیں۔ قانونی مقدمات کی بھرمار الگ ہے جن میں ہر مقدمے میں اسے سزائے موت ہوسکتی ہے۔ اس کے سیاسی دشمن الگ ہیں۔ کاروباری دشمن الگ

ہیں۔ وہ سب اسے مارنا چاہتے ہیں تو شاہ عالم ان کی اور اپنی مشکل آسان کیوں نہ کرے۔ وہ خود کیوں نہ مرجائے۔ ایک بار جیتے جی دوسروں نے مارا تھا۔ اس بار جیتے جی وہ خود ایسا کرے۔ وہ مر کے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ناصر عظیم کی صورت میں۔ اور اس کے لیے اسے کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ بس وہ اپنے ماضی کو اپنا لے گا۔ زندہ رہنے کے وسائل اس کے پاس ہیں۔ جو رشتے حقیقی معنوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس کے لیے موجود ہیں۔ مثلاً تم۔۔۔ تم میرے ساتھ ہو' رئیس ہے۔ اس کے علاوہ سابق سب انسپکٹر پولیس فرید عباسی ہے۔ آج کل رخشی اسی کے گھر میں رہتی ہے۔"

"فرید عباسی کے ساتھ؟"

"ایسے چونکنے کی ضرورت نہیں۔ اس گھر میں فرید عباسی کی ماں بھی ہے۔"

شبنم نے کہا "پھر بھی۔۔۔ کیا رخشی کا اپنا کوئی نہیں؟"

میں نے کہا "نہیں' ماں باپ پہلے ہی نہیں تھے۔ ایک بہن دُبئی میں ہے۔ دور کے رشتے دار بے کار ہیں۔ ان کے ساتھ وہ خود نہیں رہنا چاہتی اور اکیلی رہتے ہوئے ڈرتی ہے۔"

شبنم نے اچانک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ایک سوال کیا "ایک بات کا تم نے ذکر کیا' مگر پھر اسے گول کرگئے۔"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ایک بات ہے۔۔۔ سوچو' تم اتنی بڑی بات بھول نہیں سکتے۔"

میں نے کہا "میرا دماغ بہت کنفیوز ہے اس وقت۔ تم ہی یاد دلا دو۔"

شبنم نے کہا "تمہاری زندگی سے چندا نام کی ایک لڑکی کے نکل جانے کا سبب تھی رخشی۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ وہ ایک حادثہ تھا مگر اس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ اس اگر کی پوری انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ سب سے پہلا اگر تخلیقِ آدم سے بھی پہلے کے سوال میں شامل ہوگا۔ اگر شیطان نے جو اس وقت فرشتوں کا سردار تھا' اپنے غرور میں ایک خاک کے پتلے کو سجدہ کرنے سے انکار نہ کیا ہوتا تو۔۔۔ تو وہ راندۂ درگاہ نہ ہوتا۔ دینی نوع انسان کو گمراہ کرنے کی قسم نہ کھاتا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم سے وہ گناہ سرزد نہ ہوتا جس کی پاداش میں انہیں جنت سے نکالا گیا۔ ایسا ہی اگر تاریخ کے ہر موڑ پر اور ہر انسان کی زندگی میں ہر قدم پر آتا ہے۔ اگر میری شادی رخشی سے نہ ہوتی تو بالآخر چندا میری ہو جاتی اور آج بھی میرے ساتھ ہوتی۔ مجھے کرنل خان کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہتی اور میں عزت' شہرت اور دولت کی ہر منزل تک سکون اور عافیت کے ساتھ پہنچتا۔ میری زندگی میں ذلت اور عذاب کے طوفانی گرداب نہ آتے اور مجھے کبھی مرنا کبھی جینا' مرکے جینا اور جیتے جی مرنا' یہ سب کیوں کرنا پڑتا لیکن زندگی ایسے ہی حادثات کا سلسلہ ہے جو ایسے ہی چلتا ہے۔ انسان کے ارادوں کو تہ و بالا کرتا ہوا۔ امید کے ساتھ ناامیدی دیتا ہوا' توقعات میں غیر متوقع کو شامل کرتا ہوا۔"

"تم رخشی کی بات کررہے تھے؟" شبنم نے مجھے یاد دلایا۔

"ہاں۔ رخشی سے میری ملاقات ایک اتفاق گمی تھی مجھے۔ لیکن یہ اتفاق بالآخر تقدیر کی ایک سازش بن گیا۔ وہ ایک مظلوم لڑکی تھی۔ میں نے ہمدردی میں اس کی مدد کی۔ لیکن جیسا کہ ہوتا ہے' یہ ہمدردی مجھے مہنگی پڑی۔"

"تمہیں یا رخشندہ کو؟" شبنم نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم نے ناشتا ختم کیا۔ پھر شبنم نے کہا "تو مسٹر ناصر عظیم۔ اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

میں نے کہا "تھینک یو کہ تم نے ناصر عظیم کو RECOGNISE کرلیا۔ ہر نئی حکومت کے لیے یہ ہی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔"

وہ مسکرائی "میرے لیے تم وہی ہو۔ تمہارا نام شاہ عالم نہ سہی ناصر عظیم ہے تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"میرے مستقبل کے پلان تم پر واضح ہیں۔ میرا واسطہ ہے شاہ عالم کے ان دشمنوں سے جو جان لیے بغیر میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان کے پاس دشمنی کے اپنے اپنے اسباب ہوں گے مگر میں ان سب کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہوں۔ ان سے نجات حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ شاہ عالم غائب ہو جائے۔ ہمیشہ کے لیے۔ وہ اسے سارے جہان میں تلاش کرتے پھریں مگر وہ ان کے ہاتھ نہ آئے۔"

"یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے عملی طور پر اتنی ہی مشکل ہے" شبنم نے کہا۔

"ٹھیک کہتی ہو تم۔ ایک آدمی جو گمنام بھی نہ ہو گم کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے میرے پاس الگ پلان ہے۔ اس میں تم میری مدد کرو گی۔ شاہ عالم کے بارے میں وقفے وقفے سے خبریں شائع ہوتی رہیں گی کہ وہ لاس ویگاس کے جوئے خانے میں ایک ماڈل کے ساتھ دیکھا گیا۔ آج کل تو تصویر سے تصویر ملا کے کچھ بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ چند مہینے ایسے ہی خبروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا جس کا مقصد کنفیوژن پھیلانا ہوگا۔ اور اس کے دشمنوں کو گمراہ کرنا۔ وہ اسے مخصوص ٹھکانوں پر تلاش کریں گے۔ جہاں وہ جاتا رہتا تھا' وہ جو محاورہ ہے۔۔۔"

رئیس نے کہا "لاکا شہر میں اور ڈھنڈورا جنگل میں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "چل ایسے ہی سہی۔ محاورہ تو اس کا الٹا ہے۔ چھ مہینے سال بعد ایسی خبریں پھیلائی جاسکتی ہیں جن سے یہ تاثر عام ہو کہ وہ ملک سے باہر ہی کہیں جلاوطنی اور کسمپرسی کی موت مرگیا۔ اس کی تلاش سے مایوس دشمن تھک ہار کے بیٹھ جائیں۔ فوری طور پر مسئلہ ہے اس کی روپوشی کا۔ میں نے جو یہ حلیہ بنا رکھا ہے یہ عارضی انتظام تھا۔ میں اس مضحکہ خیز لباس میں ہر جگہ نہیں جاسکتا اور اس بہ خانے میں چھپ کے بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے ناصر عظیم کے لیے ایک اچھے گیٹ اپ کی ضرورت ہوگی۔"

شبنم سوچ میں پڑگئی "اس کا بندوبست مشکل نہیں۔ لیکن تم کچھ عرصہ کے لیے باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم کہیں بھی جاسکتا ہے۔ پرابلم ہوگی تمہارے لیے۔ شاہ عالم کو تلاش کرنے والے تم پر نظر رکھیں گے۔ رخشی سے اس کا تعلق ختم ہوگیا۔ یہ بات سارا زمانہ جانتا ہے۔"

شبنم نے کہا "میری فکر مت کرو۔ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ یہ جو تم بھرا ہوا ریوالور بیگ میں لیے پھرتی ہو' یہ تمہارے کام نہیں آئے گا۔ اگر میرا پتا پوچھنے والے تمہیں اٹھالے گئے تو تم جانتی ہو وہ کیا پوچھیں گے اور کیسے پوچھیں گے؟"

"میں مرجاؤں گی مگر انہیں تمہارا پتا نہیں بتاؤں گی۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ مرنے کہاں دیتے ہیں جی۔ آج کل تفتیش کے بڑے ظالم طریقے ایجاد ہوگئے ہیں۔"

میں نے کہا "اس لیے تمہارے اور میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم کچھ ایک دوسرے کا پتا نہ ہو۔ جب ضرورت ہوگی میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

"یعنی تم یہاں بھی نہیں رہوگے۔"

"نہیں۔ ناصر عظیم اسی شہر میں ہوگا لیکن اس کا پتا ٹھکانا کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔"

"وعدہ کرو مجھ سے ہر روز بات کروگے۔"

میں نے کہا "یہ وعدہ ہے میرا۔ لیکن میں بات کروں گا پی سی او سے اور اخبار کے دفتر میں۔ ابھی احتیاط ضروری ہے۔ اگر میں تم کو کہیں بلاؤں گا تو تمہیں یہ دیکھنا ہوگا کہ تمہارا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی تمہارے پیچھے لگ جائے تو تمہیں اس کو ڈاج کرنا ہوگا۔ ویسے تو میں بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ رئیس ہے میرے ساتھ۔۔۔ تم یہ بتاؤ کہ کوئی قابلِ اعتماد میک اپ مین ہے؟"

"ہے تو سہی۔ مگر پتا نہیں کہاں ملے گا۔ وہ پاگل آدمی ہے۔ پہلے ٹی وی میں تھا۔ وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کی کسی سے بنتی نہیں تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ منہ پھٹ ہے۔ شراب پی کے بالکل آؤٹ ہوجاتا ہے۔ اسٹیج والے اسے پکڑ کے لے جاتے ہیں۔ اپنے کام کا ماہر ہے مگر خرابی یہی ہے کہ غیر ذمے دار ہے۔ مجھے اس کے ایک دو ٹھکانے معلوم ہیں۔"

"کیا وہ مجھے اپنا میک اپ خود کرنا سکھادے گا۔"

"اگر میں کہوں گی تو انکار نہیں کرے گا" شبنم مسکرائی۔

"یہ بات ہے۔"

"ہاں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میں کہوں مائیک' وہ عیسائی ہے اور اس کا نام ہے مائیکل۔ میری خاطر تم کیا کرسکتے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ تم بولو پھر دیکھو' اتنا بے غرض' بے ضرر اور پاگل شخص میں نے نہیں دیکھا۔ تم حسد مت کرنا اس سے۔ وہ گلے میں لاکٹ لٹکائے پھرتا ہے۔ اس میں تصویر ہے میری۔"

میں نے کہا "کہیں وہ مجھے حسد میں قتل نہ کردے۔"

"ارے نہیں۔ اب میں کیا مثال دوں' جیسے وہ پاکٹ ڈاگ ہوتا ہے نا۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ پوڈل ٹائپ کا' ایسے ہی ہے وہ۔ بس پاؤں میں لوٹنے والا اور دم ہلا کے پیچھے بھاگنے والا۔ معصوم سا انسان۔"

میں نے کہا "تم نے کمرے میں ایک مورتی کا سر دیکھا ہوگا؟"

"ہاں۔ یہ کسی کا مجسمہ تھا' یا صرف سر ہے؟"

میں نے کہا "ہمارے پاس صرف سر ہے اور ہمیں معلوم کرنا ہے کہ یہ سر کس کا ہے۔ ابھی تک یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ ہمارے پاس ہے ورنہ اسے واپس حاصل کرنے کے لیے کچھ لوگ اتنے پریشان ہیں کہ ہم سب کو قتل بھی کرسکتے ہیں۔"

شبنم نے سر میں بہت دلچسپی لی جو ابھی تک ایک کونے میں میز پر بے قدری کی حالت میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے سر کو اٹھانے کی کوشش بھی کی مگر اس کا وزن بہت زیادہ تھا۔ وہ اسے گھما پھرا کے دیکھتی رہی۔

"پہلے ہم اسے مہاتما بدھ کا مجسمہ سمجھے تھے۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "اس کی صورت کے نقوش سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایشیا کے ان حصوں میں رہنے والے کسی شخص کا سر ہے جو منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ چین' جاپان' کوریا بھی ان میں شامل ہیں مگر اس قسم کے مجسمے تھائی لینڈ میں نظر آتے ہیں۔ ملیا' ہانگ کانگ' بنکاک۔۔۔ یہ تین اہم مراکز ہیں۔ ویسے برما سے انڈونیشیا تک مشرق بعید کی پوری پٹی میں یہ لوگ آباد ہیں۔"

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ اس مجسمے کے سر کی اہمیت اتنی کیوں ہے۔ تم آرٹ کو سمجھتی ہو' خصوصاً فن مجسمہ سازی کو؟"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "یہ تمہارے پاس کیسے پہنچا۔"

میں نے اسے بتایا "کل صبح کا اجالا پھیلنے سے بھی پہلے میں کمال اسپتال سے پیدل واپس آرہا تھا۔ میں ڈاکٹر فاروقی سے اور تم سے ملنے گیا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا تعاقب کررہا ہے۔ میں ایک جگہ چھپ کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ شخص میرے سامنے آیا پیچھے سے ایک جیپ بڑی تیزی سے

آئی اور اس شخص کو میری نظروں کے سامنے گولیاں مار کے ہلاک کردیا گیا۔ اس قتل کا ایک ہی چشم دید گواہ تھا۔۔۔ میں۔۔۔"

"تم نے قاتلوں کے چہرے دیکھے۔ گاڑی کا نمبر نوٹ کیا؟"

"گاڑی کا نمبر مجھے نظر نہیں آیا۔ لیکن میں نے ان کی صورت کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس لیے بھی کہ وہ قتل کرنے کے بعد اپنا اطمینان کرنے کے لیے رکے تھے اور جاتے ہوئے یہ جھنجے کا سر اس شخص کی لاش پر پھینک گئے تھے۔ ایک نے مرنے والے کو گالی دے کے کہا کہ یہ تحفہ بھی لے جا اپنے ساتھ' اسے دینے کے لیے۔۔۔"

"کسے دینے کے لیے؟" شبنم نے کہا۔

"سوری۔ یہ تو میں نے ان سے پوچھا ہی نہیں" میں نے معصوم صورت بنا کے کہا "پوچھتا تو وہ ضرور بتادیتے۔"

شبنم ہنسی "تم کیسے پوچھتے' تم کسی کونے کھدرے میں گھسے تھر تھر کانپ رہے ہوگے۔ جل تو جلال تو کا ورد کررہے ہوگے۔"

"تمہیں ایک اچھی سراغ رساں بننے کے لیے تربیت کی ضرورت ہے لڑکی۔ بھئی پوچھو کہ تمہارا تعاقب کرنے والا کون تھا جسے قتل کیا گیا۔۔۔"

"تم نے دیکھا تھا اسے پہلے بھی؟"

"بہت اچھی طرح۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ میرا بزنس پارٹنر اور میرا دشمن تھا۔ خادم مرزا' تم اس نام سے واقف ہو؟"

شبنم نے اقرار میں سر ہلایا "خادم مرزا۔ وہی جس کے قتل کا تم پر الزام تھا۔"

"ہاں۔ ایک اور نام تھا عثمان کا۔ مجھ پر دو افراد کو اغوا کرکے قتل کرنے کا الزام تھا لیکن وہ کیسے اور کہاں سے برآمد ہوئے' یہ کہانی تم نے ہی اپنے اخبار میں چھاپی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد آیا۔ وہ شاید تمہیں اغوا کرکے لے جانا چاہتے تھے مگر اس چکر میں خود ان کی سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ نوادرات اور تاریخی حیثیت کی حامل اشیا چرا کے باہر بھجواتے تھے۔"

"یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ مجھے بہت دیر سے پتا چلا کہ کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔ میں بہت عرصے تک ان کا مال باہر لے جاتا رہا۔ گاہکوں سے مال کی قیمت وصول کرتا رہا اور اپنا کمیشن رکھ کے باقی رقم انہیں دیتا رہا۔ میں خواہ کتنا بھی برا سہی' کسی ملک دشمن کاروبار میں کسی کا پارٹنر نہیں بن سکتا تھا۔ میں اپنی ساری خامیوں اور خرابیوں کے باوجود اول و آخر ایک پاکستانی ہوں۔"

شبنم نے کہا "تم کیا سمجھتے تھے کہ یہاں سے کیا مال جاتا ہے؟"

"وہی جو مجھے بتایا گیا تھا۔ ڈیکوریشن پیس۔ لکڑی' پیتل اور اونکس کے بنے ہوئے۔ اونکس کو عام لوگ ماربل کہتے ہیں۔"

"عثمان کا قتل اس سے پہلے ہی ہوگیا تھا۔" شبنم نے سوچ کے کہا۔

"ہاں۔ اور میں سمجھتا ہوں انہیں اس کو تباہی کی سزا دی گئی کہ ان کی وجہ سے اس کاروبار میں ملوث ایک بہت بڑے گروہ کا وجود خطرے میں پڑگیا۔ میں نے جب خادم اور عثمان کے ساتھ کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو قدرتی طور پر وہ بہت پریشان ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کمیشن بڑھانے کا لالچ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس طرح میں انہیں بلیک میل کررہا ہوں۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کسی بھی پارٹنرشپ کو ایسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے اپنا حساب کتاب صاف کرنا چاہیے۔ متبادل انتظام ہونے تک تعاون جاری رکھنا چاہیے۔"

"متبادل انتظام سے ان کی کیا مراد تھی؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ میں اس ملک میں اپنے سیاسی اثر رسوخ کے باعث ان کی راہ میں حائل بہت سی دشواریاں دور کررہا تھا۔ مثلاً یہ کہ کسٹم والے ان کے مال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے تھے یا بڑی رسمی سی چیکنگ ہوتی تھی۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "قیمت وصول کیے بغیر وہ اپنے باپ کو بخشنے والے نہیں۔"

میں نے کہا "قیمت تو انہیں یقیناً ادا کی جاتی ہوگی۔ سب کو ان کا حصہ پہنچ جاتا ہوگا۔ یہ اضافی انتظام تھا۔ خدانخواستہ مخبری ہوجائے تو ان کی نوکری پر حرف نہ آئے۔"

"تم کو کچھ اندازہ ہے کہ اس گروہ کا سربراہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"نہیں۔ میں تو ایک معمولی سا وسیلہ تھا۔ راستہ صاف رکھنے والا اور مال کی قیمت وصول کرنے والا۔ خود عثمان اور خادم کی حیثیت معمولی کارکنوں کی تھی۔ مال وصول کرکے مجھے قیمت ادا کرنے والے مجھ سے ہوٹل میں ملاقات کرتے تھے۔ مختلف شہروں میں مختلف لوگ میرے پاس آتے تھے۔ باہر اس گروہ کے ارکان کا سراغ لگانا زیادہ مشکل اور خطرناک ہے۔ خرابی کی اصل جڑ تو یہاں ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟"

میں نے کہا "کل تک کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ بالکل اندھیرے میں تھا۔ مگر آج ایسا نہیں ہے کیونکہ کل تمہارے ساتھ میں جس کوٹھی میں گیا تھا وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ اس گھناؤنے کاروبار کی پشت پناہی کررہا ہے۔ ممکن ہے وہی اصل مجرم ہو۔ وہ ہمارے پاکستان کے ثقافتی ورثے اور تاریخی نوادرات کو چوری کرکے باہر کے خریداروں کو بیچنے والے گروہ کا سرغنہ ہوسکتا ہے۔"

"تم۔۔۔ ملک کی بات کررہے ہو۔۔۔ مگر عالی۔۔۔!"

میں نے کہا "عالی نہیں۔۔۔ ناصر۔۔۔!"

"سوری۔ ناصر' تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے ضرور ہے۔ اس کا بڑا بھائی پہلے اسمبلی کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ممبر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد یہ سیٹ اسے ملی مگر وہ پڑھا لکھا اور روشن خیال آدمی ہے۔ اس کا رویہ روایتی جاگیرداروں والا نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں' وہ ذہین آدمی ہے اور تم اس کی تعریف کررہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی پی آر پر خاص توجہ دیتا ہے۔ صحافی برادری کے ساتھ بنا کے رکھتا ہے" میں نے کہا۔

"بلاشبہ اس کی پی آر اچھی ہے مگر اس کی گڈول کے پیچھے بہت سے عوامل ہیں۔ وہ ایک مخیر شخص ہے۔ بہت سے فلاحی اداروں کی باقاعدہ مدد کرتا ہے۔ غریب بستیوں میں اس کے دستکاری اسکول ہیں جہاں کام کرنے والی خواتین کو مفت تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ان کی تیار کردہ چیزیں ایک بہت مشہور بوتیک میں سیل کے لیے رکھی جاتی ہیں جہاں ان کی دگنی چوگنی قیمت ملتی ہے اور وہ رقم انہی اداروں کے اخراجات پورے کرنے میں کام آتی ہے۔"

"تم بہت متاثر معلوم ہوتی ہو اس کی تعمیری اور فلاحی اسکیموں سے حالانکہ ایسے ایکٹ۔۔۔"

اس نے خفگی سے میری بات کاٹ دی "تم ایسے کچھ جانے بغیر اسے ایکٹ یا فراڈ کیسے قرار دے سکتے ہو۔ میں نے اس کے ہر پراجیکٹ پر اس کے PRO کی بریفنگ کو کافی نہیں سمجھا۔ میں نے ذاتی طور پر باقاعدہ تحقیق و تفتیش کی۔ اندر جا کے دیکھا۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے نہیں' ایک عام عورت بن کے میں نے ان اداروں میں داخلہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی ایسی چیز نہ نظر آئی نہ میں نے سنی' وہاں کام کرنے والی عورتوں سے بات کر کے مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جو شک پیدا کرتی۔ میں جانتی ہوں تمہارے دماغ میں کیا ہے۔ جہاں دارالامان میں عورت کے لیے امان نہ ہو' وہاں عورتوں کی فلاح کے یہ ادارے عورت کے استحصال کا ذریعہ بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ اور ہیں۔۔۔"

"لیکن ملک صاحب کے ادارے کسی الزام کی زد میں نہیں آتے۔"

"ہرگز نہیں۔ ایسا میں ذاتی یقین کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔ میں نے ایک ہفتہ ایک دستکاری اسکول میں گزارا۔ ایک ہفتہ دوسرے اسکول میں رہی۔ وہاں غریب گھروں کی لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں۔ ان میں جوان اور قبول صورت بھی بہت تھیں۔ خود میں نے اپنا حلیہ مناسب حد تک ٹھیک رکھا۔ ایسے کہ میں کسی کی نظر میں آجاؤں۔ وہاں ملک صاحب بھی آئے۔ ان کے کارکن بھی۔ کسی نے مجھے نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ہے دیکھا تو کوئی خاص اہمیت نہیں دی حالانکہ میں منتظر تھی کسی بلاوے کی۔ شاید مجھے بلا کے میرے کام اور میری ذہانت کی تعریف کی جائے۔ مجھے نگراں بنا دیا جائے یا خصوصی نظرِکرم سے نوازا جائے۔ بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے طلب کیا جائے لیکن ایسی کوئی بھی بات نہیں ہوئی اور کسی جوان اور قبول صورت عورت نے یا لڑکی نے کسی کی شکایت نہیں کی۔ حالانکہ میں یہ سمجھتی ہوں' سب نہ سہی۔۔۔ غربت میں عورت کا جسم اور اس کی جوانی اچھے خریدار کو اچھی قیمت پر زیادہ آسانی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ معاشی حالات کی ستی عورت کو ترغیب کے اسباب فراہم کرتی ہے اور خواہشات کے جال میں اس کا گرفتار ہو جانا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی مزاحمت کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے لیکن وہاں نہ کسی نے جال پھیلایا نہ دانہ ڈالا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ تمہارا ملک صاحب کے لیے یہ گڈ کیریکٹر سرٹیفکیٹ قبول کیا جاتا ہے۔ دستکاری اسکول کی حد تک وہ قابلِ رشک سیرت ہے۔"

"اس کے علاوہ۔ اس کی ایک سوسائٹی ہے انجمن بقائے پاکستان' الف بے پے۔"

میں نے ہنس کے کہا "جو حب الوطنی پر سیمینار کراتے ہوں گے۔ پاکستان سے محبت کرنے کے موضوع پر پوسٹرز چھاپتے ہوں گے۔ جو پاکستان کے دلفریب سلوگن بنا کے اشٹیکرز بانٹتے ہوں اور بیج بنا کے تقسیم کرتے ہوں گے۔ اس میں نام نہاد دانشور بلائے جاتے ہوں گے جو تقریروں سے ثابت کرتے ہوں گے کہ یہ ملک کتنا عظیم ہے' اسلام کا قلعہ ہے اور انسان کی جنت ہے۔ یہاں اللہ کی مہربانی اور قدرت کی فیاضی سے وسائل کی افراط ہے۔۔۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اور خود کو کریلا بنا کہ امریکا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔"

"تم سخت متعصب اور جاہلانہ عناد پر مبنی نظریات رکھتے ہو ملک کے خلاف" شبنم جل کے بولی۔

"مائی ڈیئر صحافی صاحب۔ یہی ہے اس ملک میں منظم جرائم کرنے والوں کا طریقۂ واردات۔ MODES OPERANDI۔ منشیات کے بڑے اسمگلر خود انسداد منشیات کی مہم چلاتے ہیں۔ منشیات کے خلاف واک اور سیمینار کراتے ہیں۔ احتجاجی جلوس اور مظاہرے کراتے ہیں۔ ایک آدمی دس کا خیرات کرتا ہے تاکہ ایک بدکاری کو کیموفلاج کر سکے۔ اپنی بلیک منی کی زکوٰۃ سے بھی کم وہ اپنی پبلسٹی کی مد میں خرچ کرتا ہے اور ایسے تمام فیض کے اسباب۔ تم نے وہ شعر سنا ہوگا۔ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔"

تو یہ فیض کے اسباب اس کی وہ انویسٹمنٹ ہوتے ہیں جو اسے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ پل چاہ مسجد و تالاب دیکھنے والے واہ واہ کرتے ہیں اور ادھر دیکھتے ہی نہیں جدھر ایک زمین دوز خندق میں انسانی گوشت پک رہا ہو یا مظلوم کے خون سے محلوں کی لال قلعے جیسی دیواریں رنگین ہوں۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سرپھرا ادھر دیکھ لیتا ہے اور دنیا سے کہتا ہے کہ بے وقوفو ادھر بھی دیکھو۔ تو سب کہتے ہیں کہ یہ ذاتی دشمنی ہے۔

پروپیگنڈا ہے۔ یہ شخص تو سرپھرا ہے۔ اسے تم جیسے معتبر گواہ سپورٹ کرتے ہیں۔"

شبنم کا موڈ خراب ہونے لگا "ڈائیلاگ مت مارو۔ ثابت کرو کہ میرا مشاہدہ غلط تھا اور تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ صحیح ہے۔"

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے صوفے پر بٹھا دیا "سنو۔ کل صبح چار بجے خادم حسین کا قتل ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اتنی دیر تک میرا پیچھا کیوں کرتا رہا۔ اس نے بہت وقت ضائع کیا۔ اگر اسے میری جان لینی تھی تب بھی اور مجھ سے کچھ کہنا تھا تب بھی اتنی دیر تک میرا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کس شک میں یا کس جرم کی پاداش میں سڑک پر کتے کی موت مار دیا گیا۔ خیر' برے کام کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اسے مارنے والے بھی ایک دن مارے جائیں گے۔ آج ہم کل تمہاری باری ہے والی بات ہے۔ میں پہلے وہاں سے بھاگ گیا تھا لیکن کچھ دور جا کے مجھے تجسس نے مجبور کیا اور مجھے شرم بھی آئی اپنی بزدلی پر کیونکہ اس معاملے کا تعلق بےحال مجھ سے تھا۔ میں واپس گیا۔ لاش اس وقت تک وہیں پڑی تھی۔ جو اس کے پاس سے گزرتے تھے ڈر کے بھاگ جاتے تھے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ کسی میں انسانی ہمدردی یا احساسِ ذمے داری نہیں رہا۔"

"ہاں اور اس کی وجوہات بھی تم جانتی ہو۔ یہاں جو چور کو پکڑنے کی بات کرے وہی چور۔ جو قتل کی رپورٹ کرے وہی قاتل۔ سب اپنی جان بچاتے ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ وہاں سے ایک پولیس کی جیپ گزری اس میں ایک سب انسپکٹر تھا اور دوسرا کانسٹیبل جو جیپ چلا رہا تھا۔ انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ سب انسپکٹر ڈیوٹی ختم کر کے آیا تھا اور یہ پرائے تھانے کے علاقے کا معاملہ تھا۔ وہ بھی چلے گئے۔ میں نے فوری طور پر یہ سر اٹھایا اور ایک طرف چھپا دیا۔ میں اسے خود اٹھا کے نہیں لے جا سکتا تھا۔ مرنے والے کی جیب میں سے پرس بھی میں نے نکال لیا۔ میرا مقصد تھا کوئی انفارمیشن حاصل کرنا تھا۔ میرا یہ فعل سراسر غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھا۔ ساڑھے سات ہزار روپے تھے اس پرس میں۔ اور یہ کارڈ۔"

شبنم نے مجھ سے کارڈ لے لیا "خامان۔ خامن کارپوریشن۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایک تھا خادم۔۔۔ ایک عثمان۔ دونوں نے مل کے ایک کمپنی بنائی تو نام رکھا خامان کارپوریشن۔ خادم کا خا' عثمان کا مان۔"

"بالکل ٹھیک" شبنم نے کہا "پھر تم نے معلوم کیا۔۔۔؟"

"ابھی آگے سنو۔ میں نے جب یہ سر اٹھا کے ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا جہاں سے میں اس کو بعد میں لے جا سکوں۔ گاڑی میں رکھ کے۔ تو ایک نئی بات ہوئی۔ ایک سوزوکی پک اپ آئی اور اس میں سے کچھ لوگ اترے۔ وہ سر غائب پا کے بہت پریشان ہوئے لیکن وہ کس سے پوچھتے اور کیا پوچھتے۔ میں پھر چھپ کے دیکھتا رہا۔ انہوں نے لاش اٹھائی اور غائب ہو گئے۔"

شبنم کی آنکھیں پھیل گئیں "یعنی ایک پارٹی مار کے چلی گئی دوسری لاش اٹھا کے لے گئی۔ تم نے سوزوکی پک اپ کا نمبر دیکھا۔"

میں نے دانتوں کی نمائش کی "نمبر انگریزی میں لکھے ہوئے تھے اور میں نے اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ میری نظر بھی کمزور ہے۔"

"نمبر تو دیکھنا چاہیے پہلے۔۔۔"

"کیا ہوتا اس سے؟ ہم گاڑی کا پتا چلاتے کہ وہ کس کی ہے پھر کیا ہوتا؟ گاڑی والا اقبالِ جرم کر لیتا۔ مس رپورٹر' عموماً ایسے جرائم کرنے والے پہلے نمبر کی فکر کرتے ہیں۔ نمبر پلیٹ ہٹا دیتے ہیں یا مٹا دیتے ہیں۔ بوگس نمبر لکھ لیتے ہیں۔ میں صورتوں پر زیادہ غور فرما رہا تھا۔"

"اور فرماتے رہے' کام کرنے والے کام کر کے چلے گئے۔"

میں نے کہا "اور کیا کرتا میں۔ ان سب کو ہینڈز اپ کرا لیتا وہیں یا ان کے پیچھے دوڑتا کہ ہم بھی تو کھڑے ہیں راہوں میں۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہ سر اٹھا لایا۔ یہ کارنامہ کم ہے؟"

وہ بولی "اب اس سر سے پوچھو اپنے ہر سوال کا جواب۔"

میں نے کہا "سب سے اہم سوال کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ کل رات میں نے جس سوزوکی پک اپ میں نعت کدے سے سفر شروع کیا تھا' ملک صاحب کی کوٹھی تک۔ اسے میں نے پہچان لیا تھا۔ میں نے دو میں سے ایک شخص کو بھی پہچان لیا تھا۔ وہ خادم کے قاتلوں میں شامل تھا۔ اسی لیے میں نے اتنا بڑا رسک لیا اور سوزوکی میں لیٹ گیا مردے کی طرح۔ یہ میری قسمت ہے کہ اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھا یہ سب بتا رہا ہوں۔ انجام اس کے برعکس یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے خادم کے ساتھ کہیں گاڑ دیا جاتا۔"

"میں تمہارے پیچھے کسی سائے کی طرح۔۔۔"

"تم کیا توپ چلاتیں اگر اندر میرے چوروں کی طرح داخل ہونے کا پتا چل جاتا۔ تم نے وہ سب دیکھا جو میرے باہر نکل آنے کے بعد ہوا۔ اس میں یقیناً بڑا سسپنس تھا اور بہت ایکشن تھا۔ لیکن بات کیا تھی۔ یہ ابھی تک تمہیں معلوم نہیں۔"

"تم نے خود سسپنس میں رکھا ہے۔"

"ہاں۔ تمہیں کچھ بتانے سے پہلے یہ یقین حاصل کرنا ناگزیر ہے میرے لیے کہ تم کس حد تک میرے ساتھ ہو۔"

"حد کا کیا مطلب ہوا یہاں؟"

"حد کا مطلب ہے جذباتی حد تک' جسمانی حد تک یا اس حد تک جس کی کوئی حد نہیں اور ایک پوری رات میں نے یہی یقین حاصل کرنے میں گزار دی۔"

"اب تمہیں یقین حاصل ہو گیا یا شک باقی ہے اب بھی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ تم میرا ساتھ دو گی ہر حال میں' اور اسی لیے تمہیں یہ سب بتا بھی رہا ہوں۔ اس گاڑی کو چلانے والا تھا نیکا۔ اس کا نام رفیق شفیق ہوگا۔ ملک نے اسے نیکا کہہ کے مخاطب کیا۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے گاڑی ایک ایسی جگہ کھڑی کی تھی جہاں مجھے کسی کی نظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد کوٹھی کے اندر دیکھا تو مجھے ایک تہ خانہ نظر آیا۔ اس کے روشن دان پچھلی طرف فرش پر کھلے ہوئے تھے اس میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اندر جھانکا تو مجھے کوئی نظر نہیں آیا مگر آوازیں بہت واضح تھیں۔ ملک اس سرکی بازیابی کے لیے سخت پریشان تھا اور نیکے پر بہت برہم تھا۔ تہ خانے میں ایسی ہی بہت سی چیزوں کا ڈھیر تھا جسے کاٹھ کباڑ ہی کہا جائے گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کا اسباب تجارت تھا۔ ان کے کاروبار کا اثاثہ۔ MERCHANDISE۔"

"تمہارا مطلب ہے... نوادرات وغیرہ؟"

"یس میڈم۔ وہ تہ خانہ ایک ذخیرہ ہے۔ ورکشاپ ہے اور وہ جگہ ہے جہاں سے مال دوسروں کو بھیجا جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آیا جب میرے پکڑے جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ میں نے رسک لیا اور سوزوکی اسٹارٹ کر کے گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ نیکا چابیاں لگی چھوڑ گیا تھا۔ چوکیدار نے میرے لیے گیٹ بھی کھول دیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی طرف دیکھتے ہوئے اس ڈرائیور کا چہرہ کیسے نظر آ سکتا تھا۔ مگر شامتِ اعمال کہ عین وقت پر ملک نمودار ہو گیا۔ اس وقت مجھے رکنا پڑا۔ اگر میں فرار ہونے کی کوشش کرتا تو ملک کی ایک آواز پر گارڈ اپنی کلاشنکوف اٹھا لیتا یا گیٹ بند کر دیتا۔ میں نے ملک سے اعتماد کے ساتھ بات کی اور وہ مجھے نیکے کا معاون سمجھا۔ میں نے نیکے کا حوالہ دے کے بات کی تھی۔"

"یعنی تم اسے ڈوج کرنے میں کامیاب رہے؟" شبنم مسکرائی۔

"اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ملک نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"کیا وہ تمہیں پہلے سے جانتا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ دس سال پہلے اس کی اور میری ملاقات انتہائی ناخوشگوار رہی تھی۔ میرے بدلے ہوئے مضحکہ خیز حلیے کی وجہ سے اس کا ذہن میری صورت کے نقوش میں شناسائی کے آثار نہیں تلاش کر سکا۔ اگر وہ مجھے پہچان جاتا تو... تو اس کا انتقام بہت خوفناک ہوتا کیونکہ میں نے بھی جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا' وہ خوفناک ذلت کا تماشا تھا۔ اسے وہ بھول نہیں سکتا تمام عمر۔"

شبنم کی نظر کچھ دیر اس مجسمے کے سر پر رہی "واقعات کی کڑیاں آپس میں ملتی ہیں۔ تمہاری شہادت ٹھوس ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو پوچھو کہ آخر وہ کیوں آئے تھے ہمارے پیچھے؟"

اس نے خفت سے کہا "میرے پوچھے بغیر تم نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "ملک سے تو میں بال بال بچا لیکن نیکے نے دیکھ لیا کہ کوئی گاڑی لے گیا۔ اس کے چلانے تک میں باہر آ گیا تھا۔ اور تمہاری وجہ سے مجھے بڑی مدد ملی ورنہ میں بھاگ کے کہاں جاتا۔ ملک کی کوٹھی میں اس انکشاف سے سنسنی پھیل گئی ہوگی کہ کوئی دشمن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کے اندر آ گیا تھا۔ وہ کیسے آیا' یہ اتنا اہم سوال نہیں ہوگا۔ اصل پریشانی نہیں یہ ہوگی کہ وہ کون تھا۔ کیا دیکھ گیا اور کیا لے گیا۔ اس نے رات کے وقت دو تین گاڑیاں شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں دوڑا دی تھیں اور وہ اس گلی میں بھی پہنچ گئے تھے۔"

"تمہیں اب بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا "میں تو چھتے کو ختم کرنے کی فکر میں ہوں۔"

"یہ کیسے کرو گے تم... یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگا... کسی بھی مافیا سے ٹکر لینا۔"

میں نے کہا "میں تقدیر پر بھروسا کروں گا جس نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے اور خدا پر جو برحق ہے اور حق کے ساتھ ہے۔"

"تم نے اس سر پر غور کیا؟"

"بہت غور کیا۔ میرا اپنا سر بھی غور کرتے کرتے چکرا گیا مگر کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ میں شرلاک ہومز نہیں ہوں خاتون ورنہ اب تک مجرم کے دروازے پر دستک دے رہا ہوتا۔"

"پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ صورت کس کی ہے؟"

"یہ تم کیسے دیکھو گی۔"

وہ بولی "ریفرنس لائبریری ہے۔ اس کی تصویر اگر کمپیوٹر کے نیٹ ورک پر دی جائے تو ممکن ہے کچھ معلوم ہو جائے۔"

"میں نے اندازہ کیا ہے کہ یہ سر اندر سے کھوکھلا ہے اور یہ پتھر نہیں ہے۔ پتھر ہوتا تو اس کا وزن ہوتا چار من کے لگ بھگ۔ یہ پلاسٹر آف پیرس ہے مگر اس کے اوپر پینٹ کا اسپرے ہے۔ اس سے یہ پتھر کا لگتا ہے۔ تصدیق کے لیے اسے توڑا یا کاٹا نہیں جا سکتا۔ ابھی مجھے کچھ پتا نہیں کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہوگی۔"

"اس کے لیے ماہرین کی رائے چاہیے۔" شبنم سوچ میں پڑ گئی۔

"رائٹ۔ اب کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں کیا کرنا ہے۔ نمبر ون... تم میرے لیے کسی میک اپ مین کو لاؤ۔ اپنے اسی بے ضرر پرستار کو پکڑو تاکہ وہ مجھے صورت گری کا فن سکھا دے۔ جب تم یہاں سے جاؤ گی تو پھر میری اور تمہاری ملاقات کہیں اور ہوگی۔ میں یہ ٹھکانا بدل دوں گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"احتیاط کے معاملے میں ڈھیل نہیں۔ جب میں پھر تم سے ملوں گا تو میری صورت بھی یہ نہیں ہوگی۔ تم اس سر کے بارے میں معلومات حاصل کرو گی اور میں پتا چلاؤں گا کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ کا

یعنی ARCHEOLOGIST کا۔ اس کے ساتھ ہی ہم خان کارپوریشن کا پتا لگائیں گے۔"

"یہ کام ہم ابھی کر سکتے ہیں۔" شبنم نے کہا۔

"وہ بھی۔"

"ہاں ابھی۔ کم سے کم اس کا محلِ وقوع دیکھ سکتے ہیں۔ صبح صبح کا وقت ہے۔ رئیس تو سو گیا ہے۔ اگر تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے تو میرے ساتھ چلو۔"

میں نے کہا "نیند اب کہاں۔ چلو اس بہانے آج آزاد صاحب سے بھی مل ہی لیا جائے۔ ایک زمانہ ہوا ان کے درشن نہیں ہوئے۔"

وہ خوش ہوئی "ناشتا میں بناؤں گی۔"

میں نے مردہ آواز میں کہا "اچھا... اور کھانا پڑے گا مجھے؟ خیر' اللہ مالک ہے۔"

"اب اتنا خراب بھی نہیں پکاتی میں۔" وہ برا مان کے بولی۔

"بھئی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تعریف بھی کروں گا۔ ناراضی کیسی... آدمی مروت میں بہت جبر کرتا ہے اپنے آپ پر اور جھوٹ بھی بولتا ہے" میں نے کہا "دراصل تم کو دیکھا نہیں کبھی کوئی زنانہ کام کرتے۔ اچھا یہ بتاؤ انڈے کا کچھ پتا ہے' کدھر سے سیدھا ہوتا ہے کدھر سے الٹا۔"

وہ ہنس پڑی۔ اس نے بیگ سے اپنا کیمرا نکال کے فیش کے ساتھ مجسمے کے سر کی تصویریں اتاریں۔ ایک سامنے سے اور دو سائڈ پوز۔ رئیس باتوں کے دوران میں صوفے پر ہی سو گیا تھا۔ میں نے باہر کی چابیاں اٹھائیں اور ہم خاموشی سے باہر نکل آئے۔ رئیس کی گاڑی اس کے ڈرائیور باڈی گارڈ اور خادمِ خاص تین مارخان کے پاس ہوتی تو اسے جگانا پڑتا مگر گزشتہ رات گاڑی میں چلا کے لایا تھا۔ اس کی چابی میرے پاس تھی لیکن شبنم کی گاڑی باہر موجود تھی۔

"چلو اچھا ہے۔ صبح صبح کا وقت ہے۔ دیکھنے والا کوئی نہیں" میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا "ورنہ عزت دو کوڑی کی نہ رہتی۔ لوگ ہنستے۔"

شبنم نے کہا "تمہاری صورت دیکھ کے یا میرے ساتھ تمہیں دیکھ کے۔"

میں نے کہا "یہ چیز جسے تم کار کہتی ہو' مجھے آزاد صاحب کی چلبلی کے خاندان کی لگتی ہے۔ اس کی کزن وغیرہ۔ بلحاظ عمر صورت دسیرت۔"

"اس نے ہی رات جان بچالی میری اور تمہاری' شکر کرو۔"

میں نے کہا "بریک کی تو کوئی بات نہیں۔ آزاد صاحب بھی آخر گاڑی روک ہی لیتے ہیں مگر ممکن ہو تو اسے دائیں طرف موڑ لو۔ خان کارپوریشن کا آفس ادھر ہے۔"

سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ صبح صبح دفتر اور اسکول کالج جانے والے بس اسٹاپس پر نظر آ رہے تھے۔ دہی دودھ کی دکانوں پر قطار بندی کے نقصانات کو سمجھنے والے بالٹیاں اور ڈول لیے آگے بڑھنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے تھے۔ حلوا پوری سے دن کا آغاز کرنے والے نسبتاً قناعت پسندی سے لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے کہا "کیوں نہ ایک دن ہم سلائس آملیٹ اور چائے کا ولایتی ناشتا چھوڑ کے لاہوری ناشتا کریں۔"

اس نے برا سا منہ بنایا "یعنی تم یہ گھی میں تربتر پوریاں اور حلوا کھاؤ گے۔ پتا نہیں وہ گھی بھی ہوتا ہے خالص یا کچھ اور..."

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ تم موٹی نہیں ہو جاؤ گی ایک دن میں اور نہ تمہارا کولسٹرول بڑھے گا۔ یہ اپنا کلچر ہے۔ زندگی کا حصہ ہے۔"

"اچھا وہاں شاہ عالمی کے اندر ایک جگہ ہے' ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ اس کے چھولے مزے کے ہوتے ہیں اور جو اچار دیتا ہے وہ..."

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "یعنی سب پتا ہے تمہیں۔"

وہ ہنسی "وہ... دراصل۔ مجھے واقعی نہیں معلوم کہ انڈا سیدھا کدھر سے ہوتا ہے اور الٹا کدھر سے؟"

ناشتے سے فارغ ہو گئے تو پائے کی تلاش کا مرحلہ آیا۔ شبنم نے صاف اعلان کر دیا کہ کلچر جائے بھاڑ میں۔ کسی تو وہ ہرگز نہیں پی سکتی اب۔ میں نے اس سے اتفاق کیا کہ کسی اپنی ذات میں خود ایک مکمل ناشتا سمجھا جا سکتا ہے اور ایک ناشتے کے بعد دوسرا میں گن پوائنٹ پر جان بچانے کے لیے کر سکتا ہوں جان بنانے کے لیے نہیں۔ پرانے وقتوں کے لوگوں کی بات اور تھی۔ ہم فاسٹ فوڈ' کمپیوٹر اور ڈش کلچر کی نسل اپنے اسلاف کی طرح کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے۔

اس علاقے میں مال روڈ جیسا کوئی ریستوران نہیں تھا۔ یہاں عوامی قسم کے چائے خانے تھے۔ پرانے لوگ بتاتے تھے کہ ایک زمانے میں لاہور میں چائے پینے والے خال خال تھے اور چائے ڈھونڈنے سے کہیں ملتی تھی مگر اب صورتِ حال اس کے برعکس ہو گئی ہے۔ چائے اور کوک جیسے مشروبات نے دودھ دہی جیسے صحت بخش اور سستے مشروب کی جگہ لے لی ہے۔ ہاں سگریٹ کے بعد نوبت ہیروئن جیسی لعنت تک آ گئی ہے۔ قربِ قیامت کی نشانیاں۔

ایک جگہ شبنم نے گاڑی روکی تو میں بقلم خود چائے کا آرڈر دینے گیا اور چائے کی ٹرے اٹھا کے بھی لایا۔ چائے خانے کے مالک نے میرے حلیے کو پھر میری صحت کو غور سے دیکھا۔ پہلوان نظر نہ آنے کے باوجود میں دنگل کے جلوس والے لباس میں تھا۔ سبز ریشمی کرتہ جو دھوپ میں جھلمل کرتا تھا اور بوسکی کا لاچا۔ میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ گاڑی والی حسینہ مجھ سے بالکل میچ نہیں کرتی تھی۔

شبنم نے کہا "یہ جو تم نے اپنی لائف میں یوٹرن لیا ہے' شاہ عالم سے پھر ناصر عظیم بننے کے لیے' اس میں رخشی کس حد تک تم سے متفق ہے؟"

"اگرچہ اس کے متفق ہونے نہ ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا لیکن اب بھی میرا اس سے تعلق ہے۔ وہ فرید عباسی کے گھر میں ہے اور شاید رہے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب تم خود نکال لو۔ فرید عباسی کی لائف اسٹوری میں بھی ایک ایسی ہی ٹریجڈی تھی۔ ایک درد مشترک نے انہیں ہمدرد بنا دیا ہے۔ یہ ہمدردی مجھے تو مہنگی پڑی تھی مگر فرید عباسی کو راس آرہی ہے۔ چنانچہ انہیں شریکِ راز کرنا ہی ہوگا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں' مسئلہ ہوگا اپنے ابوبکر آزاد صاحب کا۔"

"ان سے میں بات کرلوں گی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کائیاں شخص پہلے سے اندازہ لگائے بیٹھا ہے۔ بظاہر کنفیوژن کا اظہار کرتا ہے مگر اس کے ذہن میں دو اور دو چار والا جواب واضح ہے۔ معلوم نہیں کیوں انہوں نے کئی بار میری مدد کی اور راہنمائی بھی فرمائی۔"

"ہوسکتا ہے میری وجہ سے تمہیں یہ رعایت ملی ہو۔۔۔ آخر میں ان کی منہ بولی بیٹی ہوں" شبنم نے کہا۔

ابھی بازار کی ساری دکانیں بند تھیں۔ اِکا دُکا دکانیں جو کھلی نظر آرہی تھیں' بیکری اور جنرل اسٹور تھے یا کاپی کتابوں کی دکانیں۔ میں نے کارڈ پر درج پتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے "کفایت بلڈنگ" کی تلاش جاری رکھی جس کے چوتھے فلور پر خاقان کارپوریشن کا دفتر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت دفتر میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ کاروباری اداروں کے ایسے دفاتر اور بھی دیر سے کھلتے تھے۔

ایک بار آخر تک جا کے ہم واپسی کی سڑک پر آگئے۔ شبنم نے گاڑی کی رفتار بہت کم رکھی تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم بالکل بائیں جانب تھے' اوور ٹیک کرنے والے بلاوجہ ہارن دے کر اور ہمیں گھور کے گزرتے تھے۔ شبنم کی نظر بھی عمارتوں کے ناموں پر تھی جو عام طور پر صاف نظر آجاتے تھے۔ اس کے اور میرے ذہن میں بہت سی مشہور عمارتیں تھیں مگر کفایت بلڈنگ کا پتا چلانے کے لیے بالآخر ہمیں لوگوں سے رجوع کرنا پڑا۔

ایک بس اسٹاپ پر ہماری رہنمائی پر آمادہ بزرگوار بس آتے ہی سب کچھ بھول گئے اور انہوں نے بس میں داخل ہوکے ایک کھڑکی سے جھانک کر کچھ فرمایا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک جگہ ناشتا کرنے والوں میں اختلافِ رائے ہوگیا۔ ایک شخص نے ڈکار لے کر کہا کہ وہ تو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہو تم۔ دوسرے نے زیادہ اونچی ڈکار لے کر اس کی تردید کی۔ اوئے آگے ہے کفایت بلڈنگ۔ بندے کو پتا نہ ہو تو کسی کو خواہ مخواہ بھٹکانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا اختلاف دیکھتے دیکھتے زبانی جنگ میں بدل گیا اور اس سے پہلے کہ وہ لسی کے گلاس' سلور کے جگ یا پنچیں اٹھا کے ایک دوسرے کو مارتے' ہم نے وہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔

بالآخر ایک خضر راہ قسم کے بزرگوار نے ہماری مشکل آسان کی اور یہ بتایا کہ کفایت بلڈنگ مین روڈ پر نہیں ملے گی۔ ہم نے ان کی ہدایات کو ذہن میں رکھا اور دائیں بائیں پھرتے بالآخر وہ نشانیاں تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے جو انہوں نے بتائی تھیں۔

کفایت بلڈنگ نسبتاً پرانی عمارت تھی اور مین روڈ کی بڑی بڑی کمرشل عمارات کے مقابلے میں چار منزلہ مکان لگتی تھی۔ اس کے زینے کے دونوں طرف مجھے ناموں کی تختیاں نظر آئیں۔ ہم اوپر تک گئے اور ہر دروازے کی نیم پلیٹ کو پڑھتے گئے۔ بظاہر یہ ایک رہائشی عمارت تھی۔ اس کی تصدیق کچھ دیر بعد ہوگئی جب ہمیں خاقان کارپوریشن کا دفتر کہیں نظر نہیں آیا۔

"کہیں ہم غلط عمارت میں تو نہیں آگئے؟" شبنم نے کہا۔

"میں نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کفایت بلڈنگ ہے۔ ساتھ والی عنایت بلڈنگ۔"

"دونوں دروازے ساتھ ساتھ تھے" شبنم نے کہا "تم نے دیکھا تھا کہ کفایت بلڈنگ کا دروازہ کون سا ہے اور عنایت بلڈنگ کا کون سا؟"

میں نے چڑ کے کہا "تم اب جا کے دیکھ آؤ۔ میں یہاں معلوم کرتا ہوں۔"

شبنم ضد میں نیچے اتر گئی۔ اسے یقین تھا کہ یہ عنایت بلڈنگ ہے۔ میں نے پہلے اس کے پیچھے جانے کا سوچا پھر فرسٹ فلور کے ایک دروازے پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

ایک نیم خوابیدہ آنکھوں والی خاتون نے میرے سوال پر غور کیا "ہوں' ہم تو خود نئے ہیں۔ پہلے بھی کوئی آیا تھا پوچھتا ہوا۔"

میں نے کہا "چوتھے فلور پر۔" پھر مجھے ایک خیال نے حیران کردیا۔

میں بات ادھوری چھوڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ چوتھی منزل پر میرے دائیں جانب کسی ریٹائرڈ اسکول ٹیچر نے دروازے پر ٹیوشن سینٹر کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ دوسری طرف کی نیم پلیٹ پر فائق بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

حسبِ توقع دروازہ کھلا تو میں نے اپنے سامنے نیکے کا چہرہ دیکھا۔

میرا اندازہ تھوڑا سا غلط ہوا تھا۔ مسٹر فیکا نہ رفیق تھے اور نہ شفیق۔ اس کا نام فائق علی تھا جو ممکن ہے کچھ لوگوں کے حلق میں پھنس جاتا ہو آسانی کی خاطر اسے فیکا کرلیا گیا تھا۔

میں اسے گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں تیسری بار دیکھ رہا تھا لیکن اتفاق ایسا ہوا تھا کہ دو بار خود میں اس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔ جب وہ خادم مرزا کی لاش کو سڑک پر سے اٹھا کے سوزوکی پک اپ میں ڈال رہا تھا۔ مجھے ملک نے دیکھا تھا اور شاید چوکیدار نے بھی میری جھلک گزرتے گزرتے دیکھی ہو مگر فیکا مجھے پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا تھا اور میں سیدھا نکل گیا تھا۔

ظاہر ہے اس وقت اچانک مجھے اپنے دروازے پر اپنے مقابل پا کے وہ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی گاڑی چرانے والا صبح دم اس سے ملاقات کرنے آجائے گا۔ گاڑی مل گئی تھی اور گاڑی میں سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے اسے واردات میں استعمال نہیں کیا تھا چنانچہ گاڑی کی چوری کا معاملہ تو رفت گزشت ہوگیا تھا۔ حلِ طلب سوال صرف یہ رہ گیا تھا کہ کسی نے یہ بے مقصد کارنامہ کیوں سرانجام دیا تھا اور وہ کون تھا؟

چند سیکنڈ مجھے گھورنے کے بعد فیکے نے کہا "کیا ہے بھائی۔ کس سے ملنا ہے؟"

اس سوال نے میرے یقین کی تصدیق کردی کہ فیکے نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں اس سے خاقان کارپوریشن کے بارے میں سوال کرتا تو میری پوزیشن ضرور مشکوک ہوجاتی چنانچہ میں نے ریٹائرڈ ماسٹر کا نام لیا جو مقابل کے دروازے کی تختی پر لکھا ہوا تھا۔

اس نے خفگی سے کہا "اوئے یار۔ گھنٹی پر انگلی رکھنے سے پہلے دیکھ تو لیا کرو کہ کس کا نام لکھا ہے دروازے پر۔"

میں نے اس کے ہاتھ کے اشارے پر گھوم کے دیکھا "معاف کرنا پہلوان۔"

اس نے دروازہ بند کرلیا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دھڑام سے میرے منہ پر دے مارا۔ اسے شاید پہلوان کا خطاب بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ جسمانی طور پر دُبلا پتلا اور سوکھے ہوئے روکھے چہرے والا آدمی تھا۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ خاقان کارپوریشن کا دفتر یہی تھا یا پہلے یہیں تھا اور اب کہیں اور منتقل ہوگیا تھا۔ نیچے رہنے والی خاتون نے اس خیال کی تصدیق کی تھی کہ پہلے بھی کوئی پتا پوچھتا ہوا آیا تھا مگر وہ خود نئے آنے والے لوگ تھے۔ شاید عمارت کا کوئی پرانا رہنے والا زیادہ جانتا ہو۔ یہی سوچ کے میں نے ریٹائرڈ اسکول ماسٹر سے رجوع کیا۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ فیکا دروازے کے پیچھے سے چھپ کے دیکھ رہا ہو تو اسے میرا جھوٹ بھی سچ لگے۔ میں نے سیڑھیوں پر شبنم کے تھکے ہوئے قدموں کی کھٹ کھٹ سنی۔ وہ نیچے تک جا کے واپس آئی تھی۔

"یہی ہے کفایت بلڈنگ!" اس نے پھولی سانس کے ساتھ کہا۔

"احتیاطاً ایک دفعہ اور دیکھ آؤ" میں نے متانت سے مشورہ دیا۔

دروازے کے پیچھے سے استاد مکرم کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ جاگ اٹھنے کے باوجود سو رہے تھے اور بڑی مشکل سے آدھی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کا لباس شب خوابی ایک میلی بنیان اور اس سے بھی زیادہ میلی دھوتی پر مشتمل تھا۔ شبنم کو موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرسکتی۔

میں نے کہا "سر' ٹیوشن پڑھاتے ہیں آپ؟"

"پڑھاتا ہوں یار' مگر دن میں۔"

میں نے کہا "دن تو چڑھ گیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلے گا۔"

"اچھا لڑکا کہاں ہے؟" استاد نے جماہی لی۔

آپ کے سامنے۔ آپ انگریزی بولنا سکھا دیں مجھے۔ بالکل انگریزوں کی طرح۔ فیس کی فکر مت کریں' پانچ سو۔۔۔ ہزار۔۔۔ دو ہزار۔"

استاد جی کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے مجھے بے یقینی سے اور شبنم کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ "ویری گڈ۔۔۔ کم ان۔ کہاں تک پڑھی ہے انگریزی۔۔۔ میرے تو ایسے شاگرد ہیں خیر سے جو انگریزوں کو انگریزی سکھا رہے ہیں دبئی میں۔"

ان کے دروازے سے ہٹتے ہی میں شبنم کا ہاتھ پکڑ کے اندر چلا گیا "اے بی سی کا قاعدہ پڑھا ہے۔ اے سے سیب' بی سے لڑکا۔۔۔ سی سے بلی۔"

استاد جی کو الیکٹرک شاک لگنا لازمی تھا "کیا؟ یہ۔۔۔ یہ پڑھا ہے تم نے۔ خیر سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو پھر تو۔"

ہم ایک ایسے کمرے میں کھڑے تھے جس میں استاد جی کا بستر بھی لگا ہوا تھا۔ ان کے ریٹائرڈ دماغ میں بھرا ہوا قدیم علوم کا خزانہ پرانی کتابوں کی شکل میں ڈھیر ہو رہا تھا۔ چارپائی سے بستر تک کمرے کی دیواروں پر اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر۔ دروازے پر لٹکتے پردے اور کرسیوں پر قدامت اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرسودگی ایسے چپٹی ہوئی تھی جیسے چھت کے گوشوں اور اس میں لٹکتے پنکھے سے جالے چپٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا جو چالیس واٹ کا بلب جلانے کے باوجود اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہا۔

درمیانی دروازے پر بھی ایک پردہ جھول رہا تھا لیکن اس کا رنگ اور ڈیزائن مختلف تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ دونوں پردے لنڈا بازار کی فٹ پاتھ کے ڈھیر سے اٹھائے گئے ہیں۔ ایک عظیم قوم کے قابلِ فخر مستقبل کے معماروں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے والے اور اس کے روحانی باپ کا درجہ رکھنے والے استاد کی یہ حالت دیکھ کے قوم کے مستقبل کا اندازہ یقیناً کیا جا سکتا تھا۔

ماسٹر چارپائی پر بیٹھے شبنم کو گھورنے لگا "یہ کیا پڑھے گی مجھ سے۔ فارسی یا عربی شریف۔"

میں نے کہا "اسے آپ جاہل ہی رہنے دیں فی الحال۔"

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "دیکھو برخوردار۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری عمر ستر سال ہو گئی ہے۔ مجھے ریٹائر ہوئے سات سال ہو گئے۔ اب تو بیوی بھی بات بات پر کہتی ہے کہ تم ٹھیا گئے ہو۔ تمام عمر میں پرائمری ٹیچر رہا اور جب ریٹائر ہوا تو گیارھویں گریڈ میں تھا۔ بارہ سو روپے پنشن ملتی ہے مجھے۔ یہ جو دروازے پر لکھ رکھا ہے میں نے 'ٹیوشن سینٹر' اپنے دل کی تسلی کے لیے ہے۔ آج تک کوئی اسلامیات اردو پڑھنے بھی نہیں آیا مجھ سے۔"

میں نے دل میں کچھ شرمندگی محسوس کی "دیکھئے۔ سچ بات تو یہ ہے۔"

"سچ تم کیا بتاؤ گے پتر۔ میں بتاتا ہوں تمہیں سچ۔ ایک پرائمری اسکول ٹیچر کے ساتھ مذاق کرتے ہو تم۔ ساری عمر دس بارہ سال کے بچے مجھ سے پڑھ پڑھ کے سیکنڈری کلاسوں میں اور کالج یونیورسٹی جاتے رہے۔ عالم فاضل ہو گئے اور بڑے افسر ہو گئے۔ لمبی لمبی کاروں اور عالی شان کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ انہیں انگریزی کے پہلے قاعدے میں اے سے سیب بی سے لڑکا اور سی سے بلی پڑھانے والا کون تھا۔ مگر تھے وہ تم جیسے بچے۔"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا "میں معافی چاہتا ہوں جناب۔ میں نے مذاق میں ایک بات ضرور کی تھی لیکن آپ کا مذاق اڑانے کے لیے ہرگز نہیں۔ میں استاد کی اتنی عزت کرتا ہوں کہ مجھے تو آپ کے قدموں میں بیٹھنا چاہیے۔ آپ کے برابر اس کرسی پر نہیں۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "صبح صبح آئے ہو' چائے پیو گے؟"

میرے انکار سے پہلے اندر سے اس کی شریکِ حیات نے بہ آوازِ بلند بڑبڑانا شروع کیا تاکہ ہم بھی صاف سن لیں۔ "ملو ہے نا دماغ خراب۔ پتا نہیں کون آ گیا ہے اور پوچھ رہا ہے چائے پیو گے؟ او پہلے اندر آ کے مجھ سے تو پوچھ لے کہ چائے کے لیے دودھ چینی ہے گھر میں یا نہیں۔ دودھ والے نے کب کا دودھ بند کر دیا۔ اب تو تقاضا کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

شبنم نے کہا "چائے ہم پی کے آئے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کسی اور مقصد سے آیا تھا۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا مجھے۔ یہ جو آپ کے سامنے والا دروازہ ہے۔"

"فائق علی رہتا ہے وہاں مگر اس کے بارے میں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم خفیہ پولیس والے ہو؟" ماسٹر ڈر گیا۔

میں نے اسے تسلی دی "ایسی کوئی بات نہیں ماسٹر صاحب۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ دراصل پہلے یہاں خانان کارپوریشن کا دفتر تھا۔"

شبنم نے مجھے گھورا "سچ بات بتاؤ۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ یہاں ہے وہ دفتر۔ ہمارے پاس جو کارڈ ہے اس پر یہی پتا درج ہے۔"

اچانک کسی نے دروازے پر ایسے ہاتھ مارا کہ اندر دھماکا سن کے میں بھی اچھل پڑا۔ باہر کسی نے چلانا شروع کیا "او ماسٹر۔ خانہ خراب کا بچہ۔ آج ام نئیں چوڑے گا تم کو۔ روز تمارا ابی ام کو بولتا اے ماسٹر نئیں اے۔ ابی ام بولتا اے بار آؤ اوئے۔ بے ایمان۔ نئیں تو ام اندر آ کے تمارا مردہ اٹائے گا۔ تم کو جنگل میں گاڑے گا۔ تمارا قبر پیشاب کرے گا۔"

وہ مسلسل دروازے پر مکے اور لاتیں مار رہا تھا اور طیش میں گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے چلانے کا واضح مقصد لوگوں کو جمع کرنا اور ماسٹر کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کرنا تھا۔ وہ کوئی سود خور تھا جس سے ماسٹر نے کسی اشد ضرورت کے تحت قرضہ لیا ہو گا لیکن بارہ سو روپے کی پنشن کی آمدنی رکھنے والا اپنے جھوٹے وعدے کے مطابق یہ قرضہ ادا کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ماسٹر کا چہرہ احساسِ ذلت سے زرد پڑ گیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اندر سے اس کی تمام عمر کی دکھ سکھ کی شریکِ حیات نے پردے کے پیچھے سے رونا شروع کیا "یا ربا۔ مینوں موت دے دے' میں کتھے جاواں۔"

میں ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ توڑ کے اندر گھس آنے کی دھمکی دینے والا چھ

فٹ کا خونخوار آنکھوں والا افغانی اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ دروازے کے سامنے چار پانچ تماشائی آ گئے تھے۔ ان میں فائق علی بھی تھا۔ دروازے کو آدھا کھولے ایک عورت بڑے اشتیاق کے ساتھ ایک استاد کی ذلت کا گھناؤنا کھیل دیکھ رہی تھی۔ ایک بچہ ماں کی ٹانگوں میں سے سر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

افغانی نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا "ماسٹر کدر اے۔"

میں نے غرا کے کہا "ماسٹر اندر ہے۔ آجاؤ۔" پھر میں نے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا "جایئے آپ بھی اپنے اپنے گھر۔ کچھ کر نہیں سکتے تو یہاں آنے کی زحمت بھی کیوں کرتے ہیں؟ خدا نہ کرے یہی تماشا آپ کے اپنے دروازے پر ہو تو کیا آپ کو اچھا لگے گا پڑوسیوں کا اکٹھا ہونا۔ خوب حق ہمسائیگی ادا کرتے ہیں لوگ۔"

لوگ شرمندہ نہیں ہوئے۔ الزام سچ ہو تب بھی لوگ شرمندہ نہیں ہوتے۔ اپنی غلطی کا دل میں بھی اعتراف نہیں کرتے۔ چور سینہ ٹھونک کے کہتا ہے کہ "ہاں اوئے چور ہیں ہم۔ مردوں والا کام ہے اور ہمت ہے تو کرتے ہیں۔ تجھے جو کرنا ہے کر لے۔ تھانے جانا ہے تو چل۔"

چور جانتا ہے کہ شریف آدمی کٹ کے بھی تھانے نہیں جائے گا اور چور تھانے جانے سے نہیں ڈرتا۔ وہاں تو سب اپنے ہیں' سیاں بھئے کوتوال۔

افغانی اندر آ گیا تو ماسٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے اس پر دل کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس کی زبان سے "خان صاحب۔ خان صاحب" کے الفاظ بھی بڑی مشکل سے ادا ہو رہے تھے۔

میں نے کہا "یہ کیا گالی گلوچ ہو رہی تھی ایک شریف آدمی کے دروازے پر؟"

وہ مشتعل ہو گیا "شریف آدمی؟ خو شریف آدمی تمارا ماما لگتا اے۔"

میں نے افغان کی واسکٹ پکڑ کے جھٹکا دیا تو اس کی پگڑی کھل کے نیچے ماسٹر کے قدموں میں گر گئی "ہاں یہ ماما ہے میرا۔"

اس نے مجھے دھکا دیا اور گالی دے کے بولا "ماما ہے تو بدمعاشی مت کرو۔ امارا پیسہ ادا کرو۔ خنزیر کا بچہ۔"

میں نے گالی پر اس کے سر پر مکا مارا۔ وہ تیورا کے نیچے جھکا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنی واسکٹ کی جیب کی طرف گیا "ابی ام نئیں چوڑے گا۔ تمارا ابی جنازہ بنائے گا۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میری گرفت سے وہ سمجھ گیا کہ مدمقابل کمزور حریف نہیں ہے۔ اس نے مزاحمت ترک کر دی اور میں نے اس کی جیب میں سے ریوالور نکال لیا۔ "یہاں بیٹھ کے شرافت سے بات نہیں کرو گے تو میں تم کو باہر لے جاؤں گا اور ننگا کر کے اتنا ماروں گا۔"

"خو بھانجا صیب۔ آپ سے بات کرے گا ام۔ امارا بندوق۔" اس نے ریوالور واپس لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا "یہ مجھے سرکاری ریوالور لگتا ہے۔ نمبر بھی ہے اس پر۔ تمہارے پاس لائسنس ہے اس کا؟"

ماسٹر نے کانپتی آواز میں کہا "دیکھو پتر۔ اس سے جھگڑا مت کرو' یہ خطرناک آدمی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد۔"

میں نے کہا "ماما جی۔ اب آپ مل گئے ہیں تو ہم کہاں جائیں گے' یہیں رہیں گے آپ کے ساتھ۔ دیکھتے ہیں کون کتنا خطرناک ہے۔"

افغانی کھڑا ہو گیا "اچھا ام جاتا اے۔"

میں نے کہا "اوریگا۔ پہلے حساب صاف صاف کرو پھر جانا۔ کتنی رقم ہے تمہاری؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا "پانچ ہزار لیا ماسٹر۔ پانچ سو روپیہ مہینہ پر۔ ایک سال کا واسطے۔ ابی دو سال ہو گیا' اصل باقی اے۔"

میں نے کہا "پانچ سو روپیہ ماہانہ سود کے حساب سے تم نے دو سال میں بارہ ہزار وصول کر لیے۔ تمہارے پانچ ہزار بھی باقی ہیں؟"

اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "سود خور پر لعنت۔ ام منافع لیتا اے اور زبان کا اعتبار کرتا اے۔ یہ ماسٹر خود آیا۔"

میں نے کہا "اچھا بک بک بند کرو اور رسید نکالو۔"

"رسید' ام پکا حساب رکھتا" اس نے ایک بوسیدہ چمڑے کے کور والی ڈائری نکالی "اور ماسٹر خود اپنا ہاتھ سے سب لکھتا۔"

میں نے نوٹ بک مانگی تو اس نے قدرے تذبذب کے بعد وہ صفحہ میرے سامنے کر دیا جس کے ہر صفحے پر کسی مقروض کا حساب تھا۔ اصل رقم ماسٹر نے خود اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اس کے سامنے دستخط کر دیئے تھے۔ ہر مہینے کی ایک مقررہ تاریخ کو وہ پانچ سو روپے سود کی ادائیگی کا اندراج بھی خود کرتا تھا اور دو سال کے اندراجات کے دو صفحے ہو گئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے یہ حساب دیکھ کے دکھ ہوا۔ بارہ سو روپے ماہانہ کی پنشن میں سے پانچ سو روپے ماہانہ ایک پرانے قرض کی مد میں جا رہے تھے جو اس نے نہ جانے کس مجبوری میں ہر طرف سے مایوس ہو کے اتنی بھاری شرح سود پر لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی صرف سات سو روپے میں جی رہے تھے۔ شاید گھر ان کا اپنا تھا مگر اس کے باوجود گرانی کے اس دور میں یہ سات سو کی رقم دو وقت کی روکھی سوکھی دینے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ صبح صبح بن بلائے نازل ہو جانے والے دو اجنبیوں کے لیے دو کپ چائے کی گنجائش اس میں کہاں تھی۔

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور اس نے مطلب سمجھ کے اپنا پرس دیکھا۔ وہ کچھ نروس ہوئی "میرے پاس تو۔۔۔"

میں نے کہا "ایک کاغذ اور قلم نکالو۔ خان سے رسید لو کہ رقم وصول پائی۔"

میری جیب میں وہ ساڑھے سات ہزار کی رقم محفوظ تھی جو مجھے خادم کے پرس سے ملی تھی۔ میں نے پانچ ہزار نکالے اور شبنم نے بال پوائنٹ کے ساتھ کاغذ خان کو تھما دیا۔ وہ بے وقوفوں کی طرح کھڑا باری باری میری اور شبنم کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے پانچ ہزار کے نوٹ لے کر جیب میں ڈالے اور رسید لکھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھا کے اس کو ایک سخت جلد والی کتاب تھما دی۔

پہلے خان نے ٹوٹے پھوٹے حروف میں صرف ایک جملہ لکھا تھا "پانچ ہزار روپیہ وصول کیا" پھر میں نے اسے ناکافی سمجھتے ہوئے کاغذ پھاڑ دیا اور اس سے دوسری رسید لکھوائی جو کسی حد تک قانونی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ ماسٹر شرمندگی، احسان مندی کے بار اور بے بسی کے احساس سے اشکبار سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کی عمر بھر کی ساتھی ساٹھ سال کی بیمار صورت بڑھیا پردے کی اوٹ سے نکل کے سامنے آ چکی تھی اور اس کے جھریوں بھرے چہرے پر آنسو بہہ رہے تھے مگر اسے خبر نہ تھی۔ اس کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین اور ایک خوابِ آرزو سے کم نہ تھا۔

خان نے رسید پر دستخط نہیں کیے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ کے انگوٹھے پر قلم کی سیاہی لگا کے نشان رسید پر دستخط کی جگہ ثبت کیا اور نیچے شبنم سے بطور گواہ دستخط کرائے پھر میں نے دو صفحے ڈائری میں لکھے ہوئے اندراجات پر ماسٹر کے کانپتے ہاتھوں میں قلم دے کر خطِ تنسیخ پھروایا اور حساب کے آخری اندراج کے طور پر اس نے لکھا "پانچ ہزار کی کل رقم ادا کر دی گئی" پھر اس نے دستخط کیے اور بستر پر بیٹھ کے رونے لگا۔

میں نے چٹکی بجائی "اب تم اپنی منحوس صورت لے کر دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے پھر کبھی میں نے تمہیں اس عمارت کے زینے پر قدم رکھتے دیکھا تو جہاں تم ماسٹر کو دفن کرنا چاہتے تھے وہیں تمہاری لاش گاڑ دوں گا اور وہی کروں گا۔۔۔"

اس نے خوشامد اور عاجزی کی مسکراہٹ اپنے چہرے پر طاری کی "بھانجا صیب، انی امارا بندق دے گا۔"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ اچھا شام کو لائسنس کے ساتھ تھانے آجانا، تھانہ انارکلی۔"

"آپ ایسا ظلم نہیں کرے گا بھانجا صیب۔"

میں نے کہا "اتنا تو ہونا ہی چاہیے تم جیسے لوگوں کے ساتھ۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں معاشی استحصال کے اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا مگر یہ ممکن نہیں میرے لیے۔ میں تمہاری یہ نوٹ بک بھی تمہارے سامنے جلا سکتا تھا جس میں نہ جانے کتنے مصیبت کے ماروں کے لیے عذاب کا شکنجہ ہے۔ جس سے وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود نکل نہیں سکتے مگر مجھے معلوم ہے اس کے باوجود وہ متوقع رہیں گے۔ ان میں تم سے قانونی جنگ لڑنے کی ہمت نہیں ہے اور تم ویسے بھی بدمعاشی اور غنڈا گردی سے پیسہ اینٹھتے ہو۔"

وہ ریوالور لیے بغیر جانے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اسے رقم کی وصولی سے زیادہ بلا لائسنس کے اسلحے کی ضبطی سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی "بھانجا صیب۔ آپ کا مہربانی اے۔ ام یہ بندوق تین ہزار کا لیا۔"

میں نے کہا "بکواس کرتے ہو تم۔ یہ روسی ساخت کا ریوالور ہے۔ کیا تم جہاد کے لیے افغانستان گئے تھے؟ یا یہ پولیس کے مال خانے سے لیا ہے تم نے اور تم اسے لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے استعمال کرتے ہو؟ تم نے مجھ پر بھی ریوالور نکالا تھا۔ تمہارے خلاف اقدامِ قتل کا مقدمہ اٹک بنتا ہے۔"

شبنم نے کہا "اب جانے بھی دو اسے۔"

ماسٹر نے بھی کہا "ہاں ہاں چھوڑیے۔ بس ختم کرو بات کو۔"

میں نے کہا "ایک بات ختم ہو گئی۔ میں نے اسے کہا ہے جائے مگر یہ کھڑا ہے۔ کیا میں اسے اٹھا کے باہر پھینک دوں گلی میں۔ اچھا خان، چلو فیصلہ تم کرو۔ شام کو تھانے آ کے ریوالور واپس لو گے یا مجھ سے یہیں خریدو گے؟ نقد لے لو ابھی یہ فائدے میں رہو گے، کتنی قیمت بتائی تھی تم نے اس کی؟"

"تین ہزار" اس نے حلق سے مردہ آواز نکالی۔

میں نے کہا "میرا نام ہے بشیر چوہدری۔ میں انسپکٹر ہوں سی آئی اے میں۔ خود بھی اسلحہ فروخت کر چکا ہوں کئی بار اور اسلحے کے کیس میں کوئی پکڑا جائے تو اس سے رشوت بھی ٹھیک ٹھاک لیتا ہوں۔"

خان کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے شاید یہی سمجھا ہو گا کہ ماسٹر نے قرض سے نجات پانے کے لیے سی آئی اے کا سہارا لیا اور میں اس کا بھانجا تو خیر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ شاید کوئی پرانا شاگرد ہوں۔ کسی پرانے استاد کا ادب لحاظ کرنے والے اور وضع داری میں خدمت کے لیے حاضر ہونے والے انسپکٹر کا پولیس میں وجود مشکل ہے ناممکن نہیں۔

ماسٹر اور اس کی بیوی بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اس خیال سے کہ بعد میں خان بدلہ لینے آ گیا تو کیا ہو گا۔ وہ اس کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ غریبی، معذوری، کم ہمتی۔ سب آدمی کو کتنا بزدل بنا دیتے ہیں۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ میں سود خور افغان کو جتنی ذہنی اذیت پہنچا سکتا ہوں پہنچاؤں۔ جتنا TORTURE کر سکتا ہوں کروں۔ سب وقت وقت کی بات ہے۔ اذیت دینا اور عذاب میں مبتلا رکھنا اس کے لیے پیسے کا کھیل تھا جو وہ برسوں سے کھیل رہا تھا اور اس کھیل کو جاری رہنا تھا مگر اس وقت وہ میرے قبضے میں تھا اور میں اس سے ظلم کے ہزارویں یا دس ہزارویں حصے کا حساب برابر کر سکتا تھا اور اسے احساس دلا سکتا تھا کہ گھڑی کی سوئی الٹی چلنے لگے اور ظالم کو مظلوم بنا دے تو کیا ہوتا ہے مگر میں نے یہ سب نہیں کیا۔ میں اس سے پانچ دے کے دس وصول کر لیتا اور وہ خوشی خوشی دے کے جان چھڑاتا لیکن شبنم نے بھی مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔

جب خان چلا گیا تو کمرے میں ایک بوجھل خاموشی کا کراہتا ہوا لمحہ آیا۔ اس وقت مجھے خان کی حالت کا تصور کر کے ہنسنا چاہیے تھا اور ماسٹر کو خوشی منانی چاہیے تھی۔ قہقہے لگاتے ہوئے اپنی بیوی کو مبارک باد دینی چاہیے تھی کہ تائیدِ غیبی سے ان کے عذاب کا دور ختم ہوا اور خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے ہمیں گلے لگا کے ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا جو فرشتۂ غیب بن کے نمودار ہوئے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ماسٹر کی بیوی سر جھکائے اندر چلی گئی اور ماسٹر خلا میں دیکھتا رہا۔ وہ خوددار آدمی تھا۔ پہلے قرض خواہ کے ہاتھوں ذلت اٹھاتا رہا تھا اور اب اس احساس کی اذیت کا شکار تھا کہ ایک دولت مند اجنبی نے خیرات دے کر اسے قرض کی غلامی سے آزاد کر دیا۔

میں نے کہا "ماسٹر صاحب۔ ایک کام سے آیا تھا میں آپ کے پاس۔"

اس نے میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا "یقیناً وہ کام کچھ اور تھا۔ یہ نہیں تھا جو تم نے کیا۔"

میں نے کہا "چھوڑیے اس ذکر کو۔"

"نہیں۔ میں تمہارا مقروض ہو گیا اب۔۔۔" وہ بولا۔

"یہ قرض نہیں تھا۔"

اس نے انکار میں سر ہلایا "تم میرے بھانجے نہیں ہو اور بھانجے ہوتے تب بھی میں تم سے قرض لیتا تو ادا کرتا۔ میں پانچ سو روپے مہینہ دو سال سے دے رہا تھا، تمہیں بھی دوں گا مگر اب قرضہ دس مہینے میں ختم ہو جائے گا۔"

شبنم نے مجھے آنکھ مار کے بحث نہ کرنے کا اشارہ دیا۔ "جیسے آپ کی مرضی۔ اس خونی بلا سے تو آپ کی جان چھوٹی۔"

وہ بولا "میں بیمار ہو گیا تھا۔ مرجاتا تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر نے فیس نہیں لی مگر دوا نہیں ملی سرکاری اسپتال سے۔"

میں نے کہا "سامنے والے گھر میں جہاں فائق علی رہتا ہے، یہاں پہلے کسی خاندان کا ریپوریشن کا دفتر تھا۔"

میرے سوال نے ماسٹر کو موضوع بدلنے پر مجبور کر دیا۔ "ہاں۔ تھا تو سہی۔ یہ فائق علی ابھی آیا ہے۔ مہینہ بھر پہلے۔"

شبنم نے کہا "آپ کو کچھ معلوم ہے۔ اب وہ آفس کہاں چلا گیا ہے؟"

ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا "میرا کوئی تعلق نہیں تھا ان سے۔"

میں نے کہا "کبھی آپ نے دیکھا۔ وہاں کیا کام ہوتا تھا۔ نوعیت کیا تھی ان کے کاروبار کی؟"

"یہ بھی نہیں معلوم۔ مگر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔۔۔ اور وہ کوئی شریف لوگ نہیں لگتے تھے۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ جیسے کہ سب کے ملنے والے ہوتے ہیں، رشتے دار ہوتے ہیں، اس بلڈنگ میں میرے علاوہ بھی لوگ ہیں۔ چار مالک ہیں۔ دو کرائے دار۔"

"آپ کو کیسے شک ہوا کہ آنے جانے والے شریف لوگ نہیں تھے؟" میں نے کہا "ویسے تو ہم بھی نہ حلیے سے شریف لگتے ہیں۔"

"یہ مت کہو۔ شرافت حلیے میں نہیں ہوتی پتر اطوار میں ہوتی ہے۔۔۔ آدمی کی صورت پر نظر آ جاتی ہے۔ ماسٹر کی اوقات کچھ نہیں رہی اس زمانے میں لیکن اس کو بے اوقات کرنے والے بھی ماسٹر کے پاس جا کے ہی اس قابل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے۔ ماسٹر چہرے بدلتے دیکھتا ہے زمانے کے ساتھ مگر اصل کی پہچان رکھتا ہے۔ اب ایک بات کہوں، تم انگریزی سیکھنے آئے تھے نا؟"

میں نے کہا "میں شرمندہ ہوں۔ دراصل آپ سے بات کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا تھا اور بتاؤں۔ یہ جو تمہارا حلیہ ہے یہ بھی اصل نہیں ہے مگر تم غلط کام کرنے والے آدمی بھی نہیں ہو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ آپ نے کیسے جان لیا؟"

"اگر غلط کہا میں نے تو بتاؤ۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "یہاں آنے والوں میں مرد بھی ہوتے تھے، عورتیں بھی آتی تھیں۔ ایسا ہی لباس اور فیشن ہوتا تھا ان کا بھی۔ جیسا ان کا ہے کیا ہیں یہ تمہاری؟"

"دوست" میں نے بڑی مشکل سے کہا "حالانکہ ہمارے معاشرے میں عورت مرد کی دوستی کا تصور نہیں ہے۔ ہم ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "اس لباس اور فیشن کے باوجود یہ لڑکی شریف ہی نظر آتی ہے۔ اور ہے۔ مجھے کسی کے کردار سے کیا اور میں اعتراض کرنے والا کون مگر دوسروں نے کہا کہ یہاں شریف لوگوں کی رہائش ہے۔ یہاں کسی کاروباری دفتر کا کیا کام۔ کام کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ مشکل سے چھ مہینے رہا وہ دفتر یہاں۔ شاید سال بھر۔"

میں سمجھ گیا کہ ماسٹر سے اور کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوگی۔ وہ ریٹائر ہونے کے بعد دنیا سے لاتعلق ہو جانے والا شخص تھا جو کسی کے معاملات سے دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور کسی کو اس کی ذات سے دلچسپی نہیں تھی۔ دنیا کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا اور خود اس کے لیے زندگی نام ہے مرمر کے جیئے جانے کا کی تفسیر بن کے رہ گئی تھی۔

میرے اشارے پر شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "اب ہم چلتے ہیں۔"

اندر سے اس کی بیوی نے کہا "بیٹا۔ معاف کر دینا ہمیں۔ یہ ایک غریب ماسٹر کا گھر ہے۔ تم نے اتنا بڑا احسان کیا ہم پر۔ ہم ایک کپ چائے نہ پلا سکے۔"

میں شرمندہ ہو گیا "پھر آئیں گے چائے پینے۔"

"ہاں اور آج کے دن آنا" ماسٹر بولا "ایک مہینے بعد۔ میں تمہیں پورے پانچ سو دوں گا، پہلی قسط۔ وعدہ کرو، آؤ گے؟"

میں نے کہا "ہم آئیں گے مگر قسط کم کر لیں۔ سو روپے کافی ہیں۔"

"سو روپے۔ پچاس مہینے لگ جائیں گے ایسے تو۔ اتنی مہلت زندگی دے نہ دے۔ مگر خیر، تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے" وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی مجروح انا پر خودداری کا مرہم رکھ رہا ہے ورنہ اسے بھی علم تھا کہ ہم نہیں آئیں گے اور یہ قرض ادا کرنے والی بات ظاہر کا پردہ ہے۔ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ اسے سچ مچ قرض ادا کرنا ہوتا تو وہ ہم سے ہمارا نام پتا پوچھتا اور کہتا کہ وہ ہر ماہ قرض کی قسط ادا کرنے خود آئے گا۔

میں دروازے پر تھا کہ اس نے کہا "ایک بات اور۔"

میں نے رک کے اسے دیکھا "قرض کی بات ختم ہو گئی۔"

"یہ جو فائق علی ہے۔" اس نے سوچ کے رازدارانہ انداز میں بتایا "دو چار مرتبہ میں نے دیکھا، جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، وہ بھی ویسے ہی ہیں۔ جیسے پہلے آتے تھے۔ ایک دو وہی ہیں۔"

"اچھا؟ آپ نے پہچان لیا انہیں؟"

"ہاں۔ ماسٹر چہرے نہیں بھولتا۔ انہیں بھی دیکھا تھا پہلے۔ نام نہیں معلوم ان کے" وہ بولا۔

ہم خدا حافظ کہہ کے نیچے اتر گئے۔ اس وقت تک بازار کی رونق بحال ہو چکی تھی۔ دکانیں کھل گئی تھیں اور ٹریفک بہت بڑھ گیا تھا۔ میں صبح کی اس مہم جوئی کے نتائج سے مایوس نہیں تھا۔ خاندان کارپوریشن کا پتا نہیں چلا تھا مگر فائق علی کی صورت میں ایک سراغ ہاتھ آ گیا تھا۔ اب اس کا پیچھا کرنے سے خاندان کارپوریشن تک رسائی ممکن تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ نیچے رک کے فائق علی کا انتظار کروں مگر شبنم نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھ میں ابھی اتنی ہمت نہیں ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔ گھر جا کے سونا چاہتی ہوں" شبنم نے کہا۔

"تم جاؤ، میں یہاں رک کے فیکے پر نظر رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی گاڑی ہے" میں نے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی سوزوکی پک اپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہوگی۔ آج یہاں ہے تو کل بھی ملے گی۔ ابھی تم بیٹھو میرے ساتھ۔ میں تم کو گھر چھوڑتی ہوں۔ آزاد صاحب میری جان کو رو رہے ہوں گے۔ تمہارا بھی اس حلیے میں پھرنا کسی صورت مناسب نہیں۔ میں شام کو آؤں گی تو اپنے ساتھ

مائیکل کو بھی لاؤں گی۔ آئی بات سمجھ میں؟" اس نے گاڑی کو ریورس کر کے نکالا۔

"کچھ آئی کچھ نہیں آئی" میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا "اس وقت میں گھر جا کے سو گیا تو کچھ کام رہ جائیں گے۔ دن کے کام رات کے وقت نہیں کیے جا سکتے۔ رات کو الو جاگتے ہیں یا اخبار والے۔"

"مجھے عادت پڑ گئی ہے دن میں سونے کی۔ جب سے آزاد صاحب نے ڈیسک پر بٹھایا ہے" وہ بولی "آج میں ان سے صاف بات کروں گی۔ یا تو مجھے وہی پرانی رپورٹنگ کی ڈیوٹی پر لگا دیں ورنہ میرا استعفیٰ۔ میں فری لانسنگ کروں گی۔ کیا خیال ہے اگر تم بھی میرے ساتھ چلو اور ان سے مل لو۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "آج نہیں شبنم۔ اس سے تو بہتر ہے میں بھی گھر میں آرام کروں۔ آزاد صاحب کی طرح رئیس میری جان کو رو رہا ہوگا۔"

شبنم مجھے سڑک پر چھوڑ کے آگے نکل گئی۔ گیراج کی چابی میرے پاس تھی۔ میں نے شٹر اٹھایا تو آلٹو اندر موجود تھی جس کا مطلب تھا تیس مارخان آ گیا ہے۔

رئیس ابھی تک صوفے پر غافل پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ تیس مارخان مجھے دیکھ کے چونکا۔ وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا اور اپنے آپ سے نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

میں نے کہا "تیس مارخان۔ تمہاری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا کیا حال ہے۔"

وہ بولا "ٹانگ ٹھیک ہوئی صاب۔ اللہ ام کو بچاتی ورنہ وہ ظالم کا بچی سارا عمر ام کو لنگڑا آم بولتی۔"

"یعنی ساری عمر ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تم نے۔"

اس کی مونچھیں مسکرانے سے دس بج کر دس منٹ کی پوزیشن میں ہو گئیں "اللہ آپ کا زبان مبارک فرماتی۔ وہ ام سے بہت معافی مانگتی۔ آنسو بھرتی آنکھوں میں اور اپنا دست مبارک سے مالش فرماتی۔ اس کا دادی صاب کا خاص نسخہ ہوتی۔ لال کوچ کا تیل۔"

"لال کوچ؟ یہ کس جگہ کا نام ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ جانور ہوتی صاب، ٹالی میں رہتی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کاکروچ کو یا لال بیگ۔ اس کا بھی تیل ہوتا ہے؟"

"ہر چیز کا تیل ہوتی صاب۔ ہاتھی کا اور شیر کا چربی سے تیل بنتی۔ سانڈ کا تیل ہوتی اور مچھلی کا۔ وہ مالش نہیں جادو کرتی صاب!"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ جادو اس کی نظر میں ہے، اس کی ہرا رام ہے۔ جادو اس نے تم پر کر دیا ہے۔"

اس نے شرمانے کی کوشش کی "آپ سچ فرماتی صاب۔"

میں نے اپنا لباس بدلا اور شریفانہ کپڑے پہن کر تیس مارخان کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس میں میرے لیے شناخت کیے جانے کا خطرہ ضرور تھا مگر مجھے کچھ ایسے کام نمٹانے تھے جو ناصر عظیم ہی کر سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے سال بھر سے ناصر عظیم کو نہیں دیکھا تھا اور جب دیکھا تھا تو ایک کامیاب کاروباری شخص اور ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک کے طور پر دیکھا تھا۔ اب میں ان کے سامنے ریشمی سبز کرتے اور دو گھوڑا بوسکی کے لاچے اور قراقلی ٹوپی میں نہیں جا سکتا تھا۔

آلٹو کے شیشے سیاہ نہیں تھے مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگوں نے اندر اسٹیکر پیپر لگا کے شیشوں کو TINTED بنا لیا تھا جس سے پردہ داری کے تقاضے پورے ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسا کرنے والے شرعی پردے سے زیادہ تجی نوعیت کی مصروفیات کو دنیا کی نظر سے بچانے کے لیے TINTED گلاس استعمال کرتے تھے۔

پچھلی سیٹ پر میں انہی سیاہ شیشوں کی وجہ سے محفوظ رہا مگر تیس مارخان کی بک بک سے محفوظ رہنا مشکل تھا۔ پہلے اس کے محبوب ترین موضوعات دو تھے۔ ایک اپنے قد میں اضافے کی گارنٹی دینے والی جادو اثر دواؤں کی دریافت اور ان کے استعمال سے حاصل ہونے والے حیرت انگیز نتائج کی رپورٹ۔ ہر نئی دوا کھانے کے وہ حلفیہ بیان دیتا تھا کہ اس کا قد ایک ملی میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے میں چوبیس ملی میٹر کا حساب ایک انچ ہوتا اس کا قد ساڑھے چار فٹ سے چھ فٹ ہونے میں کتنے دن لگیں گے۔

اس کا دوسرا پسندیدہ موضوع اس کی مونچھیں تھیں جن کو وہ اپنے قد سے بھی زیادہ طول دے کر شاید اپنا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کرانا چاہتا تھا۔ لوگ اپنی اکلوتی اولاد نرینہ کو اتنی محبت، توجہ اور ارمانوں سے نہیں پالتے جتنی لگن اور محنت سے وہ اپنی مونچھوں کو پالتا تھا۔ ہر قسم کے ہیئر ٹانک سے طلسماتی روغنیات تک استعمال کرنے سے اس کی مونچھیں بلاشبہ چہرے سے ایک بالشت دائیں بائیں پھیل چکی تھیں۔

آج کل اس پر چھوٹی سواری تھی چنانچہ وہ اپنے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موبچھوں کے سائز کو بھول کے سارا وقت فسانۂ غم دل اور اس کے حسن جہاں سوز کے افسانے سناتا تھا۔ وہ سارا راستہ بولتا گیا اور میں نے دل آزاری کے خیال سے اس کو شٹ اپ نہیں کیا مگر میں نے وہ سب سنا بھی نہیں جو تمیں مارخان کے خیال میں میری دلچسپی اور محویت کو ظاہر کرتا تھا کیونکہ میں خاموش تھا۔

ایک سال سے زیادہ عرصے کے بعد میں نے اپنے سب سے پرانے بینک میں پھر قدم رکھا۔ آج میرا شمار معزز اور دولت مند کلائنٹس میں ہوتا تھا لیکن اب کوئی نہیں جانتا تھا کہ جب ایک نابالغ بچے نے اسی بینک کے ایک ملازم کی مدد سے یہاں اپنا پہلا اکاؤنٹ کھولا تھا اور اس میں اپنی بچت کی معمولی سی رقم جمع کرائی تھی تو میری حیثیت ایک لاوارث اور بے نام ونسب فقیر جیسی تھی۔ میں نے چندوں سے غبن کرکے اور اپنی مظلومیت کے ناٹک سے لوگوں کا جذباتی استحصال کرکے اور بہت سے جھوٹ کیش کرا کے وہ رقم اکٹھی کی تھی جو دو طرح سے بڑی تھی۔ ایک ان لوگوں کی مدد سے جو میری ذہانت' ترقی کی لگن اور ہمت سے متاثر ہو کے میری مدد کرتے تھے اور دوسرے میری ہیرا پھیری سے۔

مجھے یہاں متعارف کرا کے میرا اکاؤنٹ کھولنے والا شخص اب معلوم نہیں کہاں تھا۔ بعد میں بے شمار لوگ آئے گئے تھے۔ بہت سے منیجر تبدیل ہوئے تھے اور کاؤنٹر کے پیچھے نظر آنے والے چہرے بدل گئے تھے۔ بینک کی یہ چھوٹی سی برانچ ترقی کرکے بہت بڑی ہوگئی تھی۔ جہاں چھ سات افراد کا عملہ کام کرتا تھا وہاں اب تیس چالیس لوگ نظر آتے تھے۔ برانچ کی عمارت اندر اور باہر سے کشادہ اور خوب صورت ہوگئی تھی۔ میرا اپنا اکاؤنٹ ہزاروں سے لاکھوں میں ہوگیا تھا اور جب شادو اپنا سب کچھ میرے حوالے کرکے رخصت ہوئی تو میرا بینک بیلنس آٹھ اعداد تک پہنچ گیا تھا۔ اس اکاؤنٹ کے ساتھ میری ایک قدرتی جذباتی وابستگی تھی۔

موجودہ بینک منیجر یہاں تین سال سے تھا اور ذاتی طور پر خوش اخلاق' دھیمے مزاج والا اور کاروباری معاملات میں بے حد فعال شخص تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی صورت پر خوش گوار حیرانی کے جذبات آگئے۔

"ناصر صاحب۔ ناصر صاحب!" اس نے مجھ سے پُرجوش مصافحہ کیا "آپ تو عید کے چاند سے بھی بڑھ کر ہوگئے جناب۔ وہ سال میں ایک بار تو نظر آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "کہاں منیجر صاحب۔ نظر کہاں آتا ہے۔ وہ رویت ہلال کمیٹی کہتی ہے کہ نظر آگیا تو ہم بھی مان لیتے ہیں۔"

"خیریت ہے۔ کہاں رہے اتنا عرصہ۔ کوئی ڈیلنگ بھی نہیں ہوئی۔ ڈیازٹ بھی نکس پڑے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی بات سے اطمینان ہوا کہ ڈیازٹ نکس ہیں۔ تحلیل نہیں ہوئے۔ میں تو ملک سے باہر تھا۔ یہاں کے حالات کی بے یقینی سے باہر بڑی بے چینی رہتی ہے۔ راتوں رات انسان' نظام' حکومت باقی نہیں رہتی تو ڈیازٹ کیا چیز ہے۔"

وہ ہنسا "خیر' اب ایسا بھی نہیں۔ اپنے کرنل صاحب کا کیا حال ہے؟"

میں نے کہا "وہ۔ کچھ بیمار ہیں بلکہ خاصے بیمار ہیں۔"

"اچھا تو کیا انہی کے علاج معالجے کے لیے اتنا عرصہ باہر قیام رہا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ یہیں ایک اسپتال میں ہیں۔ میں درمیان میں آیا مگر اتفاق ہے کہ ادھر نہ آسکا۔ اپنا بزنس لندن میں ESTABLISH کررہا ہوں۔"

"یعنی سیٹل ہونے کا خیال ہے وہاں۔ اچھا خیال ہے۔ یہاں تو جناب کوئی سیکیورٹی نہیں۔ معاشی حالات بوتل کے جن کی طرح قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں۔ یہ الیکشن وغیرہ اس کا حل نہیں ہیں۔ خیر فرمایئے کیا خدمت ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "ایک تو مجھے ٹریولرز چیک چاہئیں۔ تقریباً پچاس لاکھ کی مالیت کے۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ پاکستانی روپے کے بجائے ڈالر اکاؤنٹ رکھوں۔"

"صاحب' بڑا اچھا خیال ہے۔ حیرت ہے آپ کو اتنی دیر سے آیا۔ لوگ اب یہی کررہے ہیں۔ میرا مطلب ہے سمجھ دار لوگ۔ روپے کی قیمت گر رہی ہے اور ڈالر تو صاحب اڑ دھا ہے اڑ دھا۔ آپ کی سب سے SAFE انویسٹ منٹ ہے فارن ایکس چینج اکاؤنٹ میں۔ میری مانیں تو یہاں کچھ مت رکھیں۔ سرمایہ باہر شفٹ کردیں۔ سوئزرلینڈ جیسے کسی ملک کے بینک میں اور رئیل اسٹیٹ میں انویسٹ کردیں۔ جائداد خرید لیں برطانیہ میں۔"

میں نے کہا "منیجر صاحب۔ ملک کا سرمایہ باہر نکالنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں باہر بزنس کروں گا تو فارن ایکسچینج کما کے یہاں بھیجوں گا۔ میں ذرا مختلف قسم کا پاکستانی ہوں۔ معیشت کو خطرہ لاحق ہو پاکستان کو۔ بہرصورت میں اپنی پاکستانی شہریت نہیں بدل سکتا۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے آپ اپنے باپ کے بزنس میں منافع کے لیے شامل رہیں اور

نقصان کا اندیشہ ہو تو الگ ہو کے اس کے حریف کے ساتھ ہو جائیں۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوا "معاف کیجئے گا۔ ایسے تو کم ہی لوگ سوچتے ہیں۔ اب بلیک منی کے پہاڑ بن گئے ہیں تو لوگ کاٹ کاٹ کے ٹکڑوں کی صورت میں باہر بھیج رہے ہیں۔ اول تو ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں لیکن خطرہ محسوس کریں تو خود بھی باہر چلے جائیں گے۔ وہ جو پرندے موسم کے ساتھ نقل مکانی کرتے ہیں۔ کیا کہتے ہیں انہیں۔"

"MIGRATORY BIRDS" میں نے کہا۔

"جی تو بس ایسے ہی پاکستانی ہیں سب۔ اچھے موسم کے ساتھ۔ خیر' آپ جیسا کہیں گے ویسا ہو جائے گا۔ چائے نوش فرمایئے۔"

میں نے کہا "ایک بات اور۔ میری غیر حاضری میں میرے چیک آئیں تو باؤنس نہیں ہونے چاہئیں۔ میں یہاں نہیں ہوں' ایسا نہ ہو کہ کوئی نیا کلرک اعتراض کردے کہ دستخط نہیں تھے۔ میں کیسے آؤں گا دستخط کرنے۔"

"اجی ایسا کبھی ہوا ہے۔"

میں نے کہا "پھر بھی۔ میں ایک پوری چیک بک پر آپ کے سامنے سائن کرتا ہوں' نمبر نوٹ کرلیں ان کے۔ انہی پہ بلینک ہیں۔ رقم اور تاریخ کا اندراج میں ضرورت کے مطابق کروں گا اور کسی کو دے دوں گا۔"

اس نے ہاتھ مل کے تشویش سے کہا "یہ تو جناب۔ آپ کا رسک ہے۔ اتنے بلینک چیک دستخط کرکے رکھنا۔"

"آف کورس یہ میرا رسک ہے" میں نے کہا۔

تین دوسرے بینکوں میں جا کے میں نے ایسے ہی انتظامات کیے۔ حالانکہ میرے پاس بین الاقوامی طور پر قبول کیے جانے والے امریکن ایکسپریس اور CLUB DINERS جیسے معتبر اداروں اور بینکوں کے کریڈٹ کارڈز ناصر عظیم کے نام سے موجود تھے جن کو صرف RENEW کرانا کافی تھا۔ دنیا کے کسی حصے میں مجھے کیش کی کمی کا مسئلہ درپیش نہیں ہو سکتا تھا مگر بینکوں کے ساتھ رابطہ ضروری تھا اور اپنے اکاؤنٹس کی صحیح صورتِ حال جاننا بھی اتنا ہی ضروری تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ تقریباً ساڑھے چھ کروڑ روپے بینکوں میں سڑ رہے ہیں۔ کاروبار میں جو پیسہ بے مصرف پڑا رہے وہ سڑا ہوا ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ کہیں انویسٹ ہوتا تو PRODUCTIVE رہتا۔ بے شک بینک والے بھی پیسے کو ڈھیر کرکے نہیں بیٹھے رہتے۔ وہ پیسہ گردش میں رہتا ہے لیکن فائدہ بہرحال بینک کو ہوتا ہے۔

شاہ عالم بننے سے پہلے میری مصروفیات کچھ اور تھیں۔ میں ایک ایکسپورٹر تھا۔ کمر ایک بوتیک چلاتی تھی اور اس کے ڈیزائن کیے ہوئے ڈریس لوکل مارکیٹ میں اتنے فروخت نہیں ہوتے تھے جتنے میں باہر بھیج دیتا تھا۔ میں ایک کنسٹرکشن کمپنی کی بنیاد رکھ چکا تھا اور اس کے لیے زمین بھی حاصل کرچکا تھا جس پر میرا ارادہ ایک کمرشل پلازا کھڑا کرنے کا تھا مگر اس زمین پر تنازعہ پیدا ہوگیا اور اس احاطے کو عدالت نے سیل کردیا۔ کچھ قصور ان وکیلوں کا تھا جنہوں نے زمین کا حق ملکیت حاصل کرنے کے لیے عدالت میں پیروی کے معاملے میں پوری دلچسپی نہیں لی۔ رہی سہی کسر میری غیر حاضری نے پوری کردی۔

میں نے کنسٹرکشن کمپنی کے لیے دفتر حاصل کرلیا تھا اور اس کے لیے ضروری اسٹاف کا انتخاب بھی تقریباً طے تھا۔ ابتدائی مرحلے میں ایک آرکیٹیکٹ' ایک سول انجینئر' ایک سول ڈرافٹس مین' کیشئر کم اکاؤنٹنٹ۔ ٹائپسٹ کلرک اور چپراسی کے علاوہ میں نے خان اعظم کو جنرل منیجر کی ذمے داریاں سنبھالنے پر بھی کچھ رضامند کرلیا تھا۔ وہ چاہتے تھے میں زیادہ مستعد اور فعال' نئے زمانے کے خیالات رکھنے والے نوجوان اور باصلاحیت لوگوں کو اپنے ساتھ رکھوں۔

وہ منصوبہ میرے شاہ عالم بننے کے ساتھ ہی سرد خانے میں چلا گیا تھا۔

اب میں نے مصروفیت کے نئے امکانات پر غور کیا تو مجھے اس کمرشل پلازا کا پھر خیال آیا مگر میں نے پرانے جوش و خروش کا فقدان محسوس کیا۔ مجھے اس وقت خان اعظم کی رہنمائی اور مشاورت حاصل تھی اور چندا کے نئی اپج رکھنے والے خیالات بھی منصوبے کا حصہ تھے۔ اس کے بیشتر مشورے پہلے قطعی غیر سنجیدہ ہوتے تھے خصوصاً اس وقت جب میں سنجیدگی سے کام میں اپنے آپ کو بھی بھول جاتا تھا۔ وہ نہایت مضحکہ خیز تجاویز کے ساتھ رخنہ اندازی کرتی تھی لیکن جیسے جیسے منصوبہ ایک قطعی شکل اختیار کرتا گیا' اس کے مشورے مفید اور کارآمد ثابت ہونے لگے۔

آج صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی۔ مجھے کمرشل پلازا کھڑے کرنے کی ضرورت ہی غیر ضروری نظر آئی۔ آخر کیا ہوگا اس سے؟ ساڑھے چھ کروڑ بڑھ کے دگنے ہو جائیں گے پھر کیا ہوگا؟ پھر میں دوسرا اس سے بھی بڑا تعمیراتی منصوبہ ہاتھ میں لوں گا اور اور دولت بڑھتی جائے گی۔ کسی خودرو پودے کی طرح مگر کیا ہے دولت۔ ایک مقصد یا ذریعہ؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حصولِ دولت اگر مقصد ہو جائے تو ہوس کی سرحدیں نہیں آتیں۔ آدمی سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے کر کے ہیرے اور زمرد کے پہاڑ بنانے کی فکر میں پڑ جاتا ہے لیکن دولت ایک ذریعہ ہو کسی انسانی مقصد کو حاصل کرنے کا۔ جس میں تسکین کا سامان ہو' خوشی ہو' عظمت ہو اور عزت ہو۔ تو دولت ضرور ہونی چاہیے لیکن مصرف نہ ہو تو دولت محض اعداد و شمار کا نام ہے۔

دوپہر کے دو بجے تک میں نے ضروری کام نمٹا لیے تھے اور اب مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تیمیں مارخان کے ساتھ کسی اچھے ہوٹل میں جانے سے یہ بہتر سمجھا کہ فرید عباسی کے گھر چلا جاؤں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تیمیں مارخان کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ خود بھی اسی منزلِ شوق کا مسافر تھا۔

خلافِ توقع عباسی کے گھر میں صرف اس کی ماں کو دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی "میں تو آیا تھا کھانا کھانے مگر یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔"

انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا "کیوں' کھانا نہیں ہے' میں نہیں ہوں لڑکے؟"

میں نے خفت سے کہا "آپ تو ہیں۔"

"صاف کہہ دے تاکہ رخشی سے یا فرید سے ملنے آیا تھا۔ مجھ سے ملنے کے لیے آنے کی کسی کو کیا ضرورت ہے۔"

میں نے انہیں منانے کے لیے کہا "کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اب کھانا تو خیر کھا کے ہی جاؤں گا۔ خواہ آپ کو اٹھ کے پکانا پڑے۔"

"فرید کے لیے نہیں پکاتی تھی کیا؟ جب وہ پولیس میں تھا اور کوئی وقت نہیں تھا اس کے آنے جانے کا" وہ بولیں "اور اس سے پہلے' اللہ ان کی مغفرت کرے' فرید کے شہید والد کا بھی ایسا ہی حال تھا۔"

میں ان کے ساتھ کچن میں پہنچ گیا "ویسے یہ رخشی کہاں گئی ہے؟"

"آفس" انہوں نے مختصراً کہا "گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگی تھی۔ مجھ سے کب تک باتیں کر کے وقت گزارتی۔ فرید کے ساتھ اس کے آفس میں کام کرتی ہے۔ کہتی ہے قانون بھی پڑھوں گی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر آئندہ کے ارادے کیا ہیں؟"

"کس کے ارادے؟"

"آپ کے' فرید کے اور رخشی کے؟"

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ارادوں سے کیا ہوتا ہے بیٹا۔ سوچی میں بھی وہی ہوں جو تمہارے دماغ میں ہے مگر فرید نہیں مانتا۔"

"آپ اپنی بات نہیں منوا سکتیں اس سے' کمال ہے؟"

"بات منوائی تھی ایک بار۔ اس نے مان لی تھی بڑی سعادت مندی سے لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟"

میں نے کہا "اب ضروری تو نہیں کہ ہر بار قسمت کا فیصلہ آپ کے خلاف ہی ہو۔"

"اسی لیے میں دخل نہیں دے رہی ہوں۔ فرید خود یہ فیصلہ کرے گا وہ ٹھیک ہو گا۔"

"اس کا فیصلہ میں بتا سکتا ہوں آپ کو اور آپ کہیں تو۔"

"نہیں۔ ابھی اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پہلے ہی بتایا تھا تمہیں کہ وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا جس سے رخشی بدظن ہو کے یہاں سے چلی جائے۔ یہاں وہ محفوظ سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔"

میں نے کہا "رخشی کے بدظن ہونے کا سوال ہی نہیں۔ آپ کا اتنا تجربہ ہے۔ کیا آپ اس کی نظر نہیں پہچانتیں؟"

"تو کھانا کھا۔ جلدی مت کر۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا اپنے وقت پر اور دوسروں کی بات وہ کرے جس نے خود کچھ کیا ہو۔ کہاں ہے وہ تیری چندا۔ میں بھی تو دیکھوں اور دیکھنا کیا۔ مجھے اس کے دادا سے ملوا۔ کون ہے وہ کرنل خان' ایک ملاقات میں فیصلہ کر کے آتی ہوں میں۔"

میں نے نوالہ اپنے حلق میں اٹکتا ہوا محسوس کیا۔ رخشی نے اور فرید عباسی نے انہیں میرے بارے میں سب بتا دیا تھا اور سیاستِ زمانہ کی الٹ پھیر کو نہ سمجھنے والی اس عورت نے بس اتنا سمجھا کہ اچھا یہ ناصر عظیم ہے۔ میں بھی شاہ عالم ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھاگ جانا چاہیے۔"

"ارے لڑکے۔ کھانا تو ڈھنگ سے کھا لے۔" وہ مجھے روکتی رہ گئیں۔

میں باہر آیا تو تیمیں مارخان کا کہیں پتا نہ تھا۔ اسے میں نے پچھلے حصے میں سرونٹ کوارٹر کے سامنے دریافت کیا جہاں فی الحال وہ گھاس کھا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے تنکا چبانا موقوف کیا "صاب' آپ خوراک نہیں کھاتی؟ ابھی ام انتظار کرتی' وہ امارا خوراک لاتی۔"

"ابے خوراک کے گھوڑے۔ یہ گھوڑے کی خوراک کھا رہا ہے۔ یہ کافی نہیں؟ اور کتنی دیر ہے تیرے اسپیشل محبوبی لنچ میں؟"

اس وقت چھوٹی نمودار ہوئی اور میں نے تیمیں مارخان کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے اور اس کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے مزید کچھ دیر انتظار کرنا منظور کیا۔

میں فرید عباسی کے آفس میں ایک بار پہلے بھی جا چکا تھا اور وہاں اس کے کزن فیصل نے شاہ عالم کو بے عزت کر کے ایک پرانا حساب برابر کیا تھا۔ کیا وہ اب بھی مجھے شاہ عالم ہی سمجھے گا اور اس کا رویہ وہی ہو گا؟ یہ سوال اتنا اہم نہیں تھا جتنا اس کا یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ طلاق دینے کے بعد میں اپنی سابق بیوی سے کیوں ملتا ہوں۔ کس رشتے سے ملتا ہوں اور اس کے دفتر میں آ کے کیوں ملتا ہوں۔

اس کا فیصلہ میں نے خود رخشی اور فرید عباسی پر چھوڑنا بہتر سمجھا کہ وہ فیصل کو صورتِ حالات کی اصل تصویر کیسے دکھاتے ہیں۔ اس کا مجھے ناصر عظیم ماننا ضروری ہو گا کیونکہ وہ پہلے سے شاہ عالم کے خلاف اپنے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات رکھتا ہے۔

اتفاق سے سہ پہر کے وقت وہاں نہ فرید تھا اور نہ اس کا کزن فیصل۔ میں نے آفس کے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا تو مجھے رخشی نظر آئی جو ایک ٹائپ رائٹر پر بڑے اناڑی پن کے ساتھ انگلیاں مار رہی تھی۔

"کہاں ہو تم آخر؟" اس نے شکوہ کیا۔

میں نے کہا "میں تمہارے۔ میرا مطلب ہے تمہارے اور فرید کے گھر سے ہی آ رہا ہوں۔ معلوم ہوا کہ آپ گھر میں اس کے بغیر بور ہوتی تھیں۔"

"کوئی کام نہ ہونے سے بور ہو گئی تھی" اس نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ ایک ہی بات ہے۔ اب یہاں بھی اس کا ساتھ ہے تو ظاہر ہے بوریت کا کیا سوال۔" میں نے کہا "دل تو لگانا پڑتا ہے کہیں نہ کہیں۔ مگر مجھے کیا۔"

اس نے فوراً جوابی حملہ کیا "ابھی ابھی مجھے بھی پتا چلا ہے کہ کل سے تم شبنم کے ساتھ تھے۔ مجھے پوری رپورٹ ملی ہے رئیس سے۔ رات بھی اس نے وہیں گزاری۔ تمہارے ساتھ۔"

"OBJECTION" میں نے کسی وکیل کی طرح کہا "یہ الزام ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں ہمارے ساتھ تھی۔ رئیس بھی تھا وہاں۔"

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے کمینہ صفت کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہو گا

اپنے باکریا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار لاہور ☎7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال

نسبت روڈ چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ معنی خیز طریقے پر مسکرائی "ہاں۔ ایک ہی بات ہے پھر صبح منہ اندھیرے تم دونوں فرار ہوئے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر، مگر مجھے کیا؟"

میں نے ہاتھ بڑھایا "او کے۔ سیز فائر۔"

رخشی نے مجھ سے ہاتھ ملایا "ہم ویسے بھی لڑ کہاں رہے تھے۔"

میں نے کہا "دونوں وکلا کزن کہاں غائب ہیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ اندر قدم رنجہ فرماتے ہی فیصل کا سامنا ہوگا تو شاہ عالم کیا جواب دے گا اس کے شرعی اور قانونی اعتراض کا کہ طلاق کے بعد جو عورت حرام ہوگئی تم پر اس سے یہاں مل کے مجھے بھی رسوا کرانا چاہتے ہو؟ گیٹ آؤٹ۔"

رخشی نے کہا "ہم نے اسے قائل کرلیا ہے کہ تم وہ نہیں۔"

"اور وہ مان گیا آسانی سے۔ ایک وکیل۔"

"آسانی سے تو نہیں، کافی جھوٹ بولنا پڑا" وہ مسکرائی۔

میں نے ہنس کے کہا "مجھ سے زیادہ جھوٹ نہیں بولا ہوگا تم نے۔ میں تو ساری رات شبنم کو قائل کرتا رہا کہ میں وہی شاہ عالم ہوں مگر اب ناصر عظیم بننے پر مجبور ہوں۔"

"اور وہ مان گئی، آسانی سے۔ ایک صحافی۔"

"میں نے منوا کے چھوڑا۔ بڑا خطرناک کام تھا مگر میری خداداد ذہانت کام آئی۔ میں نے ناصر عظیم کے ماضی کو شاہ عالم کے حال سے ملا دیا۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی میں نے کہا کہ سیاست میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے میں ناصر عظیم ہی تھا۔ مگر میرا ماضی کچھ باعث شرم تھا میرے لیے چنانچہ میں شاہ عالم کے نام سے پبلک کے سامنے آیا۔ اپنی اصل کے بارے میں آج بتاتا ہوں۔ شبنم کے اور شاہ عالم کے تعلقات زیادہ پرانے نہیں تھے۔"

"ہاں۔ چار پانچ سال سے وہ بلا بن کے ایس کے اعصاب پر سوار ہوئی تھی۔ جان ہی نہیں چھوڑتی تھی کسی طرح۔"

میں نے کہا "اب میں تمہیں محبت کا فلسفہ کیا سمجھاؤں۔ کہتے ہیں جس کو عشق، ظل ہے دماغ کا۔ شبنم کے دماغ میں بھی تھا۔ اب معاف کردو اسے۔ حسد کی وجہ ہی باقی نہیں رہی ہے۔"

"ہاں۔ کم سے کم میرے لیے۔ وہ بلا تم نے اپنے سر لے لی ہے تو اپنی خوشی اور مرضی سے۔"

میں نے کہا "ایسے طعنے مت دو۔ کیا میرے حالات کی مجبوری تم پر واضح نہیں؟ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے اور آج صبح ہم فائق علی سے ملنے گئے تھے اور کہیں نہیں۔"

"یہ فائق علی کون ہے تمہارا۔ یا اس کا؟"

چائے پیتے ہوئے میں نے اسے صبح سے اب تک کی مصروفیت کے بارے میں بتایا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔

"پھر اب کیا ارادے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں کہ اپنا وہی پروجیکٹ پھر شروع کردو۔ کچھ مصروفیت بھی ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "اور آمدنی بھی۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔ تو بات یہ ہے رخشی کہ اپنے سارے اثاثے دیکھ کے مجھے یہ جدوجہد بھی لاحاصل لگتی ہے کہ انہیں دگنا کرلوں پھر چار گنا۔ آخر کیا کروں گا میں قارون کا خزانہ اکٹھا کرکے؟"

"بھئی لوگ کیا کرتے ہیں دولت مند ہوکے، عیش کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "عیش کا مفہوم میرے ذہن میں کبھی وہ نہیں رہا جو ایک عیاش سمجھے جانے والے شخص کے لیے ہوتا ہے۔ میں کنسٹرکشن کمپنی ضرور وہی رجسٹر کرالیتا ہوں لیکن پروجیکٹ وہ نہیں رکھوں گا، کمرشل پلازا یا کنسل۔"

"پھر کیا بناؤ گے؟ غریبوں کے لیے گھر۔ فقیروں کے ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ جہاں انہیں کام سکھا کے کار آمد شہری بنایا جائے۔ کوئی یتیم خانہ؟"

میں نے میز پر ہاتھ مارا "ونڈر فل۔ تمہارا دماغ تو قابل قدر اور ریجنل اور حیرت انگیز آئیڈیاز سے بھرا پڑا ہے۔ اگر میں کبھی تمہیں ناقص العقل عورت ذات کہوں تو مجھے یہ بات یاد دلانا۔ میں شرمندہ ہونے کی کوشش کروں گا۔"

"مگر عورت کے بارے میں اپنے نظریات نہیں بدلوں گا" وہ طنز سے بولی۔

"بھئی تاریخی حقائق اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہیں یہ نظریات۔ پھر بھی۔ میں تمہیں ایک EXCEPTION کی رعایت دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کیا چاہیے تمہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے رخشندہ بیگم کہ پرانے وقتوں کے لوگ تو فیض کے اسباب یہی سمجھتے کہ پل بنا مسجد و تالاب بنا چاہ بنا۔"

"یہ چائے بنانے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"چاہ کہتے ہیں کنوئیں کو۔ اب پل بناتی ہے گورنمنٹ۔ کنوئیں کی تلاش شہر میں لوگ صرف ڈوب مرنے کے لیے کرتے ہیں۔ مسجدیں چندے سے بنتی ہیں اور بنتی رہتی ہیں۔ کبھی مکمل نہیں ہوتی کوئی مسجد۔ رہے تالاب تو وہ اب فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ہیں اور سوئمنگ پول کہلاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے تو صرف ایک کام سوچا تھا کہ کمال اسپتال میں لگایا جائے اپنا سرمایہ۔ اب تم کرنل خان کو دیکھو، اس عمر میں اپنے پاس پنشن کی آمدنی کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ چندا کی فکر اللہ پر چھوڑ دی ورنہ لوگ تو اگلی سات نسلوں کے لیے اکٹھا کرکے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔"

رخشی نے مجھ سے اتفاق کیا "ایک عام سی بات ہے۔ ہر بیٹے کا ایک کارخانہ، الگ کوٹھی کار، پھر پوتے نواسے ہوں تو ان کے نام پر الگ بزنس۔"

"میں اپنی ذات کو دیکھوں تو میرے لیے وہ بہت ہے جو پہلے سے میرا ہے اور پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے۔ جتنا میں خرچ کرسکتا ہوں، اس سے زیادہ کمالینا کیا مشکل ہے میرے لیے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال فاروقی سے مل کے طے کیا جائے کہ اسپتال کو مزید ایک دو وارڈ فوری طور پر درکار ہیں یا کلاتھ وغیرہ۔ مثلاً میں سی ٹی اسکینر منگوا سکتا ہوں۔ ایم آر آئی مشین بھی ہونی چاہیے اور دونوں کام بھی کرسکتا ہوں اگر وہ کہے۔"

"یہ تمہارے لاشعور میں چندا کو متاثر کرنے کی خواہش تو نہیں ہے۔"

"فرض کرو ہے۔ تم بڑی ماہر نفسیات ہو۔"

وہ بولی "میں مذاق کررہی تھی، سوری!"

"ابھی ابھی تم نے میرے لیے مثبت سوچ اور امکانات کے روشن دروازے کھول دیئے ہیں۔ ایک بات میں بالکل بھولا ہوا تھا کہ میں ایک یتیم تھا اور آج بھی میرے جیسے لاکھوں ہوں گے جو بالکل ویسے ہی حالات سے گزر رہے ہوں گے۔ میں سب کے لیے کچھ کرنا چاہوں تو کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی "ایک یتیم خانہ بناؤ گے تم۔"

"ہاں۔ یہ لفظ بہت عجیب لگتا ہے یتیم خانے کے لیے۔ ماڈل یتیم خانہ۔ ایک مثالی یتیم خانہ۔"

"کیا ضروری ہے کہ اسے یتیم خانہ ہی کہا جائے۔"

"حد ہوگئی" میں نے کہا "اتنی سی دیر میں دوسری ذہانت کی بات؟ آخر میری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔"

"شاید شبنم اس سوال کا جواب دے سکے۔"

"میری آنکھیں کھول دی ہیں تم نے۔ یہ بہت اہم نفسیاتی نکتہ ہے۔ ساری دنیا میں پہلے گونگے بہرے اور نابینا بچوں کو معذور کہا جاتا تھا۔ اب انہیں اسپیشل چلڈرن کہا جاتا ہے۔ بوڑھوں کو زیادہ باعزت طریقے پر سینئر سٹیزن کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے احساس محرومی کا نہیں

SELF RESPECT کا اعتماد آتا ہے۔ ایدھی نے لاوارث لوگوں کے لیے جو پناہ گاہ بنا رکھی ہے، اس کا نام ہے "اپنا گھر" اس میں اپنائیت ہے۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک میں جیل بھی اصلاح خانہ ہے۔ خصوصاً بچوں کے لیے مگر یہاں اب بھی بچہ جیل ہے اور وہاں وہی ہوتا ہے جن کے لیے جیل خانے عقوبت خانے کہلاتے ہیں۔ تو میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں یتیم بچوں کی رہائش، تعلیم و تربیت کے لیے الگ ادارہ بناؤں گا جس کا نام ہوگا "بچوں کا گھر۔"

"ویری گڈ۔ مجھے یہ نام اچھا لگا۔"

"اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ ایک ہی جگہ پانچ سو ہزار بچوں کے لیے کوئی ادارہ قائم کرنا مناسب ہوگا یا پانچ بڑے شہروں میں پانچ چھوٹے ادارے۔"

"دوسری صورت یقیناً بہتر ہے کہ ہر علاقے کے بچے ایک مثالی ادارے کے فوائد حاصل کریں۔"

میں نے کہا "غور کرنے پر مجھے تمہاری یہ بات بھی ذہانت پر مبنی لگتی ہے۔ خیر ایسا ہوتا ہے کبھی۔ جیسے کرکٹ میں ہیٹ ٹرک ہوجاتی ہے۔ مسلسل تین عقل کی باتیں ایک عورت کرسکتی ہے۔"

"ویسے تو آپ کیا اور آپ کی یہ سند کیا مگر ایسا ہوا ہے کبھی کہ اپنے ہم جنس مرد کو آپ نے ایسے خراج تحسین پیش کیا ہو۔ مسلسل تین بار اس کے عقلمند ہونے کا اعتراف کیا ہو؟"

میں نے سوچ کے کہا "خاتون۔ مرد کی ذات ایسی اسناد کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بھینس روز دودھ دیتی ہے تو اس کی تعریف کی ضرورت نہیں کہ واہ کیا کمال کیا ہے۔ گھاس کھائی اور اسے تبدیل کردیا ایسے اجلے سفید دودھ جیسی مکمل غذا میں لیکن بیل ایک بار بھی دودھ دے۔ میرا خیال ہے کہ مثال غلط ہوگئی۔ یا فرض کرو کوئی بھینس گلاب کیوڑے کی خوشبو والا دودھ دے۔"

رخشی ہنسنے لگی "آگے بات کرو، مثال کو چھوڑو۔"

میں نے اپنی خودی کو پھر بلند کیا "بات یہ ہے کہ معاشرے کو ترغیب کی ضرورت بھی ہے۔ کوئی اچھا کام ہو اور اس کے اچھے نتائج سامنے آئیں تو دوسروں کو بھی خیال آتا ہے اور رس کو یا سو کو خیال آتا ہے تو ایک کو عمل کی توفیق بھی ہوتی ہے۔ پانچ بڑے شہروں میں ایک مثالی قسم کا بچوں کا گھر ہوگا تو پریس اور پبلک واہ واہ بھی کرے گی اور آہ آہ بھی۔ آہ ان یتیم خانوں کی حالت پر جن کے حالات دردناک شرمناک، عبرت ناک ہیں اور خود بخود ایک موازنہ ہوگا معاشرے میں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید انہیں بھی شرم آئے۔ یہ توقع رکھنا خواب پرستی کہلائے گا کہ پھر سب یتیم خانے ویسے ہی ہو جائیں گے لیکن حالات میں تھوڑی سی بہتری آجائے' میرے نزدیک چالیس پچاس فیصد بہتری تو تقدیر بدل دے یتیموں کی۔ دس بیس فیصد سے ہی ان کے لیے زندگی آسان ہو جائے گی۔ ایک اور فائدہ بھی ہے۔ فرض کرو میں بچوں کا گھر صرف لاہور میں قائم کرتا ہوں تو بلاشبہ یہاں کے مخیر اور دل میں انسانیت کا درد رکھنے والے اصحاب آگے آئیں گے اور اس کارِ خیر میں عملاً شریک ہونے والے بھی مل جائیں گے لیکن پانچ صوبائی کیپٹل ہوں جہاں یہ کام شروع کیا جائے تو صوبائی حکومتوں کا تعاون الگ حاصل ہوگا اور مقامی سرپرست' رضاکار اور ہمدرد الگ ملیں گے۔"

رخشی نے کہا "اب پاکستان میں کون سے پانچ صوبے ہیں؟"

"مجھے امید تھی تم سے اس سوال کی۔ بی بی' پانچواں صوبہ نہ سہی۔ یتیم تو آزاد کشمیر میں بھی ہیں۔ شاید بلحاظ مناسب وہاں یتیم کیے جانے والے زیادہ ہیں۔ ملک کے چار صوبوں میں ایک خاندان کا سربراہ قتل ہوتا ہے تو وہاں چار گھروں کے سربراہ بھارتی گولہ باری کے نتیجے میں شہید ہوتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں۔"

"ہمارے ملک میں بدقسمتی سے صوبائیت کی بنیاد پر سیاست کرنے والے انسانی فلاح میں بھی کوٹے کا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ عمران خان کے شوکت خانم میموریل اسپتال کا معاملہ دیکھو' یہ پاکستان کے لیے باعثِ فخر ہوگا کہ ایشیا کا سب سے بڑا کینسر اسپتال اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہم بنا رہے ہیں لیکن منفی سوچ رکھنے والوں کی زبان کون پکڑے جو کہتے ہیں کہ یہ عمران خان کا ذاتی پبلسٹی اسٹنٹ ہے۔ اسپتال تو پنجاب میں بن رہا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ وہاں علاج سب کا ہوگا اور مفت ہوگا۔ ڈومیسائل' شناختی کارڈ' ویزے شزے دیکھے بغیر۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو بولنے کا موقع ہی کیوں دوں۔"

"اس کام میں مجھے ضرور شامل رکھنا بلکہ مجھے ہی آگے رکھنا اپنے ساتھ" رخشی نے کہا۔

"پتا نہیں میں کیا خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کی تعبیر بھی ملے گی یا نہیں۔ یہاں صرف نیت کی بات نہیں۔ رکاوٹوں کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ خیر' اب دیکھو میں نے بیٹھے بیٹھے دو پروجیکٹ اناؤنس کر دیئے اور تم نے صرف ایک کپ فضول سی چائے پلائی ہے۔"

رخشی نے گھنٹی کا بٹن دبا کے چپراسی کو بلایا اور اسے کافی بنانے کے لیے کہا "یہ جو بچوں کا گھر ہوگا' مجھے اس میں بڑی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ تم چاہو تو پوچھ سکتے ہو کہ میرے لاشعور میں احساسِ محرومی تو نہیں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اسے عورت کی فطرت میں ودیعت کیے جانے والے مامتا کے جذبے کی آواز کہوں گا۔"

"ناصر۔ کیا اس سے دوسرے بہت سے بچوں میں احساسِ کمتری اور محرومی پیدا نہیں ہوگا؟ وہ خود کو زیادہ بدقسمت نہیں سمجھیں گے؟ جو ہمارے اس ماڈل یتیم خانے میں بھی جگہ نہ پا سکیں۔ ہم تمہارے حساب سے دو سو کو رکھیں گے بچوں کے گھر میں۔ یا چار سو کو۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں۔ ہم جادو کی چھڑی گھما کے سب کی تقدیر نہیں بدل سکتے لیکن ایک روشن پہلو یہ بھی ہے اس مثال کا' کچھ نہ کرنے سے تھوڑا کرنا بھی بہتر ہے اور ہم تو اس امید میں ایک کام کریں گے کہ دوسروں کو خدا توفیق دے۔ وہ بھی ہماری مثال پر عمل کریں۔ یہ مثال ایک تحریک بھی بن سکتی ہے۔"

"بچوں کے گھر میں کیا ہوگا؟"

"وہ سب ہوگا جو گھر میں بچوں کے لیے ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ محبت اور شفقت' اچھی تعلیم و تربیت۔ تفریح' خود اعتمادی اور ایک اچھے مستقبل کی امید۔ تم نے یہ آئیڈیا دے کے مجھے بھی عمران خان کی طرح سوچنے کی راہ پر لگا دیا ہے۔ یہ جذبہ اب میرا OBSESSION بن جائے گا۔"

"جنون کے بغیر خوابوں کو تعبیر کہاں ملتی ہے؟" وہ بولی۔

"میں اس منصوبے کو اس کی وسعت کے تناظر میں دیکھتا ہوں تو یہ کام مجھے اپنے حوصلے اور اپنی استطاعت اور بساط سے بڑھ کے لگتا ہے جس کے لیے شاید میری عمر طبعی بھی ناکافی ہو۔ اس کی کوئی LIMIT یا انتہا نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ بچوں کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔"

"مثلاً UNICEF۔"

"میں افراد کی بات کر رہا تھا۔ اداکارہ آڈرے ہیپ برن۔ لیڈی ڈائنا۔ ایسے بہت سے نام ہیں۔ میں ان کے ساتھ اپنا نام تاریخ میں لکھوانا نہیں چاہتا۔ اتنا ہی بہت ہوگا اگر میں کچھ کر سکوں۔ کچھ بچوں کے لیے' چنانچہ سردست میں تمہارے تیسرے آئیڈیا کو مسترد کرتا ہوں۔ سوری' التوا میں رکھتا ہوں۔"

"کون سا تیسرا آئیڈیا؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم خود بھول گئیں۔ تم نے فقیروں

کے لیے ایک ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے فقیروں میں رہ کے ان کے حالات کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ یہ مسئلہ معاشی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔ اس سے پہلے کئی بار حکومت نے بھیک مانگنے کی لعنت کو معاشرے سے ختم کرنے کے لیے قوانین بنائے اور بھکاریوں کو پکڑا۔ جیلوں میں ڈالا اور انہیں کام پر لگانے کی کوشش کی مگر وہ خود حکومت کے لیے دردِ سر بن گئے۔ کوئی کام کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ کچھ کام کیے بغیر مانگ کے کھانا ان کی فطرت بن گیا تھا اور پھر کام کرنے کے مقابلے میں بھیک مانگنا زیادہ منافع بخش دھندا تھا۔ اب تو خیر یہ ایک صنعت ہے۔ پیشہ ور بھکاریوں کی مافیا ہے۔"

"یعنی تم ان کی طرف سے مایوس ہو؟"

"ہاں۔ وہ کچھ سیکھیں گے نہیں اور کریں گے نہیں۔ انہیں روکنے والے اور ہمارے کیے کرائے پر پانی پھیرنے والے بہت ہوں گے۔ ہمارا وقت ہماری محنت اور ہمارے وسائل ضائع ہوں گے۔ کامیابی کا تناسب ایک فیصد یا دس فیصد بھی ہو تو کیا ضرورت ہے ایسے کام میں ہاتھ ڈالنے کی۔ یہی وقت' محنت اور سرمایہ دوسری طرف کہیں زیادہ اطمینان بخش نتائج کا ضامن ہو سکتا ہے۔"

"اس کام کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"بالکل ٹھیک کہتی ہو تم۔ معاشرے میں بہت سے کام توجہ طلب ہیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں ہاتھ بھیک نہ مانگیں۔ کام کرتے نظر آئیں لیکن انسانی تاریخ کا یہ المیہ سب سے پرانا ہے۔ گداگری اور جسم فروشی۔ تاریخ کے کسی دور میں یہ شرمناک پیشے کوئی فلاحی مملکت بھی ختم نہیں کر سکی۔ یورپ اور امریکا کی خوشحالی کو دیکھو اور وہاں تعداد دیکھو بھیک مانگنے والوں کی اور طوائفوں کی۔ انتہا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے نابالغ بچے معمولی عیاشی کے لیے یہ کام کرتے ہیں۔ ضرورت الگ چیز ہے جو آدمی سے گناہ اور جرم سب کراتی ہے۔ تمہاری کال کا شکریہ۔ میں اب چلتا ہوں۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں روانگی اختیار کرتا فون کی گھنٹی بجی اور رخشی نے ہیلو کے بعد لیس کمہ کے ریسیور میری طرف بڑھا دیا "تمہاری مس شعلہ ہیں۔"

میں نے ریسیور لے کے کہا "کون مس شعلہ!"

شبنم نے کہا "تم یہاں بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارا فون سننے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔"

"یہ تمہاری ایکس وائف تھی جس نے مجھے مس شعلہ کہا تھا؟"

"ایکس وائی زیڈ۔ میری کسی قسم کی وائف نہیں ہے ابھی تک خوش قسمتی سے۔ یہ بتاؤ مجھے تلاش کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"اچھی اور بری دونوں خبریں ہیں مگر فون پر نہیں بتاؤں گی۔ تم یہاں آجاؤ۔ آزاد صاحب بہت یاد کر رہے ہیں تمہیں۔"

میں نے فریادی لہجے میں کہا "یا میرے مولا۔ کیا چلبلی کسی مکینک کو خاطر میں نہیں لا رہی ہے۔"

"اس کا تو مجھے پتا نہیں۔"

"شبنم۔ اس چوپائے نے جس کو تمہارے مجازی ابا گاڑی سمجھ کے چلاتے ہیں' مجھے دو کوڑی کا کر دیا ہے۔ کوئی عزتِ نفس رکھنے والا مکینک بھی اس کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ خواہ وہ بے کار ہو' کتنے دھکے لگائے ہیں میں نے اسے۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ تم بھی اس زمانہ قبل از تاریخ کی مخلوق کو گاڑی سمجھتی ہو۔ قسم خدا کی کسی دن بم ساتھ لے کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہم سب کی دنیا کو ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو' آزاد صاحب کو بتا دو ذرا۔"

میں نے فوراً ریسیور رکھ دیا اور رخشی کو خدا حافظ کہہ کے باہر نکل آیا۔

ابوبکر آزاد صاحب کی جان سے پیاری راج دلاری چلبلی ان کے درِ خاص پر ایسے کھڑی تھی جیسے میری راہ تک رہی ہو۔ اس پر جتنی گرد جمع تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم سے کم ایک ہفتے سے وہ ساکت ہے۔ گھنٹی بجا کے سب سے پہلے میں نے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے اس بے زبان کو ایک لات ماری۔ اس کے اندر سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی پرزہ ٹوٹ کے گرا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کرنٹ لگا۔ اندر گونجی گھنٹی نہیں بجی مگر میری آواز پر آزاد صاحب نمودار ہوئے۔

"آؤ میاں شہزادے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بڑی دیر کی گویا۔ مہرباں آتے آتے مگر برخلاف اس کے وہ بھی خوب کہا ہے گویا کسی نے کہ دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو۔"

میں نے کہا "آدمی کو اس کی قضا خود بلاتی ہے آزاد صاحب۔ اس برقی گھنٹی سے تو بہتر ہے آپ الیکٹرک چیئر رکھ دیں ملاقاتیوں کے لیے۔"

وہ ہنسے "بھئی وہ بھی دلِ سوختہ کی طرح جل کے خاک ہوئی گویا مگر ہمیں پتا چل جاتا ہے ملاقاتی کے آنے کا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری صدا میں بھی بڑا درد تھا۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھا اور فرش پر لڑھکنے سے بچا۔ اس کی ایک ٹانگ پولیو کی ماری ہوئی لگتی تھی۔ "شبنم نے بتایا کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ تو اس سلسلے میں پہلے میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے عرض کردوں کہ۔"

"بھئی وہ عرض وغیرہ تم کرتے رہنا گویا۔ سردست ہمارے لیے کچھ کرو' ہم بہ سبب معذوری کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

میں نے کہا "ایسی کیا معذوری ہے آزاد صاحب۔ خدا نخواستہ آپ مفلوج نہیں ہیں۔ اللہ نے صورت جیسی دی وہی ہے۔ گنج آپ پہلے بھی تھے۔ کانے آج بھی نہیں ہیں پھر صورت نہ دکھانے کا سبب؟"

انہوں نے عالم خفگی میں اِدھر اُدھر دیکھا اور میری بدقسمتی کہ چھڑی انہیں قریب ہی مل گئی "یہ۔۔۔ یہ کس نامعقول نے کہا ہے گویا۔" انہوں نے میری ٹانگوں پر چھڑی مار کے کہا "کہ ہم بدشکل ہوگئے ہیں۔۔۔ بولو۔"

میں نے کہا "حضرت' آپ ابھی کیا فرما رہے تھے بقلم خود۔"

"ہم معذوری کی بات کررہے تھے۔ یہ کب فرمایا ہم نے کہ ہم منحوس صورت ہیں گویا۔ بھئی اصل سبب ہے چلبلی کی علالت۔ جب ایک عدد سواری نہیں ہوتی ہمارے پاس تو صورت ہم کیسے دکھائیں گے کسی کو۔ کہیں آنے جانے کے قابل ہی نہیں ہوں گے تو کیا خواب میں دیکھیں گے لوگ ہمیں۔۔۔ گستاخ" انہوں نے ایک اور چھڑی ماری۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اچھا جناب! ابھی دیکھ لیتا ہوں میں آپ کی بلبل خوش نوا گل نوبہار حسینہ طرح دار آپ کی شریک حیات چلبلی کو لیکن پہلے یہ فرمایئے کہ مجھے کیا صرف مکینک کے طور پر بلایا گیا تھا۔"

وہ ایک آہ بھر کے میرے پاس والے صوفے پر گر گئے۔ "اصل واقعہ کچھ اور ہے عزیزم۔ وہ کیا فرما گیا ہے ظالم نامی شاعر گویا کہ جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے' کیونکہ شرافت و مروت علم و فضل اور وضع داری کے پیکر استاد مکرم کا جنازہ جارہا ہے گویا۔"

میں نے کہا "کس کی بات کررہے ہیں آپ؟ کون مرگیا ہے؟"

شبنم جیسے پردے کے پیچھے ہی موجود تھی کہ جواب دینے اندر آگئی "بہت برا ہوا ناصر۔ آج صبح ہم جس ریڑ ماسٹر سے ملے تھے۔۔۔"

ایک اندیشے سے میرا دل دھڑکا "ہاں۔۔۔ کیا ہوا اسے؟"

"وہ آزاد صاحب کا بھی استاد تھا۔"

"آزاد صاحب نے آسمان کی طرف دیکھ کے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ "جماعت چہارم و پنجم میں درس اسلامیات دیتے تھے مرحوم۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے گویا دو چار برس کی بات نہیں۔"

"مرحوم۔۔۔ ان کا انتقال ہوگیا۔۔۔؟" میں نے کہا۔

شبنم دیوار کا سہارا لیے کھڑی رہی "انہیں قتل کردیا گیا ہے۔ قنفس سے کسی رپورٹر نے بات کی تھی۔ وہ فوٹوگرافر کے ساتھ تصویر بنانے جارہا تھا۔ میاں بیوی کی لاشیں الگ الگ کمروں میں چھت کے پنکھوں سے لٹک رہی تھیں۔"

"او مائی گاڈ۔ یہ کب کی بات ہے؟"

شبنم نے کہا "دوپہر کے بعد کا واقعہ ہے۔ خود رپورٹر کو زیادہ معلوم نہیں تھا۔ کسی نے اخبار کے دفتر میں فون کیا تھا۔ اسے اپنے اخبار کا فوٹوگرافر نہیں مل رہا تھا۔ اس نے آزاد صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کہیں ASSIGNMENT پر بھیجا ہے اسے۔ آزاد صاحب بہت افسردہ ہوئے' جب میں نے بتایا۔"

میری نظر میں ابھی تک صبح کی ملاقات کا منظر گھوم رہا تھا "وہ ہماری وجہ سے مرگیا شبنم۔۔۔!"

"ایسا مت کہو میاں فاتح اعظم۔ سب کوئی کیسے بن سکتا ہے کسی کی رحلت کا گویا۔ وہ تو بس ہر شخص کو ایک وقت پر اللہ میاں بھیج دیتے ہیں دنیا میں اور جیسے ایک محکمے سے دوسرے میں جاتے ہیں لوگ۔ کیا کہتے ہیں اسے گویا۔"

"DEPOTATION پر" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں' خوب یاد دلایا۔ تو اس جہاں سے اور عدم سے وجود میں گویا ہم تم آتے ہیں ڈیپوٹیشن پر۔ پیریڈ پورا ہوتے ہی محکمے والے واپس بلا لیتے ہیں۔ تو ایسے ہی اللہ میاں کرتے ہیں۔ بس انہیں پتا ہوتا ہے کہ کسے کب واپس آنا ہے۔۔۔ وقت پورا ہوا تو گویا واپس جانا لازمی۔ تم کیسے ذمے دار ہوئے گویا۔۔۔ لیکن وہ بدقماش اولادِ خر' سود خور کون تھا؟ اس کا کچھ تعلق ہو سکتا ہے استاد مرحوم کے قتل سے۔"

میں نے سوچ کے جواب دیا "جی۔ ہو سکتا ہے۔ وہ پکڑا جائے گا انشاء اللہ۔"

"ویسے تو ماشاء اللہ سے اپنے پولیس کے اہلکار بھی فنکار ہیں گویا۔ ہاتھی کو مار مار کے کاکروچ بنادیں اور اس سے اعتراف کرالیں کہ درحقیقت وہ مگرمچھ ہے۔ لیکن ہماری دلی خواہش ہے کہ اس گستاخ حرام کمانے والے افغان کی

تشریف گاہ پر ایک روپیہ فی ضرب کے حساب سے تیرہ نمبر پاپوش سے پانچ ہزار حملے کے جائیں گویا۔"

میں نے کہا "ایسا ہی ہوگا۔ نام تو نہیں معلوم اس کافر حلیہ دیکھا تھا۔"

"پھر تو مشکل ہے گویا" وہ مایوس ہوگئے "میاں بیالیس سال میں اپنے قائد ملت کے قاتل نہیں پکڑے گئے گویا۔ تو ایک پرائمری ٹیچر کا قتل چہ معنی دارد۔ جہاں ہاتھی مرجائے اور سراغ نہ ملے برخوردار وہاں حشرات الارض کے مرنے کا کیا ہے۔ خیر' تم بہ عجلت تمام اپنی پُرشفقت مہارت سے چلبلی کو راضی کرو میاں انجینئر صاحب۔"

میں نے خفگی سے کہا "کیا۔۔۔ ابھی۔۔۔ اسی وقت۔"

انہوں نے پھر چھڑی اٹھائی "اور کیا اگلے ہفتے۔۔۔ آئندہ ماہ۔ آنے والے سال تک انتظار کرے گی وہ تمہاری نظرِ کرم کا گویا۔ ابھی جانا ہے تمہیں جنازے میں شرکت کے لیے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا مگر انکار کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے دھول مٹی صاف کرکے چلبلی کا بونٹ اٹھایا اور اسے ایک لوہے کی سلاخ پر استوار کیا۔ یہ تین فٹ لمبا سریا بونٹ کے اندر ہی پھنسا دیا جاتا تھا۔ انجن میں سرڈال کے میں نے ایک نظر تاروں پر ڈالی ہی تھی کہ ایک دھماکا ہوا اور مجھ پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ سلاخ ہلنے سے توازن قائم نہ رہا اور بونٹ میرے سر پر آگرا۔ مجھے چوٹ زیادہ نہیں آئی تھی مگر پس منظر میں آزاد صاحب کا قہقہہ سن کے مجھے طیش آگیا۔ میں نے چلبلی کو اور اس کے موجد کو گالی دی "ملعنت ہے اس نظفہ ناتحقیق پر اور اسے بنانے والوں پر۔"

آزاد صاحب چھڑی بدست میرے بہت قریب تھے۔ انہوں نے خفگی سے چھڑی میری ٹانگوں پر ماری۔ "کیا۔۔۔ چلبلی کو کیا کہا۔۔۔ نظفہ ناتحقیق گویا۔۔۔؟"

میں نے جھلا کے کہا "اور کیا کہوں۔۔۔ کچھ پتا نہیں اس کے شجرۂ نسب کا۔ کب بنی تھی اور کیوں بنی تھی؟ کمپنی سے اس کی ولدیت ثابت نہیں ہوتی۔"

انہوں نے مجھے پھر چھڑی سے نوازا "فاتح اعظم نہیں ابوجہل ہونا چاہیے تمہارا نام گویا۔"

میں نے کہا "میرا نام فاتح عالم نہیں' ناصر عظیم ہے۔"

انہوں نے پھر چھڑی ماری "ایک اور ثبوت گویا جہالت کا۔۔۔ مطلب کیا ہوا تمہارے اس نام کا۔ وہی جو ہم نے فرمایا۔ شجرۂ نسب ہم سے پوچھو چلبلی کا۔ اس قدر عجیب الطرفین خاندانی سواری کے ساتھ بدتمیزی' یہ ٹیٹ کا رہے اٹلی کی۔ FIAT-500 ماڈل سن پچاسی۔۔۔"

میں نے کہا "آپ یہ کیا سوسنار کی مار رہے ہیں۔ ایک لوہار کی ماریئے۔ اندر سے لٹھ اٹھالایئے اور ٹانگیں توڑ دیجیے۔"

"لٹھ۔۔۔ یعنی ہم لٹھ بردار ہیں؟ اخبار کا مدیر جس کی طاقت ہوتی ہے قلم میں گویا۔ اس پر تہمت کہ لاٹھی رکھتا ہے۔۔۔ ویسے لاٹھی ہی چاہیے تمہارے لیے گویا۔ کیا فرمایا ہے وہ اپنے اکلوتے شاعرِ مشرق نے۔۔۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر۔"

میں نے پھر بونٹ کو سریے پر ٹکا کے زیادہ احتیاط سے انجن کا جائزہ لیا اور اِدھر اُدھر بہت سے تار دیکھے۔ شبنم میری ہدایت پر وقفے وقفے سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے ڈسٹری بیوٹر کیپ کو کھولا اور اس کا روٹر نکال کے دیکھا۔ اس پر کاربن تھا۔ ریگ مال دستیاب نہیں تھا۔ میں نے پیٹرول کے چند قطرے ٹپکا کے اس کو سگریٹ کے پیکٹ کے کھردرے گتے سے رگڑا اور پھر ڈسٹری بیوٹر کیپ لگا کے شبنم سے کہا تو سیلف کے گھومتے ہی انجن سوتے سوتے غرا کے جاگ اٹھا۔

آزاد صاحب کی مسرت دیدنی تھی۔ انہوں نے ہمیں فرطِ محبت سے گلے لگایا اور تین بار عید ملے "میاں اللہ نظرِ بد سے بچائے گویا۔۔۔ تم جینئس ہو۔ اپنے ڈاکٹر قدیر سے بڑے سائنس داں ہو۔ آئن اسٹائن ہوتا تو ہم اسے کہتے ضرور کہ تمہاری شاگردی کرے گویا۔۔۔ ابھی تو ہم چلتے ہیں۔"

کسی تیاری کے تکلف کے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو میں نے سریا نکال کے پھر اندر ایک مخصوص جگہ میں پھنسایا اور بونٹ بند کیا "اس انجینئر کو اجرت میں چھ ڈنڈے مارے آپ نے۔ اس کے لیے شکریہ۔"

وہ بلخ کی طرح ہنسے "یعنی کم ہے اُجرت گویا۔ آگے نامیاں مکینک کی اوقات پر طنز مت کرو ہم پھر حساب برابر کردیں گے' بشرطِ زندگی چھ اوں۔"

شبنم نے کہا "ایسے ناسا کے سائنس دانوں کی طرح خلا میں مت گھورتے رہو' خلائی شٹل پرواز کرگئی۔ اندر آجاؤ۔"

"کاش وہ سچ مچ پرواز کرکے خلا میں چلی جائے اور مختلف خلائی سیاروں کے ساتھ گھومتی رہے۔"

شبنم ہنسی "امریکی اور روسی اسپیس سینٹر میں سیاروں کی نگرانی کرنے والے پریشان ہوتے رہیں گے کہ یہ نیا سیٹلائٹ کہاں سے آگیا۔"

"صورت شکل میں ویسی ہی لگے گی چلبلی!" میں نے کہا "تم نے بری خبر سنادی۔ اب اچھی خبر بھی سنادو تاکہ میرا بلڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشنار مل ہو جائے۔"

"پہلے ہاتھ دھولو۔ میں نے چائے بنانی ہے۔ کچھ سینڈوچ ایجاد کرنے باقی رہ گئے ہیں۔ مائیک بھی آتا ہوگا" وہ کچن میں جا کے بولی۔

"مائیک یعنی مائیکل۔ تمہارا وہ افلاطونی محبت کرنے والا چرہ ساز۔ وہ تمہیں کہاں مل گیا" میں نے سنک میں ہاتھ دھوئے۔

شبنم نے کہا "وہ آزاد صاحب سے عقیدت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی ان کو اپنے شعر سنانے آجاتا ہے۔ بک۔ وقت دو زبانوں میں بعض اوقات تین زبانوں میں۔"

"اف۔ آج کا دن واقعی بھاری ہے مجھ پر۔ ایک کے بعد ایک مصیبت نازل ہو رہی ہے مجھ پر۔ ابھی پبلی سے جان چھڑائی تو اب شعر۔ وہ بھی تین زبانوں میں اور تمہارے ایجاد کردہ سینڈوچ۔ اللہ میری مغفرت کرے۔"

"یہ بالکل نئی ترکیب سے بنا رہی ہوں میں۔ ایک رسالے میں پڑھی تھی۔"

میں نے کہا "یہ دیکھ لیا تھا کہ ترکیب کے بعد کوئی نوٹ نہیں تھا۔ مثلاً یہ کہ انہیں وصیت نامہ مرتب کرنے کے بعد یا کسی اسپتال کے آئی سی یو کی ٹیبل پر کلمہ پڑھنے کے بعد کھائیں۔"

"اچھا فضول باتیں مت کرو۔ نہیں کھانا تو مت کھاؤ۔"

میں نے کہا "ناراضی کی کیا بات ہے اس میں۔ آدمی کو اپنا اطمینان کر لینا چاہیے کچھ بھی کھانے سے پہلے۔ اب اگر وہ کوئی تاریخی مضمون تھا تو ممکن ہے مصنف نے ریسرچ کر کے بتایا ہو کہ سولھویں صدی میں سیاسی قیدیوں کو سزائے موت دینے کے لیے یورپ کے قید خانوں میں یہ سینڈوچ بھی استعمال ہوئے۔ یا افریقہ کے آدم خور جنگلی قبائل اپنے رقیبوں اور دشمنوں کی تواضع ایسے کرتے ہیں۔"

وہ مسکراتی رہی اور اپنے کام میں مصروف رہی پھر کسی نے گلی میں ایک دل خراش چیخ ماری تو اس نے میری طرف دیکھا "جاؤ دروازہ کھولو' مائیک آگیا۔"

"یہ مائیکروفون کی چیخ تھی؟ وہ آیا ہے یا گزر گیا؟"

"جا کے اسے اندر لاؤ' ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔"

"اسٹریچر کہاں ہے؟" میں نے کہا "کیا پتا وہ مرا پڑا ہو الیکٹرک شاک سے۔ یہ تمہارے آزاد صاحب نے اچھا طریقہ نکالا ہے۔ گھنٹی کی آواز نہیں تو نہ سہی' باہر سے گھنٹی بجانے والے کی چیخ تو سنائی دے گی۔"

مائیک کو دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ وہ دراز قد اور سیاہ فام تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس سال ہوگی مگر وہ پچاس سے زیادہ کا لگتا تھا۔ اس کے پاس سے مجھے شراب کی بُو آئی۔ شراب کا رنگ اس کی آنکھوں میں بھی چمکتا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ شراب نوشی نے اس کی صحت کو کس حد تک تباہ کر دیا ہے۔ اس کے سر کے بال اڑ چکے تھے۔ بس کناروں پر ایک جھالر سی باقی رہ گئی تھی۔ اس کی داڑھی ایک بالشت ہوگی مگر داڑھی کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ وہ جینز کی پتلون اور لال رنگ کی چست اسپورٹس شرٹ میں ملبوس تھا۔ دونوں چیزیں لنڈا بازار کے کسی فٹ پاتھ سے اٹھائی گئی تھیں۔ شرٹ پر سامنے لکھا تھا "سکس ڈالر مین۔"

اس نے مجھے سیلیوٹ کیا "سوری۔ ابھی الیکٹرک شاک سے اپنا مغز ٹھکانے نہیں ہے۔ رانگ نمبر ہو گیا۔"

وہ پلٹنے لگا تو میں نے کہا "مسٹر مائیکل!"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "ہولی مدر۔ تم ہمارا نام جانتا ہے لیکن تم وہ نہیں ہے۔ تم فزی نہیں ہے۔ مسٹر آزاد۔"

میں نے کہا "یہ ابوبکر آزاد صاحب ہی کا گھر ہے۔ پلیز کم ان' شبنم آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ میرے علاوہ۔"

اس نے اندر آ کے مجھ سے ہاتھ ملانے میں بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا "ونڈر فل۔ ونڈر فل۔ شبنم نے میرج بنا لیا تم سے۔ اس کا واسطے ایسا ہی ہسبینڈ ہونے کو مانگتا۔ ہینڈسم مین۔"

میں نے دروازہ بند کیا "میں صرف اس کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ میرا نام ہے ناصر عظیم۔"

وہ بیٹھ گیا "جرنلسٹ۔ فائن۔ ڈونٹ یو تھنک کہ آئی ایم ڈرنک۔ اپنا مغز میں اتنا کرنٹ بھر گیا۔ وٹ ڈیم پلش بٹن۔ ابھی تم ایک تار میرا رائٹ کان میں لگاؤ' دوسرا لیفٹ کان میں۔ بلب جلے گا۔ سو واٹ کا لائٹ ہوگا۔"

چائے کا سامان پہلے ہی میز پر موجود تھا۔ شبنم ایک ٹرے میں سینڈوچ کے ساتھ نمودار ہوئی "گڈ ایوننگ مائیک۔"

وہ کھڑا ہو گیا "یس۔ اے ویری گڈ ایوننگ۔ بیوٹی فل ایوننگ کیونکہ تمہارا بیوٹی ہے ایوننگ میں۔ مورننگ اینڈ نائٹ۔ اٹ از یور بیوٹی آن دی ٹائم۔"

"اوکے اوکے مائیک۔ کئی بار سن چکی ہوں یہ ڈائیلاگ۔"

"ڈائیلاگ۔" وہ افسردہ نظر آنے لگا "میں فلم نہیں دیکھتا۔ یو نو۔ یہ اوریجنل اسکرپٹ تھا۔ خیر' ہم نیا لکھے گا تمہارے لیے۔"

"مائیک' یہ میرے فرینڈ ہیں۔"

"یس۔ ہم مل چکے ہیں۔ مسٹر نوسر۔ عجیب۔ میں نے ایسا نام نہیں سنا۔"

شبنم مسکرائی "نو سر عجیب نہیں' ناصر عظیم۔"

"یس۔ ویری سوری سر۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "میں جوک نہیں کرنا چاہتا تھا ہرگز۔"

میں نے کہا "میں نے برا نہیں مانا مسٹر مائیک۔"

"نہیں۔ تم سمجھتا ہوگا ہم DRUNK۔ نو۔"

میں نے کہا "کرنٹ لگنے سے بجلی بھر گئی ہے آپ کے سر میں۔"

"اوہ۔ میں سکس ڈالر مین ہوں۔ بہت سستا' گھٹیا آدمی۔ ایک سکس ملین ڈالر مین تھا۔ میں صرف سکس ڈالر۔ ویری چیپ۔ ویسے میں اسپرٹ سے چلتا ہوں۔ اس وقت الیکٹرک سے کام کر رہا ہوں۔ دو سو بیس وولٹ۔ یو سی مسٹر نوسر۔"

شبنم نے اسے ڈانٹا "یہ لو۔ بلیک کافی پیو۔ تاکہ تمہارا نشہ اترے۔"

"یس۔ بلیک کافی۔ بلیک مین مائیک کا قسمت بلیک۔ اور وہ بھی بلیک۔ کرتوت۔ مگر دیکھو' یہ نشہ نہیں ہے۔ کرنٹ دو سو بیس وولٹ ایک گھنٹا ہمارا باڈی میں بھر گیا۔" وہ بلیک کافی پینے لگا۔

میں اس انسانی نمونے کو حیرت اور عبرت سے دیکھتا رہا جو شبنم کا بے غرض اور بے ضرر پرستار تھا۔ اسے قدرت نے ایک عام انسان سے بڑھ کر اپنی صلاحیت سے نوازا تھا مگر اس نے ہوش و حواس کو بھی شراب میں ڈبو دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کا نشہ بالکل اتر گیا تو وہ بڑی روانی سے انگریزی بولنے لگا۔ اس کا رویہ اور لہجہ سب بدل گیا۔

"تم کو ایک کام کہوں میں تو کرو گے؟" شبنم نے کہا۔

"ہمیشہ پوچھتی ہو' کبھی کہہ کے دیکھو۔ مرڈر کر نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہوں لیکن تم پہلے ہی کر چکی ہو۔"

"شٹ اپ۔ تم ایک اچھے میک اپ مین ہو۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "پاسٹ ٹینس میں بات کرو۔ میں ایک اچھا میک اپ مین تھا۔ سب سے اچھا' باقی سب میرے شاگرد تھے۔ ڈفرز' میک اپ نہیں کرتے۔ آدمی کا چہرہ بگاڑتے ہیں۔"

"اچھا سنو۔ تمہیں ان کی مدد کرنی ہے۔ ان کا چہرہ میک اپ سے بدلنا ہے ایسے کہ پہچانا بھی جائے لیکن آسانی سے نہیں۔"

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیر نگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | محصول ڈاک 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے ''خفیہ ہاتھ'' کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے والے سا ستدانوں کی شرمناک داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "میں وضاحت کرتا ہوں۔ میں ایک نئی زندگی کا آغاز نئے نام اور نئی شخصیت کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسے کارآمد TIPS دو کہ کسی کو تبدیلی کا احساس بھی نہ ہو اور میں بدل جاؤں۔ ضرورت پڑے تو خود اپنا چہرہ بدل سکوں' کیا یہ ممکن ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموشی سے میری صورت دیکھتا رہا "آف کورس۔ سب ممکن ہے مگر ایک سوال پوچھوں گا میں۔"

"یہ کہ میں ایسا کیوں کرنا چاہتا ہوں' مجبوری کیا ہے؟"

"ہاں۔ آدمی جب چھپ کے اور چھپا کے کچھ کرتا ہے' تو کسی ڈر سے کرتا ہے' کسی کے ڈر سے کرتا ہے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ پوری کہانی میں نہیں سناؤں گا۔ ٹائم نہیں ہے میرے پاس اور تمہارے لیے بھی بے کار ہے۔ میں تمہیں جھوٹ سنا کے بھی مطمئن کر سکتا ہوں مگر مختصر اور سیدھی بات یہ ہے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور کچھ لوگ مجھ سے یہ حق چھیننا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ان کا کوئی نقصان نہیں کیا ہے۔"

"پھر کیا۔ وہ شوقیہ۔ صرف تفریح کے لیے تم کو ELIMINATE کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے ہاتھ سے گردن صاف کرنے کا اشارہ کیا "اس میں کوئی فائدہ ضرور ہوگا ان کا۔"

"اوکے۔ میں زیادہ SPECIFIC بات کرتا ہوں۔ یہاں کچھ لوگ ہیں جو ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا' ہنستے ہنستے دہرا ہوگیا۔ "ہاؤ فنی۔ کچھ لوگ! مسٹر نوسر۔ یہ کام تو اکثریت کر رہی ہے۔ کچھ لوگ نہیں کر رہے ہوں شاید ورنہ سب کر رہے ہیں۔"

"پلیز میری بات سن لو۔ ورنہ جاؤ۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "وہ میرے ذاتی دشمن نہیں ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ غداری کر رہے ہیں۔ ذاتی فائدے کے لیے' ڈالرز کے لیے۔ اس وطن کی میراث بیچ رہے ہیں۔"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ "تم فلاسفیکل جذباتی ایٹیٹ ہو۔"

"ہاں۔ بعض معاملات میں ہونا پڑتا ہے۔ ہم غیرت میں قتل کر دیتے ہیں کیونکہ اس وقت ہم عقل سے کام نہیں لے سکتے۔ ایک مثال لو۔ تمہارے پاس اپنے آباؤ اجداد کی کوئی نشانی ہو' فرض کرو کوئی حویلی۔"

"فرض کرنے کی بات نہیں۔ میرے دادا کی حویلی تھی۔ سچ مچ کی شاہانہ حویلی۔ جیسی فلموں اور تصویروں میں نظر آتی ہے مگر میں ایک گندے تاریک کمرے میں کرائے پر رہتا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "فرض کرو کہ آج بھی تمہارے پاس ہوتی وہ حویلی۔ اور تمہارا کوئی ملازم یا پڑوسی۔ اس کی ایک ایک چیز چپکے چپکے بیچ رہا ہوتا۔ تم کو معلوم نہ ہوتا اور اس کی اینٹیں تک نکال لیتا' تصویریں' ظروف' تاریخی چیزیں۔"

"میرے گرینڈ گرینڈ پا کی تلوار اور گرینڈ پا کی پگڑی جو سونے کے تاروں سے بنی تھی اور دادی کا پاندان اور میرے باپ کا ہاتھی دانت کے کام والا عصا جس کے سہارے وہ اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ چلتا تھا اور میری ماں کے گلے میں لٹکنے والی صلیب جو خالص سونے کی تھی۔"

شبنم نے کہا "مائیک کے دادا پردادا مسلمان اور مغل تھے۔"

مجھے ایک ذہنی صدمہ سا ہوا "اچھا۔۔۔ پھر تم۔"

وہ بولا "یہ مجھے اپنے باپ سے پوچھنا ہوگا اوپر جا کے۔ قیامت والے دن۔ کہ ایسا ظلم کیوں کیا اس نے مجھ پر۔ خیر' میرے پاس وہ سب نہیں ہے آج جس کے لیے میں جذباتی ہوتا ہے۔ مگر وہ سب کوئی چوری کرتا اور بازار میں بیچ دیتا تو میں اسے قتل ضرور کرتا۔"

میں نے کہا "اب تم سمجھ گئے ہو۔ میں کسی کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ اس چوری کو روکنا چاہتا ہوں اور چونکہ انہیں معلوم ہوگیا ہے کہ مجھے چوری کا پتا چل چکا ہے اس لیے وہ مجھے ختم کیے بغیر اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ میں قانون کی مدد نہیں لے سکتا اور کہیں رپورٹ یا شکایت نہیں کر سکتا۔"

"چوری کی رپورٹ کرنے کے لیے تمہیں چوروں کے پاس جانا پڑے گا اور وہ بھی ماریں گے تمہیں۔ کہیں گے تم چور ہو" وہ سر ہلا کے بولا "میں سمجھ گیا تمہاری مجبوری۔ دیکھو' میک اَپ ایک عارضی دھوکا ہوتا ہے۔ ابھی تم داڑھی مونچھ لگا کے سکندر اعظم' سوری۔۔۔ مغل اعظم بن سکتے ہو مسٹر نوسر۔ یس سر' تم پھولن دیوی بن سکتے ہو یا جو کہ۔۔۔ لیکن وہ ایک سین یا ایک فلم کا رول ہو سکتا ہے' لائف کا نہیں۔ اس کے لیے چہرے کو خود بدلنے دو' قدرتی طور پر۔"

میں نے حیرانی سے کہا "میں سمجھا نہیں مسٹر مائیکروفون۔"

وہ ہنسنے لگا "میں مائیک ہوں۔"

"میں بھی ناصر ہوں' نوسر نہیں" میں نے کہا۔

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "یہ اچھا ہے۔ میں تم کو نوسر کہوں گا' تم مجھے مائیکروفون کہو۔ سمجھنے کی کون سی بات ہے اس میں۔ شیو کر کے تم بال نہیں آنے دیتے چہرے پر۔ آنے دو' پندرہ بیس دن میں تمہاری ذاتی داڑھی ہوگی۔ اصلی۔۔۔

اور اس کے ساتھ مونچھیں مفت۔ ہاہاہا' داڑھی کے ساتھ مونچھ مفت۔ آج کل یہی ہوتا ہے ہر اشتہار میں۔"

"ویٹ از کوائٹ این آئیڈیا!" میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"ایک مہینے صبر کرو' چھپ کے بیٹھو کہیں اور قدرت کو اپنا کام کرنے کا ٹائم دو۔ پھر تم کو آئینہ بھی نہیں پہچانے گا۔ اپنا ہیئر اسٹائل بدلو' اگر اوپر سے بال غائب کر دو' ایک خوب صورت چمک دار گلوب ہو تمہارا سر۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے' گنجا نظر آنے کا کوئی مصنوعی طریقہ نہیں ہے کیا؟"

اس نے مجھے بہت سے آسان اور سستے طریقے بتائے جن سے آدمی خود اپنی صورت چند منٹ میں بدل سکتا تھا "ایک کٹ KIT رکھ سکتے ہو تم اپنے ساتھ جس میں ایسی ہی چیزیں ہوں گی۔ کچھ سلوشن۔ کچھ ADHESIVES۔ کلر جو واش ہو سکتے ہیں اور ایسے جو پانی سے خراب نہیں ہوتے۔ تم اپنی ناک چوڑی اور اونچی کر سکتے ہو۔ دانت سونے کا بنا سکتے ہو۔ اپنے جبڑے اٹھا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کنٹیکٹ لینز ہیں ہر رنگ کے۔ آنکھوں کا رنگ بدلنے کے لیے۔ سر کی ایک جھلی ہوتی ہے جس سے آدمی کا سر صاف نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "تم یہ کٹ مجھے فراہم کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ ہر چیز ملتی ہے دنیا کے بازار میں اور یہ سب تمہارے پاس ہو اور ذہانت ہو تو پرابلم۔ دس شناختی کارڈز رکھو۔ دس پاسپورٹ۔ یہاں سب بہت آسان ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا ابھی میں تمہارے سامنے اوریجنل صورت میں ہوں اور میں نے سارا دن ایسے ہی پھرنے کا رسک بھی لیا تھا لیکن مجھے جانا ہے ایک ایسی جگہ جہاں خطرہ زیادہ ہے۔ بتاؤ' میں کیا کروں؟"

"میں کیا بتاؤں' میرے پاس اس وقت کچھ نہیں" اس نے اپنے خالی ہاتھ ہلا کے کہا "ذہانت تمہارے پاس ہے تو استعمال کرو۔"

"میرے پاس تجربہ نہیں ہے۔ جو تمہارے پاس ہے' کوئی کمال دکھاؤ۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے شبنم سے پوچھا کہ اس کے پاس میک اَپ کا کیا سامان ہے؟ گھر میں اور کیا ہے۔ شبنم نے اسے بہت سی چیزیں فراہم کر دیں۔ ان میں گوند' سیاہی' ہلدی اور آٹے جیسی چیزیں بھی شامل تھیں۔

"تم کو تھوڑا گندہ لگے گا اور عجیب بھی مگر یہ کام چلانے کے لیے ہے۔ تم منہ دھو کے یا نہا کے سب واش کر سکتے ہو۔ شبنم ایک قینچی اور کنگھا بھی لاؤ۔"

وہ مجھے کرسی پر بٹھا کے کسی ہیئر ڈریسر اور بیوٹی شن کی طرح کام کرنے لگا۔ اس نے میرے بالوں کو درمیان سے تقسیم کیا اور انہیں گوند سے سیٹ کیا۔ سامنے اور سائڈ میں آئے گوند میں ملا کے سفید بالوں کا گچ دیا پھر اس نے میرے سر کے پچھلے حصے سے بہت چھوٹے بال کاٹے اور انہیں میرے ہونٹوں پر ایسے چپکا دیا کہ ہلکی سی مونچھیں بالکل اصلی نظر آنے لگیں۔ اس نے میرے چہرے کا رنگ تبدیل کیا اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر سے ان کی ساخت میں تبدیلی کے اثر کو نمایاں کر دیا۔ شبنم دیکھتی رہی اور ہنستی رہی۔

آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا تو اس نے مجھے فائنل ٹچ دے کے آئینہ پکڑا دیا "اب دیکھو مسٹر نوسر۔ یہ تم ہو یا کوئی اور ہے؟"

میں چند لمحے حیرت سے دم بخود آئینے کو گھورتا رہا جس میں ایک اجنبی صورت نظر آ رہی تھی پھر مجھے بھی ہنسی آئی "تم بلاشبہ باکمال آدمی ہو۔ مسٹر مائیکروفون۔"

اس نے رکوع کے انداز میں سر جھکا کے شکریہ ادا کیا "اور کیا کر سکتا ہوں میں تمہارے لیے؟"

مجھے اس کی مالی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اپنی لاابالی غیر ذمے دارانہ فطرت کے باعث اس کے پاس مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں تھا اور جو تھوڑا بہت وہ کبھی کبھار ملنے والے کام سے کماتا تھا' اس کا بھی بیشتر حصہ شراب کی نذر ہو جاتا تھا۔ میں نے اسے دو ہزار دینے کی کوشش کی تو اس نے بہت شور کیا۔

"او نو سر۔ یہ میں نہیں لے سکتا۔ یہ تو شبنم نے مجھ سے کہا اور اس کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے مگر یہ تم نے میرے لیے کیا ہے۔" مجھے اس کے انکار میں حقیقت سے زیادہ لحاظ' شرم اور تکلف کا شبہ ہوا۔

بالآخر شبنم نے کہا "مائیک۔ پلیز لے لو' یہ میرا حکم ہے۔"

"حکم ہے؟" اس نے بے بسی سے کہا "ایسا حکم تو ظلم ہے مائیک پر مگر اسے ماننا پڑتا ہے۔ وہ شبنم کو انکار نہیں کر سکتا۔ پیسہ کیا چیز ہے۔۔۔ دنیا میں جو ہے محبت ہے" اس نے دو ہزار لے اور جیب میں ٹھونس لیے۔

شبنم نے کہا "احتیاط سے رکھو' راستے میں ہی مت گرا دینا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "اور وہ میک اَپ کٹ۔ مجھے جلد چاہیے۔ کیا اس کے لیے میں کچھ رقم ایڈوانس دے دوں؟"

شبنم نے کہا "ہم مائیک کے پاس جائیں گے تو کٹ کا کیا ہے' ساتھ جا کے سب لے لیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ اس کو ایڈوانس دینے کے حق میں نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ وہ غیر ذمے دار تھا اور اسے شراب کی لت تھی۔ شاید وہ دو دن میں سب اڑا دیتا اور بھول جاتا۔

اس کے جاتے ہی میں نے شبنم سے کہا "اب تم کیا کرو گی؟"

"مجھے کیا کرنا ہے' تم بتاؤ۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔ میں نے تو میک اَپ کر لیا لیکن صبح تم بھی میرے ساتھ تھیں۔ خیر' تم پیچھے ٹھہرنا۔"

"تم اس نالائق علی سے کیا پوچھو گے۔ اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ بتا دے گا تمہیں؟ اعترافِ جرم کر لے گا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے ایک فیصد شبہ نہیں اس کے قاتل ہونے پر مگر یہ بات ابھی دوسرا کوئی شخص نہیں جانتا۔"

اس نے سوچ کے کہا "اچھا ایک منٹ ٹھہرو' میں آتی ہوں۔"

وہ دس منٹ میں لوٹ کے آئی تو اس نے بغل میں ایک برقع دبا رکھا تھا۔ "یہاں ایک خالہ بنا رکھی ہیں میں نے۔ ایک بیوہ بیٹی کے ساتھ رہتی ہیں۔ اوباش لوگوں نے پریشان کیا تھا انہیں تو میں نے ان کی مدد کی۔ اب بھی خیال رکھتی ہوں۔ وہ جانتی ہیں کہ میں صحافی ہوں' بھیس بدل کے بھی جانا پڑتا ہے مجھے۔ ان سے مانگ کے لائی ہوں یہ برقع۔ ان کی بیٹی کا ہے" اس نے ہنستے ہنستے بتایا۔

"بہترین۔ عورتوں کے لیے روپوشی واقعی کتنی آسان ہے۔ کوئی مائی کا لال نقاب اٹھا کے چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔"

میں نے تیس مار خان کو شاہ عالمی گیٹ میں کفایت بلڈنگ سے بہت پہلے ہی رخصت کر دیا۔ وہ میری وضع قطع اور میرے ساتھ ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کے دم بخود تھا مگر میں نے اس کے پہلے سوال پر ہی ایسا حوصلہ شکن رویہ اختیار کر لیا تھا کہ اس کے تجسس کے جذبات نے دم توڑ دیا۔

آدھا کلو میٹر کا فاصلہ ہم نے پیدل طے کیا اور آگے پیچھے کفایت بلڈنگ میں داخل ہوئے۔ رات کے آٹھ بجے تک پولیس بھی ضابطے کی کارروائی سے فارغ ہو گئی تھی اور مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دہرے قتل کی اس واردات میں مقدمہ درج کیے بنا چارہ نہیں تھا چنانچہ نامعلوم قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر درج کر لی گئی تھی اور معمول کے مطابق پولیس پوری "سرگرمی سے تفتیش کر رہی ہے۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے" والی صورتِ حال پر آ کے بات ٹھہر گئی تھی۔ ایک غریب پرائمری اسکول ٹیچر کے گھر میں چوری ڈکیتی کی نیت سے آنے والوں کو موردِ الزام ٹھہرانا مشکل تھا۔ درہم و دام اپنے پاس کہاں۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ چنانچہ ذاتی دشمنی کا نظریہ اخبار والوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی تھا۔

ماسٹر کے گھر میں دروازے کے باہر زنانہ جوتے چپل پڑے تھے اور اندر آٹھ دس عورتیں دری پر بچھی سفید چاندنی پر غم گسار بنی بیٹھی تھیں۔ جہاں زینہ ختم ہوا تھا۔ وہاں چھ سات فٹ کی راہداری سی تھی۔ ساتھ ہی میں فائق علی کے دروازے پر مردانہ چپل اور جوتے پڑے تھے۔ میں نے جوتے اتار کے بڑی قرات کے ساتھ غمگساروں کو السلام علیکم کہا اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ فیکا ایک اچھے ہمسائے کی حیثیت سے بہت مستعد تھا اور بے حد مغموم نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہاں سب ہی لوگ اجنبی ہیں یا پھر ان کی باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ میرے دائیں جانب ایک کھچڑی داڑھی والا شخص گھٹنوں میں سر دیئے مسلسل ہل رہا تھا۔ دوسری طرف ایک ہٹا کٹا سر منڈا جوان شخص تھا جو بار بار اپنے سر پر ہاتھ پھیر کے ٹھنڈی سانس لیتا تھا اور کہتا تھا "واہ میرے مولا!"

میں نے اس سے کہا "بڑا افسوس ہوا ماسٹر کا سن کے" پھر میں نے رسم کے مطابق ماسٹر کی دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔

منہ پر ہاتھ پھیر کے میں نے کھچڑی داڑھی والے سے کہا "مرحوم کے عزیز' رشتے دار تھے یہاں' انہیں خبر مل گئی؟"

اس نے سر ہلایا "میں ہوں جی اس کا داماد۔ شیخوپورے سے آیا ہوں۔"

"میں شاگرد ہوں ان کا۔ اسکول میں دس سال پڑھا مرحوم سے" میں نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ تمام حاضرین محفل سن لیں۔

اس کے ساتھ ہی مرحوم کی ذات کی اعلیٰ صفات کا ذکر

پھر شروع ہو گیا۔ اس وقت بھی وہاں ماسٹر کے تین شاگرد موجود تھے مگر وہ سب زیادہ عمر کے لوگ تھے۔ انہوں نے مجھے واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا مگر میرے بیان کی صحت پر شک کا اظہار کسی نے نہیں کیا اور نہ مجھ سے یہ پوچھا کہ میں نے کس زمانے میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی اور دسویں کب پاس کی تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ماسٹر کی عمر کس اسکول میں علم کے خزانے لٹاتے گزری تھی۔ تیس سال سے بچے وہی پڑھ رہے تھے اور ماسٹر وہی پڑھائے چلے جا رہے تھے۔ نہ نصاب بدلا تھا نہ طریقۂ تعلیم۔ چپلی دوسری کے بچے دیسی اسکولوں میں آج بھی حساب پڑھتے تھے تو کورس میں پہاڑے گاتے تھے "اک دونی دو۔ دو دونی چار" پہلے ایک لڑکا لٹک لٹک کے کہتا تھا پھر باقی کورس میں اس کا ساتھ دیتے تھے اور ماسٹر کرسی پر بیٹھا اونگھتے ہوئے 'پیریڈ گز' رد یتا تھا۔ فرق پڑا تھا تو صرف اتنا کہ اب بچے لکڑی کی گاچی (ملتانی مٹی) والی تختی پر سرکنڈوں کے خط والے قلم سے خوش خطی نہیں سیکھتے تھے۔ سیاہی کی دواتیں انگلی سے لٹکا کے ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔ سلیٹ پر حساب کے سوال حل نہیں کرتے تھے اور غلط لکھے کو مٹانے کے لیے سلیٹ پر ماسٹر کی نظر بچا کے تھوک کر قمیص کے دامن سے صاف نہیں کرتے تھے اور پکڑے جانے پر مرغا نہیں بنائے جاتے تھے۔ بچے اب "بابا بلیک شیپ" پڑھ رہے تھے۔ بال پوائنٹ اور پین استعمال کر رہے تھے۔ لکھے کو مٹانے کے لیے قیمتی 'امپورٹڈ' کارٹون کی شکل والے اور خوشبودار ریزر استعمال کر رہے تھے مگر علم وہی تھا جس میں لاعلمی زیادہ تھی۔

مجھے معلوم ہوا کہ مرنے والے کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اور داماد صاحب کے افسوس میں ماسٹر کی موت کے غم کا تناسب بہت کم تھا۔ یہ افسوس زیادہ تھا کہ مرحوم نے پہلے تو اصول پرستی میں ٹیوشن پڑھائی نہیں اور آج جب ماسٹر اسکولوں میں نہیں پڑھاتے' گھروں پر ٹیوشن لیتے ہیں تو دروازے پر کاغذ چپکا کے مطمئن ہو گئے کہ اب علم کے پروانے اس شمع آگہی کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

"بس جی' پیسے کو سمجھا ہی نہیں کہ آج کل' اللہ معاف کرے' اسی کی خدائی ہے۔ پبلسٹی کا زمانہ ہے جی۔ کوئی پوسٹر مونوگرام لگاتے۔ جگہ جگہ دیواروں پر لکھواتے' کھمبوں پر بورڈ ٹانگتے اور یہاں لگاتے بہت عالی شان بورڈ۔"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوتا؟"

وہ چمک کے بولا "ہوجی اس سے یہ ہوتا کہ پرانے شاگرد جو اتنی عزت کرتے تھے ماسٹر کی' اپنے بچوں کو لاتے ٹیوشن کے لیے۔ ہزار ہزار لے رہے ہیں ماسٹر آج کل لیکن اپنے ماسٹر صاحب نے کچھ نہیں کیا اور فائدہ کیا ہوا؟ بس ایک دو کمروں کا یہ فضول سا گھر جو ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے لیا تھا' بس وہی ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اندر کچھ بھی نہیں۔"

زبان سے اظہار نہ کرنے کے باوجود اس کے دل کی پکار از خود سنی جاتی تھی کہ کاش اس کے سسر نے کوئی کوٹھی چھوڑی ہوتی۔ گھر ہوتا تو اس میں اسباب بھی بھرا ملتا۔ ٹی وی' فریج' وی سی آر بھی ہوتے' گاڑی نہ سہی۔ ایسے کنگال سسر کے جینے کی خوشی کیا اور مرنے کا غم کیا۔ بس صبر کرنا پڑے گا اسی فضول سے مکان پر۔

ہمسایہ ماں جایہ۔ یعنی بھائی فائق علی نے بڑی مستعدی سے اندر آتے جاتے اعلان کیا کہ سوگ کا کھانا آج تو اس کا حق ہے۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کے رنگین چوکور ڈبوں والے لمبے دسترخوان کو پھیلا دیا گیا اور مرحوم کی خوبیاں گنانے والے اور ان کے غم میں نڈھال سوگواران ایسے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور یوں بوٹیوں کی فرمائش کرنے لگے جیسے وہ دعوتِ ولیمہ میں مدعو ہیں۔

کھانا سب کے ساتھ مجھے بھی کھانا پڑا مگر میں دوسروں کی باتیں سننے کے ساتھ فائق علی کو دیکھتا رہا۔ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اٹھتا تھا کہ کیا واقعی دو بوڑھے اور لاچار ہمسایوں کو مار کے ان کی لاشیں پنکھے سے لٹکانے والا وہ ہو سکتا ہے؟

ڈٹ کر کھانے والے ڈکاریں مارتے رخصت ہونے لگے اور زنانہ سیکشن کی طرف منہ کر کے بہ آوازِ بلند چلانے لگے۔ اوئے کاکے کی ماں۔ کھانا کھا رہی ہے ابھی؟ کاکے کو اچھی طرح کھلا کے نیچے آ جانا۔ میں ذرا ایک بوتل پی لوں ہاضمے والی۔

جب زنان خانہ بھی خالی ہو گیا اور وہاں صرف استاد کی بیٹی اور داماد رہ گئے تو میں بھی ادھر ہی چلا گیا۔ فائق علی نے حقوقِ ہمسائیگی ادا کر کے دروازہ بند کر لیا۔ شبنم نے اتنی دیر میں زیادہ مفید معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ پولیس کے آنے سے پہلے ہی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ماسٹر اور اس کی بیوی نے خودکشی نہیں کی مگر فائق علی اس نظریہ کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھا۔ اس نے یہ تاثر عام کرنے کی پوری کوشش کی کہ ماسٹر کا پنشن میں گزارا نہیں ہوتا تھا اور مالی پریشانیوں نے انہیں نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ پھر وہ مقروض ہو گیا تھا اور قرض خواہ تھے سود خور۔ افغان جن کے ہاتھوں اس نے بڑی ذلت اٹھائی۔ اللہ معاف کرے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاہم اس کا خودکشی والا نظریہ فیل ہوگیا۔ پولیس نے گردن پر رسی کے نیل دیکھے اور اعلان کردیا کہ مقتولین کا پہلے رسی سے گلا گھونٹا گیا اور پھر اسی رسی سے ان کی لاشوں کو پنکھے کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ یقیناً پولیس کی اس جلد بازی کے نتیجے سے ہمسائے کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ اگر وہ ذرا صبر اور عقل سے کام لیتے اور پڑوسی سے پوچھ لیتے تو اس میں انہی کا بھلا تھا۔ مرنے والے مرگئے' نہ ان کو دنیا کی ضرورت تھی نہ دنیا کو ان کی۔ پھر قتل کیا اور خودکشی کیا۔

بالآخر بیٹی داماد نے بھی صاف کہہ دیا کہ اب وہ آرام کرنا چاہتے ہیں تو ہم اٹھے اور نیچے اتر آئے لیکن ہم زینے کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔

پھر شبنم نے کہا "اب میں جاتی ہوں پڑوسی سے تعزیت کرنے۔"

میں نے کہا "دیکھ لو۔ ریوالور ہے بیگ میں؟"

اس نے بیگ پر تھپکی دی "بالکل ہے۔ میری فکر مت کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں' گولیاں ہیں ریوالور میں؟"

اس نے جھلا کے کہا "نہیں' ٹافیاں ہیں۔ اب جاتے ہو یا میں شور مچاؤں۔ شریف پردہ دار عورتوں کا پیچھا کرتے ہو شہدے' لفنگے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "جاتا ہوں بابا۔ میرے آنے تک ضرور زندہ رہنا۔"

میں شبنم کی گاڑی میں واپس گیا۔ رئیس کو تیمور خان کی زبانی میری دن بھر کی مصروفیات کی رپورٹ مل چکی تھی۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے وہ بھونچکا رہ گیا۔ تیمور خان نے ایک چیخ ماری اور اپنی بندوق اٹھائے دوڑا۔

"ابے رک جا" میں نے ٹانگ آگے بڑھادی "اب تو ہم اندر آگئے۔ اب کیا فائدہ توپ چلانے کا۔"

وہ ٹانگ اڑانے سے منہ کے بل گرا۔ رئیس نے چلا کے کہا "ابے بھوت کے بچے' یہ تو ہے؟"

میں نے کہا "تیرے اس محافظ خاص نے تو میرا یہ حلیہ دیکھا تھا۔ یہ کیوں اداکاری کررہا تھا چونکنے اور پھرتی دکھانے کی؟"

"پیارے' کیا تو فرار ہورہا ہے اس کے ساتھ۔ اسے برقع پہنا کے بھگا کے لے جارہا ہے" رئیس نے کہا "قسم اللہ کی' اس میں بھی بڑا مزہ ہے مگر کوئی سالی اپنے ساتھ بھاگنے پر راضی بھی ہو۔"

میں نے میز پر سے مجسمے کا سر اٹھایا "یار' وہ مجھے بھگا کے لے جارہی ہے تو میرے اغوا کی رپورٹ لکھوا دینا۔ اللہ مالک ہے میری عزت و آبرو کا۔"

پھر میں مجسمے کا سر اٹھا کے واپس چل پڑا۔ رئیس شور مچاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ آیا "پیارے' یہ رازداری ہم سے' لنگوٹیے یاروں سے۔"

میں نے کہا "لنگوٹی کبھی نہیں باندھی میں نے مگر تو انڈرویئر یا رکھ سکتا ہے۔ رازداری کوئی نہیں۔"

"تو پھر میں بھی چلتا ہوں تیرے ساتھ۔"

میں نے سوچا کہ ایک سے دو بھلے "پھر ایسے خالی ہاتھ مت چل۔"

"کلاشنکوف لے لوں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "چھرا زیادہ مناسب رہے گا۔ یا کمانی والا خنجر جسے کھولتے ہیں تو کٹ کٹ کی آواز سے ہی دہشت پیدا ہوتی ہے۔"

کفایت بلڈنگ سے کچھ فاصلے پر میں نے گاڑی کو کھڑا کردیا اور رئیس کو اشارے سے زینہ دکھایا "چوتھی منزل پر الٹے ہاتھ والا دروازہ ہے۔ تو پانچ منٹ بعد آجانا۔"

میرے لیے دروازہ خود شبنم نے کھولا۔ میں نے اندر داخل ہو کے دیکھا تو فیکا ایک کرسی پر منجمد بیٹھا تھا۔ شبنم نے دروازہ کھولتے وقت بھی ریوالور کا رخ اس کی طرف رکھا تھا اور ایک پل کے لیے بھی نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ مجھے دیکھ کے فیکے کا رنگ بالکل اڑ گیا۔ شاید پہلے اسے جو تھوڑی بہت امید تھی کہ وہ ایک کمزور عورت سے نمٹ لے گا' وہ میری خوفناک صورت دیکھتے ہی دم توڑ گئی تھی۔

"مسٹر فیکے۔ میں ایک تحفہ لینے گیا تھا تمہارے لیے۔" میں نے کپڑے میں لپٹے ہوئے مجسمے کے سر کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ بری طرح چونکا اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا "آخر کون ہو تم لوگ؟"

میں نے کہا "سوال ہم کریں گے' اس کو پہچانتے ہو؟ کس کا ہے یہ سر۔"

شبنم نے آواز بدل رکھی تھی "اجی اس سے کیا پوچھتے ہو؟ اب ہیں اس کے صورتیں کتنی ملتی ہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا خیال ہے' بیٹے کا سر بھی باپ جیسا کردیں؟" میں نے فیکے کی گردن پر انگلی یوں پھیری جیسے گردن الگ کرنے کے لیے نشان لگایا ہے پھر ایک دم میں نے

اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی۔ وہ تڑپا اور اس نے اٹھ کے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو فیکا ایڑیوں پر اوپر اٹھ گیا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور حلق سے خرخر کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں۔ جب اس کی زبان بھی باہر نکل آئی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بے دم ہو کے کرسی پر گر پڑا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے شبنم کو اشارہ کیا "لو وہ رئیس قسائی بھی آگیا۔"

رئیس کے آتے ہی میں نے کہا "آؤ بھئی استاد۔ یہ ہے وہ جانور جس کے سری پائے بناتے ہیں اور کھال اتارتی ہے ذرا صفائی سے۔ کٹ کوئی نہ آئے ورنہ چمڑا ضائع ہوجاتا ہے۔"

وہ آگے بڑھا تو فیکا چلانے لگا "یہ تم کیا کررہے ہو۔ کیا چاہتے ہو آخر مجھ سے؟"

میں نے اس کو ایک ہاتھ پکڑ کے جھٹکے سے اٹھایا۔ پیٹ کے نیچے گھٹنا مار کے اچھالا۔ دوسرے ہاتھ سے سنبھال کے ہوا میں گھمایا اور چھوڑ دیا۔ وہ کمر کے بل نیچے گرا تو کچھ دیر چت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ اس کی پتلیاں ساکت تھیں مگر وہ ہوش میں تھا۔

میں نے کہا "حلق سے صرف اتنی ہی آواز نکالو جتنی ضروری ہو۔ ہم میں سے کوئی بہرا نہیں ہے۔"

شبنم نے سہلایا "اجی ہمارے خاندان میں نہیں ہے کوئی بہرا۔"

"سوائے میرے سسر کے۔"

شبنم خفا ہو کے بولی "اجی وہ بہرے نہیں' میرے ہیں اور میرا بھی کون کہتا ہے انہیں' وہ پیٹر ہیں وہ۔"

میں نے کہا "خادم کی لاش کہاں ہے؟"

وہ پھر چونکا "مجھے۔ مجھے نہیں معلوم۔ کون خادم۔؟"

میں نے افسوس سے سہلایا "بے چارے کی یادداشت چلی گئی فوراً۔"

"کہاں چلی گئی؟ دروازہ تو بند ہے" شبنم نے کہا۔

"دماغ میں گڑبڑ ہے کوئی۔ پرزے ڈھیلے ہیں یا پیچ؟ اسے یاد ہی نہیں کہ خادم کی لاش اس نے اپنی سوزوکی پک اپ میں اٹھائی تھی اور اس سے پہلے کوئی اس کے ابا کا سر لاش پر پھینک گیا تھا۔ یہ بے چارہ ڈھونڈتا رہا مگر نہیں ملا۔"

"یادداشت کی واپسی کے لیے کیا کریں؟ الیکٹرک شاک دیں؟"

میں نے کہا "آپریشن زیادہ ٹھیک رہے گا۔ پیچ پرزے سب ٹائٹ کردیں گے اور صفائی بھی کردیں گے۔ اور استاد' دیکھو سر کو یہاں سے کاٹنا۔ اور پھر ادھر سے۔" میں نے کسی سرجن کی طرح انگلی سے فیکے کے سر پر نشان لگایا۔

وہ کانپنے لگا اور میں نے دیکھا کہ اس کی شلوار کے ایک پائنچے کے پاس سے پانی کی لکیر بہہ رہی ہے۔ "میں۔ میں خادم کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ احسان کو جانتے ہو؟"

اس نے نفی میں سہلایا "ضرور تمہیں۔ غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہوسکتا ہے' بالکل ہوسکتا ہے۔" میں نے شبنم کی طرف دیکھا "چلو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ ماسٹر اور اس کی بیوی کو تم نے کیوں قتل کیا؟"

وہ اچھلا "میں نے۔ وہ پڑوسی تھے میرے۔ ان سے کیا دشمنی تھی میری؟"

"اسی لیے تو پوچھ رہے ہیں کہ جب دشمنی نہیں تھی تو ان کو مار کے پنکھے سے کیوں لٹکایا تھا؟" میں نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"

"خانان کارپوریشن سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ کیا کام ہوتا تھا وہاں؟"

اس نے پھر وہی کہا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "اچھا تھا اگر تم تکلیف اٹھائے بغیر بتادیتے۔ ہم پوچھے بغیر ٹلنے والے نہیں ہیں۔ تمہاری لاش بھی بولے گی فاتق علی اور سچ بولے گی۔"

رئیس نے بڑی صفائی سے چھرا اس کے گلے پر پھیرا۔ اس سے صرف باہر کی کھال کٹ گئی اور خون چھرے پر آگیا۔ وہ اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا۔ شبنم نے بڑی پھرتی سے ریوالور اس کے حلق میں ڈال دیا۔ اس کی آواز گھٹ کے رہ گئی اور وہ ساکت ہوگیا۔ موت کا خوف اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ گولی غلطی سے بھی چل گئی تو اس کی گردن اور حلق میں سوراخ ہوجائے گا۔

میں نے شبنم سے کہا کہ ریوالور ہٹالے۔ ابھی فیکے نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ میں نے اس کا منہ کھول کے اس میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اندر والے کمرے میں ایک چارپائی کے علاوہ کچھ برتن تھے۔ وہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا اور پڑوسی کی وفاتِ حسرت آیات پر اس نے لواحقین کے لیے کھانے کا انتظام بازار سے کیا تھا۔ حقوقِ ہمسائیگی کا اتنا خیال رکھنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والے کی طرف کوئی شک کی نگاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے چارپائی کی بان سے رسی الگ کرلی اور واپس کمرے میں آیا "اب محترم خاتون' آپ پردہ کرلیں۔"

شبنم دوسرے کمرے میں چلی گئی تو میں نے پولیس کے روایتی انداز تفتیش سے پہلے فاتق علی کے سارے کپڑے اتار دیے پھر میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو کلائی سے اکٹھا باندھا اور رسی کے دوسرے سرے کو پنکھے کی طرف اچھالا۔ پنکھے کی چھت تک پہنچنے والی راڈ تقریباً تین فٹ لمبی تھی۔ اس کے باوجود پنکھا زمین سے نو فٹ اونچا تھا۔ راڈ کے گرد ایک بل دے کے میں نے رسی کو کھینچا۔ پتلی ہونے کے باوجود نائلون کی نئی رسی اتنی مضبوط تھی کہ فیکے جیسے دو افراد کا وزن اٹھا کے بھی نہ ٹوٹتی۔ زمین سے ایک فٹ کی بلندی پر فیکا ہوا میں معلق ہوگیا۔

چند منٹ کے بعد فیکے کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کا چہرہ اب ہمارے سامنے آگیا تھا۔ رئیس نے چھرا نکالا اور اس کے جسم کے نازک حصوں پر کٹ لگانے لگا۔ میں اندر سے نمک اٹھا کے لایا اور بہتے خون پر چھڑکنے لگا۔ فیکا بُری طرح تڑپا اور رسی اتنے زور زور سے جھٹکے لینے لگی کہ مجھے پنکھے کی فکر ہوگئی۔ رسی نہ ٹوٹے مگر پنکھا ہی نیچے آگرے۔ رئیس نے اپنی جراحی جاری رکھی۔ اتنا عرصہ تھانوں سے تعلق کے بعد وہ تفتیش کے فن میں ماہر ہوگیا تھا۔ میں نے زخموں پر نمک پاشی جاری رکھی اور ساتھ ساتھ اپنے سوال دہراتا گیا۔

میں نے کہا "میں سوالات ایسے کروں گا کہ تمہارے لیے صرف سر ہلانے یا نہ میں جواب دینا آسان ہوگا۔ تو پہلا سوال' خادم کو قتل تم نے کیا تھا؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ رئیس نے ایک نیا کٹ لگایا اور میں نے نمک پانی میں حل کر کے چند قطرے ٹپکاتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"ہر سوال میں تین بار پوچھوں گا" میں نے کہا "پھر سوچ کے بتاؤ' خادم کو قتل تم نے نہیں کیا تو کیا تم قاتلوں کو جانتے ہو؟"

اب اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔

میں نے دوسرا سوال پوچھا "تم نے خادم کی لاش میرے سامنے اٹھائی تھی اس لیے انکار کرنے کا فائدہ نہیں۔ تم نے اسے کیسں پھینکا ہوگا یا دفنایا ہوگا۔ تم اس جگہ تک ہماری رہنمائی کرسکتے ہو؟"

لٹکے رہنے سے فیکے کی حالت ویسے ہی خراب ہو رہی تھی۔ زخموں پر چھڑکے جانے والے نمک کی اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی مگر رئیس نے اسے مطلع کیا کہ ابھی تو تفتیش کا آغاز ہوا ہے۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "فیکا جانتا ہوگا یار۔ خیر' نہیں جانتا تو آج جان لے گا۔ خادم کو کس جرم میں سزائے موت دی گئی تھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اسے شک کا فائدہ دیا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ فیکا اور اس جیسے دوسرے الگ الگ کام کرتے ہوں۔

"اس کو ملک صاحب کے حکم پر قتل کیا گیا تھا؟"

فیکا ساکت رہا۔ اس نے نہ انکار میں سر ہلایا اور نہ اقرار میں۔ میں نے رئیس کو طبع آزمائی کا موقع دیا اور اس نے نمک کے ساتھ مرچوں کا استعمال کیا تو فیکا ذبح کیے ہوئے مرغے کی طرح پھڑکنے لگا۔ اس کے جسم پر خون کی لکیریں سی بن گئی تھیں اور ہر مسام سے پھوٹنے والا پسینہ پانی کی طرح خون میں شامل ہو رہا تھا۔ صرف چند منٹ بعد وہ بے ہوش ہوگیا تو میں نے اور رئیس نے اسے اتار کے نیچے ڈال دیا اور اس کو کپڑے سے ڈھک دیا۔

شبنم ساتھ والے کمرے میں بڑے سکون سے بیٹھی کوئی پرانا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے وہ ہر قسم کے مناظر دیکھنے کی عادی تھی۔ اس نے حادثات کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔ دو سال پہلے جب عوام ایکسپریس کے حادثے میں سیکڑوں لوگ ہلاک ہوئے تھے جو عید منانے اپنے گھر جا رہے تھے تو شبنم نے آدھی رات کے وقت وہاں پہنچ کے خاک وخون میں لتھڑی شکستہ لاشوں کی اور بکھرے ہوئے انسانی اعضا کی تصاویر بنائی تھیں۔ اس نے تھانوں میں تشدد ہوتے بھی دیکھا تھا اور اس سے ہلاک ہوجانے والوں کی رپورٹ بھی بنائی تھی۔ اس کے اعصاب اس معمولی سی تفتیش سے متاثر نہیں ہوسکتے تھے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ فیکے جیسے سفاک قاتل کے لیے کسی قسم کے رحم کے جذبات سے عاری تھی۔

میں نے کہا "فارغ مت بیٹھو۔ دیکھو' یہ شخص یہاں رہتا تھا تو کم سے کم اپنے لیے چائے تو بناتا ہوگا۔"

وہ پرانا رسالہ رکھ کے کھڑی ہوگئی۔ یہ خالص مردانہ ذوق کا رسالہ تھا۔ وہ فرش پر رکھے ہوئے ڈبے کھول کھول کے دیکھنے لگی "چلو جاؤ تم بھی کام کرو اپنا۔ یہ رسالہ رکھو' یہ تمہارے پڑھنے کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سوری' یہ زنانہ رسالہ ہے۔ مجھے پتا نہیں

تھا۔"

میں اور رئیس چائے پینے اور فیکے کے ہوش میں آنے کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد شبنم چائے لے کے آئی تو فیکا بھی کراہنے لگا۔ خون کے داغ اب چادر پر بھی نظر آنے لگے تھے۔

میں نے کہا "دیکھو' ہم سمجھتے ہیں کہ تم ایک حکم کے غلام ہو۔ تمہیں وہ سب کرنا پڑتا ہے جو ملک کہتا ہے۔ قصوروار تم نہیں سمجھے جاسکتے اس لیے ہم تمہیں چھوڑ بھی سکتے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ تم تفتیش میں ضائع ہوجاؤ۔"

"میں۔ میں نے کچھ بتایا تو۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ یہ کوئی شریفانہ کام نہیں تھے جو تم بدمعاشی کے زعم میں کرتے رہے۔"

"خادم نے کوئی نقصان کیا تھا ملک صاحب کا۔" وہ چادر اوڑھ کے بیٹھ گیا "ملک صاحب اسے اور عثمان کو ذمے دار سمجھتے تھے۔"

"چنانچہ انہوں نے اسے مروا دیا۔ مارنے والے کون تھے؟"

وہ بولا "مجھے پتا نہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس کی لاش کو غائب کرنا ہے اور کوئی چیز۔۔۔ یہ سر۔۔۔ وہاں گر گیا تھا' یہ اٹھا کے لانا ہے۔"

"خادم کو تم نے کیسے غائب کیا؟"

اس نے کہا "ایک لائن کھود رہے تھے کارپوریشن والے۔ اس میں ڈال دیا تھا۔ اوپر مٹی گرا دی تھی۔ صبح اس کے اوپر لائن ڈال دی گئی ہوگی۔ بہت بڑی لائن تھی' چھ سات فٹ چوڑی۔"

مجھے معلوم ہوگیا کہ اس معاملے میں وہ سچ بول رہا ہے۔ مجسمے کے سر کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا مگر اس نے بتایا کہ ملک کی کوٹھی کے تہ خانے میں ایسی بہت سی مورتیاں ہیں۔

"کہاں سے آتی ہیں یہ مورتیاں اور کہاں جاتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں ایک ڈرائیور ہوں۔ ملک صاحب کہتے ہیں فلاں جگہ سے ایک پیٹی لے آؤ' میں لے آتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں یہ پیٹی اسٹیشن لے جاؤ اور کراچی کے لیے بک کرا دو۔ میں رسید ان کو لا دیتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان میں کیا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "پیٹی پر پتا لکھا جاتا ہے۔ جو تم پڑھ سکتے تھے۔"

اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر رئیس نے ماچس کی تیلیاں جلا جلا کے اس کے زخموں کو داغنا شروع کیا تو اس نے یہ بھی اگل دیا۔ مال مختلف شہروں کو جاتا تھا۔ ہانگ کانگ' سنگاپور اور بنکاک کے علاوہ دو تین۔

میں نے پوچھا "ملک صاحب کے تہ خانے میں اور کیا ہے؟"

"اور۔ بہت سامان ہے" وہ کراہ کے بولا۔

"میں نے دیکھا ہے باہر سے۔۔۔ ذرا سوچ کے بتاؤ' تم نے اندر کیا دیکھا ہے؟ تم اندر کے آدمی ہو۔"

وہ جاہل آدمی تھا۔ نوادرات کی تاریخی حیثیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اسے بین الاقوامی منڈی میں ان کی مالیت کا اندازہ تھا مگر جو کچھ اس نے دیکھا وہ اپنی معلومات کے مطابق بتاتا رہا۔ ملک صاحب کے پاس مورتیوں کے علاوہ تصویریں بھی آتی تھیں۔ پرانے برتن' پتھر کے بنے ہوئے' مٹی کے اور تانبے پیتل کے۔ تلواریں اور عجیب وغریب شکل کی بندوقیں تھیں اور بہت سی ایسی چیزیں جن کے بارے میں وہ خود بھی نہیں جانتا۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ڈرائیور ہونے کے باوجود فیکا ایک اہم گواہ ہے اور ایک ہی رات میں اس سے ہر بات نہیں معلوم کی جاسکتی۔ اپنا اعتبار قائم کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ اب ہم اس کی ہر بات کا یقین کرلیں گے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے پولیس کی مار سے بچنے کے لیے چالاک قاتل فوراً اقبال جرم کرلیتے ہیں اور قتل کے اسباب کے بارے میں کوئی قابل یقین واقعات پر مشتمل کہانی بھی سنا دیتے ہیں لیکن بعد میں وہ اپنے بیان سے ہی مکر جاتے ہیں کہ پولیس نے تشدد کر کے مجھے ایسا کہنے پر مجبور کیا تھا۔

تصدیق کیے بغیر فیکے کے بیان کی حیثیت بھی مشکوک تھی اور اس کے جرائم کی سزا کا معاملہ قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نے رئیس اور شبنم سے مشورہ کیا "تمہارا کیا خیال ہے' یہ بندہ سچ بول رہا ہے' سب سچ ہے؟"

رئیس نے کہا "اپن تو کچھ جانتے نہیں پیارے ان معاملات کے بارے میں مگر ایسے لوگ اتنے شریف نہیں ہوتے کہ تھوڑی سی مار میں سب اگل دیں۔"

شبنم نے کہا "یعنی تمہارے خیال میں اور مار پڑنی چاہیے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسے تو دنیا میں اتنی مار پڑنی چاہیے قسم اللہ کی کہ یہ دنیا میں نہ رہے۔ دوسری دنیا میں تو دوزخ کے فرشتے پہلے سے انتظار میں ہوں گے اس کی چھترول کے لیے۔ ویسے بھی اصول ہے کہ جتنا گہرا کنواں کھودو اتنا ہی پانی ملتا ہے۔"

میں نے کہا "بڑی گہرائی ہے اس بات میں 'کنوئیں سے بھی زیادہ۔"

شبنم نے کہا "اس اعترافِ جرم کا فائدہ بھی کیا ہے۔ اگر ہم نے اسے چھوڑا تو یہ سیدھا جائے گا ملک صاحب کے پاس اور ان کے پاؤں پکڑ کے سب بتادے گا۔"

میں نے کہا "سوال ہے اگر کا۔۔۔ کیا ہم اسے صرف بیان لے کر چھوڑ دیں؟"

"سزا دینے کا اختیار ہم نہیں رکھتے" شبنم نے کہا۔

"مگر سزا دلوانے کا رکھتے ہیں" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "آپ نے اسے چھوڑ دیا جی تو یہ ملک کے پاس نہیں جائے گا اور اسے کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ لکھ لو میری بات' ملک کسی مجبوری کی بات نہیں سنے گا۔ وہ پوچھے گا کہ کون تھے وہ لوگ اور کیا بتایا ہے تو نے نمک حرام۔ ان کے نزدیک وفاداری یہ ہے کہ آدمی جان دے دے زبان نہ کھولے۔ کوئی ٹکڑے کردے تب بھی منہ سے ایک لفظ نہ نکلے۔"

رئیس نے کہا "یہ بات تو سولہ آنے پکی ہے پیارے۔"

میں نے کہا "اسے معلوم ہے کہ ملک کے سامنے کچھ بتانے کا مطلب ہے اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کرنا۔ ملک کہے گا کہ مار پڑی اور تو نے سب بک دیا اور اب آگیا مجھے بتانے؟ اس سے اچھا ہوتا تو مرجاتا وہیں مار کھاتے کھاتے۔ وہ قیمہ کردیتے تیرا۔ آگ میں جلادیتے تجھے۔ یہ آزمائش تھی تیری اور تو اس میں ناکام ہوگیا۔ نمک حرام کے لیے ہمارے پاس سزائے موت سے سخت کوئی سزا ہوتی تو تجھے وہی دی جاتی۔"

شبنم نے کہا "پھر یہ کیا کہے گا؟"

"اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ کچھ دن کے لیے کہیں چلا جائے گا۔ ملک صاحب کو بتا کے یا پیغام بھجوا دے گا۔ چند دن میں اس کے زخم بھر جائیں گے تو پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوجائے گا" میں نے کہا۔

"ابھی تو اس کو پتا ہی نہیں کہ ہم کون ہیں" شبنم نے کہا۔ "یہ سمجھ رہا ہوگا کہ ہم پولیس والے ہیں۔"

رئیس ہنسا "اجی اتنا بھولا نہیں ہے یہ بندہ۔ اپنی طرح اس نے بھی ساری عمر نیک کام ہی کیے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں قُلی کو قُلی پہچانتا۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ ولی کو ولی پہچانتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں۔"

"ابے ایک ہی بات ہے۔ ہم کہاں جانتے ہیں فارسی" وہ جھلا کے بولا "ایسے ہی چور کو چور پہچانتا ہے۔ یہ ہمیں پولیس والا بھی نہیں مان سکتا۔ ہم میں وہ بات ہی نہیں۔"

"ابھی ہم نے اس سے ماسٹر اور اس کی بیوی کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اور ہم ایسے ہی پوچھتے رہے تو ساری رات گزر جائے گی یہاں۔ میں تو کل بھی رات بھر جاگتا رہا۔"

"میں تو دن میں سو چکی۔ اب اخبار کے دفتر جانا چاہتی ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جائیں؟" میں نے کہا۔

"یہی ٹھیک ہے۔ اطمینان سے کریں گے تفتیش۔"

نیکا چلّائے گا "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے یہیں پوچھ لو۔"

میں نے تاپ تول کے ایک ہاتھ مارا اور اسے لڑھکا دیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے۔ کفایت بلڈنگ میں لوگ سو چکے تھے مگر سڑک اتنی سنسان نہیں تھی کہ ہم بے خوفی سے فیکے کو ایک خون آلود چادر میں لپیٹ کر کندھے پر ڈالتے اور اٹھا کے لے جاتے۔ ہمیں جو ملتا وہ یہی سمجھتا کہ ہم کوئی لاش لے کر جارہے ہیں۔

میں نے اور رئیس نے مل کے بڑی کوشش کی اور فیکے کو کپڑے پہنانے میں کامیاب ہوگئے پھر ہم نے اسے ایک صاف چادر میں لپیٹا۔ شبنم نے باہر جھانک کے آل کلیئر کا سگنل دیا اور مجھے چابی تھمادی۔

میں نے کہا "میں گاڑی بالکل سامنے لاتا ہوں۔ پیچھے والا دروازہ کھلا ہوگا۔"

شبنم نے کہا "میں زینے میں کھڑی رہتی ہوں۔ تم اسے اٹھا کے لاؤ۔ رک کے مت دیکھنا پیچھے۔"

"اجی آپ دیکھتی جاؤ۔ ہم لفٹ کی طرح کیسے اترتے ہیں نیچے" رئیس نے کہا "ویسے بندہ ہے بھاری۔ گناہوں کا بوجھ زیادہ ہے سالے کا۔"

شبنم برقع میں چہرہ چھپائے باہر نکل گئی تو چند سیکنڈ کے وقفے سے میں نکلا۔ میں نے زینے میں بھاری قدموں کی آواز سنی جو اوپر آرہے تھے اور ایک فوری ردِعمل کے طور پر میں پیچھے ہٹ گیا۔ رات کے بارہ بجے کون لوگ اوپر آسکتے ہیں؟

میں نے سوچا۔ ماسٹر کے لواحقین میں صرف بیٹی داماد تھے جو شاید اس کے گھر میں مزے سے سو رہے تھے اور مطمئن تھے کہ کچھ نہ سہی دو لاکھ تو اس گھر کے مل ہی جائیں گے۔ تعزیت کے لیے کسی کے گھر۔ آدھی رات کے وقت آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو دروازے میں پیچھے آنے والے رئیس سے ٹکرایا "ابے چھپ جا' دیوار سے لگ جا۔"

اس سے زیادہ کہنے کی مجھے مہلت ہی نہیں ملی۔ ایک ساتھ چار افراد اندر آگئے۔ وہ سب جوان اور تنومند تھے مگر اس سے زیادہ پُرخطر ان کے عزائم تھے جو ان کی صورتوں سے عیاں تھے۔ کچھ کہے بغیر ایک نے مجھے پیچھے دھکیلا مگر میں مضبوطی سے قدم جمائے کھڑا تھا۔ میں نے انہیں اندر جانے کا راستہ فراہم نہیں کیا۔

اس نے گالی دے کے زیادہ قوت کے ساتھ حملہ کیا اور مجھے دھکیلتا ہوا پیچھے تک لے گیا۔ دوسری بار میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا چلا گیا تھا۔ پیچھے والے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے میں نے اسے سائڈ دی اور دروازے سے گزار دیا۔

میری چال کامیاب رہی۔ پیچھے آنے والے تینوں کی نظر مجھ پر رہی اور وہ ایک ساتھ حملہ کرنے کے لیے آگے آئے۔ میں نے رئیس کو ہاتھ سے اشارہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ سٹک جائے لیکن وہ اس سے پہلے ہی چند سیکنڈ کی مہلت سے فائدہ اٹھا چکا تھا اور کھلے دروازے سے دبے پاؤں نکل گیا تھا۔ اسے یقین ہوگا کہ ان چاروں سے نمٹنا میرے لیے مشکل نہیں اور وہ خود بھی فیکے کو گاڑی میں ڈال کے شبنم کے ریوالور کے ساتھ واپس آسکتا تھا۔ ایک خطرناک خنجر پہلے ہی اس کے پاس تھا۔

اندر والے کمرے میں پہنچنے والا شاید مٹی کے تیل کے چولھے اور برتنوں پر گرا تھا۔ یہ اندازہ مجھے مختلف آوازوں سے ہوا۔ باقی تین اب زیادہ جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے مگر محتاط بھی تھے۔

میں نے اچانک ہاتھ اٹھا کے کہا "ایک منٹ۔ یہ کیا معاملہ ہے؟"

وہ رکے نہیں مگر میری حرکت سے ان کی پیش قدمی کا ٹیمپو ٹوٹ گیا۔ میں نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور اناڑیوں کے اسٹائل میں لات گھمائی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ایک نے پھرتی دکھاتے ہوئے میرے پاؤں کے نیچے کو اڑتے کبوتر کی طرح دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کا ارادہ ٹانگ کھینچ کے میرا توازن بگاڑ دینے کا ہوگا مگر ہوا اس کے برعکس۔ وہ میری ٹانگ کے ساتھ آگے آیا پھر میں نے ایک جھٹکا دیا تو جوتوں سمیت میرا پاؤں اس کے سینے پر پیچھے سے آگے آنے والے بہت طاقتور پسٹن کی طرح لگا۔ اس کے حلق سے "حق" جیسی آواز خود بخود نکلی اور وہ پیچھے کی طرف چکرا کے گرا۔

اس کے ساتھ ہی میں پیچھے ہٹ گیا۔ کمرے میں گرنے والا اٹھ گیا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے باقی تین سے کہا "اوئے اندر جاؤ۔ اس۔۔۔ کی بیس پنشن بنادیتے ہیں۔"

ان کا خیال ہوگا کہ ایک کمرے میں وہ مجھے آسانی سے گھیر کے پکڑ لیں گے کیونکہ میرے لیے فرار کے راستے مسدود ہوں گے۔ میں خود مقابلے کو کم جگہ تک محدود کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں دونوں ہاتھوں اور پیروں سے ایک ساتھ کام لیتے ہوئے اپنے مارشل آرٹ کے فن کو پوری مہارت کے ساتھ بروئے کار لاسکتا تھا۔ ایک زمانہ تھا جب میں چندا کے ساتھ روز پریکٹس کرتا تھا اور خان جی ہمارے مقابلے کو تنقیدی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہمیں بتاتے تھے کہ کس نے کیا غلطی کی اور کیا نہیں کیا۔ یہ تنقید ہماری بہتری کے لیے اور تعمیری ہوتی تھی۔ وہ ہمیں فن کار کی حیثیت سے سراہتے بھی تھے۔

پریکٹس نہ ہونے کے باوجود میں بھولا کچھ نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہ سب کمرے سے باہر نہ نکلنے پائیں اور مجھ سے دور بھی نہ ہوں۔ میری نظر ان کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ چہروں کے ردِعمل پر بھی تھی۔ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو وہ اٹھا کے میرے سر پر مارتے۔

چند منٹ میں باری باری وہ سب کم سے کم دو بار دیوار سے ٹکرا چکے تھے۔ میرے ہاتھوں کی برق رفتاری نے ان کے بازوؤں کو شل کردیا تھا اور میری مشین کی طرح چلنے والی ٹانگیں ان کے پیٹ' سینے اور جسم کے نازک حصوں پر مؤثر انداز میں لگی تھیں۔

ان میں سے ایک بالآخر ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اس نے خود کو مزید مار کھانے سے بچانے کے لیے چپ کر کے لیٹ جانا مناسب جانا یا وہ سچ مچ ناک آؤٹ ہوگیا۔ اس کا اندازہ کون کرسکتا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ چاروں اپنے مقصد میں ناکامی کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے اور ایک کے مقابلے میں شکست کھانے سے پہلے وہی کریں گے جو ناگزیر تھا۔ بالآخر ایک نے ریوالور نکال لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس۔۔۔ بہت ہوگئی" وہ ہانپ کے بولا "میں گولی ماردیاں گا۔"

میں نے ایک کو دبوچ کے ڈھال بنالیا "بڑی دیر میں خیال آیا پہلوان کو توپ چلانے کا۔ چلاؤ گولی' تمہارا ایک بندہ اور کم ہوجائے گا۔"

باقی دو رک کے خود کو سنبھالنے لگے۔ ان سب کے سانس پھولے ہوئے تھے اور بدن کے مختلف حصے قابل استعمال نہیں رہے تھے۔ ان میں سے ایک گنجا تھا۔ اس کے سر کی ہموار سطح پر ایک آلو جیسا ابھار نمودار ہورہا تھا۔ دوسرے کی قمیص پھٹ گئی تھی اور ناک میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ تیسرا جو میرے قبضے میں تھا' ریوالور نکالنے والے کو گالیاں دے رہا تھا۔

"اوئے پاگل دے پتر۔ خبردار! اوئے مینوں ماریں گا۔ میں نے کیا سمجھایا تھا؟"

ریوالور والے نے قدرے تذبذب کے بعد ریوالور واپس رکھ لیا "اچھا استاد جی' فیر ہن کی کریے؟"

اس کا سوال جائز تھا۔ خود استاد نکلانے پر جا بیٹھے تھے اور فرمارہے تھے کہ توپ مت چلانا۔ جنگ میں ایک ڈیڈلاک آگیا تھا۔

میں نے کہا "پہلے بھی پوچھا تھا میں نے' تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔ مارا ماری کرنی ہے تو شوق سے کرو" میں نے استاد کو چھوڑ دیا۔

استاد نے قدرے خفت سے کچھ دور جا کے مجھے دیکھا۔ "یہ سوال تو ہمیں کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تو کیا میں نے منع کیا تھا۔ اب کرلو۔"

"فیکا کہاں ہے۔۔۔" استاد نے دھوتی کا پلو اٹھا کے چہرہ صاف کیا "اور وہ عورت کہاں ہے جو اس کے ساتھ تھی؟"

میں نے صورتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ استاد شاید پہلے اکیلا آیا تھا مگر اس نے اندر سے میری اور فیکے کی گفتگو سنی تو اسے معاملہ گڑبڑ نظر آیا۔ شبنم کی آواز سے وہ سمجھا ہوگا کہ فیکا کسی عورت کو لایا تھا جو کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی مگر فیکے کی آہ وبکا اور کراہنے کی آوازوں نے اس کو تشویش میں مبتلا کیا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ تین بندے لے کر لوٹا تھا۔

شبنم برقع میں تھی اس لیے بچ گئی۔ ان کے لیے فیکے کے ساتھ کسی باپردہ خاتون کا تصور محال تھا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ نیک بی بی مرحوم استاد کے گھر سے نکلی ہے اور جاری ہے تو جانے دو۔

میں نے کہا "اس عورت کو میں نہیں جانتا مگر اسی کے ساتھ گیا ہے فیکا۔"

استاد نے جگالی کے انداز میں جبڑے چلا کے اپنے منہ کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور اس جگہ کو دبا کے دیکھا جہاں میرا مکا پڑا تھا "کہاں گیا ہے؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر کے پاس۔ تم سب بھی چلے جاؤ۔"

ایک شاگرد نے کہا "کیوں' ہمیں کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر خود ہی دیکھ لے گا۔ ویسے تمہیں تو جانا ہوگا ہڈیوں کے ڈاکٹر کے پاس یا دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس۔"

"نکو اس کرنے کی ضرورت نہیں" استاد نے کہا "فیکا کیوں گیا ہے ڈاکٹر کے پاس؟"

"پیٹ دکھانے۔ چوتھا مہینہ ہے نا۔"

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر شاگردوں نے استاد سے اجازت طلب کی "استاد جی۔ بندے کا دماغ ابھی ٹھیک نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "کون سی غلط بات کہی ہے میں نے۔ اپریل کا مہینہ چوتھا ہی ہوتا ہے۔ اور گڑبڑ فیکے کے پیٹ میں ہے۔ اس نے بھول کے لنچ اور ڈنر ایک ساتھ کرلیا تھا۔"

استاد نے مجھے ڈیڑھ آنکھ سے گھورا۔ اس کی ایک آنکھ سوج کے آدھی بند ہوگئی تھی "دیکھ فیکے کو کچھ ہوا تو۔۔۔"

میں نے ہنس کے کہا "فیکے کو بھلا کیا ہوسکتا ہے۔ ہوگا اس عورت کے کچھ' لڑکا یا لڑکی۔ اسی بات پر لڑ رہے تھے دونوں۔ فیکے نے کہا کہ لڑکا چاہیے مجھے اور عورت کہتی تھی کہ میں تو صرف کھیتی ہوں' تو نے جو بویا ہے وہی کاٹنے گا۔"

"مگر فیکے نے تو ابھی شادی نہیں کی۔"

میں نے کہا "شادی تو اس کے باپ نے بھی نہیں کی تھی۔"

ایک شاگرد نے گرم ہوکے کہا "نکو اس مت کر۔"

دوسرا بولا "حرامی کہتا ہے فیکے کو۔"

میں نے کہا "میں وہی کہہ رہا ہوں جو مجھے معلوم ہے۔ جو فیکے نے بتایا تھا مجھے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی میں وہ سب میری صورت کا جائزہ لیتے رہے "آخر تو ہے کون' ہم نے تجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا یہاں۔"

"دس کروڑ کی آبادی ہے پاکستان کی اور لاہور میں ہی پچاس ساٹھ لاکھ بندے رہتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو کیسے دیکھ سکتے ہیں۔" میں نے کہا "میں نے تمہیں نہیں دیکھا کبھی تمہیں۔"

"فیکا یار ہے ہمارا۔ کئی سال سے ہم ساتھ ہیں" استاد نے کہا۔

میں نے کہا "میری ملاقات اتنی پرانی نہیں ہے۔ دراصل میں جاپان میں تھا۔"

"جاپان میں۔۔۔" ایک شاگرد نے حیرانی کا اظہار کیا "مگر تو جاپانی نہیں لگتا شکل سے۔"

استاد نے اسے گھورا "اوئے پاگل دے پتر۔ اس نے کب کہا ہے کہ میں جاپان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیا ہوگا جاپان جوڈو شوڈو سیکھنے۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

میں نے استاد کی عقلمندی کو سراہا "بہت بے وقوف شاگرد رکھ لیے ہیں تم نے۔ کیا سکھاتے ہو تم ان کو؟"

"اوئے میں نے کیا سکھانا ہے؟"

"یہ استاد کہتے ہیں نا تم کو۔ گیراج میں کام کرتے ہیں تمہارے یا اکھاڑے میں آتے ہیں؟"

استاد نے یہ اعتراف لاحاصل سمجھا کہ وہ بدمعاشی کرتے ہیں اور جونیئر ہونے کی وجہ سے اسے استاد کا درجہ دیتے ہیں "تیرا کیا تعلق ہے فیکے سے؟"

میں نے کہا "کوئی نہیں۔"

استاد نے جھنجلا کے کہا "پھر تو کیوں آیا تھا اس کے پاس؟"

"میں نہیں آیا تھا۔ اس نے بلایا تھا مجھے" میں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" استاد کا حوصلہ جواب دینے لگا۔

"کوئی ملک ہے۔۔۔ اس کو ایک باڈی گارڈ چاہیے۔ میں نے بتادیا تھا کہ پورے پچاس ہزار لوں گا اگر کام میری سمجھ میں آگیا۔ ورنہ نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ یہ کام سیکھنے والے بہت۔"

"کون سا کام؟" ایک مرعوب شاگرد نے کہا۔

"یہی' جو میں ابھی کررہا تھا۔ ویسے یہ کام نہیں کھیل تھا۔ مارا ماری' جو میں جاپان سے سیکھ کے آیا ہوں۔ وہاں میں نے اعلان کرادیا تھا اخبار میں کہ اپنے پاکستان جانے سے پہلے میں پھر چیلنج دیتا ہوں' کوئی مقابلہ کرنا چاہے تو آجائے' ایک بندہ آگیا تھا۔ پاکستان آنے سے پہلے میں ہڈیوں کے اسپتال میں گیا تھا اس سے ملنے اور پھول بھی دے کے آیا تھا۔ اس کو اسپورٹس مین اسپرٹ کہتے ہیں۔ بندہ مار کھا کے بھول جائے۔"

"مار کھا کے کیسے بھول جائے" ایک غیرت مند شاگرد نے کراہ کے کہا۔

"اوئے بات سمجھا کرو" میں نے اسے ڈانٹا "اب دیکھو' تمہاری یہ بانہہ ٹوٹ گئی ہے۔ جب تک تکلیف ہے تم نہیں بھول سکتے مگر پلستر چڑھائے چار چھ ہفتے پھرو گے اس کو گلے میں لٹکا کے تو ٹھیک ہوجاؤ گے مگر تم نے اسپورٹس مین اسپرٹ نہ دکھائی اور دل میں کینہ رکھا تو پھر آؤ گے مجھ سے بدلہ لینے اور میں پھر تمہاری یہ بانہہ یا دوسری توڑ دوں گا۔ تم پھر پلستر چڑھا کے بازو گلے میں لٹکائے پھرو گے۔ اس سے اچھا ہے کہ باہر نکل کے بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

میں وقت ضائع کرنے کے لیے ایسی باتیں کررہا تھا اور میرے حریف بھی گومگو کی کیفیت میں تھے۔ ایک راؤنڈ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا تھا جس میں ان کا نقصان ضرور ہوا تھا اور انہیں کچھ غلطی کا احساس بھی ہورہا تھا کہ انہوں نے شاید سوال جواب کیے بغیر مجھ سے مار ماری کرکے غلطی کی۔ مجھے فیکا لایا تھا اور پچاس ہزار روپے ماہانہ پر ملک سے میری بات ہونے والی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں خاص آدمی تھا۔ یہ میں نے عملاً بھی ثابت کردیا تھا اور بتا بھی دیا تھا کہ میں نے مار ماری کی تربیت جاپان سے حاصل کی تھی جہاں میرے مقابل کوئی آنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ رستم ہند گاما پہلوان کی طرح میں رستم جاپان تھا۔

لیکن میری باتوں کو سنجیدگی سے لینا اور یقین کرنا ان کے لیے مشکل ہورہا تھا۔ وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ میں کس حد تک سچ بول رہا ہوں اور بلاوجہ دوسرے راؤنڈ کا آغاز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے رئیس کی واپسی کا انتظار تھا۔ اسے میرے حساب سے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"فیکا کب آئے گا۔" استاد نے کپڑے کا گولا سا بنا کے منہ کی ہوا سے گرم کیا اور اپنی آنکھ پر رکھ کے کہا "ہائے۔"

میں نے کہا "لگتا ہے تمہاری یہ آنکھ ضائع ہوگئی۔ خیر' تم مصنوعی آنکھ لگوالینا یا پھر یہاں جو امریکن ڈاکٹر آنکھ بدلتا ہے۔"

"آنکھ بدلتا ہے۔۔۔" استاد نے کہا "بے بے کی ایک آنکھ میں موتیا ہے۔"

"ہاں۔ وہ گھوڑے کی آنکھ لگاتا ہے اور کہتے ہیں گھوڑے کو ہر چیز انسانی آنکھ کے مقابلے میں چار گنا بڑی نظر آتی ہے۔ اس سے تو اتنا فرق نہیں پڑے گا مگر تمہاری والدہ تمہیں اس آنکھ سے دیکھے گی تو تم اسے گھوڑے نظر آؤ گے۔ کیا پتا۔"

اس نے مشتعل ہوکے کہا "میں نے پوچھا تھا فیکا کب آئے گا۔ میرے ساتھ مسخری کرنے کی ضرورت نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا " فیکا کچھ پتا کے نہیں گیا۔ ہو سکتا ہے ڈلیوری کے بعد آئے' یہ چوتھا مہینہ ہے نا۔"

اسی وقت رئیس خان کسی ڈاکو کے گیٹ اپ میں نمودار ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دروازے سے لگا کچھ دیر ہماری گفتگو سن کے اندر کے حالات کا اندازہ کرتا رہا تھا۔ اس نے منہ پر ڈھاٹے کی طرح کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا نظر آتا تھا۔

میں نے خوش ہو کے کہا "یہ لو فیکا آگیا؟ یار' بڑی دیر کی۔"

استاد نے ناگواری سے کہا "یہ فیکا نہیں ہے۔"

رئیس نے دہاڑ کے کہا "کیا۔؟ میں فیکا نہیں ہوں تو کیا تمہارا اصلی باپ ہوں۔"

میں نے کہا "یار فیکے۔ یہ تجھے پوچھ رہے تھے۔ کیا تیرے سسرالی عزیز ہیں۔ ایسے ٹوٹے پھوٹے' سیکنڈ ہینڈ۔"

ریوالور کے سامنے وہ چاروں مزید بے بس ہو گئے تھے۔ "آخر کون ہو تم دونوں ہو کر؟" استاد نے کہا۔

رئیس پھر دہاڑا "جو کر۔ اوئے کانے بندر' مجھے جو کر کہتا ہے۔ گولی مار کے بیوہ کروں گا۔"

"فیکے کا مطلب ہے تمہاری بیوی کو" میں نے وضاحت کی۔

"ہاں اور میں گولی اوپر سے مارتا ہوں تو سیدھی نکلتی ہے دوسری طرف سے۔ کوئی سوراخ کیے بغیر۔"

غور کر کے رئیس کی بات کا مطلب سمجھنے کے بعد مجھے ہنسی آئی مگر میں نے روک لی "چلو' اب وقت مت ضائع کرو ہمارا۔ دیوار کی طرف منہ کرلو سارے۔ اور لگ جاؤ دیوار کے ساتھ۔"

انہوں نے تذبذب کا مظاہرہ کیا اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا کہ دوستو' اب کیا خیال ہے۔ میں نے ایک کے پیٹ پر لات ماری تو وہ بلبلا کے پیچھے گرا اور پیٹ پکڑ کے زمین پر لوٹنے لگا۔ محض تفریح کے لیے میں نے استاد کہلانے والے پر فلائنگ کک آزمائی پھر وہ سب اٹھ کے دیوار سے لگ گئے۔

میں نے کہا "اپنے اپنے کپڑے اتارو" اور انہوں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں یہ ذلت بھی قبول کی۔ رئیس نے سب کے کپڑے اکٹھے کرلیے اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا پھر اس نے اندر والے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ زینے کی طرف والا دروازہ بند کر کے ہم تیزی سے نیچے کی طرف لپکے مگر اس سے پہلے ہی قیدی اندر کا دروازہ توڑ کے ہنگامہ برپا کر چکے تھے۔

مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ اوپر ہونے والی مار دھاڑ کی آوازیں نیچے سونے والوں کو بیدار نہ کردیں اور وہ اٹھ کر یہ تسلی کرنے نہ آجائیں کہ آخر اوپر کیا ہو رہا ہے؟ دروازے توڑنے اور شور مچانے سے پوری کفایت بلڈنگ میں مردے بھی جاگ اٹھتے۔ یہ ہنگامہ کرنے والوں کا مسئلہ تھا کہ وہ لباسِ قدرت میں پبلک کے سامنے جانا پسند کرتے ہیں یا گھر میں دستیاب چادر وغیرہ کو بطور دھوتی استعمال کرتے ہیں' لیکن ہمیں تھوڑی سی مہلت ضرور مل گئی تھی۔ کم سے کم پانچ منٹ تک ہمارے تعاقب میں کوئی دوڑتا اور پکڑو پکڑو کا شور مچاتا ہوا نہیں آسکتا تھا۔

زینہ اترتے اترتے رئیس نے کہا "ابے یہ سالے کہاں سے ٹپک پڑے؟"

میں نے کہا "پھر بتاؤں گا پوری اسٹوری۔ یہ بتا پارسل رکھ دیا تھا گاڑی میں؟"

"ہاں۔ کسی نے نہیں دیکھا" رئیس نے آخری موڑ کاٹا اور ہم سڑک پر آگئے جہاں شبنم کی کار فٹ پاتھ سے لگی بالکل سامنے موجود تھی۔ ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر میں نے شبنم کے ساتھ بیٹھ کے دروازہ بند کیا اور کہا "چلو۔"

اسی وقت رئیس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی "ابے۔ وہ کہاں گیا؟"

مگر میں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا کیونکہ اس سے پہلے ہی میں دیکھ چکا تھا کہ شبنم کا سر اسٹیئرنگ پر ہے۔ وہ ابھی تک برقع میں تھی لیکن گاڑی میں بیٹھ کے اس نے نقاب پیچھے الٹ دی تھی۔ اس کا چہرہ مخالف سمت میں گھوما ہوا تھا۔

میں نے چلا کے کہا "شبنم۔۔۔" اور پھر اسے سیدھا کرنے لگا۔

رئیس نے کہا "اسے کیا ہوا۔۔۔ مر گئی؟"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ فیکا اس کو ناک آؤٹ کر کے بھاگ گیا۔ چل تو اسے پیچھے لے جا۔"

اوپر کفایت بلڈنگ میں لوگ جاگ اٹھے تھے۔ اس کا اندازہ ان لائٹوں سے ہوتا تھا جو مختلف کھڑکیوں میں نظر آنے لگی تھیں۔ نہ جانے کس نے کھڑکی سے منہ نکال کے کہا۔ "اوئے اے کی ہو ریا جے' رات نوں ویں سون نئیں دیندے اد"

رئیس دروازہ کھول کے اترا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والے دروازے سے بے ہوش شبنم کو باہر کھینچا۔ بلڈنگ کی تیسری منزل سے کوئی چلانے لگا "اوئے وہ

دیکھو گاڑی میں کیا ہو رہا ہے؟"

چوتھی منزل کی بالکونی سے جو زینے کی سیدھ میں تھی ماسٹر صاحب مرحوم کا داماد شور کرنے لگا "پولیس۔۔۔ پولیس۔ اوئے پکڑو انہیں۔"

ایک چہرہ دروازے میں نمودار ہوا "چوکیدار۔۔۔ چوکیدار کدھر ہے؟"

رئیس اس وقت تک شبنم کو پیچھے ڈال کے دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے فوراً شبنم کی جگہ سنبھالی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چابی شبنم کے پرس میں یا اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں رئیس میرے ساتھ آکے بیٹھتا' بہت سے لوگ اوپر سے چلانے لگے تھے اور جب میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو تین جی دار بندے کار کے ساتھ روڈ کے مقابلے میں شرکت پر آمادہ تھے۔ وہ کفایت بلڈنگ سے نکل کے ہماری طرف آرہے تھے۔

ان میں سے ایک نے لنگی کو کستے ہوئے کہا "کھلو جا تیری تے۔"

دوسرے نے مایوسی کی کیفیت میں سڑک پر سے پتھر اٹھا کے پھینکا اور زیادہ وزن دار گالی دی۔ جواب میں رئیس نے وہ حرکت کی جو بیک وقت احمقانہ بھی تھی اور عاقلانہ بھی۔ اس نے جوش میں کھڑکی سے سر نکال کے جوابی گالی دی اور ایک ہوائی فائر کردیا۔ کفایت بلڈنگ کی مختلف منزلوں اور کھڑکیوں میں سے شور مچانے والے چہرے ایک دم غائب ہو گئے۔ ریس لگانے والے تینوں پلٹ کر بھاگے تو جو سب سے پیچھے لنگی کس رہا تھا' وہ سب سے آگے ہو گیا۔ تاہم اس کا نقصان یہ ہوا کہ رات کی خاموشی میں فائر کی آواز بہت دور تک سنی گئی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اِکا دُکا گاڑی والوں نے چیخ پکار شاید نہ سنی ہو مگر فائر کی آواز ضرور سنی ہو گی۔

تاہم میں نے رئیس سے کچھ نہیں کہا اور گاڑی کو دوڑاتا ہوا اس سڑک پر چلتا گیا جو آنے والی ٹریفک کے لیے مخصوص تھا۔ صحیح کین میں آنے کے لیے مجھے بہت آگے کسی کٹ تک جانا پڑتا اور واپسی میں ہم پھر کفایت بلڈنگ کے سامنے سے گزرتے تو یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی بیچ کرسی یا چارپائی ڈال کے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی جاتی۔

ایک کلومیٹر کا فاصلہ ایک منٹ میں طے ہو گیا تھا تو میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ شبنم برقع سمیت سیٹ پر سمٹی پڑی تھی۔ مجھے سڑک کے کنارے ایک بس کھڑی نظر آئی۔ میں نے اس کی دوسری سائڈ میں چھوٹی سی کار کو روک لیا اور پیچھے والا دروازہ کھول کے شبنم کی حالت دیکھی۔ وہ بدستور بے ہوش تھی۔ میں نے اس کا برقع ہٹایا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے دو چار بار گالوں کو تھپکی دی۔ میں نے اسے آواز بھی دی مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔

"یار' کیا اس کی حالت خطرناک ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "میں کیسے بتا سکتا ہوں؟"

"چل اسے اسپتال لے جاتے ہیں" رئیس بولا۔

میں نے ہاتھوں سے شبنم کے سر کو ٹٹولا اور اپنی انگلیوں سے بالوں کے اندر کسی چوٹ کے آثار تلاش کیے مگر نہ بالوں میں خون تھا اور نہ کوئی شکست و ریخت کی کوئی علامت تھی۔ صرف ایک جگہ مجھے معمولی سا ابھار محسوس ہوا۔

"ایسی گہری چوٹ تو نظر نہیں آتی" میں نے کہا "دیکھ کہیں سے پانی مل جائے تو۔"

"پانی!" رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بس میں چڑھ گیا۔ اس خیال سے کہ شاید مسافروں کے لیے رکھا جانے والا واٹر کولر اندر موجود ہو۔ واٹر کولر ہی نہیں' اندر گلیسز بھی موجود تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"کون ہے۔ کیا چاہیے؟" وہ گھبرا کے بولا۔

رئیس نے اسے تسلی دی "ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

"اوئے صاف کہو نا کہ کولر چوری کرنے آیا تھا۔ پانی پینے کے لیے اور کوئی جگہ نظر نہیں آئی تجھے۔ چور دے پتر' میرے جوتے بھی اٹھا لیتا تو۔"

رئیس نے حیرت انگیز صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا "یار' یہ گاڑی کھڑی ہے ہماری۔۔۔ میری۔۔۔ بھابی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی اچانک۔ وہ بے ہوش ہے۔۔۔ تو دیکھ لے نیچے اتر کے بے شک۔"

گلیسز کچھ شرمندہ ہوا۔ "اچھا۔ آگے رکھا ہے کولر۔ گلاس بھی ہے" وہ پھر چادر سر تک تان کے سو گیا۔ اعتماد کا یہ اظہار' معذرت کا ایک انداز تھا۔ رئیس اسٹین لیس اسٹیل کے گلاس میں پانی لے آیا۔ میں نے شبنم کے منہ پر چھینٹے مارے اور پھر اس کا سر اوپر اٹھا کے اسے ایک گھونٹ پانی کا پلایا تو وہ کراہنے لگی۔ میری تشویش دور ہو گئی۔

میں نے کہا "شبنم۔۔۔ ہوش میں آؤ۔"

اس نے اپنا سر تھام کے کہا "میرا سر۔۔۔ اس نے۔۔۔ آف۔ پیچھے سے۔"

میں نے کہا "وہ بھاگ گیا۔ کوئی بات نہیں' تم ٹھیک ہو نا' کیا ہم اسپتال چلیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے نفی میں سرہلایا "نہیں۔۔۔ میں ٹھیک۔۔۔ ہوجاؤں گی۔"

میں نے ہنس کے کہا "چل تو ڈرائیونگ کر۔ پہلے یہ گلاس واپس رکھ۔"

اس نے غصے سے کہا "دل تو چاہتا ہے قسم اللہ کی کہ اب اٹھالاؤں کولر۔ سؤر کا بچہ مجھے چور کہہ رہا تھا۔ ابے شکل سے ہم شریف نظر آتے ہیں۔"

سیٹ پر اتنی ہی جگہ تھی کہ شبنم سٹ کریٹ سکتی تھی۔ جب میں اس کے پاس بیٹھا تو مجھے اس کا سر اپنی گود میں رکھنا پڑا۔

"سوری ناصر۔ مجھ سے۔۔۔ کوتاہی ہوگئی۔ مجھے کیا پتا تھا۔"

میں نے کہا "غلطی تم سے زیادہ رئیس کی ہے۔"

وہ بگڑ کے بولا "ابے واہ۔ اپن کیا کرتے' یہاں کھڑے رہتے پستول لے کے تو اوپر تیرا آئیٹ بنادیتے' فیکے کے یار۔"

"آئیٹ تو میں نے بنادیا تھا ان کا۔"

شبنم نے آہستہ سے کہا "ہوش میں آنے کے بعد۔۔۔ وہ مکر کیے پڑا رہا۔ ریوالور تھا میرے ہاتھ میں۔۔۔ مگر۔۔۔ اس نے میرا سر آگے۔۔۔ اسٹیئرنگ پر مارا۔ دو بار۔۔۔ اور مجھے۔۔۔ چکر آگیا۔۔۔ پھر مجھے نہیں پتا۔"

"وہ بھاگ گیا یقیناً اور یہ بہت بُرا ہوا کیونکہ اب وہ سیدھا جائے گا ملک کے پاس اور اسے سب بتادے گا" میں نے کہا۔

"میں۔۔۔ آفس جاؤں گی" شبنم نے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ اس حالت میں۔۔۔؟"

"میں۔۔۔ ٹھیک ہوجاؤں گی۔ میرا آفس جانا ضروری ہے" اس نے ضد کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی۔

"ایسی کون سی ضروری خبر ہے؟" میں نے کہا۔

"ماسٹر اور اس کی بیوی کو قتل کرنے والا اس کا پڑوسی تھا۔ فائق علی۔۔۔ جو اب فرار ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟ اور کیا فائدہ ہوگا اس خبر سے۔ ابھی تک اس شک کا اظہار کسی نے نہیں کیا۔ تم خبر دوگی تو سب کی توجہ تمہاری طرف ہوجائے گی۔ ملک معلوم کرلے گا کہ صرف ایک اخبار میں یہ خبر کیسے آئی اور اس نے تم پر شک کیا کیونکہ تم ایسے دھماکے کرتی رہی ہو۔ تو وہ فیکے سے کہے گا کہ اس برقع والی عورت کا چہرہ دیکھا تھا تو نے؟ بغیر برقع کے دیکھا تو پہچان لے گا نا؟ اور فیکا تمہیں دیکھے گا تو قسم اٹھانے کو تیار ہوجائے گا کہ یہ وہی عورت ہے۔"

"اپنا یار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہارے لیے بہت خطرہ ہے ایسی خبر دینے میں" رئیس نے کہا۔

"اس کے علاوہ۔۔۔ فی الحال سسپنس رکھنا ضروری ہے۔ فیکا بتا ہی نہ سکے کہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کون آیا تھا۔ دیکھیں وہ ملک کو کیا بتاتا ہے اور ملک کیا اندازے قائم کرتا ہے۔ وہ سمجھ تو جائے گا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ فیکے کے سامنے اس مجسمے کی مورتی رکھ کے یہ پوچھنے والے دوست نہیں ہوسکتے کہ یہ سرکس کا ہے۔ خادم کو کس نے قتل کیا اور کہاں گاڑا؟ ملک کے پاس کس قسم کا سامان آتا ہے اور کہاں جاتا ہے' خان کارپوریشن کیا ہے؟"

رئیس نے کہا "وہ ڈر جائے گا قسم اللہ کی کہ ہو نہ ہو' اس کے خلاف سرکاری تفتیشی ادارے حرکت میں آگئے ہیں۔"

"اسی لیے میں کہتا ہوں کہ فی الحال خاموشی سب سے بہتر ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو پھر مجھے گھر چھوڑ دو۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "تمہیں اس حالت میں گھر پر اکیلا چھوڑ کے میں چلا جاؤں؟ کیا یہ ممکن ہے؟"

اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر میری گود میں لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ میری گردن میں حمائل ہوگئے "اگر وہ مجھے مار جاتا۔۔۔ تو؟"

میں نے کہا "تم کیسا جواب سننا چاہتی ہو' جذباتی' رومانٹک۔"

"ہاں۔۔۔ اور کچھ نہیں" وہ بولی۔

میں نے کہا "تو جانِ من' میری دنیا تیرہ و تار ہوجاتی۔ حیات مستعار بے کار ہوجاتی۔ طبیعت زیست سے بیزار اور زندگی درپے آزار ہوجاتی۔ میری جان' راہِ وفا میں نثار ہوجاتی۔"

وہ مسکرائی "جھوٹے۔ شاعری کرتے ہو۔ شاعری میں مبالغہ آرائی کے سوا کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے تمہاری آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکتا۔"

"پتا ہے تو پھر پوچھتی کیوں ہو۔ مگر تم دیکھنا' وہ حرام زادہ میرے ہاتھ آجائے ایک بار۔ پھر۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"میں شکریہ ادا کروں گا اس کا" میں نے بتیسی کی نمائش

کی "کہوں گا بڑی مہربانی آپ کی فیکے صاحب! میں نے تو بڑی مار لگائی تھی آپ کو مگر آپ نے پھر بھی شبنم کو اتنا ہلکا ہاتھ مارا۔ نازک سی لڑکی سمجھ کے۔"

رئیس نے گاڑی روکی اور بولا "چلو آجاؤ اندر۔ میں اپنی گاڑی باہر کھڑی کرتا ہوں اور اس گاڑی کو بھی اندر لاتا ہوں۔ فی الحال یہ بھی مشکوک ہوگئی ہے۔"

شبنم کو ہم نے ایک بیڈ روم میں زبردستی لٹادیا۔ اس کے سر میں درد ہونا لازمی تھا۔ رئیس نے چائے کے ساتھ اس کو اسپرین دی۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی مگر میں نے کہا کہ اب صبح کریں گے باتیں۔ میں اس وقت تک اس کے پاس بیٹھا رہا جب تک وہ سو نہیں گئی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس کے لیے کتنا متفکر تھا اور اس خیال سے بھی خائف تھا کہ کہیں فیکا فرار ہوتے ہوئے واقعی شبنم کو جان سے مار دیتا تو کیا ہوتا۔ وہ ایک بہتا کتنا مرد تھا اور شبنم اس کے مقابلے میں بہت نازک سی لڑکی لیکن ایک تو مار کھانے اور زخمی ہونے سے اس کی توانائی زائل ہوچکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شبنم کے پاس ریوالور ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ ریوالور رئیس لے گیا ہوگا۔ اسے بھاگنے کی جلدی تھی ورنہ ہم آجاتے تو موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ اگر شبنم اس سے الجھ جاتی تو شاید وہ فرار نہ ہوپاتا۔ ان سب عوامل نے شبنم کی جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے باوجود خوش قسمتی کا دخل زیادہ رہا ورنہ شبنم کا گلا گھونٹنا یا اس کی گردن توڑنا فیکے کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

رئیس کے گھر میں ایک اور صدمہ جانکاہ منتظر تھا۔ میں نے دیکھا تو وہ بستر پر اداس صورت بنائے بیٹھا تھا۔

میں نے کہا "پریشان مت ہو' فیکے کے لیے۔۔۔ سوچا۔"

"بھاڑ میں گیا فیکا۔" وہ رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"تجھے کیا ہوا ہے آخر؟"

"یار' وہ شہید ہوگیا۔" وہ سر جھکا کے ٹپ ٹپ آنسو گرانے لگا۔

میں لیٹا تھا اٹھ کے بیٹھ گیا "ابے کون مرگیا؟ خدانخواستہ وہ جو تیری چنڈال چوکڑی تھی۔ اس میں زیادہ عمر تو چاچا پتنگ باز کی تھی اور وہ تیرا بلینڈ تیرا یار جو انسپکٹر نذیر بنا پھرتا تھا۔"

"ابے نہیں' اپنا عمران خان مرگیا۔۔۔ شیردا پتر شہید ہوگیا۔"

میں نے پہلے سوچا کہ اسے گالی دوں کہ ایک مرغا مرگیا تو کون سی قیامت آگئی۔ ایسے زار و قطار رونے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر میں نے اس کے جذبات کو ملحوظ رکھا اور اسے تسلی دی "ابے رو مت' اتنی بہادری سے لڑا تھا وہ۔۔۔ اور بہت زخمی کردیا تھا اس شرابی گوسکر نے اسے۔۔۔ اور تو نے ہی کہا تھا کہ پہلے بھی ایسا ہوا ہے۔"

اس نے آنسو پونچھے "ہاں یار لیکن اس وقت دوسرا بچھا تیار ہوتا تھا جو عمران خان کا جانشین بن جاتا تھا۔"

"چل ابھی نہ سہی' کچھ دن بعد ہوجائے گا۔۔۔ یہ ویسے بھی لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔"

"ابے اگلے چھ مہینے تک اپن کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے اور یار لوگ جانتے بوجھتے ہر ہفتے آجائیں گے جرمانہ وصول کرنے۔"

"جرمانہ کیسا؟"

"یہ بھی رسم ہے یار۔ کوئی چیلنج ہی قبول نہ کرے تو ہزار روپے دے۔ ورنہ آجائے مقابلے پر۔ ہار میں زیادہ بے عزتی ہوتی ہے۔ جرمانہ تو دے سکتا ہے آدمی عزت بچانے کے لیے۔ کوئی بہانہ بنا کے۔"

"تو مت بتانا کسی کو کہ عمران خان فوت ہوگیا۔ میرا مطلب ہے شہید ہوگیا ہے" میں نے کہا۔

"اگلے مہینے مقابلے ہوں گے اور بہانے نہیں چلتے اس میں پیارے۔ کل سب کو معلوم ہوجائے گا۔ سب تعزیت کے لیے آئیں گے' تدفین کے بعد۔"

میں نے کہا "یار' مجھے افسوس ہے اور ہمدردی ہے مگر یہ سب ڈراما اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ایک مرغے کا سوئم' چہلم بھی ہوگا۔ اتنا تو اپنی ساس کے لیے کوئی نہیں کرتا۔"

سونے کی کوشش کے باوجود میں بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ مجھے ماسٹر اور اس کی بیوی کی موت کا جتنا دکھ تھا' اس سے زیادہ فیکے کے فرار ہونے کا صدمہ تھا۔ شبنم نے میرا بہت اچھا ساتھ نبھایا تھا اور بہت کچھ ثابت کردیا تھا۔ یہ کہ وہ جتنی بے باک صحافی ہے' اتنی ہی بے خوف اور مضبوط اعصاب کی عورت بھی ہے اور اس نے مجھے شاہ عالم تسلیم کرلیا ہے اور اسے میرے نام سے کوئی غرض نہیں۔۔۔ یہ کہ میرا ماضی جان لینے کے باوجود اس نے مجھے اپنے مستقبل کو اسی طرح میرے نام سے منسوب کر رکھا ہے جیسے پہلے تھا اور یہ کہ اس کی محبت کے جذبات کی کوئی انتہا نہ تھی' نہ ہے اور نہ ہوگی۔ اور یہ کہ وہ بھی کم حسین نہیں ہے چندا سے۔

پھر مجھے چندا کا خیال آیا۔ کیا اس کی جگہ شبنم ہوتی تو اس کا بھی ایسا ہی رویہ ہوتا۔ اتنی بے رخی سے وہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھکرا دیتی؟ میری مجبوری کو سمجھے بغیر؟ میری خطاکار انسانی کمزوری کو تسلیم کیے بغیر۔ میری شرمندگی اور معافی کی درخواست پر غور کیے بغیر۔ نہیں۔ شاید شبنم کا ردِعمل اس کے برعکس ہوتا۔ وہ خوش ہوتی کہ جو میرا تھا وہ بالآخر لوٹ کے میرے پاس ہی آیا۔ اسے وہ اپنی محبت کی جیت سمجھتی اور ناز کرتی۔ مجھے حوصلہ اور سہارا دیتی۔ امید اور اپائیت دیتی۔ مگر چندا نے تو۔

مگر میں چندا کا شبنم سے کیوں موازنہ کر رہا ہوں؟ میں نے سوچا۔ صرف اس لیے کہ چندا مجھ سے دور ہو گئی ہے اور شبنم میرے قریب آ گئی ہے؟ کیا بالآخر چندا ہار جائے گی اور شبنم کی جیت مکمل ہو جائے گی جو ابھی ادھوری ہے؟ خود میرے لیے یہ کیا ہے۔ ناامیدی اور دل شکستگی کا ردِعمل یا لاشعوری طور پر ایک انتقامی کھیل؟

جیسا کہ رئیس نے کہا تھا۔ میرے ماضی اور مستقبل کے درمیان وقت کی خلیج ہے اور میں اسے ملانے والے پل کے درمیان کھڑا سوچ رہا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ فیصلہ تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔ پل کے ادھر یا اُدھر۔ منزل ہے کہاں تیری۔ وقت کا دھارا بہہ رہا ہے۔ پل کے نیچے سے بہتے پانی کی طرح۔ لمحے گزرتے جا رہے ہیں۔ خیالات کے انتشار کی تیز ہوا مجھے ایک تنکے کی طرح اڑاتی رہی اور تھک ہار کے رات کے آخری پہر میں مجھے نیند نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ میں ایسا سویا کہ پھر میری آنکھ کھلی تو گھڑی صبح کے دس بجا رہی تھی مگر وہاں نہ خانے میں وہی رات کا اندھیرا تھا۔

میں نے لائٹ جلائی اور دوسرے کمرے میں جا کے دیکھا تو شبنم مزے سے بیٹھی چائے پی رہی تھی اور کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے مسکرائی۔

میں نے کہا "اور لوگ کہاں ہیں؟ رئیس اور تیس مار خان؟"

وہ ہنسی "عمران خان کی تدفین کے لیے گئے ہیں' چائے پیو گے؟"

میں نے انگڑائی لے کر نیند کے خمار کو کم کیا "پہلے نہاؤں گا۔ ناشتا کیا تم نے؟"

"نہیں۔ میں نے سوچا کہ تم اٹھ جاؤ پہلے۔"

"طبیعت کیسی ہے اب؟" میں نے کہا "کل رات پہلے تو میں ڈر گیا تھا۔ مجھے تم کو ایسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

"غلطی کسی کی نہیں تھی اور کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔ اب اس ذکر کو چھوڑو۔ میں ناشتا بناتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم نے آزاد صاحب سے بات کی؟ وہ پریشان ہوں گے؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا مگر انہوں نے کہا کہ ناصر عظیم تمہارے ساتھ تھا تو پریشانی دونوں کی طرف سے تھی گویا۔ یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا رات کے ایڈونچر کے بارے میں۔"

"یہ تو بتایا ہوگا کہ رات کہاں تھیں۔ اور اس وقت کہاں ہو؟"

"ہاں۔ میں نے کہا کہ تمہارے ساتھ تھی اور اس وقت بھی ہوں" اس نے نظر جھکا کے کہا "یہ نہیں بتایا کہ کہاں ہوں۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "شبنم۔ وہ تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔ تم ان سے ایسے بات کرتی ہو۔ میرا مطلب ہے کیا انہیں بُرا نہیں لگتا۔"

"وہ عادی ہیں اس کے۔ میں نے عادی بنا لیا ہے۔"

"یعنی وہ اسے پسند نہ کریں مگر برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ جذباتی بلیک میلنگ اچھی بات تو نہیں۔"

وہ بولی "جذباتی بلیک میلنگ مجھے بھی پسند نہیں۔ میں حقیقی ماں باپ کو بھی اپنی زندگی پر اس حد تک اختیار نہ دیتی کہ وہ میری زندگی کے مالک بن جائیں اور اسے اپنے فیصلوں پر قربان کر دیں۔ بڑے خود غرض ہوتے ہیں ماں باپ اس معاملے میں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ وہ اپنی خوشی دیکھتے ہیں۔ سب کچھ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں کہ اولاد کیا کرے گی اور کیا نہیں کرے گی۔ ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور پالا پوسا' پڑھایا لکھایا' دوسری یہ کہ ہمارا تجربہ زیادہ ہے کیا ہم اولاد کا برا چاہیں گے۔ ورنہ اپنا حق جتائیں گے۔ بیٹی ہو تو اس کی شادی اس سے پوچھے بغیر جہاں چاہیں کر دیں۔ بعد میں چاہے وہ ساری عمر روتی رہے۔ کسی کو بیٹی سے زیادہ بھائی مرحوم کا بیٹا عزیز ہے یا مرحومہ بہن کی وصیت کا خیال ہے۔ بیٹا ہو تو وہ کہیں گے کہ ڈاکٹر بنو۔ باہر جانا چاہے تو روئیں گے کہ ہمارا کیا ہوگا؟ بڑھاپے میں ہمارا خیال رکھنے والا کون ہے یہاں اور بیٹا ان کے چند سال کے مستقبل پر اپنا مستقبل قربان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیا یہ خود غرضی نہیں ہے؟"

"میں معاشرتی روایات کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی محبت نہیں کر سکتا۔"

"بیوی کرتی ہے" اس نے بڑے دعوے سے کہا "بیٹی کرتی ہے اور میں نے تو یہ روگ پالا ہی نہیں۔ میری ایک

زندگی ہے۔ یہ میں اپنی مرضی سے جیوں گی۔ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ بدنامی میری نیک نامی میری۔ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنا اچھا بُرا سمجھتی ہوں۔ کسی اور کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں میری۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جہاں بھی تم رہو گے۔"

میں نے کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"کیوں؟ اب کس کا ڈر ہے؟ پہلے تو رخشی تھی تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "وہ بیوی تھی میری۔ تمہارے ساتھ میرا کون سا رشتہ ہے؟"

"محبت کا رشتہ کافی نہیں ہے کیا؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔

"نہیں۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میری تربیت نے میری فطرت اور مزاج میں اخلاقی قدریں ڈال دی ہیں۔ میں مذہبی پابندیوں سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ یہ قانونی طور پر بھی غلط ہے۔"

شاید اسے کچھ سبکی محسوس ہوئی "پہلے کبھی ایسا نہیں سوچا تم نے؟"

میں نے کہا "یہ میں آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ پہلے والی بات میرے سامنے مت کرنا۔ میں نے جو غلطیاں کی تھیں' گناہ کیے تھے یا جرائم' اب مجھے ان کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ انہیں دہرانا نہیں ہے۔"

وہ خفیف ہو کے بولی "چلو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں۔"

"سوری شبنم۔ فی الحال میں اپنی شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ ایک ایسی ذمے داری ہے جو میں پوری نہیں کر سکتا۔"

"میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔"

"فضول بات مت کرو۔ شادی خود ایک بوجھ ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بالکل غیر مشروط۔ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"ہمارے ساتھ رئیس بھی تو ہے" وہ میرا خراب موڈ دیکھ کے ڈر گئی۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ کہیں رئیس ساتھ نہ ہو۔"

"پھر میں اپنا بندوبست کر لوں گی۔ دیکھو مجھے غلط مت سمجھو' میں ایسی ویسی لڑکی ہوتی تو مجھے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی۔"

میں نے کہا "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں تمہارے جذبات کو اور ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک مضبوط کردار کی مالک ہو۔"

"تم بدنامی سے ڈرتے ہو؟۔ اب بھی۔"

میں نے کہا "اب میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں۔ میں خود کو کسی آزمائش میں ڈالنے سے ڈرتا ہوں۔ خطائے آدم سے ڈرتا ہوں۔"

اس نے کہا "اگر میں وعدہ کر لوں۔ کہ ساتھ رہ کے بھی تم سے دور رہوں گی۔"

میں نے کہا "وعدے پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ جذبات کی ندی میں باڑھ آ جائے تو سارے ارادے اور خود سے کیے ہوئے وعدے ریت کی دیوار کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی سکتے ہیں مگر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے خواہ ان کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کا معاہدہ کرانے والا' نعوذ باللہ خود خدا ہو۔ یہ شیر کی حیوانی فطرت کے خلاف ہے۔ جب وہ بھوکا ہوگا تو بکری کو کھا جائے گا۔ اب اس سے زیادہ میں کیا کہوں؟"

وہ مسکرائی "ابھی تم نے میرا دوسرا روپ دیکھا نہیں ہے۔ اگر میں نہ چاہوں تو مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے تم بھی۔ میں تمہیں قتل کر دوں گی یا اپنی جان لے لوں گی۔"

میں اسے دیکھتا رہا "اتنا بھروسا ہے خود پر؟"

"آزما کے دیکھ لو" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میرے ساتھ تمہارے مستقبل کا انحصار اسی آزمائش میں تمہاری کامیابی پر ہوگا۔"

اس کا چہرہ مسرت کی مسکراہٹ سے روشن ہو گیا "مجھے منظور ہے" اس نے کہا اور اٹھ کے مجھے چوم لیا۔

میں نے گھبرا کے کہا "یہ کیا۔ عہد کرتے ہی عہد شکنی۔"

وہ ہنسی "عہد یہ ہے کہ میری مرضی کے بغیر تم مجھے ہاتھ تک نہیں لگا سکتے مگر تم خود کو کیسے بچاؤ گے مجھ سے' یہ تمہارا کام ہے۔"

میں نے مسکرا کے اپنی بانہیں پھیلائیں "یعنی میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔"

وہ ہنس کے آگے بڑھی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آئی' میں نے اسے ایک ہاتھ سے بڑی نزاکت کے ساتھ یوں تھاما جیسے اسے سینے سے لگانا چاہتا ہوں پھر میں نے اسے اٹھا کے بیڈ پر پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر شرمندہ سی پڑی رہی اور پھر اٹھ بیٹھی "یہ بدمعاشی۔!"

میں نے کہا "اور یہی بدمعاشی میں تمہیں بھی سکھاؤں گا۔ دنیا میں شرافت نام کی کوئی چیز نہیں رہی مس شبنم۔ تم نے دیکھا کل کتنی آسانی سے تم کو ناک آؤٹ کر کے نکل گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیکا۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس ریوالور نہیں تھا۔ وہ رئیس لے گیا تو تم خالی ہاتھ ایک کمزور اور نازک اندام لڑکی رہ گئیں۔"

"تم۔۔۔ تم مجھے سکھاؤ گے یہ سب' جوڈو کراٹے۔۔۔؟"

میں نے کہا "میں اسے مارا ماری کہتا ہوں۔ ایسے بہت سے مارشل آرٹ ہیں۔ نن چکو' کنگ فو' میں نے ان سب کے ساتھ فری اسٹائل ریسلنگ اور ویسی کشتی کے داؤ پیچ ملا کے جو فن ایجاد کیا ہے وہ مارا ماری ہے۔ ہے نا بالکل جاپانی نام۔ ہارا کاری جیسا۔"

"ہارا کاری تو خودکشی کی رسم ہے جو جاپانی ایک مقدس فریضہ سمجھ کے سرانجام دیتے ہیں مگر مارا ماری بڑا دلچسپ نام ہے۔ خالص ہماری تہذیب کا آئینہ دار۔ میں سیکھوں گی تم سے مارا ماری" وہ جوش سے بولی۔

"اس کے بغیر تم ہر جگہ غیر محفوظ رہو گی" میں نے کہا۔

"میری حفاظت خاک کرو گی۔"

میں نے باتھ روم کا رخ کیا تو وہ چلائی "نہانے جا رہے ہو۔ یہ دیکھ لو کہ پھر صورت یہ نہیں رہے گی۔ بسہ جائے گا سارا عارضی میک اپ۔"

میں نے کہا "اب مجھے ضرورت بھی نہیں اس صورت کی۔ جیسے تمہیں ضرورت نہیں رہی برقع کی۔"

"وہ میں واپس کر آؤں گی' خالہ کو ضرورت ہو گی۔"

میرے غسل سے فارغ ہونے تک شبنم نے ناشتا میز پر لگا دیا تھا۔ میں نے غور سے سب چیزوں کو دیکھا۔

شبنم نے خفت سے کہا "سلائس کچھ جل گئے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ کچھ جلنے سے رہ گئے ہیں۔ باقی کو ٹلا ہو گئے ہیں اور ماشاءاللہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟"

اس نے کہا "آملیٹ ہے اور کیا ہے؟"

"اچھا ایسا ہوتا ہے آملیٹ!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "بڑی محنت ہوئی ہو گی انڈوں کا حشر نشر کرنے میں؟"

وہ خفا ہو گئی "نہیں آتا مجھے یہ سب کچھ۔ میں نے کبھی نہیں کیے ایسے کام۔"

"اللہ نظر بد سے بچائے۔ بس دیکھنے ہی دیکھنے کی ہو گیا" میں نے آزاد صاحب کے لہجے کی نقل اتاری "لڑکی نظر آتی ہو ابھی مگر لڑکیوں والے گن نہیں ہیں۔"

وہ جھینپ کر بولی "میں۔۔۔ سیکھ لوں گی۔۔۔ دراصل سکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ آزاد صاحب کیا سکھا سکتے تھے' ہاں ان کی بیوی ہو تیں۔۔۔"

"بیوی ہوتی تو کب کی خودکشی فرما چکی ہوتی گویا مگر خیر۔۔۔ ہم یہ بھی سکھائیں گے تمہیں' عزیزہ۔ ہر فن مولا ہیں ہم لیکن چائے ٹھیک نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کہ چائے رانی تمہارے سر عزیز کی قسم' تمہارے سر پر توڑ دیں گے۔"

وہ ہنسی "کیوں نہ ہم ناشتا باہر کر لیں؟"

"عافیت اسی میں ہے۔ تمہاری بھی اور میری بھی" میں نے کہا۔

ہم اوپر گئے تو گیراج میں جہاں رات کو شبنم کی گاڑی کھڑی تھی' وہاں اب رئیس خان کی سیاہ شیشوں والی آلٹو موجود تھی۔

"رئیس میری گاڑی لے گیا" شبنم نے کہا۔

"دیکھو۔ جیسے آزاد صاحب نے اپنی کار کو کار کہنا چھوڑ دیا ہے' اس سے دوسری کاروں کے جذبات مجروح ہوتے تھے' ایسے ہی تم بھی اسے گاڑی مت کہو۔"

"پھر کیا کہوں' گدھا گاڑی کہنے سے گدھوں کے جذبات مجروح ہوں گے۔"

میں نے کہا "چاند گاڑی اچھا نام ہے۔ وہ کچھ ایسی ہی تھی۔"

"تھینک یو۔ تم نے مجھے چاند کہا۔ کیا میں تم کو سورج کہوں تاکہ محاورے کے مطابق چاند سورج کی جوڑی لگے ہماری۔"

اندر سے چابی لا کے میں نے آلٹو کو اسٹارٹ کیا "رئیس خان کوئی کام سوچے سمجھے بغیر نہیں کرتا۔"

"سوائے مرغ لڑانے کے" وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

"اور محبت کے" میں نے کہا "اس گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں۔ اور جہاں مجھے جانا ہے۔ وہاں میں اپنی اصل صورت میں جانا چاہتا ہوں' تمہارے ساتھ۔"

"تم چندا سے ملنے جا رہے ہو۔ یا مجھے ٹلوانے لے جا رہے ہو؟" شبنم نے اپنے سامنے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے اپنی ذہانت سے اندازہ قائم کرتے ہوئے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا۔ یہ خیال مجھے اچانک آیا تھا کہ میں کمال سے مل کے اس سے کمال اسپتال کی توسیع کے منصوبے پر تبادلۂ خیال کروں لیکن میرے لاشعور میں کہیں انتقام کی خواہش خوابیدہ تھی۔ میں چندا سے اپنی تذلیل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں نے کہا "مقصد صرف یہی نہیں۔"

"مگر یہ بھی ہے" وہ بضد رہی۔

"اوکے۔ یہ بھی ہے لیکن میں تم کو اپنے ماضی سے متعارف کرانا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں شک نہ رہے۔"

"شک کیسا۔ کیا تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔"

میں نے کہا "تم خود اندازہ کر لینا۔ اصل مقصد کچھ اور

تھا۔ میں کمال سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا پسند کرے گا۔ اضافی وارڈ یا مشینیں اور لیبارٹری۔۔۔ اور آپریشن تھیٹر۔"

"میرے یہ کپڑے کچھ ٹھیک نہیں ہیں" شبنم نے خود اپنا جائزہ لیا "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میرے گھر کی طرف سے چلو' بس دس منٹ لگیں گے مجھے۔"

"اعتراض کیا ہو سکتا ہے مجھے۔ بس آزاد صاحب سے ڈر لگتا ہے۔"

"ان سے یا چلبلی کے مزاج سے؟"

میں نے کہا "دونوں باتیں ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا کہ یہ کیا شرفا کے اطوار ہیں۔ شبنم کو اپنے ساتھ لے گئے تو واپس لانا ہی بھول گئے۔ وہ چھڑی سے مار مار کے پوچھیں گے کہ سچ بتاؤ' کہاں تھے رات بھر؟"

آزاد صاحب واپس آ کے سوئے ہی تھے کہ انہیں دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کے آنا پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ شرمندگی شبنم کو نہیں تھی مگر آزاد صاحب اپنی بے بسی پر شرمندہ تھے کہ اس سے کوئی جائز سوال بھی نہیں کر سکتے تاہم انہوں نے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک خود سر لڑکی کے خودرا رباب کی مجبوری پر مجھے افسوس ہوا۔

وہ اخلاقاً میرے ساتھ بیٹھ کے اونگھتے رہے "میاں وہ کیا سلسلہ ہو گیا پُراسرار واقعات کا۔ ہم نے سنا ہے کہ مرحوم استاد مکرم کا کوئی ہمسایہ تھا فائق علی؟"

میں نے کہا "آپ کو کس نے بتایا؟"

"منکر نکیر نے۔" وہ بولے "میاں مکمل سوالات میں تم طاق ہو گیا۔ بھئی اخبار والوں کو الہام ہوتا ہے اور الہام نہ تو فرشتے بتاتے ہیں گویا۔ سارا شہر گمنام فون کرتا رہتا ہے۔ رات فائق علی کا اغوا ہو گیا۔ کوئی مرد جواں تھا سیہ رو ہمراہ ایک برقع پوش حسینہ کے۔ دروغ بر گردن راوی۔ انہوں نے فائق علی پر استاد مکرم کے قتل کا الزام عائد کیا گویا۔۔۔ اور پھر اسے اٹھا لے گئے۔"

میں نے بات کو گول کر دینا بہتر سمجھا "جو حقیقت ہو گی سامنے آ جائے گی۔"

انہوں نے جیسے نیند سے چونک کے کہا "آ جائے گی کیا مطلب؟ بھئی آ گئی۔ تم شبنم کی بات کر رہے تھے نا۔"

میں نے آزاد صاحب کی عیاری اور اداکاری کو دل ہی دل میں سراہا۔ انہوں نے بڑی صفائی سے اصل بات کا رخ پلٹ دیا تھا۔ کسی مداری کی طرح جو ہاتھ کی صفائی سے رومال بدل دے اور کہے کہ رنگ بدل گیا ہے۔ شبنم لباس بدلنے کے ساتھ میک اپ کر کے لوٹی تھی۔ معلوم نہیں کیوں' اس کے لیے اچانک لباس کا معاملہ اتنا اہم کیوں ہو گیا تھا۔ وہ ایک پتلون اور مردانہ قمیص میں گھومنے والی لڑکی تھی جس کا چہرہ ہمیشہ میک اپ کے بغیر نظر آتا تھا۔

اس وقت میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ لباس کے رنگ اور تراش خراش میں ذوق حسن کے استعمال سے اور آرائش حسن کے کمال سے حسن کا انداز جلوہ گری اتنا ہو شربا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے اب گہرے نیلے رنگ کے ریشمی کپڑے کا سوٹ پہن لیا تھا جس کی شلوار تو خیر سادہ تھی مگر قمیص پر زرد بسنتی پھول کھلے ہوئے اور دوپٹے پر یہی پھول کچھ چھوٹے تھے تو (کرشن چندر کی زبان میں) ایسا لگتا تھا جیسے اس نے تاروں بھرے آسمان کا کوئی ٹکڑا اوڑھ لیا ہو۔

وہ میری محویت کے انداز سے دل ہی دل میں خوش ضرور ہوئی ہو گی۔ اس کے چہرے پر حیا کی لالی ذرا دیر کے لیے جھلکی پھر اس نے کہا "زیادہ دیر تو نہیں لگائی میں نے" اور میں نے اس کے سوال میں چھپا ہوا سوال سمجھ لیا کہ میں کیسی لگ رہی ہوں اب؟

کوئی جواب دیے بغیر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح شبنم کے ساتھ چندا کے اور قمر کے سامنے جاتے ہوئے اب کچھ ندامت آمیز جھجک کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کا اظہار بڑے غلط انداز میں کیا۔

میں نے شبنم سے کہا "اتنا اہتمام کیا ہے تم نے۔۔۔ جیسے ہم اسپتال نہیں کسی شادی کی تقریب میں جا رہے ہیں۔"

اس کا چہرہ مایوسی سے بجھ گیا "آئی ایم سوری۔ اگر یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

میں نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا "نہیں۔۔۔ لگ تو بہت اچھا رہا ہے۔"

"میں بدل لیتی ہوں۔ پانچ منٹ میں" وہ منہ سجا کے بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اب رہنے دو اور دیکھو' ایسے مسکراتے خوش رنگ پھولوں کے ساتھ تم بھی مسکراتی ہوئی زیادہ اچھی لگو گی۔"

اس کے باوجود شبنم کا موڈ اسپتال پہنچنے تک خراب رہا۔ میں گاڑی کو سیدھا گزار کے پچھلی طرف لے گیا اور قمر کے گھر کے سامنے روک دیا۔ کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اندر سے ہی دیکھ لیا اور بھاگی ہوئی آئی۔

"بھائی۔ آج میں آپ کو یاد کر رہی تھی" وہ مجھ سے چمٹ گئی "میری سالگرہ ہے نا آج' تحفہ لائے؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "تحفہ! ابھی لاتا ہوں۔ سالگرہ کا کیک پہلے' تحفہ بعد میں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا منہ پھول گیا "بھول گئے نا۔ یاد نہیں ہوگی میری سالگرہ۔"

"یاد ہے بابا۔ سب یاد ہے۔ شبنم' یہ میری پاگل بہن ہے قمر۔ چاکلیٹ کھاتی نہیں' چرتی ہے اور قمر۔! یہ شبنم ہیں۔"

"یہ شبنم ہیں؟" اس نے حیرانی سے منہ کھول کے ہاتھ ملایا "وہی جو بڑی مشہور صحافی ہیں۔ مگر اتنی خوب صورت۔"

میں نے ہنس کے کہا "دیکھا۔۔۔ ٹھیک کہا تھا میں نے۔ پاگل ہے نا یہ؟"

شبنم نے مسکرا کے کہا "تم خود اتنی پیاری ہو' اپنے نام کی طرح۔"

قمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "آئیں۔ اندر آئیں آپ۔ بھائی' یہاں کیوں کھڑے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم سیدھے یہاں آگئے تھے۔ میں اس الو کے پٹھے سے مل آؤں ورنہ وہ گالیاں دے گا۔"

"یہ الو کا پٹھا کون ہے؟" شبنم نے کہا۔

"اپنے بہنوئی کو کہہ رہے ہیں اور وہ بھی میرے سامنے" قمر نے خفگی سے کہا۔

"ارے یہ ڈاکٹر کمال فاروقی کا اصل نام ہے" میں نے کہا۔

"اچھا جلدی سے آجائیں مل کے۔ میں چائے بناتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گی پھر سالگرہ ہے شام کو" قمر بولی۔

شبنم ہنسی "یعنی آج کا سارا ون بک کرالیا تم نے؟"

اسپتال کی طرف پیدل جاتے ہوئے میں نے شبنم کو بتایا کہ قمر بہت جلد مجھے ماموں کے عہدے پر فائز کرنے والی ہے۔

"کتنی معصوم اور محبت کرنے والی ہے تمہاری یہ بہن!" شبنم نے کہا۔

"کمال فاروقی بھی کمال کا آدمی ہے۔ بہت محبت کرنے والا شوہر اور دوست مگر میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ محبت وہ اپنے کام سے کرتا ہے۔ اپنا سب کچھ اسپتال میں لگا دیا ہے اس نے۔ صرف قمر جیسی بیوی ہی گزارہ کرسکتی تھی اس کے ساتھ۔"

برآمدے میں اچانک کوئن میرے سامنے آگئی۔ وہ مجھے دیکھ کے جتنی حیران ہوئی اس سے زیادہ خوش ہوئی "مسٹر ناصر! آپ کہاں ہیں آخر۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ڈاکٹر کمال کے ساتھ ہوں گے۔"

"اب تم آگئی ہو تو سمجھو میں بھی آگیا۔" میں نے کہا اور شبنم کا اس سے تعارف کرایا۔

"مجھے تو زبردستی کھینچ لیا ڈاکٹر کمال نے۔ یہاں بھی وہی کام سونپ دیا مجھے۔ دواؤں کے اسٹور کا۔ ورنہ میرا کام افریقہ میں تھا۔ میرے والدین انتظار کررہے ہیں۔ خیر' یہ بھی وہی کام ہے۔ خدا کی مرضی ہے کہ میں یہاں کروں تو ٹھیک ہے۔ میں اور میرا شوہر خدا کی رضا میں خوش ہیں۔"

"شوہر۔۔۔ یعنی شادی کرلی ہے تم نے۔۔۔ مبارک۔۔۔ مبارک!"

وہ شرما کے بولی "جب میں افریقہ نہیں گئی تو وہ ادھر آگیا۔ میں تمہیں اس سے ملواؤں گی۔ بہت اچھا آدمی ہے۔"

میں نے کہا "برا مت ماننا۔ وہ تم سے اچھا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ تم سے اچھا انسان کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔"

اس نے سینے پر صلیب بنائی "ایسا مت کہو۔ میں تم سے زیادہ گنہگار انسان ہوں۔ یہ تمہاری واقف ہے نا صرا!"

میں نے کہا "نہیں۔۔۔ ایک دوست ہیں۔ میرے ساتھ کام کرتی ہیں۔"

شبنم کا چہرہ لال پڑ گیا تھا "ویسے یہ خود فی الحال کوئی کام نہیں کرتے۔"

کوئن ہنسی اور معذرت کرکے چل پڑی۔ "شام کو ملیں گے۔"

"ہاں' قمر کی سالگرہ ہے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر کمال کو میں نے اس کمرے سے نکلتے دیکھا جس میں کرنل خان لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے چندا باہر آئی۔ ان کے چہرے بہت سنجیدہ اور فکرمند ہورہے تھے۔

کمال نے کہا "ناصر تو کب آیا؟ قمر سے ملا؟"

میں نے کہا "پہلے وہیں گیا تھا۔ ورنہ شامت آجاتی میری اور آج سالگرہ تھی اس کی' مجھے بالکل یاد نہیں تھا سچ پوچھو تو۔۔۔ اب جاکے چاکلیٹ لاؤں گا۔"

"یہ شبنم ہیں نا؟" کمال فاروقی نے کہا۔

"تو جانتا ہے انہیں؟"

"انہیں۔۔۔ اور ان کی وجہ شہرت کو کون نہیں جانتا" کمال نے طنز کیے بغیر کہا "تو نے چندا سے ملوایا انہیں؟"

میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے ابھی تک میں نے چندا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کا چہرہ تاریک ہورہا تھا۔

میں نے کہا "بھئی شبنم! یہ چندا ہیں۔۔۔ کرنل خان کی بیٹی۔ کیا حال ہیں بھئی کرنل صاحب کے۔۔۔؟"

چندا اور کمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

میں نے اپنے روپیے سے چندا کے ساتھ ملال کی وضع داری کی تھی۔ میرا خان اعظم کی مزاج پرسی کا انداز کسی اجنبی شناسا جیسا تھا جو سرِراہ مل جائے تو پوچھ لیتا ہے کہ سب خیریت ہے گھر میں؟ اور پھر جواب سنے بغیر گزر جاتا ہے۔ درحقیقت اسے کسی کی خیریت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا مگر رسمی اخلاق کا مصنوعی مظاہرہ ایک عادت ہوتی ہے۔

چندا اور کرنل خان کے ساتھ میری جذباتی وابستگی اتنی سطحی نہیں تھی۔ اپنی عمر کا ایک طویل' سب سے مضبوط اور کارآمد حصہ میں نے انہی سہاروں پر گزارا تھا۔ لاتعلقی کا ایک مختصر دور میری زندگی میں حادثاتی طور پر آیا تھا۔ جب میں شاہ عالم تھا۔ وقتی طور پر بھی ان سے دور ہوگیا تھا تو یہ حالات کی مجبوری تھی۔ میں نے خود جانتے بوجھتے اور چاہتے ہوئے ایسا نہیں کیا تھا مگر میرے رشتوں کی بنیاد میں پڑنے والی دراڑ نے اپنوں کو غیر جیسا بنا دیا تھا۔ چندا اور خان جی نے میری مجبوری کے عذر کو قبول نہیں کیا تھا اور ناصر عظیم کو اپنی زندگی سے ایسے خارج کردیا تھا جیسے وہ کبھی ان کا نہ تھا۔ وہ کوئی اندھیری رات میں راہ گم کردہ مسافر تھا جس نے رات بھر کے لیے پناہ لی تھی۔ وہ گھر کا ایک فرد کیسے بن سکتا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔ کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔ اس کے رشتے حوالے کیا تھے۔ وہ ناصر عظیم تھا یا شاہ عالم۔ اس بارے میں وہ کیوں سوچیں۔

یہ صرف ان کی زیادتی تھی۔ حادثاتی طور پر گھر سے دور ہوجانے والے کا گھر تو وہی رہتا ہے۔ روزگار کے لیے سات سمندر پار جانے والے' گم یا اغوا ہوجانے والے یا گھر سے بھاگ جانے والے بچے۔ اگر وہ گھر لوٹ آئیں تو کیا گھر والے انہیں پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں؟ ان کے رشتے ختم ہوجاتے ہیں؟ کیا رشتے ایسے ختم ہوسکتے ہیں جیسے کاروباری معاہدے؟

لیکن چندا اور خان اعظم نے یہ سب نہیں سوچا تھا اور مجھ پر اپنے گھر کے دروازے بند کردیے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "تم شاہ عالم ہو اور ہم تو صرف ناصر عظیم کو جانتے تھے" پھر میں کیا کرتا؟ کس امید پر کھڑا رہتا کہ ایک دن وہ دروازہ پھر کھلے گا اور میرا گھر پھر میرا ہوجائے گا۔ خان جی کہیں گے کہ "آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم شاہ عالم نہیں وہی ناصر عظیم ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ تم کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر کے آنا ہے کیونکہ تم اور کہیں نہیں جاسکتے۔" وہ مجھے پھر گلے لگالیں گے اور چندا میرا مذاق اڑائے گی کہ "خیر سے لوٹ آئے بدھو اپنے گھر؟ پتا چل گیا اپنی اصلیت کا؟ دنیا کی حقیقت معلوم ہوگئی؟ خیر' تجربہ اچھی چیز ہے۔ کسی کے سمجھانے سے کون سمجھتا ہے۔ جب کٹہن میں گرتا ہے تو آدمی کو پتا چلتا ہے کہ کنواں کیا چیز ہے؟ اور وہ روتے روتے کہے گی کہ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں ہیں۔ میں تمہاری بے وقوفی پر رو رہی ہوں۔ چلے تھے شاہ عالم بننے' سیاست کی سیڑھی پر چڑھ کے پہنچنا چاہتے تھے زیرِاعظم ہاؤس۔ پہلی سیڑھی سے منہ کے بل گرے تو کیسا لگا؟ وہ کیا محاورہ ہے۔ جتنے دی کھوتی اتنے آن کھلوتی۔ تو جناب "گدھے کی طرح سر جھکائیے اور گھاس نوش فرمائیے۔ قورمہ' بریانی سے آپ کو کیا۔"

مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

چندا اور خان اعظم کے بے رخی اور بے عزتی والے طرزِ عمل نے مجھے شاید مایوسی اور فرسٹریشن کے جذباتی ردِعمل میں مبتلا کردیا تھا جو ایک فطری بات تھی۔ میں اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوجانے کے بعد یہ ثابت کرنے پر تل گیا تھا کہ میں ان کے بغیر بھی جی سکتا ہوں اور جنت سے نکالے جانے والے آدم کی طرح اپنی دنیا خود آباد کرسکتا ہوں۔ غصے اور ضد کا یہ ردِعمل احساسِ ذلت سے پیدا ہوا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ آج میں شبنم کے ساتھ چندا کے سامنے کھڑا یہ پوچھ رہا تھا کہ بھئی کیا حال ہے کرنل خان کا۔

مزاج پرسی کا یہ انداز بڑا رسمی تھا۔ اس میں جذبات کو مجروح کرنے والی غیریت تھی۔ مجھے اپنے اس انتقامی جذبے کی کمینگی پر بہت شرم آئی۔ آخر میں شبنم کے ساتھ یہاں کیوں آیا تھا؟ صرف چندا کو یہ احساس دلانے کہ اس کے ٹھکرانے سے مجھے فرق نہیں پڑا۔ میں ناصر عظیم تھا۔ ہوں اور رہوں گا لیکن اس حقیقت کو چندا تسلیم نہیں کرسکتی تو بھاڑ میں جائے۔ شاہ عالم کو شبنم نے ناصر عظیم مان کے قبول کرلیا ہے۔

بلاشبہ جو چندا نے کیا' وہ اچھا نہیں تھا۔ مگر ردِعمل کے طور پر جو میں نے کیا وہ بہت زیادہ برا تھا۔ اس سے رشتوں کی دراڑ پھیل کے ایک خلیج بن گئی۔ شاید اس سے چندا کی یہ آس بھی ٹوٹ گئی ہوگی کہ وقت ہر درد کا درماں کردے گا۔ میں اس کے ساتھ عہدِ وفا کی جس زنجیر سے بندھا ہوا ہوں وہ ناقابلِ شکست ہے اور میں اتنی آسانی سے راہِ وفا کی رفاقت ترک کرکے کسی اور منزل کی طرف قدم بڑھانا چاہوں تو یہ میرے اختیار میں کہاں ہوگا۔

میں نے ثابت کردیا تھا کہ یہ بھی میرے اختیار میں ہے۔ شبنم نے اس شک کا اظہار پہلے ہی کردیا تھا کہ میں [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں' وہ اپنی تذلیل کے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کے گزر رہا ہوں اور میں نے اس کے خیال کی تردید کردی تھی۔ میں واقعی چندا پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جیسے ڈیم کے پانی کا رخ کسی بھی نہر میں موڑا جاسکتا ہے ایسے ہی میں نے اپنے جذبات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے۔

یہاں میں شبنم کو یہ ثابت کرنے کے لیے لایا تھا کہ ناصر عظیم اور شاہ عالم ایک ہی شخص کی زندگی کے مختلف دور ہیں۔ وہ پہلے ناصر عظیم تھا' پھر شاہ عالم بنا اور اب حالات نے اسے پھر ناصر عظیم بننے پر مجبور کردیا ہے۔ اس میں غلط کچھ بھی نہیں تھا۔ غلط صرف یہ تھا کہ جو شاہ عالم بنا تھا' وہ اصل شاہ عالم نہیں تھا مگر شاہ عالم کی زندگی کا وجود حرفِ مکرر کی طرح مٹ گیا یا مٹا دیا گیا تو باقی رہا صرف ناصر عظیم۔ جو میں تھا۔ میں شبنم کو اس کے ثبوت فراہم کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کے حوالوں سے۔ قمر کی گواہی سے اور ڈاکٹر کمال فاروقی کی گواہی سے۔ تاکہ میرا مستقبل ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ ہوجائے۔

میرا مقصد ہرگز چندا کی تذلیل اور اسے یہ احساس دلانا نہیں تھا کہ اس کے لیے میرے دل میں جذبات کی نوعیت بدل گئی ہے یا اس کے لیے میری چاہت اور خان جی کے لیے عزت اب میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بقول شاعر۔ کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔ شبنیں چندا اپنے ذہن دھر چلے۔

میں نہ سنبھلتا تو صورتِ حال کہیں زیادہ خراب ہوجاتی۔ وہ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ تھا جس کی یلغار نے سب کو احساسِ شکست سے یکساں طور پر دوچار کیا۔ اس نے ایک طرف چندا کی مجروح انا کے زخموں پر نمک پاشی کی تو دوسری طرف مجھے خود اپنی نظر سے گرا دیا۔ اس نے شبنم کو حادثاتی مجرم بنا دیا تو ڈاکٹر کمال کو آزمائش میں مبتلا کردیا۔ یہاں وہ پہلے ایک ڈاکٹر تھا اور اس کا تعلق چندا کے ساتھ میرے رشتے یا حوالے سے نہیں تھا۔ وہ ایک عظیم مقصد میں ساتھ ساتھ تھے اور ڈاکٹر فاروقی کے لیے یہی اہم تھا۔ مگر وہ ڈاکٹر سے پہلے میرے لیے ایک دوست تھا اور قمر میری بہن تھی تو وہ میرا بہنوئی تھا۔ اس کی پریشانی جائز تھی۔

میں نے اپنے خیالات کا کوئی عکس صورت پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور کمال سے کہا "کیا بات ہے؟ میں نے ایک سوال کیا تھا؟"

کمال نے کہا "سوال غیر ضروری تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تو ہم سے کیوں پوچھ رہا ہے کہ کرنل خان کا کیا حال ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں....؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "آئی ایم سوری۔ مجھے معلوم ہے مگر۔"

"مگر کیا؟ تو خود دیکھ نہیں سکتا جا کے؟ ہم بتا دیں تجھے۔ وہ کافی ہوگا تیرے لیے؟" کمال نے برہمی سے کہا۔

شبنم نے کہا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم خود جا کے دیکھ لیتے ہیں۔ دراصل ہم نے سوچا کہ کہیں وہ بے آرام نہ ہوں۔"

کمال کا موڈ "ہم" کے لفظ پر مزید خراب ہوا "مس شبنم!" ڈاکٹر کمال نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں جانتا ہوں آپ بہت بڑی سخی ہیں لیکن یہاں آپ ناصر کے ساتھ آئی ہیں اس لیے آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں مگر آپ اس سؤر کے بچے کی وکالت مت کریں۔"

شبنم کا رنگ اڑ گیا "میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیسے دوست ہیں۔ اور کیا رشتہ ہے آپ کے درمیان۔"

"خان جی اس کے لیے باپ کی طرح ہیں۔ اور یہ یہاں برآمدے میں کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ کیا حال ہے ان کا؟" کمال کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا "آپ اس سے پوچھیں کہ اسے شرم نہیں آتی؟"

چندا نے اچانک اپنا رویہ بدل لیا۔ اس نے متانت اور نرمی کے ساتھ ڈاکٹر کمال فاروقی کا بازو پکڑ لیا "کمال۔۔! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ جو کہنا ہے خود کہو ناصر سے۔ شبنم کو کیوں ڈانٹ رہے ہو؟ اس کا کیا قصور ہے؟"

شبنم نے اسے پُرتفکر نظروں سے دیکھا "میں نے برا نہیں مانا۔"

کمال نے کہا "آپ مہمان ہیں ہم سب کی۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ یہاں صرف میں مہمان ہوں۔ باقی سب گھر کے لوگ ہیں۔" شبنم نے اپنے لہجے کی مایوسی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

چندا نے کمسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا "پلیز شبنم! اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم پہلی بار آئی ہو۔ اس لیے کمال نے ایسا کہہ دیا۔ آؤ ہم گھر چلتے ہیں۔ آج قمر کی سالگرہ ہے۔"

چندا کے رویے کی اس تبدیلی نے مجھے حیران بھی کیا اور شرمسار بھی "میں بھی آتا ہوں' خان جی کو دیکھ آؤں۔"

کمال ابھی تک سیریس تھا "وہ ویسے ہی ہیں جیسے پہلے تھے۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا "ڈراما مت کر میرے ساتھ۔ ابھی ایک جھانپڑ مار کے موڈ ٹھیک کردوں گا تیرا۔"

کمال میرے ساتھ چلنے لگا "یار' میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔"

شبنم نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں بھی دیکھ لوں خان۔ کرنل خان کو۔ میں تو ان سے کبھی نہیں ملی مگر جس حد تک مجھے ناصر سے معلوم ہوا ہے' ہی از اے گریٹ مین۔"

کمال نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہی واز اے گریٹ مین۔ اب وہ کیا ہیں' کچھ بھی نہیں۔ محض سانس کی ڈوریوں سے بندھا ہوا ایک جسم۔ صرف دیکھنے کی چیز۔ تم بھی دیکھ لو' اس کے لیے کسی کی اجازت کیا۔"

چندا نے کہا "کمال۔ تم بہت BITTER ہو رہے ہو بلاوجہ۔"

خان جی اسی طرح بستر پر آنکھیں بند کیے سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے جسم کو گلوکوز کی صورت میں غذا ایک ٹیوب سے فراہم کی جارہی تھی جو ان کے بازو کی ایک رگ سے ملی ہوئی تھی۔ جسم کا نظامِ اخراج کسی کنٹرول کے بغیر ٹیوبوں کی مدد سے چل رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اور سانس کا آتا جانا ہی ان کی زندگی کا ثبوت تھا ورنہ عملی طور پر ان کو زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تمام عمر ایک انتہائی فعال اور بامقصد زندگی بسر کرنے والا آج تماشائے عبرت بنا مفلوج پڑا تھا اور اتنا بے بس تھا کہ اپنی مرضی سے ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لیا تھا اور ہر محاذ پر دادِ شجاعت دی تھی۔ بے شمار تمغے جیتے تھے اور موت کی ہر کمیں گاہ سے بچتا ہوا سلامتی کے ساتھ واپس آگیا تھا۔ اس کی زندگی.... مسلسل فتوحات کی ایک قابلِ رشک کہانی تھی جس میں اپنے کردار کی مضبوطی' یقین محکم اور نظم وضبط کے ساتھ اس نے میرے جیسے بے مقصد زندگی گزارنے والوں کی راہنمائی کی اور انہیں کامیابی کی ہر منزل تک رسائی کے خوابوں کو تعبیر دینا سکھایا۔ لیکن آج وہ موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا اور قابلِ رحم ہوگیا تھا۔ میں کچھ دیر انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا اور چند منٹ کے اس مختصر وقفے میں مجھے اپنی وہ زندگی یاد آئی جو خان جی کے ساتھ ان کے گھر میں گزری تھی۔ اس کی اَن گنت یادوں کے اَن گنت نقوش تھے جو میرے تصور میں روشن ہوئے۔ میں جب تک ان کے پاس نہیں آیا تھا' میرے جینے کے انداز میں کوئی قرینہ نہیں تھا۔ میرے پاس عقل اور ذہانت تھی مگر اپنی ہر خداداد صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی تربیت مجھے خان جی سے ملی۔ انہوں نے مجھے مثبت سوچ کے ساتھ صحیح مقاصد کی سمت میں واضح حکمتِ عملی اختیار کرنے کا وہ ہنر سکھایا جو کسی درسگاہ کے کسی نصاب کی تکمیل سے نہیں ملتا۔

یہ میرے لیے دکھ اور شرم کی بات تھی کہ میں نے بدلے میں انہیں صرف مایوسی دی۔ کسی ناخلف اولاد کی طرح میں ان کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ انہوں نے کبھی ان توقعات کا اظہار نہیں کیا تھا مگر میں ان کے جذبات کو سمجھتا تھا۔ میری ہر کامیابی کو وہ اپنی کامیابی اور میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے تھے۔ چندا کے ساتھ میری جذباتی وابستگی بھی ان پر عیاں تھی لیکن وہ اس تعلق پر کبھی معترض نہیں ہوئے تھے۔ عمر کے آخری دور میں انہیں یہ اطمینان حاصل ہوگیا تھا کہ ان کے بعد چندا کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں اس کی حفاظت کرسکتا ہوں۔ زبان سے کچھ کہے بغیر اور کسی رسمی اقرار کے بغیر ہم سب نے مستقبل کی ایک ہی تصویر بنا کے اس میں اپنے اپنے جذبات کے رنگ بھر دیئے تھے لیکن وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس تصویر کا ہر نقش مٹا دیا اور اس کے سارے شوخ رنگوں پر سیاہی پھیر دی۔

میں آج بھی یہ سمجھتا تھا کہ خان جی اور چندا نے میرے حالات کی مجبوری کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور میری ہر وضاحت کو عذرِ گناہ بدتر از گناہ" قرار دیتے ہوئے بغیر سنے مسترد کردیا۔ ان کے لیے ناصر عظیم کے اچانک شاہ عالم بن جانے کا صدمہ اتنا غیر متوقع اور شدید تھا کہ ان کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ چندا نے رخشی کے ساتھ میرے "ازدواجی" تعلقات کو اور شبنم سے مراسم کے افسانوں کو حقیقت سمجھ لیا۔ اس کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ میری دوسری زندگی کو ایک ڈراما سمجھ کے مطمئن ہوجائے۔

چندا کا یہ ردِعمل فطری تھا۔ ہر عورت محبت کے معاملے میں شکی' حاسد اور تنگ نظر ہوجاتی ہے۔ چندا کیسے مان لیتی کہ شاہ عالم کی زندگی گزارنے کا قانونی حق حاصل کرلینے والے ناصر عظیم کے بارے میں جو کچھ اخبارات شائع کررہے ہیں' وہ غلط ہے۔ میں نے شاہ عالم کا نام اور اس کی شخصیت' اس کی سیاست اور کاروبار' اس کی دولت جائداد اور دنیاوی رشتے سب پر اپنا قانونی حق تسلیم کرانے کے لیے اتنی جدوجہد کی تھی اور خود رخشی نے عدالت عالیہ میں مجھے اپنا شوہر شاہ عالم مانا تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے وجود کا وہ حصہ جو ناصر عظیم تھا اور چندا سے محبت کرتا تھا حالات کی دستبرد اور واقعات کی رست وخیز سے اسی طرح محفوظ رہا ہو جیسے سمندر کی سطح کے طوفانوں اور موجوں کے مدوجزر سے آغوشِ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صدف میں پڑا موتی محفوظ رہتا ہے۔

میری طرف سے مایوسی نے خان جی کو دہرے عذاب میں مبتلا کیا۔ ایک تو چندا کا دکھ تھا جس کا مداوا ان کے پاس نہیں تھا۔ چندا نے اپنی زندگی کی ناؤ میرے حوالے کردی تھی اور میں نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے اسے ساحلِ مراد تک پہنچنے سے پہلے ہی حالات کی موجوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے لیے میری بے وفائی کا تصور بھی محال تھا مگر اچانک میں رخشی کا شوہر اور شبنم کا محبوب ہوگیا تھا۔ اس صدمے نے اس کے خوابوں کے شیش محل کو ریزہ ریزہ کردیا تھا اور بے رحم حقائق کے پتھروں کی دیوار سے سر پھوڑنے کے لیے وہ تنہا رہ گئی تھی۔

خان جی کے لیے دوسرا عذاب چندا کے مستقبل کا تھا جو اچانک غیر محفوظ اور غیر یقینی ہوگیا تھا۔ انہوں نے بروقت فیصلہ کیا اور چندا کو ایک ایسی مصروفیت فراہم کردی جس میں اس کے لیے روح کی تسکین کا سامان بھی تھا اور یہ احساس بھی کہ محبت کی کوئی سمت اور کوئی حد نہیں ہوسکتی۔ ناصر عظیم ایک شخص تھا جس کی محبت ایک ہی مقصدِ حیات تک محدود تھی۔ لامحدود ہو کے یہ محبت ایک سمندر بن گئی۔ اس نے اپنی محبت کو انسانیت سے محبت تک پھیلا دیا اور اپنے جذبات کا رخ موڑ کے ناصر عظیم سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ ایک عظیم تر مقصدِ حیات کے لیے خود کو وقف کردینے کے سوا چندا کے پاس چارہ ہی نہ تھا۔ وہ میری جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کا عذر نہیں تراشا۔ اس نے دوٹوک فیصلہ کیا "تو نہیں تو کوئی نہیں، کبھی نہیں، کہیں نہیں۔"

خان جی تو جیسے پہلے سے طے کیے بیٹھے تھے کہ کب چندا کو اپنی منزلِ مراد ملے اور کب وہ منزلِ راہ عدم پکڑلیں۔ چندا نے ایک شخص کے بجائے ایک مقصد کو سفرِ حیات کی منزل سمجھ لیا تھا۔ اور اس فیصلے پر قائم وقانع تھی تو خان جی بھی مطمئن ہوگئے کہ اب دنیا میں ان کے کرنے کو کچھ نہیں رہا چنانچہ چلنا چاہیے اور شاید جنٹی قناعت کے ساتھ انہوں نے زندگی کو قبول کیا اتنے ہی سکون کے ساتھ وہ موت کو گلے لگاتے مگر نہ جانے کس آس کی خلش تھی کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان کی نومین لینڈ پر رکے رہے۔ شاید انہیں یقین تھا کہ ناصر عظیم ضرور واپس آئے گا۔ کیونکہ وہ بہرحال شاہ عالم نہیں ہے۔ جلد یا بدیر سب پھر وہی اور ویسا ہی ہوجائے گا جیسا کہ ہوتا تھا۔ ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا تھا۔ ان کا یقین غلط نہیں تھا۔ میں ان کا انتظار ختم ہونے سے پہلے ہی لوٹ آیا تھا اور میں نے معافی مانگی تو وہ بھی ایک بار پلٹ کے پھر زندگی کی سرحد تک آگئے تھے اور انہوں نے بقائمی ہوش وحواس مجھے آخری دعا بھی دے دی تھی کہ چلو جو ہوا سو ہوا، تم وہی ہو تو سب کچھ وہی ہے اور جو تمہارا تھا وہ آج بھی تمہارا ہے۔ خدا تمہیں شاد و آباد رکھے۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔

یہ محض میری بدقسمتی تھی کہ اس وقت میں اکیلا تھا اور کسی نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ خان جی کا دل میری طرف سے صاف ہوگیا ہے۔ اگر مسلسل بے ہوشی کے دوران میں ہوش کے چند لمحوں میں انہوں نے مجھے معاف کردیا تھا تو اس کا گواہ میں اکیلا تھا اور میری بات کو چندا نے صاف جھوٹ اور دھوکا قرار دے کے ختم کردیا۔ ایک سال سے وہ دیکھ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ سارے زمانے کو دھوکا دے رہا ہوں اور جو زندگی گزار رہا ہوں وہ جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انتہا یہ تھی کہ میں نے عدالت عالیہ میں حلف اٹھا کے جھوٹ بولا تھا کہ میں شاہ عالم ہوں اور قانون سے اپنے جھوٹ کے لیے سچ کی سند حاصل کرلی تھی مگر چندا جانتی تھی کہ سچ کیا ہے۔ پھر اب وہ مجھ پر کیسے یقین کرسکتی؟

اس کے لیے میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ کہنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس نے میرے جھوٹ کی طرف سے اپنے کان بند کرلیے تھے اور مجھے نہ پہچاننے کی قسم کھالی تھی۔ میرے لیے اس کے دل کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا تھا اور یہ احساس ذلت ودندامت مایوسی اور مجبوری کے جذبات تھے کہ میں نے اپنی زندگی کو حالات کے نئے تقاضوں کی راہ پر ڈالا اور زندہ رہنے کی ضرورت کو ناگزیر سمجھتے ہوئے مستقبل کے لیے نئی منزلوں کے نئے راستوں کا تعین کیا۔

مجھے یقین تھا کہ چندا اس کا بھی الٹا مطلب نکالے گی مگر یہاں میں اس کے سامنے کمینگی کے جذبات سے مغلوب ہوکے یہ ثابت کرنے نہیں آیا تھا کہ وہ کچھ بھی سمجھے، مجھے فرق نہیں پڑتا اور میں اس کے بغیر بھی جی سکتا ہوں، دوسرے حسین سہارے بھی تلاش کرسکتا ہوں۔ میں شبنم پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اس سے سب سچ کہا ہے۔ میں یعنی شاہ عالم اپنی اصل میں ناصر عظیم تھا۔ شبنم کے لیے میرے ماضی کے حوالوں پر چندا، قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی گواہی بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اس سے میرا مستقبل محفوظ اور شکوک و شبہات سے پاک ہوگیا تھا۔ اب مجھے پھر کسی "انکشاف" سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شبنم کا اعتماد حاصل کرنا بھی میرے لیے آج کی سب سے اہم ضرورت تھی۔

بالآخر کمال نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "چلیں۔ گھر چلتے ہیں، یہاں کب تک کھڑا خان جی کو دیکھتا رہے گا۔"

اور تب مجھے احساس ہوا کہ میرے جذبات کا دکھ میری آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا تھا "ہاں۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ وہی وقت ہے جو گزر گیا۔"

"پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔" چندا نے کہا۔

میں نے اس کے لہجے کی کاٹ کو محسوس کیا "کیوں، آدمی پتھر کا ہوجاتا ہے؟"

"آگے بڑھتے جانا۔ زندگی اسی کا نام ہے ناصر صاحب!"

وہ بولی "پیچھے صرف ماضی کے مزار ہیں، اور کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہم اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتے۔"

چندا نے کہا "سب کہنے کی بات ہے۔ آدمی کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہے۔ ماضی کو یاد کرنا تو بس ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ جیسے فراغت ہوئی تو پرانا البم کھول کے بیٹھ گئے۔"

شبنم نے کہا "میں آپ سے اتفاق نہیں کرسکتی۔ بات ایک فرد کی ہو یا قوم کی۔ جب تک ماضی کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کو نہ دیکھیں۔"

چندا نے اس کی بات کاٹ دی "یہ سب کتابی باتیں غلط ثابت ہوچکی ہیں مس شبنم۔ اگر ماضی سے کوئی کچھ سیکھ سکتا تو تاریخ اپنے آپ کو کیوں دہراتی۔ دنیا میں ہر شخص ہر دور میں صرف ایک بار ہوتی۔ صرف ایک نسل کا تجربہ کافی ہوتا۔ مگر انسان وہی غلطی کرتا جارہا ہے جو پہلے کرتا تھا۔"

کمال نے محسوس کیا کہ بحث ناحاصل ہونے لگی ہے۔ شاید یہ ہمارے اندر کے جذبات تھے جو ظاہری شائستگی اور مصنوعی سکون کی دیوار کے پیچھے سیلاب کے رکے ہوئے پانی کی طرح جمع تھے اور اس دیوار کے پیچھے ہمارا خود کو محفوظ سمجھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ رویوں کے کنٹرول پر اتنا بھروسا رکھنا غلط تھا۔ ہم سب کے اعصاب پر جذباتی کشیدگی کا اثر غالب تھا مگر ہم سب مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دوستانہ خلوص اور فراخ دلانہ تعلق کا یقین دلا رہے تھے۔ اس TENSE اور EXPLOSIVE فضا میں ایک غلط لفظ یا ایک سچ جیسی کڑوی بات دھماکا کرسکتی تھی اور سب کے رشتوں میں دراڑ ڈال سکتی تھی۔

چندا کا رویہ مجھے سب سے زیادہ پُراسرار اور پُرخطر محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے شبنم کے ساتھ کسی جذباتی عناد کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے جذبات کی نوعیت کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ شبنم کے صحافی ہونے سے چندا کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایک عورت کی حیثیت سے اس نے کبھی شبنم کو عزت کے قابل نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس کے شاہ عالم کے ساتھ تعلق کے افسانوں میں رسوائی کے سوا کچھ نہ تھا، جن پر وہ شرمسار ہونے کے بجائے نازاں نظر آتی تھی۔ جب میں نے شاہ عالم کی جگہ لی تو چندا کے لیے شبنم سے نفرت کے جذبات کئی گنا بڑھ جانے کے اسباب پیدا ہوگئے تھے۔

لیکن آج اس نے شبنم کی طرف داری کی تھی۔ اس کے ساتھ آداب میزبانی کا پورا خیال رکھا تھا اور اس کے میرے ساتھ آنے پر نہ حیرت کا اظہار کیا تھا نہ دکھ کا اور نہ صدمے کا۔ وہ بالکل RESERVE اور لاتعلق سی ہوگئی تھی جیسے میرے معاملات سے اس کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اور جب تعلق نہیں تو پھر شکوہ کیسا اور شکایت کیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے کہنے پر اس نے کسی ردِعمل کے بغیر مجھے ناصر عظیم بھی کہنا شروع کردیا تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہی تھی اور کیا چاہتی تھی۔ بظاہر یہ اندازِ تغافل بھی مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش نظر آتا تھا کہ اب نہ میرے نام سے غرض اور نہ کام سے۔ میں شاہ عالم ہوں تو کیا اور ناصر عظیم بن گیا ہوں تو کیا۔

کمال نے کہا "یار، تھوڑی دیر کے لیے گھر چلیں۔ قمر کھانے پر انتظار کرے گی۔ پھر مجھے تو واپس آنا ہے فوراً۔"

چندا نے کہا "مجھے تو ابھی بھوک نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یار کمال! آئی ایم سوری۔۔۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔"

"کیسی غلطی؟" کمال بولا۔

"صرف ایک غلطی۔۔۔؟" چندا نے اس کے ساتھ ہی کہا اور پھر شبنم کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ "اتنی عمر گزار کے آج کہہ رہے ہیں ناصر صاحب کہ ایک غلطی ہوگئی۔ چلو کوئی بات نہیں، پھر بھی تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "میرا مطلب تھا ایک اور غلطی۔ میں آج خان جی کو دیکھنے آیا تھا۔"

"اوہ۔ تو یہ غلطی ہوگئی۔۔۔" چندا نے طنز سے کہا۔

کمال کچھ پریشان ہونے لگا "بھئی بات تو کرنے دو اسے۔"

میں نے بالکل دفاعی انداز اختیار کرلیا "مس چاندنی کی خفگی جائز ہے کمال، گلہ بھی انہی سے ہوتا ہے جن سے کوئی توقع ہو۔ میں بہت دن اپنی مصروفیت کے باعث باقاعدگی سے نہ آسکا۔ میرے حالات ہی ایسے تھے۔"

"آپ کے حالات کی خبریں تو ملتی رہیں اخباروں سے" چندا نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "آج یہاں آتے ہوئے میں بھول گیا کہ قمر کی سالگرہ ہے اور اسے پتا چلا کہ میں خالی ہاتھ آگیا تھا تو وہ بہت ناراض ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ مت بتانا کہ تم خالی ہاتھ آئے تھے۔ ایک بے ضرر سا جھوٹ بولنے میں کیا جاتا ہے تمہارا؟" چندا نے کہا۔

دوسرے الفاظ میں چندا نے مجھے احساس دلایا کہ میں تو بڑے بڑے جھوٹ بولنے کا عادی ہوں اور میری ساری زندگی ہی ایک جھوٹ ہے جو میں مسلسل بول رہا ہوں۔ چندا کی جارحیت کے جواب میں شرمندگی آمیز طریقے پر خاموش ہوتے جانا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ خود کمال بڑے مخمصے میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔ نہ وہ چندا کو روک سکتا تھا کہ وہ شبنم کے سامنے اور اسپتال میں اپنے جذباتی طرزِ عمل کو تماشا نہ بنائے اور نہ مجھ سے کہہ سکتا تھا کہ کوئی ناپسندیدہ صورتِ حال پیدا ہونے سے پہلے ہی میں شبنم کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا جاؤں۔

اس کی مشکل میں نے آسان کی "یار، شام کو آؤں گا میں۔ اس کا تحفہ لے کر۔ ابھی تو ہمیں ویسے بھی ایک ضروری کام سے جانا تھا۔"

"اوکے۔ میں کہہ دوں گا قمر سے۔" کمال بولا۔

چندا نے کہا "آپ بھی آئیں گی نا شام کو مس شبنم! ضرور آیئے گا۔"

شبنم نے کہا "جی۔۔۔ میں پوری کوشش کروں گی۔ ویسے شام کے وقت میں اخبار کے دفتر میں ہوتی ہوں۔ اور یہ ایک گھر کی تقریب ہے گھر والوں کے لیے۔"

میرا خیال ہے کہ کمال نے نظروں ہی نظروں میں چندا کو خبردار کردیا تھا کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول رکھے یا شاید اس نے خود ہی کمال کے چہرے پر ناپسندیدگی کے جذبات دیکھ لیے تھے کہ وہ سنبھل گئی۔ میں نے باہر آکے سکون کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چندا کو بسنریا نے مغلوب نہیں کیا اور ہم سب کی عزت کا بھرم رہ گیا۔ کمال نے اخلاقاً بھی شبنم سے اصرار نہیں کیا کہ وہ گھر والوں کی نجی تقریب میں شریک ہو۔

جب میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو چندا پھر خان جی کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور کمال برآمدے میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں شام کو شبنم کے ہمراہ آنے کی غلطی نہ کروں ورنہ سالگرہ کا جذباتی موقع ایک بہانہ بن جائے گا اور پرانے زخم کھل جائیں گے۔ مگر میں خود یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ان حالات میں خود مجھے آگ سے نہیں کھیلنا چاہیے۔ یہ ناممکن تھا کہ میں قمر سے یا کمال فاروقی سے قطع تعلق کرلوں کیونکہ میں چندا کا ذلت آمیز رویہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں خان اعظم کی خیریت سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ میں احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے شبنم کو کسی معاملے میں ملوث نہ کروں جس کا تعلق میرے پرانے رشتوں سے ہو۔

شبنم بے وقوف نہیں تھی کہ چندا کے ظاہری اخلاق کے پردے میں چھپی ہوئی ناپسندیدگی کے جذبات کو محسوس نہ کرتی۔ میری باتوں سے وہ پہلے ہی اندازہ کرچکی تھی کہ ناصر عظیم اپنے دل میں چندا کے لیے چاہت کے جذبات ضرور رکھتا تھا۔ پھر اس نے شاہ عالم بن کے چندا کو بھلا دیا تھا اور رخشی سے شادی کرلی تھی۔ چندا کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے آج تک ناصر عظیم کو اس کے جرمِ بے وفائی پر معاف نہیں کیا اور کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح وہ آج بھی مجھ سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہی ہے۔

ایسا تھا یا نہیں تھا؟ یہ سمجھنا خود میرے لیے مشکل تھا۔ جہاں تک میری نیت اور خواہش کے خلوص کا معاملہ تھا تو میں نے کبھی چندا سے بے وفائی نہیں کی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ حالات کی گواہی مجھے مجرم ثابت کرتی تھی اور چندا نے خود اس تعلق کو اپنی ایک بھول سمجھ کے بھلا دیا تھا۔ وہ مجھے گزرے ہوئے وقت کے کسی حوالے سے یاد بھی رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ میرے ساتھ شبنم کو دیکھ کے جیسے وہ بھول گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی تھی۔

اسپتال سے کچھ دور آنے تک شبنم خاموش رہی۔ میری وجہ سے اس کی سبکی ہوئی تھی۔ یہ میری غلطی تھی لیکن میں اسے ایک مقصد کے تحت یہاں لایا تھا۔ میں اسے اپنے ماضی کے ان کرداروں سے ملوانا چاہتا تھا جن کا ذکر میں نے اپنی زندگی کی کہانی میں کیا تھا۔ اس وقت مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ اس میں کوئی خطرے کی بات ہے۔ چندا کی لاتعلقی کا خاموش انداز چانک جارحانہ ہوجائے گا۔ ایسا میں نے نہیں سوچا تھا حالانکہ یہ ناممکن نہ تھا۔

شبنم نے باہر دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تمہارے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

میں نے کوشش سے ایک پُرسکون لہجہ اختیار کیا "میں لایا تھا تمہیں۔ غلطی میری تھی۔۔۔ فارگیٹ اٹ۔"

"چندا کو دیکھ ہوا تمہارے ساتھ مجھے دیکھ کے۔"

"پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے دل پر جبر کرکے کہا۔

شبنم نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "آج کتنا

آسان ہے تمہارے لیے ایسا کہنا۔ کل تم اس سے محبت کرتے تھے، وہ ابھی تک بھولی نہیں ہے یہ بات۔"

"مجھے افسوس ہے۔۔۔ اور میں کیا کہوں۔۔۔ قصوروار تو وقت ہے اور حالات ہیں جو نہ میرے اختیار میں تھے اور نہ چندا کے۔ شاہ عالم بننا میری ایک مجبوری تھی۔ جسے چندا نے میری خطا سمجھ لیا۔ اگر وہ اس مجبوری کو سمجھتی تو میرا ساتھ نبھاتی مگر اس نے بالکل یکطرفہ طور پر مجھ سے تعلق نہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے میری ایک نہیں سنی اور ایک وقت آیا جب اس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ اس کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتی۔ حالانکہ نام میں کیا رکھا ہے۔ تمہارے لیے جو میں کل تھا وہی آج بھی ہوں۔ تم سب کچھ جانتی ہو کہ حالات کی سازش نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میرا سیاسی کیریئر، وہ جماعت جس کا میں چیئرمین تھا۔ میرا مستقبل۔ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا۔ جو اپنے تھے پرائے ہوگئے اور دوست ہی دشمن بن گئے۔ زندہ رہنے کے لیے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں اپنی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ روپوشی اختیار کرلوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو دوسری بار بدخواہ مجھے سچ مچ مار دیتے یا مروا دیتے۔ ناصر عظیم بن کے میں سکون سے زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم سے کچھ چھپایا نہیں میں نے۔ اور ایک تم ہی ہو جو آج بھی میرے ساتھ ہو۔"

میری بات نے شبنم کو خوش کیا "تمہارے لیے میرے جذبات کیسے بدل سکتے ہیں۔" —

"لیکن پہلی بار چندا نے ایسا نہیں کیا تھا۔ پھر میں یہ کرتا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کم کوشش نہیں کی تھی۔ بہت عرصہ میں نے اس امید پر گزار دیا کہ شاید میری کوئی وضاحت اسے مطمئن کردے یا اس کی جذباتی سرد مہری میں پھر گرم جوشی پیدا ہوجائے مگر وہ دل سے ایسا سمجھتی تھی کہ میں شاہ عالم بن کے وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔"

شبنم نے کہا "بدل تو اب بھی بہت گئے ہو تم۔"

"دیکھو شبنم! حالات کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو آدمی کو بدل دیتے ہیں اور کچھ وقت کے ساتھ بھی تبدیلی آتی ہے۔ ایک افلاطونی اور فلمی قسم کا رومانس کرنے والا لڑکا اپنی محبوبہ سے شادی کرلے تو اس کے جذبات بھی وہ نہیں رہتے، حالات کو چھوڑو۔"

"جذبات کیسے بدل سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "محبت کم نہیں ہوتی مگر غم ہجراں نہیں رہتا۔ جدائی کے اندیشے نہیں رہتے۔ ملنے سے پہلے بچھڑ جانے کا خوف نہیں رہتا۔ وہ تڑپ اور بے قراری نہیں رہتی۔ زندگی ایک خوابش سے بڑھ کر ایک ذمے داری ہوجاتی ہے۔ اب وہ شوہر بن جانے والا پرانا عاشق پیار بھری باتیں چھوڑ کے اس ذمے داری کو نبھانے کے لیے فکرِ روزگار میں لگ جائے، ترقی کرنے، زیادہ عزت اور دولت کمانے کے لیے دن رات ایک کرے تو محبوبہ کو لگتا ہے کہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ بدل گیا ہے۔"

شبنم ہنسنے لگی "ایسا تو ہوتا ہے۔"

"اب یا تو آدمی شادی نہ کرے، بس عشق کرتا رہے۔ ایسے ہی چوری چھپے ملنا جاری رکھے۔ عاشقانہ خط و کتابت میں زورِ قلم صرف کرتا رہے اور جذبات سے چھلکتے ڈائیلاگ بولتا رہے۔ مگر ایسے کتنے دن چلے گا۔ سال۔ دو سال، چار پانچ سال۔ جوانی سے بڑھاپے تک یہ پیار کا کھیل کھیلنا پڑے تو ہوش ٹھکانے آجائیں لیلیٰ مجنوں کے۔ وحشت ہونے لگے، وہی باتیں سن سن کے اور کسی چیز میں سنسنی خیزی نہ رہے۔ عشق برائے عشق ایک خیالی فلسفہ ہے جو صرف فلموں میں اچھا لگتا ہے ہیشہ۔ عملی زندگی میں عشق کا انجام بہرحال شادی ہے۔ خود شاعروں نے اتنے دیوان لکھ مارے لیکن مطالبہ ان کا ایک ہی رہا، شب وصل۔"

شبنم پھر ہنسی "یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی نام ہے عشق کی موت کا؟"

"اگر عشق کو زندہ رکھنا ہے اور غم عشق زیادہ معجز ہے تو بھائی، آپ شادی کرلیں جہاں ماں چاہیں اور اسے جانے دیں غیر کے ساتھ۔ اس کے بعد انشاء اللہ باقی عمر خوب گزرے گی دونوں کی۔ تڑپنے، روتے اور گاتے۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا۔ اور آہیں بھرتے کہ کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔"

"تم واقعی یقین بھی رکھتے ہوئے اس بات پر؟"

"یہ حقیقت ہے۔"

"مگر EXCEPTIONS بھی تو ہوتی ہیں۔" شبنم نے کہا "شادی کے بعد بھی محبت کی جاسکتی ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کی جاسکتی ہے؟ نظریہ تو یہ ہے کہ محبت ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ میں نے کب کہا کہ شادی سے محبت ختم ہوجاتی ہے۔ بات اس عاشقانہ جذباتی رویے کی ہے جو بدلے ہوئے حالات میں باقی نہیں رہتا۔ عشق کا وہ جنوں آفریں انداز نہیں رہتا۔ شوہر بے پناہ محبت کرتے ہیں اپنی بیوی سے۔ اس کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی ہے۔ وہ صرف باتیں نہیں کرتے، چاہتے پہلے سے کہیں زیادہ ہیں اس لڑکی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو ان کی شریکِ حیات اور پھر ان کے بچوں کی ماں بنتی ہے۔ آدمی ایک جیسا رویہ کیسے رکھ سکتا ہے ہر لحظہ بدلتے حالات میں۔"

"مجھے ہمدردی ہے چندا سے۔ مگر تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں میں۔ ایک بات البتہ عجیب اور غیر معمولی لگتی ہے مجھے بھی۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا "وہ کیا؟"

"ممکن ہے یہ صرف میرا احساس ہو۔ مگر تمہاری شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی بڑی غیر فطری سی لگتی ہے مجھے۔ حالات کی بات تو ٹھیک ہے' آدمی عمر اور تجربے کے ساتھ نظریات اور خیالات بدلتا ہے۔ اس کا رویہ بھی تبدیل ہوتا ہے مگر یہ سب بہت آہستہ آہستہ' نامعلوم طریقے پر ہوتا ہے۔ ایسے کہ کسی کو احساس نہیں ہو پاتا۔ مگر تم اچانک بدل گئے۔ اس وقت جب تم شاہ عالم ہی تھے۔ یہ تبدیلی جیسے راتوں رات آئی تھی۔ تمہارا کردار پہلے کچھ اور تھا۔"

"میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں۔"

"ہاں۔ مگر پھر بھی یہ عجیب سا لگتا ہے۔ کہ آدمی خود کو یوں بدل سکے جیسے کوئی گھر کا نقشہ رنگ اور ساز و سامان کی ترتیب بدل ڈالے۔"

میں نے کہا "یہ تبدیلی اچھی نہیں لگی تمہیں؟"

"اصل بات تو یہی ہے کہ تمہاری شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی آئی۔ تم وہ نہیں رہے جو تھے۔ اس سے بہت اچھے ہو گئے۔ تمہارے کردار کی خامیاں اچانک خوبیوں میں ڈھل گئیں۔ صورت تو خدا کی دی ہوئی تھی مگر سیرت میں یہ انقلاب۔"

میں نے کہا "اس کی توفیق بھی خدا دیتا ہے۔ اس میں عجیب کیا ہے؟"

وہ بولی "عجیب یہ ہے کہ تم جیسے خود کرتے ہو' یہ سب کچھ۔ صورت کے ساتھ سیرت کو بدلنا' ظاہر کے ساتھ باطن سے ایک بالکل مختلف شخص بن جانا۔"

"تم پاگل ہو۔ تمہارا مطلب ہے میں اداکار ہوں۔ ڈبل رول کرتا ہوں۔"

شبنم نے نفی میں سر ہلایا "ڈبل رول کی اداکاری کیسے چل سکتی ہے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے۔"

میں نے ناگواری سے کہا "پھر شاید میرا نفسیاتی معاملہ ہو۔ دہری شخصیت رکھنے والے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔"

"چلو چھوڑو اسے' تم برا مان گئے۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی" وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "دل میں بات رکھنے سے کیا فائدہ۔ تم کہو۔ میں برا نہیں مانوں گا۔"

"نہیں' رہنے دو۔ ویسے بھی اس بات کا میری یا تمہاری آج کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔" شبنم نے کہا۔

میں نے اصرار کیا "پھر تو کہنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "جب تم ناصر عظیم تھے۔ تو ایسے ہی تھے' جیسے آج ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہاری سوچ' تمہارے نظریات' پسند ناپسند' انسانوں کے ساتھ تمہارا رویہ۔ زندگی کے بارے میں تمہارے خیالات۔ تمہارا کردار' سب یہی تھے؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ظاہر ہے۔"

"مگر شاہ عالم اپنی فطرت میں تمہاری شخصیت کے برعکس تھا۔ وہ بے ضمیر' ہوس پرست' لالچی' بے اصول' وطن فروش اور عیاش تھا۔ شرابی اور بدکردار تھا۔" وہ بے خودی سے بولتی رہی "تھا یا نہیں تھا؟"

"میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔"

"پھر الزام چندا کو کیسے دے سکتے ہو تم؟" وہ بولی۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھو۔ ناصر عظیم ایسا ہی تھا' جیسے تم آج ہو۔ اگر چندا جیسی لڑکی اس پر مرتی تھی تو کچھ دیکھ کے مرتی تھی۔ اس ناصر عظیم کو صورت اور سیرت کے حسن سے نوازا تھا خدا نے اور فرشتہ نہ سہی' اسے عام انسانوں کے مقابلے میں بہت اعلیٰ صفات عطا کی تھیں۔ وہ ہر عورت کا محبوب ہو سکتا تھا۔ مگر پھر کیا ہوا؟ ناصر عظیم نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کر لی۔ ہر عورت شبنم نہیں ہو سکتی کہ آنکھیں اور کان بند کر کے اس کی چاہت میں ڈوب جائے۔ یہ نہ دیکھے کہ وہ کہاں ڈوب رہی ہے۔ چشمے کے شفاف پانی سے وجود میں آنے والی جھیل میں یا گندی نالیوں سے بننے والے گڑھے میں۔ چندا کے بارے میں تم نے بتایا کہ وہ بہت اعلیٰ ذوق کی مالک انتہائی REFINED اور حساس طبع اپنی پسند کے معاملے میں حد درجہ انفرادیت کی حامل اور بہت ذہین لڑکی تھی۔ ذرا خود سوچو' ناصر عظیم اگر شاہ عالم بن جائے تو اس کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ اسے حالات اور مجبوری کے عذر سے کیا۔ وہ کسی فرشتے کو چاہتی تھی' اگر وہ شیطان بن جائے تو چندا کیسے' کس دلیل سے زبردستی خود کو قائل کر سکتی تھی کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس کا پابرد ہی رہنا چاہیے۔"

میں شبنم کی منطق سے متاثر ہوا "یو آر رائٹ۔ اس کی

مجھ سے نفرت کا یہی سبب ہو سکتا تھا مگر تمہیں فرق نہیں پڑا۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہر لڑکی شبنم نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ۔ مجھے شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم کو قبول کر کے دکھ نہیں ہوا' خوشی ہوئی۔ جتنا میں نے چاہا تھا مجھے اس سے زیادہ مل گیا۔ پیتل کا شاہ عالم سونے کا ناصر عظیم بن کے میرے سامنے آیا تو یہ میری خوش قسمتی ہے' چندا کے ساتھ اس کا الٹ ہوا۔ اس کا ناصر عظیم کندن تھا۔ وہ پیتل کو کیسے معتبر مان لیتی۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتی تو میرے جذبات بھی بدل جاتے۔"

"چلو چھوڑو اسے۔ تقدیر اپنی چال ایسے ہی چلتی ہے۔ ہم بعد میں تاویلیں کرتے رہ جاتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو ایک احاطے کے پھاٹک پر روک لیا۔

"یہ کیا جگہ ہے؟" شبنم نے کہا۔

"یہاں بھی ناصر عظیم کا ایک خواب دفن ہے۔ آؤ' آج گڑے مُردے اکھاڑنے کا دن ہے" میں نے دروازہ کھول کے شبنم کو مدعو کیا۔

اس احاطے کی دیواریں آٹھ فٹ سے زیادہ بلند تھیں لیکن کسی عمارت کی فصیل کی طرح ان کی تعمیر میں مضبوطی یا خوبصورتی کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ تقریباً دو سو گز تک ہر سمت میں پھیلی ہوئی اس دیوار کا مقصد ایک ایکڑ کے پلاٹ کی حدود متعین کرنا اور اس کی حفاظت کرنا تھا۔ سڑک کی جانب دیوار میں دس دس فٹ کے دو پٹوں والا فولادی گیٹ کنکریٹ کے ستونوں پر قائم تھا اور اس کی اونچائی گیٹ لائٹس کے ساتھ دس فٹ سے زیادہ تھی۔ گیٹ میں اوپر سے نیچے تک بھاری کنڈیوں میں تین تالے پڑے ہوئے تھے اور میرے لیے ان میں سے ایک کو بھی توڑنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے زنگ لگے ہوئے گیٹ کا جائزہ لیا "پہلے ایک چوکیدار ہوتا تھا۔"

شبنم نے کہا "کس کا ہے یہ احاطہ؟"

میں نے کہا "تمہارے خیال میں کس کا ہو سکتا ہے میرے علاوہ۔ اس گیٹ پر پہلے ایک بورڈ لگا ہوا تھا کہ یہ متنازعہ جگہ ہے۔ اس کا کیس کورٹ میں تھا اور تالوں پر بھی عدالت کی سیل تھی۔ میری ایک کنسٹرکشن کمپنی تھی' یہاں میں ایک کمرشل پلازا بنانا چاہتا تھا۔ آس پاس رہنے والوں کو اس کی تعمیر پر اعتراض تھا۔ ان کا مؤقف تھا کہ یہ رہائشی جگہ ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ اس سے ان کی نجی زندگی کی پرائیویسی متاثر ہو گی' وہ ٹھیک سمجھتے تھے۔"

شبنم مسکرائی "اس کے باوجود تم اپنے ارادے پر قائم تھے۔"

"بس۔ میرے لیے اپنا بزنس زیادہ اہم تھا کسی کی پرائیویسی سے۔ اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ مخالفت کرنے والے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہر علاقہ پہلے رہائشی ہوتا ہے پھر وہاں دکانیں کھلنے لگتی ہیں اور بازار بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ بازار کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں۔ جن کو شور و غل راس نہ آئے وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کمرشل پلازا ہی وقت کی ضرورت ہیں۔ ایسی مثالیں پہلے سے موجود تھیں جہاں رہائشی علاقے میں کاروباری مراکز قائم ہوئے۔ مجھے بھی این او سی یقیناً مل جاتا۔ میرے پروجیکٹ کے خلاف عارضی حکمِ امتناعی جاری کیا گیا تھا۔ کیس کرنے والے وکیل کر کے مطمئن ہو گئے اور معاملہ عدم پیروی کے باعث خود ہی ختم ہو گیا۔ میں نے تیاری مکمل کر لی تھی۔ ڈیزائن منظور ہو گیا تھا۔ آرکیٹیکٹ اور انجینئرز کی ایک فرم سے ٹھیکے کی بات چل رہی تھی کہ میرا ارادہ بدل گیا۔ کچھ ایسی مصروفیات آڑے آئیں کہ میں ادھر توجہ نہ دے سکا اور یہ پروجیکٹ سرد خانے میں پڑا رہا۔ میں نے تو اسٹاف بھی رکھ لیا تھا۔ آؤ' اندر چلتے ہیں۔"

شبنم نے کہا "چابیاں لائے ہو اپنے ساتھ۔"

"چابیاں کہاں۔ لیکن ہم اندر جا سکتے ہیں۔" میں نے ہاتھ مل کے کہا۔

"کیا گیٹ کے اوپر سے جاؤ گے۔" شبنم غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی "میں نہیں چڑھ سکتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کوشش کر کے دیکھو' میں ہاتھ پکڑتا ہوں۔"

وہ اور پیچھے ہو گئی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں گری تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

"یہ رسک تو واقعی نہیں لیا جا سکتا۔ تم انتظار کرو یہاں۔ ابھی گیٹ کھل جائے گا" میں نے کہا اور قدم جما کے گیٹ پر چڑھ گیا۔

اندر اتر کے میں نے احاطے کو دیکھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اور ویسی ہی تھی۔ گرد و غبار اور موسمی اثرات کی کارفرمائی ہر سمت میں نظر آتی تھی۔ میں نے بڑے گیٹ کے ایک پھاٹک میں بنے ہوئے چھوٹے گیٹ کو دیکھا۔ اس کی کنڈی اندر سے لگا دی گئی تھی مگر اس میں قفل نہیں ڈالا گیا تھا۔ چھوٹا گیٹ لوگوں کے آنے جانے کے لیے تھا۔ بڑا گیٹ صرف بھاری مشینری اور ٹرک وغیرہ کے لیے کھولا جاتا تھا۔

کنڈی زنگ سے لال ہو رہی تھی اور کسی حد تک جام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی۔ میں نے اسے کھولنے میں خاصی محنت صرف کی۔ میرے ہاتھوں پر زنگ پھیل گیا اور لوہے کی رگڑ سے پیدا ہونے والے شور سے میرے کان خراب ہونے لگے۔ پانچ منٹ بعد میں نے شبنم کو اندر کھینچ لیا۔

شبنم نے احاطے میں اسکریپ کی طرح پڑے ہوئے تعمیراتی سازو سامان کو حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا۔ ایک طرف مختلف سائز کا سریا' زنگ کا ڈھیر سا نظر آتا تھا۔ اس کے پاس ہی دو کنکریٹ مکسر کھڑے ہوئے تھے اور ایک لفٹ جیسی ٹرالی موجود تھی جو سیمنٹ کے آمیزے کو اوپر لے جاتی تھی۔ شٹرنگ کے سامان میں لکڑی کے تختے پڑے تھے اور کچھ فولادی پلیٹیں۔ کسی چھوٹی سی پہاڑی کے برابر ایک ڈھیر کنکریوں کا تھا اور دوسرا ریت کا۔ ٹین کی چھت والے ایک برآمدے جیسے گودام میں اس وقت بھی چالیس پچاس سیمنٹ کی بوریاں نظر آرہی تھیں۔ نہ جانے کتنی بوریاں ضرورت مند دیوار کے اوپر سے آگرلے گئے ہوں گے۔ جو بچی تھیں وہ تعمیراتی مقصد کے لیے بے کار ہوگئی تھیں۔

بائیں جانب آخری کونے میں میرا آفس تھا "اندر ساری چابیوں کا ایک سیٹ ہوگا۔ ہونا چاہیے۔"

"مگر تم اندر کیسے جاؤ گے؟" شبنم نے پوچھا۔

"چوروں کی طرح۔" میں نے ایک کھڑکی پر سریا مار کے شیشہ توڑ دیا۔

"کسی نے دیکھ لیا تو۔؟"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کسی نے تمہیں دیکھ لیا میرے ساتھ؟ میں مالک ہوں خاتون اس جگہ کا۔ اور آپ بھی کچھ کم نہیں' تشریف لائیے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اندر ہاتھ ڈال کے کنڈی کھولی اور کھڑکی سے اندر کود گیا۔ پھر میں نے شبنم کو اندر کھینچ لیا "یہ اچانک آفس کھولنے کی کیا سوجھ گئی؟"

میں نے کہا "ابھی عرض کرتا ہوں۔ مٹی لگ گئی ہے تمہارے کپڑوں پر۔"

"پھر کمرشل پلازا بنانے کا سوچا ہے؟" شبنم نے کپڑے جھاڑے۔

میں نے کچن سے اندر کھلنے والے دروازے کو دھکیلا۔ اس کے پیچھے ایک وسیع ہال تھا جس میں دائیں اور بائیں جانب تین تین میزیں لگی ہوئی تھیں۔ چوتھی نسبتاً بڑی میز بالکل سامنے تھی۔ ہر میز کے پیچھے اور سامنے کرسیاں بھی موجود تھیں۔ یہ سارا فرنیچر بالکل نیا تھا مگر اس پر گرد و غبار کی تہ اتنی موٹی تھی کہ نیچے کا اصل رنگ چھپ گیا تھا۔ سارا فرنیچر ایک جیسے خاکی رنگ کا ہوگیا تھا۔ خالی میزوں اور کرسیوں سے بھی ہال کی ویرانی کا تاثر پیدا ہوتا تھا مگر دھول مٹی اور فرش پر بکھرے ہوئے تنکوں' چھت میں نظر آنے والے گھونسلوں اور بیٹ کے سفید سفید داغوں سے یہ تاثر کسی حد تک آسیب زدگی میں بدل گیا تھا۔

شبنم احتیاط سے قدم اٹھاتی میرے ساتھ چل رہی تھی اور غبار سے بچنے کے لیے اس نے دوپٹے کا پلو ناک پر رکھ لیا تھا۔ میں نے آخری میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کے دیکھا۔ ظاہر ہے فون کٹے زمانہ ہوگیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کے ہاتھ جھاڑے اور ایک بغلی دروازہ کھولا۔

"یہ میرا آفس تھا" میں نے کہا۔

شبنم نے آفس کی شاہانہ آرائش کو پُرستائش اور حیران نظروں سے دیکھا۔ "کیا حال ہو رہا ہے ہر چیز کا" اس نے صوفوں' پردوں' قالین اور اے سی پر نظر ڈالی "کسی کو تو چھوڑ دیتے یہاں دیکھ بھال کے لیے۔"

"ایک چوکیدار تھا۔ عدالتی حکم کے بعد چلا گیا۔ یہ سب مجسٹریٹ نے سیل کردیا تھا۔ کوئی بھی اندر نہیں آسکتا تھا اور نہ کوئی چیز باہر لے جاسکتا تھا۔ خراب صفائی دو دن میں ہوجائے گی" میں نے کہا۔

میز کرسی پر صوفوں پر گرد ہی گرد تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصاویر' فائر کیبنٹ' ٹیبل کیلنڈر' فون سب پر یہ گرد ایک غلاف کی طرح چڑھ گئی تھی۔ میں نے چھت کی ایک لائٹ آن کی اور میز کی سب سے نیچے والی دراز کو کھینچا۔ اس میں پورے آفس کی چابیاں ایک گچھے کی صورت میں موجود تھیں۔ ہر چابی پر ایک نمبر کا ٹیگ تھا اور دروازے یا دراز پر لکھے ہوئے نمبر سے تالے کی نشاندہی ہوتی تھی۔ میں نے ایک چابی سے پیچھے کی طرف کھلنے والے دروازے کو کھولا۔

"یہ ہے میرا رسٹ روم۔"

"ریٹائرنگ روم!" شبنم نے اندر جا کے اس کمرے کو دیکھا جو ہر طرح سے ایک فرنشڈ بیڈ روم تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے اندر کی ہر چیز پر کور ڈال دیے تھے۔ میں نے احتیاط کے ساتھ بیڈ کور کو ہٹایا۔ اس کے نیچے بچھی ہوئی بیڈ شیٹ بالکل صاف تھی۔

"آپ بیٹھ سکتی ہیں یہاں!" میں نے کہا۔

شبنم نے بیڈ پر بیٹھ کے پسندیدگی کا اظہار کیا "تمہارا ذوق اچھا تھا پہلے۔"

"اب بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن درمیان میں۔۔۔ جب تم شاہ عالم تھے۔۔۔ تم

بدذوق کیوں ہوگئے تھے؟" شبنم نے سوال کیا "کیا یہ بھی نام کی تبدیلی کا اثر تھا؟"

میں نے ہنس کے بات ٹال دینا بہتر سمجھا "ہوگا۔ کہتے ہیں نام سے فرق تو پڑتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بجلی نہیں گئی ورنہ مل کسی نے بھرا ہوگا۔ سارے مل لیٹر باکس میں بھرے پڑے ہوں گے۔"

میں نے ٹی وی ٹرالی کے اوپر سے پلاسٹک کور ہٹایا تو نیچے سے ہر چیز اپنی اصلی صاف ستھری حالت میں برآمد ہوئی۔۔۔ ٹی وی کے نیچے والے ریک میں وی سی آر تھا۔ اس کے نیچے ڈش ریسیور۔ اس کے ساتھ ہی تینوں کے ریموٹ کنٹرول رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ٹی وی کو آن کر کے دیکھا' وہ کام کر رہا تھا۔

"باہر ڈش تو نظر نہیں آئی؟" شبنم نے کہا۔

"ڈش تھی۔ شاید کوئی لے گیا اوپر سے اتار کے۔" میں نے کہا اور ٹی وی کو بند کردیا۔ فریج پر کوئی کور نہیں تھا مگر وہ بند پڑا تھا۔ میں نے اسے آن کردیا۔ فریج کے اندر بوتلوں میں پرانا پانی تھا اور کولڈ ڈرنک کی بوتلیں بند رکھی ہوئی تھیں۔ باقی سب سڑ گیا تھا اور بُو دے رہا تھا۔

"افوہ۔ بند کردو ابھی فریج کو۔ پہلے صفائی ہونی چاہیے۔" شبنم نے کہا۔

میں نے فریج آف کردیا "تمہیں گرم کوک پیش کی جاسکتی ہے۔ دو سال پہلے کی۔ اولڈ از گولڈ۔"

شبنم نے کہا "ابھی کسی چیز کی ضرورت نہیں مجھے۔"

میں نے چٹکی بجائی "آؤ واپس کچن میں چل کے دیکھتے ہیں۔ چائے کافی ضرور بن سکتی ہے۔"

میرا خیال ٹھیک تھا۔ کچن میں چینی چائے اور کافی سب موجود تھے۔ اوون بھی کام کر رہا تھا لیکن میں نے الیکٹرک کیتلی کو پلگ میں لگانے سے پہلے نل کھول کے پانی سے دھونا چاہا تو ٹونٹی سے صرف ہوا نکلی۔ اوور ہیڈ ٹینک خالی ہو کے خشک ہوگیا تھا۔ ہوا کے بعد پائپ میں رکا ہوا تھوڑا سا پانی بہہ کے ختم ہوگیا۔ شبنم فریج میں رکھی ہوئی پانی کی بوتلیں نکال کر لائی۔ یہ منرل واٹر کی بوتلیں تھیں۔ "یہ خراب نہیں ہوسکتا" شبنم نے ایک کی سیل توڑی اور اسے کیتلی میں انڈیل دیا۔ پھر اس نے ایک کیبنٹ میں سے مگ نکالے اور انہیں گرم پانی سے صاف کردیا۔ کافی تیار ہونے میں مشکل سے دس منٹ لگے۔ دودھ کا مسئلہ کنڈنس ملک سے بھی حل ہوسکتا تھا مگر وہاں کافی میٹ موجود تھا اور خراب بھی نہیں ہوا تھا۔

میرے یہاں آنے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو میں دیکھنا چاہتا تھا کہ پرانے آفس میں اب کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جب سے رخشی نے مجھے مصروفیت کے بہانے ایک کارِ خیر کی تجویز دی تھی' میں نے سنجیدگی سے ایک۔ مثالی قسم کا یتیم خانہ بنانے کے امکانات پر غور کرنا شروع کردیا تھا اور میرے نزدیک یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اگر ایک کمرشل شاپنگ پلازا بن سکتا تھا تو ہوسٹل اسکول ٹائپ عمارت کی تعمیر بہت آسان تھی۔ اصل کام اس یتیم خانے کو ایک آئیڈیل تربیت گاہ کے طور پر چلانے کا تھا جس کے لیے مجھے اچھے لوگوں کا تعاون درکار تھا۔ اور اچھے لوگ اب ڈھونڈے نہیں ملتے تھے۔

کافی پیتے ہوئے میں نے ایک چابی کی مدد سے فائل کیبنٹ کھولی۔ اس میں کمرشل پلازا کے ڈیزائن اور نقشے سب موجود تھے۔ شبنم نے ان کا سرسری جائزہ لیا اور متاثر ہوئی۔

"میں کاروباری معاملات کو زیادہ نہیں سمجھتی لیکن جگہ اچھی ہے۔ پلاننگ بہت اچھی ہے۔"

"نام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تم نے۔"

وہ مسکرانے لگی "وہ تو ہے ہی سب سے اچھا۔ چاندنی ٹاور۔"

"یہ تقریباً دو کروڑ کا پروجیکٹ تھا۔ اور مکمل ہوجاتا تو مجھے پچاس لاکھ کا فائدہ ضرور ہوتا" میں نے کہا۔

"IT IS NEVER TOO LATE" وہ بولی۔

"ہر کام کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ اور ہر وقت کے لیے ایک کام۔ اس وقت یہ کام شروع ہوجاتا تو شاید اب تک میں اگلے پروجیکٹ کی منصوبہ بندی کر رہا ہوتا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ جو وقت گزر گیا وہ لوٹ کے نہیں آسکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی' بڑے بڑے منصوبے DELAY ہوجاتے ہیں۔"

"بالکل ہوجاتے ہیں۔ لیکن اس تاخیر کے پیچھے کوئی غیبی اشارہ تھا۔ ممکن ہے انویسٹمنٹ اور نفع نقصان کے اصولوں میں اس نقطۂ نظر کی کوئی اہمیت نہ ہو' لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ ایمان رکھتا ہوں کہ خدا کی رضا میں پوشیدہ مصلحت کو ہم بندے اپنی دنیاوی عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔ خدا کو مجھ سے کچھ اور کام لینا تھا اور اس کے لیے ایک وقت پہلے سے مقرر تھا چنانچہ حالات خود بخود ایسے پیدا ہوگئے کہ میرا ایک بہت منافع بخش کاروباری منصوبہ مکمل کیا شروع بھی نہ ہوسکا مگر مجھے دوسرے منصوبے کا اشارہ مل گیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دوسرا منصوبہ!"

"ہاں۔ اس میں دنیاوی معیار سے لاکھوں کا منافع نہیں ہے۔ مگر آخرت کی کمائی کا یقیناً فائدہ ہے۔ آج دن بھر میں مجھے ایک موقع ملا' اپنے سارے اثاثوں کی مالیت کا جائزہ لینے کا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔"

"شرم کی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "دنیا میں شاید اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ میں دور دراز کے ملکوں کی بات نہیں کرتا جن کے بارے میں ہم ٹی وی پر فلمیں دیکھ دیکھ کے عبرت پکڑتے رہتے ہیں اور خدا سے توبہ کرتے رہتے ہیں۔ صرف زبانی توبہ جہاں مسلسل خشک سالی' قحط' بیماری' قدرتی آفات اور خانہ جنگی سے لاکھوں کی تعداد میں انسان مرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف وہ ممالک ہیں جن کی پُرتعیش رنگین زندگی کے افسانے اور نظارے ہمارے خواب پرست نوجوانوں کو کھینچتے ہیں۔ وہ انسانیت کے نام پر زکوٰۃ نکال کے غذا' دوائیں اور کپڑے بھیج کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ چلو ہمارا اخلاقی فرض تو پورا ہوا۔ اور پھر اپنے خوبصورت گھروں اور کاروں' فیتی ملبوس' فیشن' آرٹ' اسپورٹ' اعلیٰ شراب اور بیش قیمت پرفیوم فائیو اسٹار ہوٹل اور BEACHES کی عیش و عشرت والی زندگی میں گم ہوجاتے ہیں۔ میں تو اپنے ملک کی بات کرسکتا ہوں۔ جہاں کروڑوں ایسے ہیں جن کے گھروں میں ایک وقت چولھا جلتا ہے۔ میں اپنے شہر کی بات کرتا ہوں۔ یہاں لاکھوں ہیں جو زندگی کو ایک ایک دن کرکے جیتے ہیں۔ آج کا دن گزر گیا۔ کل کا کیا ہوگا؟ آج روزگار مل گیا تھا۔ کل آٹا کیسے آئے گا؟ دوا کہاں سے آئے گی' اگر موت نہ آئی۔ بجلی کا بل ہے' امتحان کی فیس ہے۔ جوتے پھٹ گئے ہیں۔ عید آرہی ہے۔ غریب آدمی سوچ سوچ کے اور آمدنی کو کھینچ کر خرچ کے برابر لانے کی فکر میں گھلتا رہتا ہے۔ پیسے گنتا رہتا ہے اور دن شمار کرتا رہتا ہے۔ اور پریشان ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس میں تھا کہ حیران ہوا' اپنے اثاثوں کی کل مالیت دیکھ کے جو میری توقع سے کہیں زیادہ نکلے۔ توقع کا لفظ بھی غلط ہے۔ مجھے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری دولت مندی کی حد کیا ہے۔ میں نے نقد کی صورت میں جتنا اکٹھا کر رکھا تھا وہ کتنا تھا؟ مجھے کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ کروڑوں میں ضرور ہوگا۔ صحیح ہندسہ..... میں دس بیس لاکھ کے فرق سے بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ساڑھے پانچ ہیں یا ساڑھے سات تب بھی حیران ہوتا۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے؟"

"میں اب بھی نہیں سمجھی کہ اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ تم نے یہ سب ناجائز ذرائع سے یا ڈاکے ڈال کے اکٹھا کیا تھا تو اور بات ہے" شبنم بولی۔

میں نے کہا "شبنم۔ جس ملک میں ننانوے فیصد افراد محدود آمدنی میں مشکل سے گزارا کرتے ہوں وہاں کچھ لوگ کسی مقصد کے بغیر دولت جمع کرنے میں مصروف ہوں۔ جسے وہ خرچ نہیں کرسکتے۔ جو خود رو کینسر کے خلیوں کی طرح بڑھتی جارہی ہو۔ اور وہ دولت کے پہاڑ کو اونچا ہوتا دیکھ کر خوش ہونے کے سوا کچھ نہ کرسکتے ہوں۔ تو کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے۔ ان کے چاروں طرف ضرورت مندوں کے اندھے غار ہیں جو خاندان کو' معاشرے کو' ملک و قوم کو نگلتے جارہے ہیں۔ کیا ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے؟ خاندان' پاس پڑوس' محلہ' انہیں کیا چاہیے؟ کس چیز کی فوری ضرورت ہے؟ شہر میں کیا نہیں ہے؟ اسکول' اسپتال' پانی' روٹی۔ ملک میں کیا نہیں ہے؟ عورت کے تن پر کپڑا' بچے کے لیے دودھ۔ تھانوں میں دینے کے لیے رشوت۔ جیلوں میں پڑے بے گناہ غریبوں کے لیے ضمانت' لاوارث مرنے والوں کو کفن۔ ہزاروں ضرورتیں ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے کسی کے پاس وسائل نہیں۔"

"ایسے کون سوچتا ہے؟"

کیا یہ سوچ درست ہے؟ اسے غلط بھی نہیں کہنا چاہیے۔ میں نے کہا "دولت کی اس نامنصفانہ تقسیم کا ذمے دار کون ہے؟ یہ تو بڑی لمبی بحث ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جو بہت کچھ کرسکتے ہیں' وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بس سوچتے ہیں اور بولتے ہیں۔ کانفرنس اور سیمینار کرتے ہیں۔ غربت و افلاس کے مسائل پر آرٹ موویز بناتے ہیں اور تیسری دنیا کے موضوع پر دانشوری کی دکان چلاتے ہیں۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ سات کروڑ ہوجائیں اسی سال میں' آئندہ سال آٹھ۔ زکوٰۃ نکالتا ہوں نکیں بچا کے۔ کاروبار کے لیے بانگ کانگ' سنگاپور جاتا ہوں تو گناہ ثواب برابر کرنے کے لیے عمرہ بھی کرلیتا ہوں۔ میں عام آدمی کی بات نہیں کررہا ہوں۔ یہ میرے جیسے لوگ کرتے ہیں۔ کارخانے' پلازا' جائدادیں' ٹھیکے' امپورٹ ایکسپورٹ کے لیے نئی مارکیٹیں۔ دن رات یہی سوچنے والوں کو انسانی' قومی یا معاشرتی مسائل پر سوچنے کی فرصت کہاں۔ اور فرصت نکل آتی ہے اگر ضرورت کا احساس ہو۔ جو نئے بزنس کو سیٹ اپ کرنے کے لیے ٹائم نکالتے ہیں وہ کسی اسپتال میں جاکے ضرورت مند مریضوں

سے ملنے کے لیے وقت نہیں نکالتے۔ مہینے یا سال میں ایک دن بھی کسی یتیم خانے میں جاکے نہیں دیکھتے کہ بن ماں باپ کے بچے کیسے پل رہے ہیں' ٹائم نہیں ہے۔ جب ہارٹ اٹیک ہوگا تو ٹائم نکل آئے گا لندن جاکے کسی اسپتال میں لیٹنے کے لیے۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ "کتنا ناقابلِ یقین ہے یہ؟"

میں نے کہا "ہاں۔ لیکن یہی ہورہا ہے۔ ہم جیسے سب ایسے ہی ہیں۔"

"میں تمہاری اس سوچ کی بات کررہی تھی۔ یہ ناقابلِ یقین ہے میرے لیے۔"

میں نے خفت سے کہا "اسی لیے میں نے کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ میں نے جو کیا صرف اپنے لیے کیا' دوسروں کے بھی حقوق تھے مجھ پر۔ میں نے سوچا کہ ایک اور پلازا بنالوں۔ یہ نہیں سوچا کہ کوئی اسپتال' کوئی اسکول' کوئی یتیم خانہ یا لائبریری بنالوں۔ ہندو ایسا کرتے تھے' لاہور میں ان کے نام کے... رفاہی ادارے کتنے ہیں۔ گنگا رام اسپتال' دیال سنگھ پبلک لائبریری۔ گلاب سنگھ دیوی اسپتال۔ کون تھے یہ لوگ۔ تم پاکستان کے دس بڑے صنعت کاروں کے نام لو۔ مجھے بتاؤ' کسی کے نام سے کہیں کوئی فلاحی ادارہ چل رہا ہے؟ ستار ایدھی تو کوئی صنعتکار نہیں ہے۔ یہ جو انڈیا میں ٹاٹا برلا جیسے نام تھے اور پاکستان میں سہگل آدم جی اور داؤد جیسے نام ہیں۔ فلاں گروپ اور فلاں گروپ۔ انہوں نے کیا کیا؟ کہتے ہیں جتنا اس ملک پر قرض ہے اس سے دگنا سرمایہ پاکستانی تاجروں' سیاست دانوں اور کرپٹ افسروں نے بیرونِ ملک جمع کر رکھا ہے۔ منشیات اور کرنسی کے بڑے بڑے اسمگلرز ہیں جو حاجی فلاں اور حاجی فلاں ہیں' کوئی نہیں سوچتا اس ملک یا قوم کے مسائل کے بارے میں۔ اور انہی بڑے بڑے پہاڑ جیسے خودغرض اور کمینے لوگوں میں میرا شمار ایک کنکر کی طرح ہے۔ مگر کوئی فرق نہیں مجھ میں اور ان میں۔ فرق صرف سائز کا ہے' سوچ کا نہیں ہے۔"

"یہ تو واقعی شرم کی بات ہے" شبنم نے اعتراف کیا۔

"اسی لیے مجھے شرم آئی۔ اپنی حیرت پر شرم آئی۔ میرے پاس ساڑھے چھ کروڑ ہیں۔ اگر آج میں یہ رقم خرچ کرنے لگوں اور میری زندگی کا انداز نہ بدلے۔ شوق کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہوگا اور جوئے میں ایک رات کیا ایک داؤ میں اپنا سب کچھ ہار سکتا ہوں میں۔ لیکن میں اپنے معیارِ زندگی کو آج کی سطح پر رکھوں... تو میری یہ دولت میری زندگی میں ختم نہیں ہوگی۔ مجھے مزید کچھ کمانے کی ضرورت نہیں۔ اس رقم کا سود ہی بہت ہوگا میری ضروریات کے لیے۔"

"سود حرام ہے" شبنم نے کہا۔

"منافع کہہ لو۔ آمدنی سمجھ لو... مگر میں سوچتا ہوں کہ میرے بعد میرے بچوں کا مستقبل محفوظ ہو۔ وہ آرام سے رہیں۔ انہیں کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ میرے بچے اور پھر ان کے بچے میرے نام اور خاندان کے نام کو اور آگے بڑھائیں یعنی خاندان کی عزت' شہرت' دولت اور طاقت میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ میں زبان سے کچھ بھی کہوں' عملی طور پر یہ نہیں سمجھتا کہ عزت' ذلت منجانب اللہ ہے اور رزق وہ دیتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے میں نوشتۂ تقدیر پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ یہ سمجھتا ہوں کہ آنے والے دن پر سو فیصد میرا اختیار ہے۔ اس کے برعکس تم دیکھو کرنل خان کو۔ انہوں نے کل کے لیے کچھ نہیں بچایا۔ جو تھا وہ بھی سب اٹھا کے ڈاکٹر کمال کو دے دیا۔ ایک لڑکی تھی' اس کی فکر نہیں کی کہ اس کا کیا ہوگا؟ کل کا اللہ مالک ہے۔ صبر و قناعت میں کتنا سکون ہے۔ دنیا کی پروا ہی نہیں۔ آخرت کا معاملہ خدا کے سپرد۔"

"چنانچہ تم نے بھی ان کی مثال کی تقلید کا فیصلہ کرلیا۔"

"یہی سمجھو" میں نے کہا "میں نے سوچا یہی تھا کہ اپنا سب کچھ ڈاکٹر کمال کے حوالے کردوں مگر پھر میں نے اطمینان سے سوچا تو جیسے ان گنت امکانات کے روشن راستے سامنے آگئے۔ کرنل خان کے وسائل محدود تھے لیکن انہوں نے سب ایک مقصد کے لیے وقف کردیے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے مگر میں اپنے وسائل کو پھیلا کے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ میں نے دوستوں سے مشورہ کیا اور اس سے میرے لیے ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنا آسان ہوگیا۔"

"پھر کیا سوچا تم نے؟"

"میں نے یہ طے کیا ہے کہ پہلے تو کمال سے پوچھوں گا کہ اس کو فوری طور پر اسپتال کے لیے کیا چاہیے؟ کوئی وارڈ یا مشینیں۔ ایکس رے' الٹراساؤنڈ اور ای سی جی مشین۔ اور ایک مکمل لیبارٹری خون اور پیشاب وغیرہ کے معائنے کے لیے یا ایک مکمل آپریشن تھیٹر؟"

"ایک اسپتال کو اچھی طرح چلانے کے لیے وارڈ سے زیادہ یہ چیزیں اہم ہوتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ فی الحال اس کا ارادہ اسپتال کی توسیع کا نہیں ہے۔ بڑھانے سے کیا فائدہ اگر موجودہ اسپتال ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نامکمل ہو اور مریضوں کو بنیادی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے کہیں اور جانا پڑے۔ ممکن ہے میں اسے مشینیں' لیبارٹری اور آپریشن تھیٹر سب فراہم کردوں۔ مجھے ان کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں۔ سب باہر سے منگوانا پڑے گا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"تمہیں آئندہ کبھی یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی بھی بات کا برا نہیں مانتا۔ نہ دوستوں کی اور نہ دشمنوں کی" میں نے کہا۔

"کہیں تم وہ پرانا کھیل نئے سرے سے تو شروع نہیں کرنا چاہتے۔ زیادہ بڑے پیمانے پر۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے سوشل ورک اور پھر پبلسٹی اور خدمتِ خلق سے ملک و قوم کی خدمت کے مقصد کا حصول؟"

"شاہ عالم تم ایسے ہی بنے تھے۔"

میں نے کہا "مگر اب تو شاہ عالم کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اسے شکست ہو گئی ہے۔"

"کچھ لوگ ایک شکست کو آخری شکست تسلیم نہیں کرتے۔ جیسے ہمایوں نے بارہ سال بعد ایران کے بادشاہ کی مدد سے ہندوستان کی سلطنت پھر حاصل کرلی تھی۔ اب لوگ الیکشن میں ایک پارٹی کے ٹکٹ پر ہار جاتے ہیں تو دوسری پارٹی میں چلے جاتے ہیں اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں" شبنم نے کہا۔

میں نے اس کی بات غور سے اور سکون سے سنی "تمہارا ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھنا جائز ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ تمہارے تجربات ایسے ہی تھے کہ اب ناصر عظیم کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی لیکن میں ایک کھوئی ہوئی منزل تک کسی دوسرے راستے سے پہنچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"یعنی اب سیاست کے میدان میں کبھی قدم نہیں رکھو گے۔"

میں نے کہا "میدان نہیں دلدل کہو۔ شاہ عالم ہوتا تو میں یقیناً اپنے دوست کمال کے لیے بھی یہ سب کچھ بے غرض ہو کے نہ کرتا۔ اس میں بھی میں اپنا فائدہ دیکھتا۔ میری دریا دلی اور انسان دوستی' فیاضی اور قومی خدمت کو بھرپور پریس پبلسٹی ملتی۔ پریس کانفرنس تصاویر اور بیانات سے میں پورا سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک میڈیا ٹیم کی خدمات حاصل کرلیتا۔ لیکن میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے' جب تم اتنے وثوق کے ساتھ یہ بات کہتے ہو" شبنم نے کہا "میرے یقین کی بنیادیں جیسے زلزلے کے جھٹکے سے ہل جاتی ہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ میرے ایسا کہنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ میں اس زندگی کے دائرے سے نکل آیا ہوں۔ میں ایک بالکل مختلف سوچ رکھنے والا وہی آدمی ہوں جو پہلے ناصر عظیم تھا۔ اصل یہی تھی میری۔ ایسے سمجھ لو کہ ویزا لاٹری نکل آئے کسی کی تو وہ بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے خود کو۔ یہ تو امریکا جا کے پتا چلتا ہے کہ لاٹری میں اس نے سب کچھ گنوا دیا۔ اپنا ماضی' اپنا گھر' اپنے رشتے' اپنی تہذیب اور ثقافت۔ اپنا وطن اور اپنی قومی شناخت۔ جسے احساسِ زیاں اتنا پریشان کرے کہ اجنبیت کی اس فضا میں سانس لینا دوبھر ہو جائے' وہ ایک بار لوٹ کر آنے کے بعد کبھی پھر امریکا جانے کی سوچے گا؟"

"اس مسئلے پر تم سے پھر کبھی بات ہوگی کہ سیاست کے میدان کو برے لوگوں کے لیے خالی چھوڑ دینا کس حد تک جائز ہے۔"

"معلوم ہے کرنل خان نے کیا' کیا۔ وہی جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پھر خان اعظم نہ ہوتے۔ انہوں نے ایک وار ڈ تعمیر کرایا مگر اسے اپنے نام سے موسوم نہیں کرنے دیا۔ کہیں نام کی تختی تک نہیں لگانے دی کہ یہ عطیہ کس کا ہے۔"

"تم بہت زیادہ متاثر ہو خان جی کے کردار سے۔"

"یہ ایک قدرتی بات ہے۔ میری ذہنی اور روحانی پرورش انہی کے زیرِ سایہ ہوئی۔ وہ میرے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں بھی اسپتال کے معاملے میں کہیں سامنے نہیں آؤں گا۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ پبلک کو میرے نام کا بالکل پتا نہ چلے۔ اپنی ضرورت کا اندازہ ڈاکٹر کمال کرسکتا ہے۔ اس کی معاون اور دستِ راست کوئن بھی اسپتال کے معاملات کو سمجھتی ہے۔ وہ خود مل کے طے کرلیں گے کہ کیا چاہیے۔ کس معیار اور قیمت کا چاہیے اور ظاہر ہے وہ سامان باہر سے منگوائیں گے یا کوئی انہیں منگوا کے دے گا۔ میں کمال کو خاموشی سے پے آرڈر دے دوں گا۔ اس میں مجھے اور کچھ نہیں کرنا ہے۔"

"تم عملی طور پر بھی کمال کے ساتھ کام کرسکتے ہو۔ جیسے کوئن اس کی مدد کر رہی ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "میں ضرور کرتا۔ اگر میرے پیشِ نظر اپنی مصروفیات نہ ہوتیں۔"

"فی الحال تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔" شبنم نے کہا۔

میں نے کہا "فی الحال میں اپنی جان بچا رہا ہوں۔ اسپتال میں پبلک آتی ہے اور کوئی بھی مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے شناخت کرسکتا ہے۔ اس سے میرا روپوشی کا سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔ میرے دشمنوں کو پتا چل جائے گا کہ میں ناصر عظیم کے نام سے کہاں چھپا ہوا ہوں۔ میں اپنا پلان تمہیں بتا چکا ہوں۔ دو چار مہینے تک لوگ ڈھونڈتے پھریں کہ شاہ عالم آخر گیا کہاں؟ اس عرصے میں تم میری مدد کروگی اور کبھی کبھار اخباروں میں ایسی خبریں شائع ہوں گی کہ شاہ عالم کو فلاں ملک میں دیکھا گیا۔ یا وہ آج کل فلاں شہر میں ہے اور فلاں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اگر کسی فرضی اخباری نمائندے کا کوئی انٹرویو بھی لگ جائے تو سونے پہ سہاگا۔ تردید کرنے والا کون ہوگا؟ معلوم یہ ہو کہ شاہ عالم جلاوطنی کی زندگی سے مطمئن ہے اور پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

"اس کا انتظام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہاری لندن یا پیرس میں کسی کے ساتھ تصویریں بھی بن جائیں گی۔"

"اور بالآخر یہ خبر کہ شاہ عالم پُراسرار حالات میں مر گیا۔ کسی حادثے کا شکار ہوا یا اپنے فلیٹ میں یا کسی ہوٹل کے کمرے میں مردہ پایا گیا۔ یہ خودکشی تھی یا قتل۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ معاملات میرے وائزہ کار میں آتے ہیں۔ یہ فیلڈ ہے میرا۔ اس میں مجھے ہدایات دینے کی ضرورت نہیں۔ تم خود دیکھ لوگے کہ جیسا تم چاہتے تھے ویسا ہی ہوا۔ قتل یا حادثے کی خبر دینے سے گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ وہاں ایک کتا بھی غیر طبعی موت مرے تو اس کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ ہوٹل کا نام دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"باہر کون پڑھتا ہے ہمارے اخباروں کی ایسی خبریں۔" شبنم نے کہا "آخر تمہیں بھروسا کیوں نہیں۔ میرا تجربہ ہے۔ عقل ہے میرے پاس۔ وہاں نہ سہی۔ یہاں کو سلیٹ یا سفارت خانے اپنے ملک کے بارے میں شائع ہونے والی ہر خبر کو نوٹ کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے فوراً تردید آجائے گی مگر تردید سے پہلے وہ خبر کا ذریعہ تلاش کریں گے۔ مشکل مجھے پڑے گی۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اوکے! جیسے تم مناسب سمجھو کرو۔ کیا خیال ہے' اب ہم چلیں۔ کھانے کا وقت تو گزر گیا ہے مگر کھانا بھی ضروری ہے۔"

شبنم اٹھ کھڑی ہوئی "ناصر۔ آئی لو یو۔"

میں ہنسنے لگا "بہت سے مکالمے صرف فلموں میں بولے جاتے ہیں۔"

وہ مجھ سے چمٹ گئی "نہیں۔ آج مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میری محبت جیت گئی ہے۔ میں تمہارے لیے اہم ہو گئی ہوں۔"

میں نے اسے نرمی سے الگ کیا "تم ہمیشہ اہم تھیں میرے لیے۔"

"وہ میری اہمیت نہیں تھی' ضرورت تھی تمہاری۔ تمہیں ایک نامور صحافی کی خدمات حاصل تھیں جو تمہارے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوتا۔ اور وہ ایک عورت بھی تھی' جو خود اپنا جذباتی استحصال چاہتی تھی۔ میری کوئی عزت نہیں تھی۔ نہ تمہاری نظر میں نہ کسی اور کی نظر میں۔ مجھے تمہارا اعتماد کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے مجھے۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم سے مل کے؟"

"ہاں۔ کتنا عرصہ مجھے یہ گمان رہا کہ میں تمہارے قریب ہوں۔ مجھے خوش فہمی تھی کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ شاید جتنا میں جانتی ہوں کوئی اور نہیں جانتا مگر ایسا نہیں تھا۔ اس اعتماد کے قابل اب سمجھا ہے تم نے مجھے کہ مجھے ناصر عظیم سے ملوا دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم دہری زندگی گزار رہے ہو اور تمہاری شخصیت کا جو پہلو عیاں ہے' وہ اصل اور حقیقی نہیں ہے۔"

"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا" میں نے گیٹ کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"رخشی کو بھی نہیں۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔"

"وہ بیوی تھی تمہاری۔۔۔" شبنم میرے ساتھ باہر آگئی۔

"لیکن ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ اتنا مضبوط کبھی نہیں ہوا کہ میں اسے سچ بتا سکتا۔ مجھے اس میں خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ راز تب تک راز ہے جب تک اپنے سینے میں دفن ہے۔ وہ لفظ بن کے زبان تک آگیا تو پھر راز نہیں رہا۔ زبان سے نکلی بات پرائی ہو جاتی ہے۔" میں نے گیٹ کو مقفل کردیا۔

"تھینک یو ناصر۔ آج تم مجھے یہاں لائے۔ ان لوگوں سے ملوایا جو تمہارے اپنے ہیں۔ جو یہ جانتے تھے کہ شاہ عالم بننے سے پہلے تم ناصر عظیم تھے اور ناصر عظیم کون تھا لیکن کتنے خلوص کے ساتھ انہوں نے تمہارے راز کی حفاظت کی۔ کبھی کسی کو پتا نہیں چلنے دیا کہ تمہارے دو چہرے ہیں۔ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔ کسی نے افشائے راز کی دھمکی نہیں دی۔ بلیک میل نہیں کیا تمہیں۔ اتنے اچھے اور پیارے لوگوں سے لاتعلق رہے تم۔"

"تعلق وہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سیدھی صاف بات تھی کہ ہم کسی شاہ عالم کو نہیں جانتے۔ ناصر عظیم کو جانتے ہیں لیکن میں دہری زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ میں کیا کرتا' میں نے ناصر عظیم کو پس منظر میں رکھا۔ کسی کے سامنے نہیں آنے دیا۔ اس کی شخصیت میرے لیے آبائی گھر اور آبائی گاؤں جیسی تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا یہ سیاست داں اور جنرل۔ بیوروکریٹ اور بڑے لوگ۔ ان سب کا ایک گاؤں ہوتا ہے جس سے ان کی شناخت منسوب رہتی ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کا ہری پور ہزارہ کے پاس گاؤں تھا' ریحانہ۔ بھٹو صاحب کا گڑھی خدا بخش' غلام اسحاق خاں کا پشاور کے قریب گاؤں ہے اوڑہ' اپنا مایہ ناز فاسٹ باؤلر وقار یونس' وہ بورے والہ ایکسپریس کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔ ساری عمر اسلام آباد سے نیویارک اور کراچی سے لندن تک ہر شہر میں رہنے والے لوٹ کے اپنے آبائی گھر ہی آتے ہیں۔ مجھے بھی آج اپنی اصل میں پناہ ملی۔ گمنام ناصر عظیم خوش و خرم زندگی گزار سکتا ہے۔ شاہ عالم اپنی ساری عزت و شہرت کے باوجود دشمنوں سے چھپتا پھر رہا ہے" ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے اپنی نگاہ سڑک پر رکھی۔

شبنم بہت خوش تھی "ناصر۔ یہ بڑا عجیب تاثر ہے۔ بدلا کچھ نہیں ہے۔ سوائے تمہارے نام کے مگر مجھے لگتا ہے سب بدل گیا ہے۔ یہ دنیا بھی وہ نہیں رہی۔ میں وہ شبنم نہیں ہوں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "کیوں۔ ایسا کیوں لگتا ہے تمہیں؟"

"شاید اس لیے کہ عزت اور اعتماد کا یہ رشتہ نیا ہے میرے لیے۔ جو ناصر عظیم کے اور میرے درمیان آج قائم ہوا۔ شاہ عالم کی نظر میں کوئی عزت نہیں تھی میری۔ اس کے لیے میں بس ایک کھلونا تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت بے بس' مجبور اور بعض اوقات بہت گرا ہوا سمجھتی تھی۔ اتنی بے بس تھی میں اپنے جذبات کے ہاتھوں اور شاہ عالم نے میری کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا رکھا تھا۔ میں اس کے اشاروں کی غلام تھی۔ کٹھ پتلی کی طرح۔ شرم آتی ہے مجھے آج یہ اعتراف کرتے ہوئے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے لیے میں ذلت کی کسی انتہا تک جا سکتی تھی۔ وہ کہتا کہ میرے ساتھ سو۔ تو میں اس کی ناراضی کے ڈر سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ کہتا کہ میرا دل بہلانے کے لیے ہو۔"

میں نے کہا "بس کرو شبنم۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ عزت کا برتاؤ نہیں کیا۔ آئی ایم سوری' جو وقت گزر گیا' اسے بھول جانا چاہیے۔ اسی میں ہم دونوں کے لیے عافیت ہے اور سکون ہے۔ اعتماد کا یہ رشتہ تمہیں اچھا لگا' مجھے خوشی ہوئی یہ جان کے۔ اس رشتے کو بے غرضی کی بنیادوں پر ہی استوار رہنا چاہیے۔"

شبنم نے کہا "یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ ہوگا۔ بے غرض اعتماد کا رشتہ۔"

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور اسی لیے میں نے تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ تمہیں سب بتا دیا کہ میں کیا تھا پھر کیا بن گیا اور اب کیا بننا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک دور وہ تھا جو خان جی کے گھر تک میری زندگی کے بیس سالوں پر محیط رہا۔ اس سفر میں بہت لوگ ملے اور بچھڑ گئے۔ رئیس خان کے علاوہ سب لوگوں ..... نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ان سب سے تم آج مل چکی ہو۔ اب میں زندگی کا نیا سفر شروع کر رہا ہوں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ ناصر عظیم کا مستقبل اس کی زندگی کا تیسرا دور ہے۔ دوسرے دور کے ہم سفر بھی سب ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ سوائے تمہارے یا آزاد صاحب کے۔ مجھے خوشی ہے کہ رخشی میری شریکِ حیات نہیں رہی مگر وہ پرانے تعلق کی بنا پر میرے حالات سے ہمدردی رکھتی ہے اور میں اس پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ ایک اچھا دوست فرید بھی ہے۔ چنانچہ میں اکیلا بہرحال نہیں ہوں۔"

"تمہیں دوستوں اور خیر خواہوں کی کمی نہیں ہو سکتی۔" شبنم بولی۔

"مگر پتا نہیں کیوں' ہمیشہ میں نے دشمن زیادہ بنائے۔"

"شاید میں نے اور تم نے جو راستہ اختیار کیا' اس میں ایسا ہی ہوتا ہے" وہ بولی۔

اب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ کھانے کے لیے ہم لوٹ کے گھر جا سکتے تھے۔ اس گھر میں جہاں میں رئیس کے ساتھ روپوش تھا یا آزاد صاحب کے گھر جہاں شبنم اپنی مرضی سے رہتی تھی لیکن دونوں جگہ کھانا ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ رئیس کے بارے میں مجھے پوری امید تھی کہ وہ میرے لیے بہت متفکر ہوگا اور انتظار سے تنگ آ کے مجھے گالیاں دینے

کے بعد کہیں چلا گیا ہوگا یا پھر سو رہا ہوگا۔ آزاد صاحب کے لیے بھی یہ سونے کا وقت تھا۔ وہ صبح دس بجے واپس آتے تھے تو پھر شام چھ بجے تک ان کے لیے رات ہوتی تھی۔ مجھے فرید کے گھر کا خیال آیا مگر اس خیال سے شرم آئی کہ اکیلا بھی میں وقت بے وقت وہاں جا کے کھانے کی فرمائش کر دیتا تھا اور فرید کی ماں کو خاص طور پر اٹھ کے میرے لیے روٹیاں ڈالنی پڑتی تھیں۔ اب اپنے ساتھ شبنم کو لے جانا تو وہ برا نہ مانتیں مگر یہ کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ کسی ریسٹورنٹ میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے حق میں نہ شبنم تھی اور نہ میں تھا۔

بالآخر یہی طے ہوا کہ شبنم کہیں سے لنچ پیک کرا لے اور ہم رئیس خانے جا کے کھانا کھائیں۔

خلافِ توقع رئیس کی گاڑی گیراج میں موجود تھی اور وہ خود بھی نہ کہیں گیا تھا اور نہ سو رہا تھا۔ اس کی صورت سے ظاہر تھا کہ وہ غصے میں ہے اور غصے کا سبب بھی مجھے معلوم تھا۔ شبنم کو میرے ساتھ دیکھ کے وہ خاموش رہا مگر میں نے اسے چھیڑنے کے لیے سر پر ہاتھ مارا۔ "حد ہو گئی یار' تو یہاں بیٹھا ہے؟"

رئیس بھنا کے بولا "اور کہاں جا کے بیٹھوں' مینارِ پاکستان پر؟"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "ملاحظہ ہو' ہم اس سالے کی خاطر سارے شہر میں خوار پھرتے رہے۔"

رئیس کا پارا چڑھ گیا "ابے میں لحاظ کر رہا تھا قسم اللہ کی ورنہ جوتے پڑنے چاہئیں تجھے۔ چار گھنٹے ہو گئے پریشانی میں۔ کہاں جا کے مرگیا تھا تو؟ دل میں ہول اٹھ رہے تھے کیسے کیسے۔"

میں نے کہا "اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ بتائے بغیر کون غائب ہوا تھا؟ مجھے تو صبح شبنم نے جگا کے بتایا کہ تمہارا دوست غائب ہے اور میری گاڑی بھی غائب ہے۔"

رئیس نے بوکھلا کے شبنم کی طرف دیکھا "لو جی۔ میں تو کہہ گیا تھا کہ اپنے چیمپئن کو دفن کرنے جا رہا ہوں۔"

"شبنم نے تو نہیں بتایا مجھے۔ اسے پریشانی تھی کہ گاڑی باہر کھڑی تھی' چوری ہو گئی۔ ہم نے تو رپورٹ بھی لکھوا دی۔"

رئیس اچھلا "کیا۔۔۔ چوری کی رپورٹ لکھوا دی؟"

"اور کیا کرتے ہم۔ گاڑی جو وہاں نہیں تھی۔" شبنم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"یار کمال ہے۔ چوری کا کیا سوال۔ سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا اب گیراج میں سے گاڑی نکالنے کے لیے ان کی گاڑی کو سامنے سے ہٹانا پڑے گا۔ میں وہی لے گیا۔ بس آنے جانے میں ایک گھنٹا لگا ہوگا۔" رئیس چلانے لگا "واپس آیا ہوں تو دونوں غائب۔ میری گاڑی لے گئے تھے تم۔ میں نے تو رپورٹ نہیں لکھوائی چوری کی۔ میں بھی چلا جاتا تھا نے کہ گیراج میں کھڑی تھی گاڑی' اب نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بتا کے جانا چاہیے تھا مجھے۔"

"ابے میں بول کے گیا تھا۔ اب انہوں نے نہیں بتایا تجھے تو میں کیا کروں۔ کیوں جی' آپ سے کہا تھا میں نے یا نہیں؟ کہ عمران خان فوت ہو گیا ہے۔ میں آتا ہوں اسے دفنا کے۔"

"کہا تو تھا" شبنم سوچ کے بولی "اور میں نے بتایا بھی تھا۔"

میں نے سر کھجا کے کہا "اچھا؟ بتایا تھا۔ چلو' پھر کہا سنا معاف۔ آؤ شبنم' ہم کھانا کھائیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔ رئیس تو سوگ میں ہے' اس سے کہاں کھایا جائے گا۔ عمران خان مر گیا ہے۔"

"نحوس مت کر۔ خدا عمران خان کو میری زندگی دے۔ اس کے بارے میں ایسی منحوس بات اچھی نہیں لگتی" وہ بولا۔

"تو نے ہی نام رکھا تھا ایک مرغے کا عمران خان!"

"ابے تو یوں کہہ کہ وہ مرغا مر گیا ہے جو عمران خان کے نام پر لڑتا تھا۔ شہید ہو گیا ہے عمران خان کی آن پر۔ عمران خان پاکستان کی شان ہے۔"

"اچھا اچھا' آجا تو بھی اگر واقعی ابھی تک بھوکا بیٹھا تھا" میں نے کہا۔

"واقعی کا کیا مطلب۔ یہاں کون سی میری گھر والی بیٹھی تھی پکا کے کھلانے کے لیے۔" رئیس نے کہا۔

"کیوں؟ وہ تیرا ملٹی پرپز تمیں مار خان کہاں ہے؟ چوکیدار' ڈرائیور' خانساماں اور نجانے۔"

"اس سالے کا دماغ خراب کر دیا ہے چارفٹ کی عورت نے۔ کہتا ہے کہ یہ زنانہ کام ہم نہیں کرتی۔ ہمارا گھر والی آتی تو جھاڑو دیتی' کھانا پکاتی' برتن صاف کرتی۔ وہ بولتی کہ تمہارا ایسا شاندار مردانہ مونچھ کا بے عزتی خراب ہوتی۔"

شبنم ہنسنے لگی "بڑے ہوٹلوں میں سارے شیف مرد ہی ہوتے ہیں اور باہر والایت جاتے ہیں ہمارے عالم فاضل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوجوان تو برتن دھوتے ہی نظر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "تیس مار خان کی خودی اس کے قد سے زیادہ بلند ہے۔"

"سالا خود بھی بھوکا بیٹھا ہے' اس عورت کے ڈر سے۔"

میں نے کہا "بھائی رئیس خان۔ یہ تو ایک عالمی مسئلہ ہے اور ازل سے ہے۔ کیا فرمایا ہے شاعر نے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ سب اسی زلف کے اسیر ہوئے۔ تو اس کی بات کی گہرائی میں جا۔"

"ہاں۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں وہ اپنا مطالبہ کیسے پیش کر سکتا ہے آخر" شبنم بولی "گھر کا پکا ہوا کھانا ہے تو گھر والی لے آؤ۔"

میں نے کہا "چوائس تمہاری ہے۔ اپنے لیے لاؤ یا اس کے لیے۔"

رئیس نے کہا "ابے ہاں یار۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ ہاتھ مار دیا سالے کو۔ صاف کہہ دیا کہ اتنا خیال ہے مونچھوں کی عزت کا تو صاف کرا دے انہیں۔ کام تو کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "اسے بلا کے بات کرتے ہیں۔"

طلب کیے جانے پر تیس مار خان بڑے باوقار انداز میں چلتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس کا بدلا ہوا حلیہ دیکھ کے میں حیران رہ گیا۔ شلوار قمیص کی جگہ اس نے جینز کی پتلون اور شوخ رنگ کپڑے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں تیس مار خان کا مختصر وجود مزید سمٹا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں پرانے بھدے جوتوں کی جگہ نئے جوگرز تھے اور اس نے اپنی شخصیت کے تاثر کو بھرپور کرنے کے لیے گھر میں بھی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ بالوں کی شان وہی تھی کہ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے اور سر سے چپکے ہوئے تھے۔ مونچھیں ہمیشہ کی طرح دائیں بائیں شانوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اس کی دلآزاری کے خیال سے میں نے ہنسی کو ضبط کر لیا "یار رئیس خان' تم تو پہچانے نہیں جا رہے ہو۔"

شبنم نے تعریفی انداز میں سر ہلایا "بالکل ہیرو لگ رہے ہو۔"

رئیس نے برہمی سے کہا "یار' اس کا دماغ اور خراب مت کرو۔ جو کر پہلے ہی گنتا تھا' عشق میں کارٹون بن گیا ہے۔"

تیس مار خان نے میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا "غریب آدمی کا بھی دل ہوتا ہے صاب۔ ام فیشن کرتی تو کیا گناہ

کرتی۔"

"گناہ کے بچے! صاف کیوں نہیں کہتا کہ اس پری نے کہا ہو گا تجھ سے۔ پہلے تو کبھی خیال نہیں آیا فیشن کا تجھے۔" رئیس خان نے کہا۔

"اب ام اس کا خوشی کا واسطے سب کرتی۔" تیس مار خان نے تسلیم کیا "وہ ام کو بولتی کہ تم اتنا خوبصورت جوان ہوتی۔ نوجوانوں کی طرح رہتی۔ اچھا کپڑا پہنتی تو شاندار نظر آتی۔ وہ ام کو ایک ولایتی رسالہ دکھاتی' اس میں ایک تصویر ہوتی۔"

"تجھے وہ بنا دیا اس نے تصویر جیسا۔ اب میں دوں گا تجھے ایک ولایتی رسالہ۔ اس میں میموں کی تصویریں ہیں۔ تو اسے کہنا کہ وہ بھی پہن لے ان جیسے کپڑے۔ بڑی بچت ہو گی دونوں کی۔ آدھے گز میں اس کا سوٹ بن جائے گا اور تیرا کام چل جائے گا لنڈے بازار سے۔" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "آدھے گز میں تو اس کے دو سوٹ نکل آئیں گے۔ وہ ہے بھی تو آدھی۔"

"آپ کیسا بے شرمی کا بات بولتی صاب۔ ام اس کا پاکستانی لباس رکھتی۔ ایک دم اسلامی۔" تیس مار خان کی متانت میں فرق نہیں آیا۔

"دیکھا تم نے۔ محبت میں بھی دوغلا پن" شبنم بولی "خود تو ولایتی ہیرو بنا پھرے گا' بیوی کے لیے اسلامی لباس۔"

میں نے کہا "شوہر ہوتا ہے مجازی خدا۔ وہ جیسے چاہے رکھے اپنی بیوی کو اور ویسے بھی یہ معاشرہ مردوں کا ہے' یہاں ہماری مرضی چلے گی۔"

محبت نے تیس مار خان کا حلیہ ہی نہیں' اس کے خیالات بھی بدل دیے تھے۔ کھانا پکانے کا مسئلہ آیا تو اس نے کہا "صاب' ام ایک تنخواہ لیتی' ایک کام کرتی۔ ام گاڑی چلاتی۔ آپ ام کو ڈرائیور نہیں شوفر بولتی۔ ام چوکیدار کا ڈیوٹی دیتی تو دوسرا تنخواہ لیتی اور آپ ام کو گارڈ بولتی' ام کھانا پکاتی تو تیسرا تنخواہ لیتی اور آپ ام کو شیف بولتی۔ ام آٹھ گھنٹا ڈیوٹی کرتی' زیادہ کرتی تو اوور ٹائم لیتی۔ آپ ام کو تین یونیفارم دیتی۔ شوفر کا' گارڈ کا اور شیف کا۔ ام ایک دن چھٹی کرتی۔"

ہم سب اس کی باتوں سے لطف لیتے رہے اور ہنستے رہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے منہ میں زبان اپنی نہیں۔ وہ برسوں سے رئیس کے ساتھ تھا اور ان کے درمیان مالک اور ملازم کا رشتہ کبھی نہیں تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ رئیس اس کی ضروریات کا پورا خیال رکھتا تھا اور شاید خود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیمی مارخان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے تنخواہ یا شرائط ملازمت پر رئیس سے بات کرنی چاہیے یا کوئی اور ٹھکانا تلاش کرنا چاہیے جہاں اسے بہتر مواقع حاصل ہوں۔ وہ ایک قناعت پسند' وفادار اور سادہ دل شخص تھا مگر پھر اچانک اس کی زندگی بدل گئی۔ اسے ایک عورت سے محبت ہوگئی جس نے اس کے دل پر ہی نہیں' دماغ پر بھی اختیار حاصل کرلیا۔ وہ ایک تیز طرار عورت تھی جس نے پہلے دل لگی میں یا عادتاً تیمی مارخان کو بے وقوف بنا کے لوٹا مگر پھر اس کی یہی سادگی کی ادا اس کے دل کو بھا گئی۔ ہر عورت کی طرح اس کی خواہش بھی ہوگی کہ شوہر اس کو دیوانہ وار چاہے اور اس کے اشارۂ ابرو کا غلام ہو۔ تیمی مارخان اس معیار پر ایک مثالی قسم کا شریک حیات ثابت ہوتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ اپنی سادہ لوحی کے باعث تیمی مارخان چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور ہر کام کرتا ہے مگر اسے معاوضہ محنت کے مطابق نہیں ملتا چنانچہ اس کے مالی مفاد کی محافظ وہ بن گئی تھی۔ یہ بات رئیس بھی سمجھتا تھا کہ تیمی مارخان جیسا بے وقوف شخص کسی کے بہکاوے میں آکے ایسے کاروباری لہجے میں بات کرنے لگا ہے مگر چھیڑنے کے لیے شبنم نے کہا "بھئی یہ بات تو دل کو لگتی ہے۔ کام اتنے ملازموں کا' تنخواہ صرف ایک کی۔ شوفر' شیف اور گارڈ۔ اس کے علاوہ تمہاری کیا ذمے داریاں ہیں؟"

تیمی مارخان نے اسے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "ام جناب! ام گھر کا سارا کام کرتی۔ صفائی کرتی۔ اور مالی ہوتی۔"

میں نے کہا "کم سے کم پانچ افراد کا کام تم اکیلے کرتے ہو۔ تمہیں پانچ تنخواہیں ملنی چاہئیں اور پانچ وردیاں' کیا خیال ہے؟"

"صاب' آپ انصاف کا بات کرتی۔ وہ ام کو بولتی کہ۔"

"وہ کون؟" شبنم نے کہا۔

شرماتے ہوئے تیمی مارخان کی مونچھیں لرزنے لگیں "وہ جی۔۔۔ خانم۔ ہم خان ہوتی وہ خانم ہوتی۔ ام کو بہت اچھا لگتی۔۔۔ وہ۔۔۔"

"سالا دیوانہ ہوگیا ہے اس چار فٹی کے پیچھے" رئیس نے کہا۔

"صاب جی۔ آپ کا بڑا مہربانی ہوتی۔ آپ اس کو ایسا مت بولتی۔ خانم بولتی" اس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی "خانم اماراپی بی ہوتی۔"

"یعنی شادی کا معاملہ آپس میں ہی طے کرلیا ہے دونوں نے؟" رئیس نے کہا۔

"ابھی ام بات کرتی۔ وہ بولتی خان صاب تم بہت پیسہ کماتی پھر بہت پیسہ بچاتی۔ ایک کوٹھی بناتی' اس سے بڑا۔۔۔ اور گاڑی لیتی۔ بہت بڑا۔ اس میں سارا بچہ لوگ اسکول جاتی۔ انگریزی اسکول میں پڑھتی۔"

خوابوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی جہاں پہنچ کے خیال رک جائے اور آدمی آنکھیں کھول کے سوچے کہ نہیں' ایسا تو مجھے خواب میں بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔ جب تک ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے وہ کوئی غیر قانونی شارٹ کٹ اختیار نہ کریں۔ تیمی مارخان جیسے لوگوں کی زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور آزمائش رہتی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ سخت سے سخت تر ہوجاتی ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے' عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عدم کی رات آجاتی ہے اور اس وقت سکون کا آخری سانس وہی لیتا ہے جسے ناتمام حسرتوں کا ملال ہو لیکن پچھتاوا نہ ہو کہ اس نے نفس کی غلامی کی اور چوری کی۔ ڈاکے ڈالے اور موت کی سوداگری میں مال کما کے عیش کی زندگی گزاری۔

رئیس نے کہا "ابے ایسی شرطیں ہیں اس کی شادی کے لیے تو پھر چھوڑ دے اس کا خیال۔"

شبنم نے کہا "میرا خیال ہے کوئی محبت کرنے والی عورت اس قسم کی شرائط عائد نہیں کرسکتی۔ کیوں تیمی مارخان۔ تمہاری خانم نے کہا ہے کہ کوٹھی کار ہوگی تمہارے پاس تو شادی کروں گی۔"

"نئیں صاب۔ ایسا ام کہتی۔ وہ بولتی کہ خان صاب۔ ام تمہارا ساتھ خوش' جدھر تم رکھتی۔ غسل خانہ میں یا غریب خانہ میں۔ مرغی خانہ میں یا کبوتر خانہ میں۔ ام بولتی کہ رئیس خان صاب کا رئیس خانہ ہوتی۔ ہمارا گھر تیمی مارخانہ ہوتی۔ وہ کچھ نہیں مانگتی صاب۔ یہ سب ام سوچتی۔"

میں نے کہا "دیکھو تیمی مارخان۔ جب تک تم رئیس کے ساتھ ہو' تمہیں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ گھر بھی تمہارا گھر ہے۔ تم اس کے ساتھ یہاں رہوگے تو سب کچھ تمہارا ہوگا۔ کیا کل تم اسے رئیس خان کی گاڑی میں لے کر گھومتے نہیں رہے؟ رئیس دل کا رئیس ہے۔ یہ تم جانتے ہو مگر تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ رہوگے تو عیش کروگے۔ یہ تنخواہ کی یا اوور ٹائم الاؤنس کی بات مت کرو۔"

رئیس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ابے ہم نے

کبھی ملازم نہیں سمجھا تجھے۔ ہمارے ساتھ ہے تو یار ہے اپنا۔ چھوٹا بھائی ہے۔ اپنی اس ہوشیار خانم کو بھی سمجھا دینا یہ بات۔ گھر یہ اسی کا ہے اگر وہ سمجھے۔ ورنہ تجھے بھی لے جائے اپنے ساتھ۔"

تیمی مارخان کا شرمندگی سے بُرا حال ہوگیا "صاب' آپ ام کو معاف کرتی۔ ام غلطی کرتی۔ ام گدھے کا بچہ ہوتی۔ خانم پھر ایسا بولتی تو بخدا ام اس کا زبان جلاتی اور ایک دم طلاق بولتی اس کو۔"

"یار پہلے شادی تو کرلو۔ طلاق کی دھمکی بعد میں دینا" میں نے کہا۔

"مگر صرف دھمکی' طلاق نہیں" شبنم نے کہا۔

"بالکل نہیں۔ دھمکی بھی نہیں چلے گی قسم اللہ کی۔" رئیس نے کہا "ابھی دیکھ لو' سمجھ لو ایک دوسرے کو۔ بعد میں کچھ نہیں۔ لڑو جھگڑو' مارو ایک دوسرے کو مگر طلاق کی بات آئی کسی کی زبان پر تو قسم اللہ کی مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ میں اب جارہا ہوں ایک کام سے۔ تم گھر میں بیٹھنا شرافت سے۔"

میں نے کہا "اچانک کیا کام یاد آگیا؟"

"اچانک نہیں پیارے۔ ٹائم دیا تھا ہم نے۔" اس نے مجھے آنکھ ماری اور چلا گیا۔

شبنم نے گھڑی دیکھی "آزاد صاحب متفکر ہوں گے میرے لیے؟"

"تم نے انہیں بتادیا تھا کہ تم کہاں مصروف ہو؟"

"یہ مصروفیت ان کے کس کام کی۔ اخبار کے لیے میں کچھ نہیں کررہی ہوں۔ پہلے تو میرے کچھ ایسے مسائل تھے کہ وہ کام چلاتے رہے۔ ایک عرصہ ہوا میں نے کوئی اسٹوری نہیں دی۔ کوئی فیچر نہیں کیا۔ عملی طور پر میں صحافت سے اور صحافیوں سے کٹ کے رہ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "صحافت ہی تمہاری اصل طاقت ہے۔"

"طاقت سے پہلے یہ میرے لیے ایک مقصدِ حیات ہے۔ ایک مشن ہے۔ میں نے اس پیشے میں شہرت حاصل کرنے یا دولت کمانے کے لیے قدم نہیں رکھا تھا۔" وہ بولی۔

"دولت کے لیے صحافی کو بلیک میلر بننا پڑتا ہے۔"

"ہاں' میں نے جن لوگوں اور اداروں کے کردار کو بے نقاب کیا' اگر میں چاہتی تو ان سے سودا کرسکتی تھی اور مجھے منہ مانگی رقم بھی مل جاتی۔ کچھ لوگ ایسا ہی کررہے ہیں۔ خصوصاً کرائم رپورٹنگ اور شوبزنس کے شعبے میں۔ سب جانتے ہیں ان کے بارے میں کہ انہوں نے خوب مال کمایا ہے۔ ان کی کوٹھیاں ہیں اور وہ گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ میری شہرت میں بدنامی کا کوئی پہلو نہیں۔ جو پرانے اور بہت بڑے' دھانسو قسم کے صحافی ہیں' وہ اوپر حکومت کی سطح پر معاملات طے کرتے ہیں۔ سیاسی کالم اور تجزیہ نگاری سے وہ اپنا ایک امیج بنا لیتے ہیں۔ سرکاری اداروں' سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات سے وہ پبلک کو بھی چونکاتے ہیں اور ان کی آواز حکومت کے ایوانِ اعلیٰ تک پہنچتی ہے تو صاحبانِ اقتدار کے لیے بھی لمحۂ فکریہ آجاتا ہے۔ وزیر مشیر اور وی وی آئی پی قسم کے لوگ بجا طور پر اس خدشے میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انکشافات کا یہ سلسلہ دراز ہوا تو ان کی باری بھی آجائے گی۔"

"مگر ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی وہ صحافی کا ضمیر اور اس کا قلم خرید لیتے ہیں۔"

"بیشتر صورتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ جو بڑے صحافی ہیں' یہ اپنی عمر گزار چکے ہیں' اسی دشت کی سیاحی میں۔ ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کے نام کی شہرت ایسی بن گئی ہے کہ انہیں معلومات حاصل کرنے کے لیے کوئی جدوجہد بھی نہیں کرنی پڑتی۔ معلومات خود ان کے پاس چل کے پہنچ جاتی ہیں۔ گھر کے بھیدی اور ان کے آدمی جو قریب رہنے کی وجہ سے سب کچھ جانتے ہیں۔ دفتری سازش کا شکار ہوں یا کسی کے ذاتی عناد کا' سامنے آئے بغیر بھی ثبوت کے ساتھ ایسی معلومات ان صحافیوں کو فراہم کردیتے ہیں جن سے کسی کا کیریئر ختم ہوجاتا ہے۔ کسی بہت نیک نام سمجھے جانے والے افسر یا سیاسی لیڈر پر بدنامی کا ایسا داغ آجاتا ہے جو تردیدی بیان سے دھونا مشکل ہو۔ ایک بار صحافی کی دھاک بیٹھ جائے تو پھر اس کا نام ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتا ہے۔ انفارمیشن بم حکومت کے لیے ایٹم بم سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔"

"ایسے انفارمیشن بم حکومتوں کو تباہ کردیتے ہیں۔ صدر نکسن کو واٹر گیٹ اسکینڈل میں جو تیس سال کی معطل قید کی سزا ہوئی۔ اس کا ذمے دار پریس ہی تھا۔"

"ہمارے ملک میں صورتِ حال ذرا مختلف ہے۔ وہاں صحافی اپنا فرض بے خوفی سے ادا کرتا ہے اور کسی ناپاک دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں خطرناک حد تک بے باک ہو کے سچ بولنے والے صحافی بہت ہیں مگر ایسے کم ہیں جو اندر یا باہر کے دباؤ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹے رہیں۔ انہیں بڑے خطرات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ باقی اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حکومت سے پلاٹ بالآخر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معاف ہوجانے والے قرضے اور سفارتی عہدے حاصل کرلیتے ہیں۔ کچھ اپوزیشن کے کیمپ میں چلے جاتے ہیں۔ اس امید پر کہ جب اپوزیشن اقتدار میں آئے گی تو ان کی خدمات کا صلہ حسب خواہش ملے گا۔ آج کل تو سیاست میں باری باری کا میوزیکل چیئر والا گیم چل رہا ہے چنانچہ صحافی بھی کچھ ادھر ہیں' کچھ ادھر۔ جو حکومت میں ہیں وہ سفیر وزیر تک بن رہے ہیں۔ باقی اپوزیشن کے ساتھ مل کے حکومت کو گرانے کے لیے زور لگا رہے ہیں۔ دوسری پارٹی برسراقتدار آئے گی تو سائڈ بدل جائے گی۔ جیسے ہاف ٹائم پر ہاکی' فٹ بال یا ٹینس میں سائڈ بدل جاتی ہے' اب تم ادھر' ہم ادھر۔"

میں نے کہا "اور تم کدھر ہو فی الحال؟"

"میں کسی طرف بھی نہیں ہوں کیونکہ مجھے صحافت سے کچھ لینا نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ایک مقدس فریضے کی طرح ہے۔ میں عزت کے ساتھ نام کمانا چاہتی ہوں۔ ضمیر نیازی کی طرح۔ حالانکہ میں جانتی ہوں اب یہ کتنا مشکل اور خطرناک کام ہوگیا ہے۔ جب سے ملک میں کلاشنکوف کلچر' دولت کی سیاست اور طاقت کے قانون نے فروغ پایا ہے۔"

"تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ ایک مرد کے مقابلے میں تم جیسی عورت اس ماحول میں صحافت کرے اور آئین جواں مردی' حق گوئی و بے باکی کے فلسفے پر عمل کرے تو وہ خود کو کیسے خطرات میں ڈالتی ہے؟"

وہ تلخی سے مسکرائی "یہ مجھ سے بہتر تم نہیں جانتے۔ یہاں تو جواں مرد بھی میدان چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے حق اور انصاف کے علمبردار کی پوری فیملی کو۔ میری کوئی فیملی نہیں۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سارے زمانے کو دشمن بنالو۔"

"جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ اس پیشے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی انجام کے خوف کو میں نے دل سے نکال دیا تھا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔"

میں نے کہا "عورت کی رسوائی اس کی موت سے زیادہ عذاب ناک ہوسکتی ہے۔ صحافی اغوا ہوتے ہیں تو انہیں مارپیٹ کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تم بلیک میل ہوسکتی ہو' ہر طرح سے۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی "مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "لیکن مجھے ہے۔ میں تمہاری صحت اور سلامتی کے معاملے سے بھی اتنا ہی CONCERNED ہوں جتنا تمہاری رسوائی کے خیال سے۔"

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "کیا چاہتے ہو تم؟ میں صحافت چھوڑ دوں؟"

میں نے کہا "صحافت میں عزت کے ساتھ شہرت کمانے کے محفوظ راستے بھی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے میں شوبزنس کرلوں۔ فلمی ستاروں کے انٹرویو اور فلم نگری کی خبروں کا کالم لکھوں؟ یا پھر سنڈے میگزین میں زنانہ صفحے کی نگراں بن جاؤں۔ میک اپ اور کھانے پکانے کی ترکیبوں تک محدود کرلوں خود کو؟"

میں نے کہا "معاشرتی اور معاشی مسائل بہت ہیں۔"

"اگر میں جوئے سٹے کے اڈوں کی نشاندہی کروں' منشیات فروشی کے نیٹ ورک کے بارے میں بتاؤں۔ بردہ فروشی' قبضہ گروپ یا کسی مافیا کا کچا چٹھا لکھوں تو ٹھیک ہے؟ یہ معاشی اور معاشرتی مسائل ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم! تم جانتی ہو اس میں کیسے خطرناک لوگ ملوث ہوتے ہیں۔ خدا کے لیے ان سے چھیڑ چھاڑ مت کرو۔ تم ماری جاؤ گی۔"

"موت سے ڈر کے کون سا جہاد کیا جاسکتا ہے؟"

میں نے کہا "بھاڑ میں گیا جہاد۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے میں صحافت چھوڑ دوں؟ صرف تمہاری ضرورت بن کے تمہارے ساتھ رہوں" اس کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوتا جارہا تھا۔

میں نے کہا "معلوم نہیں تم کس کی ضرورت کی بات کررہی ہو۔ شاہ عالم کی یا ناصر عظیم کی۔ ایک وقت تھا جب شاہ عالم تمہاری ضرورت تھا اور وہ تمہاری ضرورت پوری کرنے کے لیے تمہارا پورا استحصال کرتا تھا۔ خود اپنی ضرورت وہ کہیں سے بھی پوری کرلیتا تھا مگر ناصر عظیم کی ضرورت کچھ اور ہے۔"

"ناصر عظیم صاحب! ہر آدمی کو اپنے زندگی کے خواب اور مقاصد عزیز ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم میرے لیے یہ سب چھوڑ دو۔ ایک وقت تھا کہ میرے لیے سیاست ایک مقصد تھی اور میں نے خود کو جائز ناجائز طریقے سے اس مقصد کے حصول کے لیے وقف کررکھا تھا۔ سرحدھر کی بازی لگادی تھی میں نے۔ عزت' شہرت و دولت کی تکون کا نام تھا شاہ عالم لیکن پھر قدرت کی طرف سے مجھے ایک بہت عبرت آموز

سبق ملا۔ جب میں مر کے زندہ ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی کتنی بڑی نعمت ہے جو خدا نے مجھے دی۔ اسے میں سیاست جیسے فضول اور لاحاصل مقصد کی خاطر داؤ پر لگادوں؟ اگر مجھے اتنی ہی طاقت اور اختیار حاصل ہوجائے جتنا بھٹو صاحب کو یا ضیاء الحق کو اپنے دور اقتدار میں حاصل رہا تو پھر میرا انجام بھی انہی جیسا ہو۔ تو کیا حاصل سیاست کی اس جدوجہد سے۔ کیوں نہ میں اپنی زندگی کے لیے کسی اعلیٰ تر مقصد کو اپنالوں۔ دولت میں نے بہت کمائی مگر وہ مجھے زندہ درگور ہونے سے نہ بچاسکی اور اگر خوش قسمتی سے میں وزیراعظم یا صدر بھی بن جاتا تو مجھے حاصل ہونے والی عزت و شہرت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتیں۔ میں غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہوتا۔ میری کوئی ادا ان کو ناگوار گزرتی اور وہ مجھے ذلیل کرکے عرش سے فرش پر گرادیتے۔ بھٹو صاحب اور ضیاء صاحب کی موت پر آدھا ملک خوشی کے شادیانے بجارہا تھا اور آدھے جو رو رہے تھے' ان کے بارے میں بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ سب مخلص تھے۔ اب کون سا لیڈر قائداعظم کی طرح عوام کا محبوب ہوتا ہے۔ لیڈر بنائے جاتے ہیں اور مٹائے جاتے ہیں۔ جیسے مجھے جیتے جی مار دیا گیا تھا۔ بس اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کی قدر کرنا سیکھا۔ میں نے جھوٹی شہرت اور عزت کی اس دوڑ سے اپنا نام واپس لے لیا۔ اب میری زندگی پر میرا اختیار ہے۔"

شبنم نے کہا "ناصر' صرف عزت اور شہرت کی تمنا ہوتی تو میں فلموں میں چلی جاتی۔ پتا نہیں کتنی بار فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی طرف سے مجھے آفر ہوئی۔ مجھے لیڈ رول بھی مل سکتا تھا۔"

میں نے کہا "یہ انکشاف ہے میرے لیے۔"

وہ چونکی "کیا؟ آفر ملنے والے بھی تم خود تھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے صورت حال کو سنبھالا "میرا مطلب تھا یہ لیڈ رول والی بات۔ ویسے تو ہر صلاحیت تھی تم میں جس کی فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔"

"تمہاری سیاست اور میری صحافت کا ساتھ ضرور رہا۔ لیکن ہمارے مقاصد الگ تھے۔ آج تم اس مقصد سے ہٹ گئے ہو تو کیا مجھ سے توقع رکھتے ہو کہ میں بھی۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میری بات کا غلط مطلب مت نکالو۔ میری یہ خواہش تھی کہ تم بیل مجھے مار قسم کی صحافت مت کرو۔ میں تم پر بہت زیادہ DEPEND کرنے لگا ہوں۔ خدانخواستہ تم کو کچھ ہو تو میرا کیا بنے گا؟"

شبنم کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ "تم کو واقعی اتنا خیال ہے میرا؟"

میں نے کہا "خیال نہ ہوتا تو یہ بات ہی کیوں ہوتی۔"

"تم جانتے ہو میں تمہارے لیے ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں۔ صحافت کیا چیز ہے۔ تم ایک بار یہ کہہ دیتے۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کو جذباتی طور پر بلیک میل نہیں کرے گا۔ یہ قربانی دے کے تم مجھے خریدنا چاہو تو آئی ایم سوری۔ میں اسے باعزت سودا نہیں سمجھتا۔"

اس کا چہرہ بجھ گیا "پتا نہیں تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم محتاط رہو۔ میری وجہ سے تم پہلے ہی خطرے میں ہو۔ میرے دشمن بہت ہیں اور زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے تمہیں استعمال کرسکتے ہیں۔ تمہارے اور شاہ عالم کے تعلق سے سارا زمانہ واقف تھا۔"

"پھر کیا مجھے ناصر عظیم سے نہیں ملنا چاہیے؟"

میں نے کہا "جو تمہیں دیکھ رہے ہوں گے' انہیں یہ بہت غیر فطری سا لگے گا اگر تم نے شاہ عالم کے اچانک غائب ہوجانے پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ ذرا یاد کرو' شاہ عالم کی موت پر تمہاری کیا حالت تھی۔ اب وہ غائب ہوا اور تم بالکل نارمل۔ خوش و خرم زندگی گزارو' اپنے کام میں مصروف نظر آؤ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' تو کیا یہ رویہ شک پیدا نہیں کرے گا؟"

"یو آر رائٹ!" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اب تم ہفتہ دس دن سرعام پریشانی کا ڈراما کرو۔ سب کے سامنے تمہیں کیسی اداکاری کرنا چاہیے' یہ میں کیا بتاؤں؟ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری حالت دیکھ کر لوگوں کو میرے غائب ہونے کا یقین آئے۔ خصوصاً اخبار والوں کو کیونکہ انہی سے مجھے خبریں لگوانی ہیں شاہ عالم کے بارے میں کہ وہ کہاں دیکھا گیا اور کس کے ساتھ۔ سال چھ مہینے میں لوگ اس کو بھول جائیں گے تو پھر آخری خبر۔"

وہ پریشان نظر آنے لگی "یعنی سال چھ مہینے تک میں مسلسل اداکاری جاری رکھوں اور جب آخری خبر آئے تو پھر وہی پرفارمنس دوں جو پہلے حقیقی تھی۔"

"فی الحال اتنی دور کی مت سوچو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ شاہ عالم کی بیرون ملک گمنامی میں مرجانے کی خبر آنے تک تم بھی اس کی طرف سے جذباتی لاتعلقی اختیار کرلو۔ سب کو ایسا لگے کہ تم نے شاہ عالم کی بے وفائی کے بعد اسے بھلادیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری مدد کے بغیر شاہ عالم داستانِ ماضی نہیں بن سکتا اور اس کی جگہ ناصر عظیم دنیا میں بے خوفی سے نہیں جی سکتا۔"

"اور سال چھ مہینے کے بعد کیا ہوگا' جب میں ناصر عظیم کے ساتھ نظر آؤں گی؟" وہ الجھن میں پڑ گئی۔

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تمہارے چاہنے والے مایوس ہو جائیں گے کہ شبنم نے کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ دنیا کو اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا ناصر۔ تم ساری عمر میک اپ سے چہرہ بدل کے نہیں گزار سکتے۔ بالآخر لوگوں کو تمہاری اور شاہ عالم کی صورت میں مشابہت کا احساس ہوگا اور تمہارے ساتھ میرا نظر آنا ان کے شکوک کی تصدیق کر دے گا۔"

میں نے کہا "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس مسئلے کا بھی کوئی حل تلاش کریں گے بعد میں' ابھی ہفتہ دس دن تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔ اگر مجھے تم سے ملنا ہوگا تو میں خود رابطہ کروں گا۔"

"تم خود بھی محتاط نہیں ہو۔ اتنی بے خوفی سے ہر جگہ جانے کا رسک لیتے ہو کہ تم سے زیادہ مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی "ماناکہ گاڑی کے سیاہ شیشوں کے پیچھے صورت صاف نظر نہیں آتی مگر اترتے بیٹھتے نہ جانے کتنے لوگوں کی نظر پڑتی ہے۔"

"بس آج میں کچھ بے پروا ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو حلیہ بدلے بغیر نہیں نکلتا تھا اور کچھ تبدیلی تو آ گئی ہے میری صورت میں" میں نے اپنی پندرہ دن کی بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا جو باقاعدہ خشخشی داڑھی نظر آتی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں جاننے والے زیادہ ہیں مگر جو مجھے جانتے ہیں وہ بڑے چوکنے لوگ ہیں۔ ہر وقت اور ہر جگہ آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور کسی خبر کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں جاسوسوں کی طرح۔ ایک چھٹی حس بن جاتی ہے ان کی جس سے وہ خبر کو سونگھ لیتے ہیں۔ کتے سے زیادہ تیز ناک ہوتی ہے ان کی خبر کے معاملے میں۔ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو فوراً تم پر بھی غور کرے گا اور کھٹ سے بنا لے گا تصویر۔ تمہیں پتا چلے گا اگلے دن اخبار دیکھنے سے۔ میں اب چلتی ہوں۔"

"تمہارے آفس جانے کا وقت ہے۔"

"ہاں مگر دیکھو' کپڑے کیسے ہو رہے ہیں۔ کل سے ایسے ہی پھر رہی ہوں میں۔ پہلے گھر جاؤں گی" وہ بولی "تم اب آرام سے گھر میں بیٹھو۔"

"آج نہیں' مجھے بھی قمر کی سالگرہ میں جانا ہے۔ ہاں کل سے میں سیکیورٹی کے مسئلے کو پوری اہمیت دوں گا۔ اگر تمہارا اپنے اس پرستار مائیک سے رابطہ ہو تو اسے کہنا کہ۔"

میری بات ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے سے ادھوری رہ گئی۔ میز پر رکھا ہوا رئیس کا موبائل فون تھا جسے میں استعمال کر رہا تھا مگر اس کا نمبر رئیس کے علاوہ صرف تین دیگر افراد کے پاس تھا۔ پہلی شبنم' دوسرا فرید اور تیسری رخشی۔ خود میرے نام پر جتنے ٹیلی فون کنکشن تھے' وہ میرے استعمال میں نہیں رہے تھے۔ اب مجھے کی جانے والی کسی فون کال سے کوئی میرا سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔ جن تین چیزوں سے شاہ عالم کی زندگی کا تعلق جسم و جاں کی طرح تھا یعنی سیاست' شاہ عالم ہاؤس اور اس کی بیوی رخشندہ' ان سے قطع تعلق کی خبریں اخباروں کی شہ سرخیاں بنی تھیں اور سنسنی خیز صحافت کے علمبرداروں نے اس موضوع پر ہرزہ دیئے سے اظہارِ خیال کیا تھا کہ شاہ عالم نے سیاست کو اور اپنی جماعت سے دستبرداری کیوں منظور کی۔ اپنی بیوی کو کیوں طلاق دی اور حق مہر کے طور پر اسے اپنی ساری جائداد کیوں دے دی۔ شاہ عالم ہاؤس کے علاوہ کتنی کوٹھیاں بنگلے تھے۔ کتنی گاڑیاں تھیں جو رخشی کو ملیں اور اس نے یہ سب فروخت کر دیا۔ کیا شاہ عالم کو بلیک میل کیا گیا تھا؟ کیا وہ پاگل ہو گیا تھا۔ کیا اس نے دنیا چھوڑ کے سنیاس لے لیا تھا۔ ایسے مفروضات اور قیاس آرائیوں پر مبنی افسانوں اور افواہوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔

میں نے فون اٹھا کے اپنی آواز بدلی اور کہا "جی فرمایئے۔"

"آپ کون ہیں؟" میں نے رخشی کی آواز سنی۔

"رخشی۔۔۔ کیا حال ہے؟" میں نے کہا۔

"تم کہاں ہو آخر۔ نہ کوئی خیر نہ خبر۔ میں نے مجبوراً فون کیا۔" وہ بولی۔

"کوئی خاص بات؟ تم کچھ پریشان لگتی ہو۔"

"پریشانی کی بات ہے۔ کل کسی نے فون کیا مجھے۔ کہنے لگا کہ میں اخباری نمائندہ ہوں۔ اس نے میرے پرانے موبائل فون نمبر کا پتا چلا لیا تھا پھر یہ معلوم کر لیا کہ اب کیا ہے میرا نمبر۔"

"یہ اخبار والوں کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ کیا پوچھ رہا تھا وہ تم سے۔ میرے بارے میں۔۔۔؟"

"ہاں۔ کہنے لگا کہ شاہ عالم صاحب سے کوئی رابطہ ہے آپ کا؟ میں نے اسے خوب بے عزت کیا کہ میرا کیا تعلق شاہ عالم سے۔ طلاق لینے کے بعد وہ نامحرم ہے میرے لیے۔ ایک غیر مرد سے میں کیوں تعلق رکھوں گی؟"

"ٹھیک کہا تم نے۔"

"مگر وہ بھی بہت ڈھیٹ چیز تھا۔ شام کو پھر فون آ گیا اس کا۔ وہ میرا انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ اس کے ایک لاکھ دینے کو تیار تھا۔ میں نے بھی خوب سنائیں کہ آخر تم سمجھتے کیا ہو مجھے۔ ایک لاکھ تمہارے لیے بہت ہوں گے' اتنی تو زکوٰۃ بنتی ہے میری۔ وہ منت سماجت کرنے لگا کہ میں اس فیلڈ میں نیا ہوں۔ مالکوں نے کہا ہے کچھ کر کے دکھاؤ ورنہ چھٹی کرو۔ کسی نے مجھے یہ لائن دی اور مالک بھی راضی تھے کہ اگر ایک لاکھ میں بات بنتی ہے تو مجھے مل جائیں گے' میری نوکری کا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "وہ جھوٹ بول رہا ہوگا۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ دوبارہ فون کیا تو پولیس کو رپورٹ کر دوں گی۔ بے غیرت ہنسنے لگا کہ کیا رپورٹ کرو گی۔ کسے الزام دو گی اور میرا کام تو آسان ہو جائے گا رپورٹ سے۔ میں آپ کے پیچھے لگ جاؤں گا سائے کی طرح۔ ابھی تو معلوم نہیں کہ آپ ہیں کہاں؟"

"اس کا مطلب ہے کچھ لوگ تمہارے پیچھے بھی لگے ہوئے ہیں اور ممکن ہے وہی صحافیوں کو بھی استعمال کریں۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ناصر۔ میں تو تمہارے۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ عالم کے اس کاروبار کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ نہ میرا اس کی سیاسی مصروفیات سے کوئی تعلق تھا۔ میں گھر کی چار دیواری سے باہر کہاں نکلتی تھی اور خود شاہ عالم مجھے اس قابل کہاں سمجھتا تھا کہ اپنے ساتھ رکھے۔"

میں نے کہا "اس کا ایک فائدہ بھی ہے آج۔ تمہیں پہچاننے والے بہت کم ہوں گے۔"

"میں انہی دنوں میں پبلک کے سامنے آئی تھی' پہلی بار جب شاہ عالم کے زندہ مردہ یا اصلی نقلی ہونے کا معاملہ چل رہا تھا۔ میں نے پریس کانفرنس بھی کی تھی تمہارے کہنے پر اور عدالت میں حاضر ہو کے تمہارے حق میں گواہی بھی دی تھی۔ پہلے واقعی کوئی مسز شاہ عالم کو نہیں جانتا تھا۔ اب جانتے ہیں لوگ اور یہ خطرناک بات ہے۔"

"بالکل ہے۔ تم احتیاط کرو۔ یہ موبائل فون بھی واپس کر دو اور فی الحال گھر سے کہیں نہ جاؤ۔ آفس میں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ سیدھا تمہارے پاس۔"

"میں خود کو آفس میں زیادہ محفوظ سمجھتی ہوں۔ کوئی وہاں آئے تو فرید اس سے نمٹ لے گا۔"

"کیا نمٹ لے گا۔ ایک اخباری نمائندے کا کسی کے پاس انٹرویو کے لیے جانا کوئی جرم نہیں لیکن ایک بار کسی نے تمہارا پتا ٹھکانا دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ فرید بھی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اخبار والوں میں کوئی بلیک میلر ہوا تو ایسی ایسی باتیں شائع ہوں گی کہ تمہارا واقعی گھر سے نکلنا دوبھر ہو جائے گا اور وکیل صاحب کی ساری پریکٹس خود اپنے کیس لڑنے تک محدود ہو جائے گی۔ اخبار والے تو چاہتے ہیں کہ ان کے خلاف ہتکِ عزت اور ہرجانے کے کیس ہوں۔ ثابت کچھ نہیں ہوتا سالوں میں' پبلسٹی خوب ملتی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ میں آفس نہیں جاؤں گی لیکن پتا چلانے والوں نے گھر کا پتا معلوم کر لیا۔۔۔ پھر۔"

"تم سے زیادہ میرے لیے روپوشی مشکل کام ہے لیکن یہ ناممکن نہیں ہے۔ چار چھ مہینے میں شاہ عالم کا نام بھول سکتے ہیں لوگ تو تمہیں بس دو تین ہفتے غائب رہنا ہے۔ تم نے فرید کو بتایا؟"

"ہاں۔ پہلے اسے ہی بتایا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ آنے دو اس اخبار والے کو۔ وہ کھاتو نہیں جائے گا۔ دیکھیں تو آخر وہ ہے کیا چیز اور چاہتا کیا ہے؟ انٹرویو دینے میں کوئی نقصان نہیں۔ مجھے یہی کہنا ہے بس کہ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔"

"لیکن اس کے بعد لائن لگ جائے گی دوسرے اخبار والوں کی۔"

"میں نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا تھا لیکن فرید کا خیال ہے کہ جب پہلے انٹرویو میں کچھ نہیں ہوگا تو دوسرے اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ میں اسے گھر یا آفس میں نہ بلاؤں۔ اس سے کہوں کہ میں انٹرویو دینے کے لیے خود اخبار کے دفتر آ جاؤں گی۔ اس طرح پتا چل جائے گا کہ اخبار کون سا ہے اور رپورٹر جعلی تو نہیں ہے؟ یا پھر میں اس کو کسی ریسٹورنٹ میں بلا لوں۔ میں وہاں اکیلی جاؤں مگر آس پاس دوسرے لوگ پہلے سے موجود ہوں۔ فرید کا خیال ہے کہ سادہ کپڑوں میں پولیس والے ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں۔ بات صرف انٹرویو تک رہتی ہے تو میں مایوس کن جوابات سے رپورٹر کو اتنا بیزار کر دوں کہ وہ سمجھے اس نے اپنا وقت ضائع کیا۔ اگر معاملہ کچھ اور ہوا تو فکر کی بات نہیں ہوگی۔ آس پاس لوگ ہوں گے جو سب دیکھتے رہیں گے۔"

"یعنی وہ رپورٹر کسی کا ایجنٹ ہوا یا اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ آ پہنچے تمہیں اغوا کر کے ساتھ لے جانے کے لیے تو سب پکڑے جائیں گے۔ آئیڈیا فرید کا بھی اچھا ہے" میں نے کہا۔

"وہ کہتا ہے کہ اس طرح پتا چل جائے گا۔ رپورٹر کا بھی اور اگر اس کو استعمال کرنے والا کوئی اور ہے۔ تو اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی۔ رپورٹر کا تعاقب کیا جاسکتا ہے بعد میں کہ وہ کس کو رپورٹ دیتا ہے۔ اخبار کو یا کسی اور کو۔"

میں نے کہا "فرید کی بات مجھے بہت قابلِ عمل لگتی ہے۔ آخر ہے نا پولیس والا۔"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے یہ گیم کھیلتے ہوئے۔"

"تمہیں بھروسا رکھنا چاہیے فرید پر۔ وہ تمہاری حفاظت کرسکتا ہے اور اپنی جان پر کھیل کے بھی کرے گا۔ اس کے جذبات کا معاملہ ہے۔"

"اور تمہارے لیے کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "بُرا ماننے کی کیا بات ہے اس میں۔ جو فرید کے جذبات ہیں وہ میرے نہیں ہوسکتے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمہاری کوئی اہمیت نہیں رہی میری نظر میں۔ میں خود بھی آسکتا ہوں بلکہ ضرور آؤں گا بھیس بدل کے۔ میں بھی دیکھنا چاہوں گا اس رپورٹر کو جو میری بیوی سے انٹرویو لینے میں اتنا INTERESTED ہے۔ اس کی دلچسپی کے پردے میں پیشہ ورانہ تجسس ہے یا وہ دل میں کچھ اور جذبات رکھتا ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔ اگر اس نے یرغمال بنالیا مجھے خطرے کو محسوس کرکے' یا خود کو محصور پاکے' پھر کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے پھر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم ٹھنڈی آہ بھر کے اپنی بے بسی پر کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے اور تمہیں ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہیں گے پھر میں فرید کو اپنا رومال دوں گا آنسو پونچھنے کے لیے۔ اسے تسلی دوں گا کہ اول تو رخشی آجائے گی' نہ آئے تو وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ کوئی اور انتظام کردے گا۔ اس کے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے اور اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔"

"تم سیریس نہیں ہو۔ اس وقت تم سے بات کرنا بے کار ہے۔" رخشی نے فون بند کردیا۔

شبنم نے میری گفتگو سے اندازہ تو کرلیا تھا کہ میں کس سے بات کررہا ہوں اور موضوعِ سخن کیا ہے؟ پھر بھی میں نے اسے گفتگو کا خلاصہ بتادیا۔

"فرید کی اسکیم پر عمل کرنا چاہیے تمہیں۔ یہ سسپنس تو ختم ہوگا کہ وہ رپورٹر صرف انٹرویو لینا چاہتا ہے یا انٹرویو محض ایک بہانہ ہے رخشی تک رسائی حاصل کرنے کا۔"

"وہاں تم بھی آسکتی ہو اچانک۔ اتفاقیہ طور پر۔ اور دیکھ سکتی ہو کہ اخبار والا اصلی ہے یا نقلی اور انٹرویو میں تم بھی شریک ہوسکتی ہو۔ تمہیں کس کا ڈر ہے؟ انٹرویو فراڈ ہوگا تو تمہیں دیکھ کر وہ لوگ ویسے ہی پریشان ہوجائیں گے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا پھر کہا "ہوٹل سے رخشی کو اغوا کرکے لے جانا آسان نہیں۔ ہم باہر تک اپنے آدمی کھڑے کرسکتے ہیں۔ رخشی کی گاڑی کی ڈکی میں بندہ تک ٹھاسکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے لٹاسکتے ہیں۔"

"رخشی کو یہ خطرہ مول لینا چاہیے۔ اس طرح اصل خطرہ ٹل جائے گا۔ ورنہ جن لوگوں نے اس کے پرانے موبائل فون کا نیا نمبر معلوم کرلیا ہے' وہ اس کے گھر کا پتا بھی معلوم کرہی لیں گے بالآخر اور اچھا ہے وہ بتا کے آئیں تاکہ ان کے استقبال کا مناسب بندوبست ہوجائے۔ وہ اچانک پہنچ گئے گھر تو رخشی کی حفاظت کیا اس کی ساس کرے گی؟"

میں نے ہنس کے کہا "تم نے ابھی سے فائر کردیا اسے ساس کے عہدے پر۔ ویسے تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بہو کے لیے فرید کی ماں بھی جان کی بازی لگانے پر تل جائے گی۔ رخشی ہر طرح سے ان کے معیار پر سوفیصد پورا اترنے والی دنیا میں ایک ہی مثالی بہو ہے۔"

"رہنے دو یہ باتیں۔ آخر پہلی والی بھی تو انہی کی پسند تھی۔"

میں نے کہا "اسے انہوں نے دور سے دیکھا تھا اور دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ رخشی کا وہ دن رات بڑے غور سے مشاہدہ کرچکی ہیں اور یہ نتیجہ ان کی عملی ریسرچ سے حاصل ہوا ہے اس لیے غلط نہیں ہوسکتا۔ سونے پر سہاگا کہ ان کا مظلوم بیٹا جس پر پہلے انہوں نے اپنی غلط پسند مسلط کی تھی' رخشی پر فریفتہ ہے اور وہ دیکھ رہی ہیں کہ ان دونوں میں کتنی UNDERSTANDING ہے۔ کوئی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے مگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ ان کی مرادوں کی ٹرین کا جنکشن ڈائریکٹ لائن پر نہ آئے۔ وہ ایک دائرے میں گھوم کے اور پٹڑی بدل کے اس اسٹیشن پر ملیں جہاں عام حالات میں لوگ سیدھے پہنچتے ہیں۔"

"اوکے۔ میں اب چلتی ہوں۔ ورنہ دیر ہوجائے گی۔"

میں نے کہا "شبنم!"

وہ جاتے جاتے رک گئی "کہو کیا ہے۔؟"

"شاہ عالم کا پتا پوچھنے والوں کے لیے رخشی سے زیادہ تم مددگار ثابت ہوسکتی ہو۔ رخشی کبھی اس کی سوشل وائف نہیں رہی تھی۔ اس کی باہر کی مصروفیات کا علم تمہیں زیادہ رہتا تھا۔"

"ایسا لوگ سمجھتے ہوں گے۔ میں نہ اس کی سیکریٹری تھی

اور نہ پی آر او۔ اس کی سیاسی زندگی تو ایک اشتہار تھی جس کا مقصد ہی لوگوں کو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ اس کے سیاسی معاون جانتے تھے۔ میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا سب اخبار والے جانتے تھے اور کاروبار کے بارے میں تم خود جانتے ہو کہ مجھ سے تم نے کبھی بات نہیں کی۔"

میں نے سنبھل کے کہا "میں کیا بات کرتا جب کہ میں خود کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں دوسروں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا۔"

"تم جانتے تھے کہ تم سے جو کام لیا جارہا ہے' وہ قانونی نہیں ہے۔ کسی قانونی کاروبار میں اتنا منافع نہیں ہوتا جتنا تم وصول کررہے تھے۔"

"مگر مجھے کاروبار کی نوعیت کا علم نہیں تھا۔"

"تم کیا سمجھتے تھے آخر۔ یہاں سے باہر کیا جاتا ہے اور باہر سے کیا آتا ہے؟ تم مال کلیئر کراتے تھے۔ مال منگوانے والے تم سے کاغذات وصول کرتے تھے اور ادائیگی بھی تمہارے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نے کبھی پوچھا نہ ہو یا خود جاننے کی کوشش نہ کی ہو۔"

"میں پہلے وضاحت کرچکا ہوں۔ مجھے یہی کہا جاتا تھا کہ سامان میں دستکاری کی چیزیں ہیں۔ اونکس اور پیتل کے ڈیکوریشن پیس' چمڑے کی جیکٹیں' دستانے اور ہینڈ بیگ۔۔۔ اور گارمنٹس۔"

"یہ تو سب ہی ایکسپورٹ کررہے ہیں' قانونی طریقے پر۔"

"اسمگل کرنے والے ڈیوٹی بچاتے ہیں۔"

شبنم نے کہا "مجھے معلوم ہے مگر شک تو ایک معمولی کھیپی کو بھی ہونا لازمی ہے کہ اتنا منافع آخر کیسے؟"

"شک مجھے بھی تھا۔"

"اسی لیے تم دہری شخصیت رکھتے تھے اپنی۔ یہاں سے جاتے تھے شاہ عالم بن کے۔ اپنی سیاسی اہمیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔ تمہیں وی آئی پی کی حیثیت حاصل تھی۔ تمہارا سامان چیک نہیں ہوتا تھا لیکن باہر تم مال کی ڈلیوری دیتے تھے ناصر عظیم بن کے۔ ناصر عظیم ہی قیمت وصول کرتا تھا اور پیسہ بھی ناصر عظیم کے اکاؤنٹ میں جاتا تھا۔ معاف کرنا' یہ بات اپنی عقل میں نہیں آئی کہ شاہ عالم جیسا ہوشیار اور عیار شخص چپ چاپ یہ کام کرتا رہا۔ اس نے کبھی کسی سے کچھ پوچھا نہیں اور خود بھی تجسس کا شکار نہیں ہوا۔"

"میں نے کہا نا کہ مجھے شک ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اصل مال وہ نہیں جو میں لے جارہا ہوں۔ مال کسی اونکس کے ڈیکوریشن پیس میں ہوگا۔ اونکس پتھر ہے اور چھوٹی چیزیں مثلاً ایش ٹرے' جام' سگریٹ باکس وغیرہ بھی ایک کلو کے ہوتے ہیں۔ کسی کو کھوکھلا بنا کے سو گرام ہیروئن بھردی جائے تو وزن کے فرق کا اندازہ بھی نہیں ہوتا اور سو پیس ایسے ہوں ایک ہزار کی لاٹ میں تو دس کلو ہیروئن نکل جائے گی۔"

"یعنی ہیروئن اسمگل کرنے میں تمہارے لیے اعتراض کی کوئی بات نہیں تھی؟" شبنم نے کہا۔

"اعتراض ہوتا تو میں انکار نہ کردیتا۔ کیا فرق پڑتا اس سے۔ کیا ہیروئن کی اسمگلنگ رک جاتی؟ وہ کسی اور کو استعمال کرتے۔"

"وہ کون؟"

"یہاں تو دو ہی تھے۔ خادم اور عثمان۔ دونوں قتل کردیئے گئے جب میں نے اس کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیا اور انہیں خطرہ لاحق ہوا کہ شاید اب مجھ پر شرافت کا دورہ پڑا ہے تو میں ان کے پورے نیٹ ورک کو تباہ کرادوں گا۔ حالانکہ میرا کسی سے دشمنی مول لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خادم اور عثمان کا قصور صرف یہ تھا کہ ان سے میں نے کچھ انفارمیشن چھین لی تھی۔"

"کہاں ہے وہ انفارمیشن؟"

میں نے کہا "تمہیں بتایا تھا میں نے۔ ایک ڈسک میں ہے۔"

"اور ڈسک کہاں ہے؟"

"میرے پاس۔ کمپیوٹر بھی لیا تھا اسے چلانے کے لیے۔۔۔ مگر مجھے کمپیوٹر چلانا نہیں آتا۔"

"حد کرتے ہو تم بھی' مجھے بتاتے۔"

میں نے کہا "تمہیں آتا ہے کمپیوٹر سے انفارمیشن لینا؟"

شبنم نے کہا "بعض اوقات تم بڑی عجیب بات کرتے ہو۔"

میں نے فوراً سنبھل کے کہا "یار' میں مذاق کررہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پہلے میں دوسرے معاملات میں الجھا رہا۔ اپنی جان بچانے کا مسئلہ سب سے اہم تھا پھر مجھے اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا اور یہ فیصلہ آسان نہیں تھا لیکن زندہ رہنے کے لیے میں نے اپنی پارٹی سے بھی جان چھڑائی پھر ایک معاملہ رخشی کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بخیر و خوبی طے ہوگیا۔ عام طور پر طلاق اور علیحدگی کے معاملات میں نفرت اور دشمنی کی وہ انتہا آجاتی ہے جس سے برسوں شریکِ حیات رہنے والے ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوتے مگر رخشی کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنا وعدہ پورا کیا اور میں نے اپنا۔ نتیجہ یہ کہ آج ہم اچھے دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ ہم نے ماضی کے تعلق کو اس کی تمام تلخ یادوں کے ساتھ بھلا دیا ہے۔ اس کے بعد سے میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں۔ خود تم نے بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا مجھے اور یہی کام سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔"

"کون سا کام؟"

"تمہارا اعتماد اور یقین حاصل کرنے کا کام۔"

"ایک بات بتاؤں تمہیں ۔۔۔ پتا نہیں کیوں' اب بھی مجھے عجیب سا لگتا ہے یہ سب۔۔۔ جیسے یہ کوئی پُراسرار کہانی کا حصہ ہے۔۔۔ تم ناصر عظیم تھے' پھر شاہ عالم ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی ناصر عظیم بھی رہے۔ اس کے بعد کہیں سے ایک نقلی شاہ عالم نمودار ہو گیا۔ جو تمہیں مارنا چاہتے تھے انہوں نے نقلی شاہ عالم کو مار دیا۔ جب انہیں غلطی کا احساس ہوا تو تمہیں جان بچانے کے لیے پھر اپنی پرانی شخصیت کی طرف لوٹنا پڑا۔"

میں نے کہا "عام زندگی میں ایسے واقعات کا شمار واقعی طلسمِ ہوشربا جیسی ناقابلِ یقین کہانیوں میں کیا جائے گا مگر تمہارے سامنے سارے حقائق ہیں۔ شاہ عالم کی زندگی تم سے پوشیدہ نہیں تھی اور ناصر عظیم سے میں نے تمہیں اب ملوایا ہے۔ تمام حوالوں کے ساتھ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن نہ جانے کیوں۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ ڈبل رول' ناصر عظیم اور شاہ عالم کی زندگی۔ دہری شخصیت کا کیس ہے۔" شبنم نے کہا۔

"یعنی SPLIT PERSONALITY کا؟"

"ہاں۔ ڈبل زندگی گزارنے والوں کے کیس بہت ہیں۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "مگر ایسے لوگ نفسیاتی مریض شمار ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک پرسنالٹی میں ہوتے ہیں تو دوسری کے بارے میں نہ انہیں کچھ یاد ہوتا ہے' کسی کے یاد دلانے سے بھی یاد نہیں آتا اور وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ اپنی بیوی' بچوں' ماں باپ اور دوست احباب سب کو بھول جاتے ہیں پھر اچانک کسی دن ان کی پرانی پرسنالٹی غالب آجاتی ہے۔ کسی وجہ کے بغیر اور وہ واپس آجاتے ہیں۔ سب کو پہچاننے لگتے ہیں۔"

شبنم نے سر ہلایا "ایک مشہور کیس تھا جس پر فلم بھی بنی تھی۔ ایک شخص اچانک غائب ہو گیا اور کئی سال غائب رہا۔ اس نے سیکڑوں میل دور کسی قصبے میں دوسرے نام سے شادی کر لی اور اس کے بچے بھی ہو گئے۔ کئی سال بعد اچانک کسی وجہ کے بغیر وہ صبح اٹھا تو دوسری بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم کون ہو؟ میں یہاں کیسے آیا؟ اسے اپنا اصلی نام اور گھر کا پتا سب یاد آگیا اور وہ بھاگ کے پہلی بیوی کے پاس آگیا۔ دوسرا گھر اور دوسری بیوی اسے بالکل یاد نہیں رہے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ کبھی وہ مسٹر ایکس بن جاتا تھا تو کبھی مسٹر وائی اور وہ کسی کو جھوٹ بول کے بے وقوف نہیں بناتا تھا۔ ایکٹنگ نہیں کرتا تھا۔ اس کا دماغ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ماہرین نفسیات نے اسے ایک کیس تسلیم کیا۔ ایسے بہت کیس ہیں جن میں آدمی کی شخصیت صبح شام بدل جاتی تھی۔"

میں نے کہا "تمہاری معلومات اور قابلیت سے میں متاثر ہوا مگر خاتون! مجھے تو دونوں کے بارے میں سب یاد ہے۔ ناصر عظیم کے بارے میں بھی اور شاہ عالم کے بارے میں بھی۔ نہ میں غیر شعوری طور پر شاہ عالم بنا تھا اور نہ پھر ناصر عظیم بنا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔۔۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"مگر کیا؟"

"کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے۔۔۔ کہ تم اپنے بارے میں یا میرے بارے میں کوئی بات بھول جاتے ہو۔ تم نے صرف نام بدلا ہے اپنا' تم پھر وہی ناصر عظیم ہو جو خود شاہ عالم بنا تھا۔ شاہ عالم کی زندگی بھی تمہاری اپنی تھی' اس کا ہر لمحہ تمہاری یادداشت میں محفوظ کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "آج ہی تم نے کہا۔۔۔ کہ مجھے فلموں میں لیڈ رول کی آفر والی بات ایک انکشاف ہے۔ ابھی تم نے حیرانی کا اظہار کیا کہ مجھے کمپیوٹر آپریٹ کرنا آتا ہے۔ حالانکہ یہ تم ہی کہتے تھے مجھ سے کہ تمہیں تو فلموں میں جانا چاہیے۔ تم بڑی بڑی ہیروئنوں کے چراغ گل کر دو گی اور تم نے ہی مجھے کئی بار ڈنر میں اپنے ساتھ لے جا کے ان لوگوں سے ملوایا تھا جو فلمی دنیا میں اہمیت رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک نے تم سے کہا تھا کہ شاہ عالم صاحب' میں اس لڑکی کو لیڈ رول دینے کے لیے تیار ہوں مگر وہ مانتی نہیں۔ آپ اسے منائیے۔ یہ جو راہ بن گھوش والی ہیروئن شبنم تھی نا۔۔۔ نئی شبنم کے آنے سے لوگ پرانی کو بھول جائیں گے اور تم نے مجھے قائل کرنے کی کوشش بھی کم نہیں کی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ چھوڑو یہ صحافت۔۔۔ دو لاکھ تک دینے کو تیار ہے وہ پروڈیوسر۔ راتوں رات دولت اور شہرت مل

جائے گی۔"

"مجھے یاد ہے" میں نے اپنی صورت سے کسی پریشانی کا اظہار نہیں ہونے دیا "تم ناراض ہو گئی تھیں مجھ سے۔"

"چلو' یہ تو یاد ہے۔" وہ مسکرائی۔

"بعض اوقات میں اپنی ذہنی الجھنوں میں گم ہو کے کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہوں اور تمہارے دماغ میں شاید ابھی تک کہیں شک کے جراثیم موجود ہیں۔"

"نہیں ناصر۔ میں نے اپنے ساتھ ضرورت یا مصلحت کے تحت کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ اگر میرا دل اور دماغ دونوں نہ مانتے تو میں کسی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کسی کی گواہی کو تسلیم نہ کرتی۔ میرے دماغ میں شک کے جراثیم تمہاری بات سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے' میں ایسا کیوں کرتا ہوں؟"

"میں کیا بتاؤں؟ اب یہی دیکھ لو' میں نے کتنا کام کیا تھا تمہارے لیے' کمپیوٹر کی ٹریننگ میں نے تمہارے کہنے سے لی تھی۔ کچھ کام ایسے ہوتے تھے جو تم اپنے آفس کے کسی ماتحت سے نہیں کراتے تھے۔ تم نے شاہ عالم ہاؤس کے BASEMENT میں اپنا پرائیویٹ آفس قائم کر رکھا تھا۔"

"ہاں' وہ بہت محفوظ جگہ تھی۔"

"وہاں کتنی بار تم نے مجھے رات کو بلایا۔ خاموشی اور رازداری کے ساتھ تاکہ تمہاری بیوی کو اور تمہارے ان والدین کو پتا نہ چلے۔ جن کے بارے میں مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ نہ ماں جی تمہاری ماں تھیں اور نہ ابا جی تمہارے والد تھے۔ حالانکہ دنیا یہی سمجھتی تھی۔"

"سمجھنے والے بیر رانجھا کو بھی میرے ماں باپ سمجھتے تھے۔"

"تمہارے کمپیوٹر میں ٹاپ سیکرٹ قسم کی انفارمیشن میں نے فائل کی پھر تم کیسے پوچھ سکتے ہو مجھ سے یہ سوال کہ مجھے کمپیوٹر پر کام کرنا آتا ہے یا نہیں؟"

میں نے اپنا سر کھجایا "یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"یعنی تم واقعی بھول جاتے ہو؟"

"PARTIAL AMNESIA ایک پرابلم ہوتی ہے جس میں آدمی کی یادداشت جزوی طور پر متاثر ہوتی ہے۔"

"اس کی ایک وجہ تو PHYSICAL ہوتی ہے۔ دماغ کی کوئی چوٹ یا حادثہ! دوسری نفسیاتی۔" شبنم کچھ فکرمند ہو گئی "تمہارے ساتھ پہلے ایسا نہیں تھا۔"

میں نے اس کی بات کو پکڑ لیا "میرا خیال ہے کہ تھا۔ ممکن ہے تم نے نوٹ نہ کیا ہو لیکن بعض اوقات مجھے شرمندگی ہوتی تھی۔ کسی کا نام یا کوئی بات مجھے بالکل یاد نہیں آتی تھی۔ سال چھ مہینے میں ایسا ہو جاتا تھا لیکن کسی نے بھی اس کو SERIOUSLY کبھی نہیں لیا۔ کوئی نقصان ہو سکتا تھا مجھے مگر ہوا نہیں۔ شاید پچھلے دنوں میں جس ذہنی انتشار اور خوف کا شکار رہا اس سے فرق پڑا۔ میں زندہ تھا اور دنیا کہتی تھی مر گیا۔ جب میں یتیم خانے میں تھا تو میرا ایک ہم نام تھا ناصر عظیم۔ اسے خود اس کے چچا نے جائداد ہتھیانے کے لیے قتل کرا دیا تھا۔ میں تقریباً پاگل ہو گیا تھا صدمے سے اور میری ذہنی کیفیت بہت عجیب سی ہو گئی تھی۔ کئی مہینے تک مجھے خود پر قابو نہ تھا۔ میں اپنے ہم نام دوست کے قاتل کو قتل کر کے انتقام لینا چاہتا تھا۔ یتیم خانے کے ماحول میں تھوڑے بہت نفسیاتی مسائل تو سب کے لیے پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں زیادہ ذہین تھا چنانچہ زیادہ حساس تھا۔ مجھ پر زیادہ اثر ہوتا تھا ایسے واقعات کا۔ جب میں نے شاہ عالم سمجھے جانے والے شخص کی لاش کے دوبارہ نکالے جانے کا منظر دیکھا تو میری ذہنی کیفیت میں ایک انقلاب آگیا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کیسا FEEL کرتا تھا۔ اکیلے میں کیا سوچتا تھا اور مجھے کیسے بھیانک خواب آتے تھے۔ میں یقیناً ایک نفسیاتی مریض ہوں۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے۔"

میرا یہ حربہ بہت مؤثر رہا اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے یہ طریقہ پہلے کیوں نہیں آزمایا۔ خیر' دیر آید درست آید۔ اب میرے پاس ایک وجہ تھی اور ایک سبب تھا۔ کسی بھی کنفیوژن یا بھول کو میں اپنی نفسیاتی بیماری کے کھاتے میں ڈال کے شبنم کی ہمدردی حاصل کر سکتا تھا۔ "۔۔۔ اچھا' ایسا تھا' یہ ہوا تھا؟ یہ بات ہے؟ سوری' مجھے بالکل یاد نہیں۔ میری یادداشت کے کسی خانے میں ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ مسلسل صدمات اور حادثات سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگی۔"

شبنم نے کہا "اٹ از آل رائٹ۔ میں سمجھ سکتی ہوں تمہارے مسئلے کو۔ میں خود بھی پاگل ہو گئی تھی اور تم کوشش نہ کرتے تو آج پاگل خانے میں ہوتی۔ تھوڑے بہت پاگل تو سب ہی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں مشورہ کروں گا کسی نیورو فزیشن سے یا سائیکاٹرسٹ سے۔۔۔ لیکن ابھی نہیں۔"

اس نے میرے گالوں پر تھپکی دی "اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں' تم بالکل نارمل ہو۔"

میں نے کہا "شبنم' کہیں تمہیں شاہ عالم سے تعلق کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیمت نہ چکانی پڑے۔ اب مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی ہے۔"

"خواہ مخواہ سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا ملے گا۔ میں تمہاری طرح روپوشی کیسے اختیار کروں؟"

میں نے کہا "نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ رخشی کی طرف سے مایوس ہو کے وہ تمہاری طرف آئیں گے۔ رخشی لاپتا ہے فی الحال مگر تم لاپتا نہیں ہو۔"

"کسی نے مجھے بھی فون کیا تو میں بتا دوں گی تمہیں۔"

"کوئی براہِ راست تم سے ملنے گھر بھی آ سکتا ہے۔ راستے میں روک سکتا ہے تمہیں یا آفس پہنچ سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میں مانتی ہوں مگر میں کیا کروں۔۔؟"

میں نے کہا "ریوالور ہے تمہارے پاس؟"

"بالکل ہے۔ لائسنس بھی ہے اس کا اور میں شوٹنگ کلب کی ممبر ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ریوالور ہر وقت پاس رکھو۔ اپنی دسترس میں۔۔۔ اور آنکھیں ہر وقت کھلی رکھو۔ مجھے آج قمر کی سالگرہ میں نہ جانا ہوتا تو میں تمہارے ساتھ چلتا۔"

شبنم نکل ہی رہی تھی کہ رئیس آ گیا۔ اس کی بغل میں ایک مرغا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی "یار، یہ دیکھ۔"

میں نے کہا "کیا دیکھوں۔۔۔ مرغا اچھا ہے۔ بس آج ہو جائے چکن بریانی۔"

اس کا موڈ خراب ہو گیا "ابے وہ کیا کہتے ہیں بارہ برس دل میں رہے کیا بھاڑ جھونکا۔ اتنا عرصہ ہمارے ساتھ گزار کے بھی کچھ نہ سیکھا۔ الو کے پٹھے، یہ وہ چکن بریانی والا مرغ نہیں ہے۔ یہ تو فائٹر پٹھا ہے۔ شاہی نسل کا اصیل مرغ ہے۔ یہ اس سال کا چیمپئن ہو گا دیکھ لینا۔"

"یعنی یہ نیا عمران خان ہے، کتنے میں لیا؟"

وہ رازداری سے بولا "ویسے دس ہزار بھی کم ہیں۔ کون بیچتا ہے اپنے نازوں کے پالے لختِ جگر کو مگر مجھے ہزار میں مل گیا۔"

میں نے کہا "کیا جگر کے ٹکڑوں کی کلیئرنس سیل لگی ہوئی تھی؟"

رئیس ہنسا "بس پیارے، یوں سمجھ لے لاٹری میں مل گیا۔ پشاور کے ایک شوقین کے پاس تھا۔ اس کا نوکر چوری کر کے لے آیا۔ شوقین سالا مقروض تھا اور اپنے نوکر کو تنخواہ نہیں دے رہا تھا۔ یہاں نوکر نے معلوم کیا ہو گا کہ کس سے سودا ہو سکتا ہے۔ بازار میں جاتا تو وہی چھری پھیرنے والے ملتے تیرے جیسے۔ کسی نے میرا نام بتا دیا۔ سالا مجھ سے دس ہزار مانگ رہا تھا۔"

"دس ہزار مانگ کے ایک ہزار میں مان گیا؟"

"ماننا کیسے نہیں پیارے! اپن نے منوا لیا۔ جیرا بلیڈ پہنچ گیا عین وقت پر تھانے دار کی وردی میں اور اسے پکڑ لیا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ سالا گھبرا گیا۔ جیرے نے کہا کہ چل تھانے بیٹا، سب معلوم ہو جائے گا کہ کہاں سے چرا کے لایا ہے۔ کسی نہ کسی تھانے میں رپورٹ ضرور درج کرائی گئی ہو گی۔ اپنا تو ڈراما پورا طے تھا۔ میں نے کہا کہ چلو تھانے دار صاحب مک مکا کر لو۔ میں نے ہزار جیرے کو دیئے اور ہزار اسے۔ سالے کی شکل دیکھنے والی تھی۔ پشاور سے لاہور آیا تھا اس امید میں کہ یہاں اچھے پیسے ملیں گے۔ انکار کرتا تو پہلے تھانے میں چھترول ہوتی پھر مالک آ کے مارتا۔ قسمت کو کوستا ہزار لے کے چلا گیا۔ جیرے نے بعد میں ہزار واپس کر دیئے مجھے۔"

میں نے کہا "یعنی چور کو پڑ گئے مور۔ اب تو اسے مقابلے پر لائے گا تو کوئی پوچھے گا نہیں؟ فرض کرو اس نے جھوٹ بولا ہو کہ میں پشاور سے لایا تھا۔ یہیں کسی کا ہوا مرغا تو کیا ہو گا؟"

اس نے محبت سے مرغ کو تھپکی دی "ایسی بات نہیں پیارے۔ لاہور میں کس کے پاس کیا ہے، ہم سب جانتے ہیں اور بیٹا! اگر برآمد ہو فقیر کے تشکول سے تو وہ چور لیکن بادشاہ کے خزانے میں سب چوری کا مال ہو تو کون مائی کا لال انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ہم ہیں خاندانی مرغ باز۔ اس کا اصل پشاور والا مالک بھی آ جائے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ اپنے ہوں گے سارے گواہ کہ یہ تو سال بھر سے لاہور میں معرکے سر کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا، اسے تو چھوڑ عمران خانے میں ابھی اور ایک کام کر۔ شبنم ابھی ابھی گئی ہے اپنے گھر۔"

"ہاں، کیا اسے واپس بلا کے لانا ہے۔ پیارے تو کہے تو قاضی کو بھی ساتھ ہی لے آؤں۔ دو گواہ ہیں یہاں، میں اور تیس مار خان۔"

میں نے کہا "ٹائم مت ضائع کر۔ یہ اچھا ہوا کہ تو آ گیا۔ گاڑی لے اور جا شبنم کے پیچھے۔"

"یار، آخر معاملہ کیا ہے۔ تو اتنا سیریس کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ لوگ رخشی کو فون پر پریشان کر رہے ہیں کہ شاہ عالم کا پتا بتاؤ۔ رخشی کا پتا معلوم ہو تا تو شاید گھر پہنچ جاتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اب شبنم سے پوچھیں گے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر جا سکتے ہیں یا شبنم کا پیچھا کر سکتے ہیں۔

اسے راستے میں روک سکتے ہیں یا آفس کے باہر۔ تجھے شبنم پر نظر رکھنی ہو گی۔ اس طرح کہ شبنم کو بھی پتا نہ چلے۔"

رئیس نے مرغ کو اس خانے میں چھوڑ دیا جو گزشتہ رات ہی خالی ہوا تھا "قسم اللہ کی۔ کسی نے بری نظر سے بھی دیکھا اسے تو اپن اس کا بینڈ بجا دیں گے۔" اس نے فوراً..... ریوالور نکال کے دکھایا۔

میں نے کہا "اگر معاملہ صرف زبانی ہو تو دخل مت دینا۔ زبردستی کرے کوئی تو پھر جیسا مناسب ہو کرنا۔ یہ دیکھنا کہ شبنم سے بات کرنے والے کون ہیں۔ ان کی گاڑی کا نمبر دیکھ لینا بلکہ کیمرا لے جا۔ موقع ملے تو تصویر اتار لینا۔"

"یار تو یہ سب مت سمجھا مجھے۔ اپن اناڑی نہیں ہیں" وہ خفا ہونے لگا۔

"تو چاہے تو جیرے بلیڈ کو بھی بلا لے۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔" میں نے رئیس کی بات سنی ان سنی کر دی "ان کا پتا ٹھکانا معلوم ہونا چاہیے اور دیکھ، میں انتظار کروں گا تیرے فون کا۔ مجھے بتا دینا اگر وہ تیرا کام تمام کر دیں۔ شبنم کو کچھ ہوا تو پھر یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔"

رئیس بکتا جھکتا چلا گیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے والے تھے۔ میں نے لباس بدلا اور آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ کی تو مجھے مسٹر بائیکل کی بات یاد آئی۔ قدرت کو اپنا کام کرنے کا موقع دو۔ واقعی میرے چہرے پر داڑھی ایک خوش گوار تبدیلی کا سبب بن رہی تھی۔ اگرچہ ابھی اسے شرع کے مطابق ایک مشت ہونے میں کافی وقت درکار تھا لیکن جیسے بنیادیں بھر جانے کے بعد عمارت کی صورت سامنے آ جاتی ہے، ایسے ہی میں مولانا ناصر عظیم کا داڑھی مونچھوں والا جلالی چہرہ تصور میں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ لمبے بالوں کی وگ سے ڈرامائی تاثر پیدا کیا جا سکتا تھا اور ہر وگ کے ساتھ لباس بدل کے شخصیت بدلنا بہت آسان تھا۔ داڑھی کے ساتھ چغہ اور پگڑی ہو تو میں عالم دین نظر آؤں گا۔ سوٹ کے ساتھ سیاہ فریم کی موٹے شیشوں والی عینک اور لمبے بال ہوں تو میں اپنا تعارف کسی پروفیسر یا مصور کی حیثیت سے بھی کرا سکتا ہوں۔ مائیکل مجھے میک اپ کٹ فراہم کرنے کے ساتھ ہی کار آمد TIPS دے سکتا ہے کہ کم سے کم وقت میں نیا چہرہ کیسے بنایا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ مسٹر مائیک کہاں ملیں گے؟

گیراج میں گاڑی کھڑی دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ رئیس میرے لیے گاڑی چھوڑ گیا تھا اور خود شاید ٹیکسی میں گیا تھا تیس مار خان نے ڈرائیونگ کے ساتھ دلنا شروع کیا تو بقول شاعر اپنا موضوعِ سخن اس کے سوا اور نہیں۔ وہ مجھے خانم کے بارے میں بتاتا رہا کہ ازدواجی زندگی کو وہ کس نظر سے دیکھتی ہے اور خاندان کے بارے میں اس کے خیالات و نظریات کیا ہیں؟

میں نے کہا "خاندانی منصوبہ بندی تم نے پہلے سے کر لی ہے گویا۔"

وہ ایسے تڑپا جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو "صاب، یہ بڑا گناہ کا بات ہوتی۔ بچہ اللہ کی رحمت کا فرشتہ ہوتی۔ محبت زیادہ ہوتی تو بچہ زیادہ ہوتی۔"

میں نے کہا "یہ تو سچ کہا تم نے۔ ہر بچہ ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے میاں بیوی کے پیار کا۔ سولہ سال میں ایم اے کی ڈگری مل جاتی ہے۔ تمہارے سولہ بچے ہوئے تو تم بھی ماسٹر اِن افزائشِ نسل ہو جاؤ گے۔"

"سب اللہ کی مرضی ہوتی صاب۔ وہ ایک دیتی اور نیک دیتی، یا سال میں دو دیتی اور حرامی ہوتی تو بے فضول۔ یہ ہمارا ابا صاب بولتی۔"

میں نے کہا "ماشاء اللہ سے تمہارے والد صاحب کے کتنے تھے؟"

"اٹھائیس!" اس نے بڑے فخر سے کہا "وہ چار شادی بناتی۔ بہت انصاف کے ساتھ سب کو رکھتی۔ ہر ایک کا سات بچہ ہوتی۔ سب کا ایک جیسا کپڑا بناتی۔"

"اٹھائیس بچوں کے ایک جیسے کپڑے، یونیفارم کہو نا۔"

"بی بی لوگ کا بھی سب چیز ایک ہوتی۔ سب کے ساتھ برابر سلوک کا حکم ہوتی اسلام میں۔ ابا بہت انصاف کرتی۔ چار جوڑا لاتی۔ سب کو ایک ایک دیتی۔ سب ایک جیسا کھاتی، برابر کھاتی، خوراک بھی اور گالی بھی۔ ابا صاب کا ایک ڈنڈا ہوتی، سب کو برابر لگاتی۔"

چار بیویوں کے درمیان شرطِ انصاف کی یہ شرعی وضاحت سن کے مجھے ہنسی آئی مگر میرے تبسرے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ مسئلہ قانونی ہو یا شرعی، ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق موڑ توڑ کے کسی بھی مسئلے پر اپنے حق میں تاویل لے آتا ہے اور پھر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔

موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میں نے تیس مار خان سے کہا "پوچھو کون ہے؟ پھر مجھے بتاؤ۔"

فون آگے رکھا ہوا تھا۔ اس کا ایک تار بیڑی کی چارجنگ والے ساکٹ سے منسلک تھا۔ تیس مار خان نے نون۔ کان سے لگا کے ہیلو کہا اور پھر..... میری طرف بڑھا دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"رئیس خان صاب' آپ سے بات کرتی جناب!"

میں نے کہا "رئیس' کیا ہوا؟"

"ابھی تک کچھ نہیں ہوا پیارے۔ نہ کسی سے سچا پیار۔ نہ قول قرار' متعلی' شادی۔ یہ سب نہیں ہوا تو پھر کیا ہو سکتا ہے صبر کے سوا۔"

میں نے کہا "اتنی اہم اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا آپ نے؟ شبنم کہاں ہے؟"

"یار' مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہوگی اندر کسی خانے میں۔ غسل کے یا باورچی کے۔ اپن تو کھڑے ہیں گلی کے نکڑ پر۔"

میں نے کہا "تو نے دیکھا تھا اسے گھر میں جاتے ہوئے' کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بیٹھی ہوا اپنے آفس میں؟"

"اب ہم بے وقوف ہیں' پاگل نہیں۔ ابھی ایک گاڑی سے دو بندے اتر کے دروازے تک گئے تھے۔ شبنم سے کچھ پوچھا اور واپس چلے گئے۔ شبنم نے دروازہ کھول کے دیکھا تھا اور پھر بند کر لیا تھا۔ سفید رنگ کی شیراز تھی۔ نمبر نہیں دکھائی دیا اندھیرے میں لیکن پیلی نمبر پلیٹ تھی۔ کراچی کی ہوگی۔"

میں نے کہا "حیدر آباد' سکھر' نواب شاہ کی بھی ہو سکتی ہے' آگے بول۔"

"گاڑی تیسرا شخص چلا رہا تھا۔ وہ یہاں گلی کے نکڑ پر میرے سامنے اترا اور جو پیچھے بیٹھے تھے' وہ آگے آ گئے۔ ایک ڈرائیور کی جگہ بیٹھ گیا اور ڈرائیور واپس گیا۔ وہ گھر کے دروازے سے کچھ دور کھڑا ہے۔"

"اور وہ سفید شیراز؟"

"وہ تو گئی مگر جو بندہ گلی میں موجود ہے اس کے پاس ہی دوسری گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔ اپنا اندازہ بالکل ٹھیک تھا قسم اللہ کی۔ اس سالے نے ابھی ابھی چابی لگا کے دروازہ کھولا گاڑی کا اور پھر بند کر دیا۔ شاید چابی اندر لگا دی ہوگی تاکہ اسٹارٹ کرنے میں دیر نہ ہو۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے وہ شبنم کا پیچھا کرے گا۔ پہلے دو نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ گھر میں موجود ہے یا نہیں' تو کیا کرے گا؟"

"اپن اس کے پیچھے ہوں گے۔"

میں نے کہا "مگر تو گاڑی گھر میں ہی چھوڑ گیا تھا۔"

"ہاں یار' اپن نے سوچا کہ تجھے بھی جانا ہے قمر کی سالگرہ میں۔ تو ہم ٹیکسی پکڑ لیتے ہیں۔ ورنہ تجھے سڑک پر انتظار کرنا پڑے گا' یہ ٹھیک نہیں۔"

"عین وقت پر ٹیکسی نہ ملی تھی۔ پھر؟"

وہ ہنسا "ابے پکا کام کرتے ہیں ہم۔ ٹیکسی والے کو بتایا تھا کہ حساب ہوگا گھنٹے کا اور ہم پانچ سو گھنٹا بھی دے سکتے ہیں لیکن شہر میں جہاں کہیں جانا ہوگا' سوال کوئی نہیں۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ تیار بیٹھا ہے ٹیکسی میں۔"

میں نے کہا "ان تینوں میں سے کسی کی شکل تجھے دیکھی ہوئی لگی؟"

"یہ جو گلی میں کھڑا ہے۔ اس پر شک ہے پیارے کہ فائق علی عرف فیکے صاحب کے گھر میں زیادہ مار اسی نے کھائی تھی۔"

"دیکھ' میری بات غور سے سن۔ اگر یہ شرافت سے پیچھا کرے شبنم کا تو کوئی بات نہیں۔ اگر یہ راستے میں یا آفس پہنچ کے پنگا لے تو پھر اسے چھوڑنا نہیں۔ ٹیکسی والے کو پہلے ہی بتا دینا کہ یہ بدمعاش روز پریشان کرتا ہے بے چاری لڑکی کو آتے جاتے۔ کہہ دینا میں بھائی ہوں اس کا۔"

"کہنا ہی پڑے گا پیارے!" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"ریوالور مت نکالنا۔ ایسے ہی پکڑ لینا اسے اور شور مچا دینا۔ دوسرے لوگ بھی ضرور مدد کریں گے تیری۔ اسے لے جانا تھانے۔"

"ابے نہیں یار۔ اپن اس چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"

میں نے کہا "میں شبنم کو سمجھا دیتا ہوں۔ وہ فوراً وہاں سے بھاگ کے اوپر اپنے آفس چلی جائے گی اور پولیس کو طلب کرے گی۔ پولیس والے اخبار کے دفتر سے آنے والے فون کو ٹال نہیں سکتے مگر انہیں حرکت میں آتے آتے بھی آدھا گھنٹا لگ جاتا ہے۔ تیرے تھانے پہنچنے سے پہلے ہی فون پر بات ہونے سے فائدہ یہ ہوگا کہ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ملزم کو ان کے حوالے کر کے کہنا کہ اپنا کام ختم' رپورٹ لکھوانے آئے گا کوئی اخبار والا۔"

"مگر یار' اس کا فائدہ؟"

"فائدہ ہے۔ تیرے رخصت ہوتے ہی تھانے والے ملزم سے اپنی زبان میں بات کریں گے اور مک مکا کے لیے اسے موقع فراہم کریں گے کہ کوئی والی وارث ہے تو بلا لے ورنہ ان اخبار والوں سے کون نمٹے گا۔ اگر ایسا ہو تو تھانے سے باہر آتے ہی مجھے بتا دینا' میں فوراً آ جاؤں گا۔ ہم دیکھیں گے کہ اسے چھڑانے کے لیے کون آتا ہے اور چھڑا کے کہاں لے جاتا ہے۔"

رئیس نے کہا "یعنی اصل بندے کا پتا دیکھنا ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو حکم کا غلام ہے۔ معلوم یہ ہونا چاہیے کہ حکم دینے والا کون ہے پھر ہم اس سے بھی مل لیں گے۔"

"اور اگر ایسی نوبت ہی نہ آئے' تھانے جانے کی۔"

"تو پھر اس کو گھر پہنچا کے آنا۔ ورنہ گھر مت آنا۔ تو بات کہاں سے کر رہا ہے۔ کسی پبلک فون سے؟"

"نہیں پیارے۔ اپن آج اسی کام سے گئے تھے۔ ایک موبائل فون اور لے لیا ہے۔ چیرے بلیڈ کے نام پر۔ اس نے لیا اور مجھے دے دیا۔ یار' یہ شبنم آخر گھر میں گھس کے کیوں بیٹھ گئی ہے۔"

میں نے کہا "تیاری کر رہی ہوگی۔ مجھے اپنا یہ فون نمبر بتا دے۔ میں قمر کے گھر میں ہوں ابھی۔"

قمر کے گھر جانے سے پہلے مجھے اس کے لیے کوئی تحفہ خریدنا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں نے اس کی شادی کے موقع پر دینے کے لیے چاکلیٹ خریدی تھی۔ اسٹور کے مالک نے شاہ عالم کو پہچان کے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا اور گفٹ پیک کی قمر کو فری ڈلیوری کے لیے بھی تیار تھا مگر پھر میرا ارادہ بدل گیا اور میں وہ گفٹ لے کر خود ہی بن بلائے مہمان کی حیثیت سے خان جی کے گھر جا پہنچا تھا اور خاصا ذلیل ہوا تھا۔

وہ اسٹور اسی راستے پر آگے نظر آیا تو میں نے تیس مار خان کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ چاکلیٹ وہ بھی لا سکتا تھا مگر کچھ اپنی پسند کی چیز منتخب کرنے اور کچھ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب شاہ عالم کو پہچاننے والا کوئی ہے یا نہیں' میں خود اتر کے اسٹور میں داخل ہو گیا۔

چھ مہینے میں میری صورت کے نقوش نہیں بدلے تھے۔ شباہت میں تبدیلی میرے چہرے پر داڑھی سے آئی تھی جس کے گھنے سیاہ بال آدھے انچ لمبے ہو چکے تھے۔ میرا بال بنانے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ پہلے میں سیدھے ہاتھ پر مانگ نکالتا تھا' اب میرے بال پیچھے کی طرف تھے اور خاصے لمبے نظر آ رہے تھے۔

کاؤنٹر کے پیچھے وہی شخص موجود تھا مگر مجھے خوشی ہوئی جب اس نے چاکلیٹ کو پیک کر کے شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے میرا شکریہ رسمی انداز میں ادا کیا لیکن پرانی شناسائی کی گرم جوشی اس کے رویے میں نظر نہ آئی۔ شاہ عالم کو یقیناً افسوس ہوتا کہ صرف ایک سال میں لوگوں نے اسے بھلا دیا مگر یہ دنیا اب بہت مصروف اور بے مروت ہوتی جا رہی ہے۔ زندگی کے معمولات میں لوگوں کو تین مہینے بعد اپنا مرا ہوا باپ یاد نہیں آتا۔ شاہ عالم کون سا بھٹو یا نواز شریف کے پائے کا لیڈر تھا جس کی صورت روز اخباروں میں یا ٹی وی پر نظر آتی ہو اور بچہ بچہ پہچانتا ہو۔ شاہ عالم ابھی صرف صوبائی اسمبلی تک پہنچا تھا اور اس کے جیسی سیاسی جماعتوں کا حلقہ اثر مسلم لیگ' پیپلز پارٹی یا جماعت اسلامی جیسی معروف جماعتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صوبائی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ یہاں تو لوگ اب وزیروں کو نہیں پہچانتے اور جب تک ضرورت نہ پڑے یہ نہیں جانتے کہ کس محکمے کا قلمدان کس وزیر کے پاس ہے۔

قمر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی اس نے رونے دھونے کا ڈراما شروع کر دیا "بھائی۔ جاؤ' میں بات نہیں کرتی آپ سے۔"

میں نے چاکلیٹ کا ڈھیر اسے پیش کیا "سالگرہ مبارک ہو۔"

اس نے للچائی نظر سے دیکھا مگر پھر منہ پھیر لیا "نہیں چاہیے مجھے کچھ بھی۔"

میں نے ہنس کے کہا "آخر قصور کیا ہوا ہے مجھ سے میری بہنا!"

"قصور...؟ قصور پوچھتے ہیں مجھ سے آپ" وہ بگڑ کے بولی "دن میں آنے کا وعدہ کر کے گئے اور پلٹ کے نہیں آئے۔ میں انتظار کرتی رہی کھانے پر۔ آپ ادھر سے ہی نکل گئے اس چڑیل کے ساتھ۔ وہ لے گئی ہوگی کان سے پکڑ کے اور آپ بھی چلے گئے۔ کہاں کی بہن اور کیسی بہن۔ میں پوچھتی ہوں آخر اس کے ساتھ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

میں نے کہا "اوہو۔ تو خفگی اس بات پر ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی؟"

"ہاں۔ کیوں آئی تھی وہ یہاں۔؟"

میں نے کہا "آنی تعریف کی تھی میں نے اپنی بہن کی کہ اسے بڑا اشتیاق تھا تجھ سے ملنے کا۔"

"بھائی۔ جھوٹ مت بولیں۔ آپ چندا سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اپنی تذلیل کا۔ اسے یہ جتانا چاہتے تھے کہ وہ آپ کو معاف کرنے پر راضی نہیں تو آپ کو بھی کوئی پروا نہیں اس کی اور بہت ہیں دل لگانے کو۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں قمرا!"

"میں مانتی ہوں بھائی کہ چندا کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ اس نے بہت زیادتی کی تھی آپ کے ساتھ لیکن آپ تو عقل سے کام لیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ عقل کی خرابی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساری۔ معاملہ تھا دل کا مگر وہ بات بالکل نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"کھائیں میری قسم!" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھا۔

"او بابا' تیری قسم۔ وہ ایک صحافی ہے۔"

"مگر وہ آپ کو شاہ عالم سمجھتی ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں نے بتادیا ہے اسے سب کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ تیرے بارے میں اور چندا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اسے۔ وہ پھر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے اور آج کل مجھے اس کی مدد کی بہت ضرورت ہے۔"

قمر مسکرائی "سنبھل کے رہنا بھائی۔ مدد کے چکر میں انگلی پکڑنے والی کہیں ہاتھ نہ تھام لے۔"

"ارے تو کیا سمجھتی ہے اپنے بھائی کو آخر؟ یہ پکڑا اپنا تحفہ!"

اس نے کہا "تھینک یو بھائی! دراصل چندا بہت دکھی ہے۔ اس نے خود کو ساری دنیا سے الگ کرلیا ہے۔ مجھ سے بھی پہلے کی طرح نہیں ملتی۔ بس کام کی بات کرتی ہے۔ مسکرانا ہنسنا تک بھول گئی ہے۔ خان جی کا مسئلہ تو بعد میں پیدا ہوا' پہلے تو اسے آپ کے بدل جانے کا صدمہ تھا۔"

"میں بدلا نہیں تھا قمر۔ مجبوری تھی میری لیکن چندا سمجھنے پر تیار ہی نہیں تھی۔"

"ناراض مت ہونا بھائی۔ یہ بات کوئی عورت نہیں سمجھے گی۔ آپ میری نظر میں فرشتہ ہو مگر چندا کی بات اور تھی۔ آپ رخشی کے ساتھ رہتے تھے۔ دن رات اور ایک ہی گھر میں۔ سارا زمانہ آپ کو میاں بیوی سمجھتا تھا اور رخشی کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا تھا آپ کے ساتھ۔"

"اس کی بھی مجبوری تھی قمر!"

"اس کے علاوہ شبنم کا معاملہ تھا۔ اسے اپنی بدنامی کی ذرا پروا نہیں اور آپ ہیں کہ مستقل اس کے ساتھ نتھی ہیں۔ یہاں لے کر آگئے اسے۔ خود سوچیں کہ چندا کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ شبنم کو یہاں اپنے ساتھ لاکے اس نے ٹھیک نہیں کیا۔"

"وہ کون ہے۔ وہ الو کا پٹھا۔"

قمر ہنسنے لگی "انہوں نے بھی آپ کے لیے کچھ اور کہا تھا' مگر میں نہیں کہہ سکتی۔"

کمال کچھ دیر میں آگیا اور جو قمر نے کہا تھا' اس نے مجھ سے ذرا مختلف انداز میں کہا۔ اس نے مجھے گالیاں دیں اور میری کسی وضاحت کو قبول نہیں کیا۔ اس کی ساری ہمدردی چندا کے ساتھ تھی جو ایک قدرتی بات تھی پھر کوئن کے ساتھ چندا بھی آگئی۔ سانگرہ ایک گھریلو تقریب تھی چنانچہ کوئی بھی اہتمام کے ساتھ تیار ہو کے نہیں آیا تھا۔

قمر اور ڈاکٹر کمال سے کھری کھری سننے کے بعد میں چندا کے سامنے کچھ خجالت کے جذبات کا شکار تھا مگر مجھے حیرت ہوئی جب میں نے چندا کے رویے میں ایک خوش گوار تبدیلی دیکھی۔ وہ اتنی خوش نہیں تھی کہ قہقہے لگاتی مگر وہ اداس اور الگ تھلگ بھی نہیں تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا "تم اکیلے آئے ہو؟"

میں نے کہا "اکیلا بھی بن بلائے آیا ہوں۔"

"میرا مطلب تھا شبنم کو بھی ساتھ لے آتے۔" چندا نے یوں کہا کہ مجھے اس کے لہجے میں طنزیا ناراضی کی تلخی کا قطعی احساس نہیں ہوا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ تبدیلی اچھی نہیں لگی۔ یہ ایک نارمل ردعمل نہیں تھا۔ اس کا حسد اور اس کی بدگمانی اور ناراضی کے پیچھے محبت تھی مگر اس کا بدلا ہوا طرزِ عمل اگر انتقامی جذبات کا آئینہ دار نہیں تھا تو پھر مایوسی کی وہ انتہا تھی جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔

جواب قمر نے دیا "شبنم کا یہاں کیا کام۔ ہم تو گھر والے ہیں' کسی باہر والے کو نہیں بلایا ہم نے۔"

کوئن نے اس بات کو محسوس کیا "پھر تو مجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔"

کمال نے قمر کو گھورا "یہ تو پاگل ہے' ایسے ہی سوچے سمجھے بغیر بولتی ہے۔"

قمر نے خفت سے کہا "ویسے بھی تم ہمارے گھر میں شامل ہو۔"

کمال نے کہا "میرا اور تمہارا ساتھ زیادہ پرانا ہے۔ اسے تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے یہاں آئے۔"

کوئن بہت معصوم اور صاف دل عورت تھی جو کسی بات پر ناراض ہونا یا کسی کی زیادتی پر بھی شکایت کرنا جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ مسکرانے لگی۔ کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ کمال نے مجھ سے کہا "چل ہم اتنی دیر میں کیک لے آئیں؟" مگر یہ صرف مجھے باہر لے جانے کا بہانہ تھا۔

میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بگڑ گیا۔ "سؤر کے بچے۔ اس کے ساتھ یہاں آکے تو کیا ثابت کرنا چاہتا تھا آخر؟"

میں نے کہا "دیکھ بھائی! تیری بیوی بہت سنا چکی ہے مجھے پہلے۔ اب تو اپنی بکواس بند کر۔ نہ میں اتنا کمینہ ہوں اور نہ

بے وقوف۔ اسے یہاں لانے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"یار مقصد گیا بھاڑ میں۔ چندا کے جذبات کا کچھ خیال نہیں تجھے؟"

میں نے کہا "چندا کے جذبات کو سمجھتا ہوں میں۔ کھل کے ان کا اظہار بھی کرچکی ہے وہ کئی بار۔ وہ مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں اور مجھ میں اس سے زیادہ ذلت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔"

"یعنی اب تو ایسے ذلیل کرے گا چندا کو' بدلہ لے گا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کوئی جوابی کارروائی نہیں تھی۔ میں نے چندا کی جگہ نہیں دی ہے شبنم کو۔ چندا کے رویے سے میں دل برداشتہ ضرور ہوں مگر اس کی جو عزت میرے دل میں ہے' وہ اپنی جگہ ہے۔ اس کے اور خان جی کے احسانات کا بدلہ چکانے کی بات بھی کروں میں تو یہ کم ظرفی ہوگی۔ شبنم' کمال اسپتال دیکھنا چاہتی تھی اور تم سب سے ملنا چاہتی تھی۔"

"کیوں؟ کوئی فیچر نہیں شائع کرانا ہے مجھے اور نہ کسی کو انٹرویو دینا ہے۔ چندا اب ہمارے ساتھ ہے اور رہے گی۔ خان جی نے اسے ہماری ذمے داری بنادیا ہے۔ اگر شبنم کی وجہ سے اس کی دلآزاری ہو تو مجھے اس خاتون صحافی سے کہنا پڑے گا کہ آپ کی صورت مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

مجھے کمال کے رویے سے مایوسی ہوئی "ٹھیک ہے۔ شبنم نہیں آئے گی یہاں مگر تم سب غلطی کررہے ہو۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ رخشی میری نہیں' شاہ عالم کی بیوی تھی۔ میں جتنے دن اس کے ساتھ رہا' میں یہ بات نہیں بھولا اور میں نے اسے بھی سمجھادیا تھا کہ قانونی اور شرعی طور پر وہ جس کی بیوی تھی وہ شخص مرچکا ہے۔ وہ شاہ عالم کے ساتھ جبر کے تحت رہتی تھی۔ اس شرط پر رخشی نے اپنی گواہی سے مجھے شاہ عالم مانا تھا کہ میں اسے آزاد کردوں گا۔ چار مہینے دس دن عدت کے تھے۔ بیوہ کے لیے طلاق کیسی مگر دنیا کے سامنے شاہ عالم نے یعنی میں نے اسے طلاق دی اور وہ الگ ہوگئی۔ یہ سب تو نے بھی اخباروں میں دیکھا ہوگا مگر تم سب نے ایک مفروضے کو حقیقت تسلیم کرلیا ہے کہ میں نے اتنا عرصہ رخشی جیسی عورت کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کے گزارا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے جسمانی تعلقات استوار نہ ہوئے ہوں۔ اسے شوہر سے نفرت تھی اور شوہر کے مرنے کے بعد وہ بالکل آزاد۔ کبھی مگر یار تمہیں اعتبار کرنا چاہیے مجھ پر۔ چندا کی عقل پر جذبات کا پردہ پڑگیا ہے مگر تو میری بات کیوں نہیں سمجھتا۔ میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے تجھ سے۔؟"

کمال نے گاڑی ایک بیکری کے سامنے روک لی "یار چلا مت' آرام سے بات کر۔ رخشی کی حد تک تیری بات پر مجھے اعتبار ہے لیکن یہ شبنم' شاہ عالم کے ساتھ کسی قانونی' شرعی یا اخلاقی جواز کے بغیر رہتی تھی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ نہ اپنی بدنامی کی اور نہ کسی کے جذبات کی۔ رخشی کے لیے اپنے شوہر سے نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہی عورت ہوگی۔ وہ بدستور تیرے ساتھ ہے۔ دن رات اور کسی روک ٹوک کے بغیر۔ کیا یہ غلط ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "یہ ٹھیک ہے مگر کمال! اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ صرف اس لڑکی نے مجھے شاہ عالم نہیں مانا تھا' ساری دنیا نے مان لیا تھا مگر یہ اپنی ضد پر قائم تھی اور اس ضد کی ایک بہت معقول اور ناقابلِ تردید وجہ تھی۔ آخر میرے حق میں سب سے مستند گواہی رخشی کی کیوں سمجھی گئی تھی؟ تو ایک ڈاکٹر ہے۔ یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ صرف بیوی ہوتی ہے جو شوہر کی ANATOMY کو سمجھتی ہے۔"

"اور شاہ عالم کی ANATOMY کو سمجھنے والی دوسری عورت شبنم تھی جو اس کی غیر منکوحہ بیوی بن کے ساتھ رہتی تھی۔"

"ہاں۔"

"پھر اسے یقین کیسے آیا؟ تو نے یقین دلانے کے لیے کچھ تو کیا ہوگا۔ ذہنی طور پر تجھے شاہ عالم ماننے والوں کے لیے عدالت کا فیصلہ کافی تھا مگر شبنم کے لیے اسے جسمانی طور پر شناخت کرنا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ وہ پاگل ہوگئی تھی۔ اس ذہنی کشمکش نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ کبھی پوچھنا ڈاکٹر عائشہ سے۔ ان کے کلینک میں کتنا عرصہ رہی تھی شبنم۔ یار' یہ اس کی ذہنی شکست تھی کہ وہ مجھے شاہ عالم ماننے پر تیار ہوئی۔ اسے بچانے کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا پڑا۔"

"بہت کچھ کیا؟"

"وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اگر اس کی جان بچانے کے لیے مجھے عملی طور پر بھی خود کو شاہ عالم ثابت کرنا پڑتا تو میں کرتا۔ اس میں شک کی کوئی بات نہیں کہ معاملہ زندگی اور موت کا ہو تو حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔ اگر وہ مرجاتی' خودکشی کرلیتی' تو اس کا ذمے دار کون ہوتا میرے سوا لیکن خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بچایا۔ اگر تو ڈاکٹر عائشہ سے بات کرے گا تو وہ کہے گی کہ شبنم ایک نفسیاتی کیس ہے آج بھی۔ بے یقینی کے عذاب سے بچنے کے لیے اس کے لاشعور نے پسپا ہونا اور مفاہمت کرنا قبول کرلیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے شاہ عالم تسلیم نہ کرنا بہت مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا اس کے لیے اس نے آسان راستہ اختیار کیا اور مجھے شاہ عالم مان لیا۔ اس کا عذاب ختم ہوگیا۔"

"یہ بات بھی میری سمجھ میں آتی ہے۔ شاید کسی اور کی سمجھ میں نہ آئے لیکن آج صورتِ حال کیا ہے؟ تو اسے شبنم مانتا ہے اور وہ تجھے شاہ عالم سمجھتی ہے اور تمہارے درمیان سے رخشی کا کانٹا بھی نکل گیا ہے' اب کون ہے تمہیں روکنے ٹوکنے والا۔"

"ڈاکٹر کمال فاروقی صاحب! ایک چیز ہوتی ہے انسان کا ضمیر۔"

"جی۔ وہ آپ کے پاس ہے مگر شبنم کے نزدیک اخلاقی قدروں کی کیا اہمیت تھی؟ اس کے شاہ عالم سے ناجائز مراسم تھے۔ دنیا کھلم کھلا اسے شاہ عالم کی داشتہ کہتی تھی اور وہ بڑے فخر کے ساتھ اس الزام کو قبول کرتی تھی۔"

میرا دماغ اس بحث سے ماؤف ہونے لگا تھا "یار فاروقی! یہ بات بہت لمبی ہوجائے گی۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ میں پھر کبھی وضاحت کروں گا کہ میں نے کیسے شبنم کا ذہن بدلا۔ کیسے اسے قائل کیا کہ اب میں وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میرے خیالات و نظریات بدل گئے ہیں۔ میں نے سیاست چھوڑ دی۔ رخشی کو چھوڑ دیا۔ اپنی ساری دولت و جائداد چھوڑ دی۔ یہ سب شبنم نے دیکھا۔ ظاہر ہے میرے اور شاہ عالم کے کردار میں اور سوچ میں فرق ہے۔ میں ناصر عظیم ہوں' میں شاہ عالم نہیں بن سکتا۔ اگر ان کی شخصیت کا فرق ابھر کے سامنے آجاتا ہے اور مجھے شبنم کو مطمئن کرنے کے لیے اسی ایک دلیل کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ میں بدل گیا ہوں۔ وہ دیکھ رہی ہے کہ میں واقعی بدل گیا ہوں۔ میں نے شاہ عالم کی ساری بُری عادتیں ترک کردی ہیں۔ وہ شرابی اور عیاش آدمی تھا۔ شبنم کا بھی استحصال کرتا تھا۔ میں نہیں کرتا۔ وہ حیران ضرور ہوتی ہے لیکن اسے شاہ عالم کی شخصیت کا یہ بدلا ہوا روپ زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"چنانچہ اب وہ پہلے سے زیادہ محبت کرتی ہوگی شاہ عالم سے۔ یعنی آپ سے۔"

"میں اس کی تردید نہیں کرسکتا۔ وہ بلاشبہ بہت محبت کرتی ہے مجھ سے مگر میں نے اب اسے محبت اور ہوس' چاہت اور جنسی ضرورت۔ ان کے درمیان فرق کی اہمیت سمجھادی ہے۔ یہ بتادیا ہے کہ مجھے اس کی مدد چاہیے۔ اس کے جسم کا استحصال کیے بغیر۔ جذباتی بلیک میلنگ اب کوئی نہیں کرے گا۔ اگر اسے یہ شرط قبول نہیں تو پھر وہ شاہ عالم کو بھول جائے کیونکہ میں دوسرا شاہ عالم ہوں۔"

"اور اس نے مان لیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی طوائف کو سمجھائے کہ جسم فروشی گناہ ہے اور وہ کوٹھے پر بیٹھنا چھوڑ دے۔"

میں نے غصے کو ضبط کرلیا "یار کمال! یہ بڑی غلط بات کی تو نے۔ شبنم صرف شاہ عالم کی محبت میں جائز اور ناجائز کے فرق کو بھول جاتی تھی ورنہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ پتا نہیں کتنے لوگ اس غلط فہمی میں ذلیل ہوئے۔ جو سمجھتے تھے کہ وہ آسان حاصل ہے۔ خود کو شاہ عالم سے زیادہ خوبرو' دولت مند یا نامور سمجھنے والوں کی مٹی پلید ہوئی۔ شاہ عالم اس کی کمزوری ضرور تھا مگر اس کا کردار کمزور نہیں ہے۔ وہ ایک حساس ذہن کی مالک ذہین اور باہمت لڑکی ہے۔"

"تو چاہے مت مان لیکن بیٹے' تو اس لڑکی کے چکر میں پڑگیا ہے۔ اس کی خامی بھی خوبی بن گئی ہے۔ آج مجموعہ صفات ہوگئی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ از دیدہ دور' از دل دور۔ چندا سے دوری نے تجھے شبنم کے قریب کیا ہے۔"

"اس میں چندا کے روپے کا کوئی قصور نہیں؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"یقیناً ہے۔ ہم چندا کو بھی غلط کہتے ہیں اور تجھے بھی مگر نہ تو اپنی غلطی مانتا ہے نہ وہ سمجھتی ہے" کمال نے افسوس سے سر ہلایا۔

"چل پھر چھوڑ پریشان ہونا۔ کیا فائدہ اس لاحاصل کوشش سے۔ سب سے اچھا یہ کہ جو ہورہا ہے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرلیا جائے۔ چل کیک لے کر واپس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایک گھنٹا ہوگیا۔ قمر منتظر ہوگی۔"

واپسی پر ہم خاموش تھے۔ شبنم کا مسئلہ ہمارے درمیان ایک نظریاتی اور جذباتی خلیج بن کے حائل ہورہا تھا اور میں یہ محسوس کررہا تھا کہ بات صرف شبنم کی نہیں۔ ہمارے درمیان یقین اور اعتماد کی بنیادوں پر استوار ذہنی ہم آہنگی باقی نہیں رہی تھی۔ کہاں وہ وقت کہ ہم بغیر کہے ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ لیتے تھے اور کہاں یہ دن کہ میں اسے دلیل سے بھی قائل نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ باقی سب لوگ ابھی تک اپنی پرانی دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ میں ان سے الگ رہ کے ایک سال بعد بھی اکیلا واپس نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ شبنم تھی اور اس زندگی کے بدگمان کرنے والے حوالے تھے جو میں نے شاہ عالم کی حیثیت سے گزاری تھی۔ چنانچہ سب کچھ بالکل

ویسا نہیں ہوسکتا تھا جیسا سال بھر پہلے تھا۔ جب میں صرف ناصر عظیم تھا۔

اس صورتِ حال میں میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سب کچھ جیسا ہے 'جہاں ہے' کی بنیاد پر قبول کرلوں۔ میں اس سے غرض نہ رکھوں کہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے اور کیا سمجھتا ہے۔ میں وہی کروں جو میرے دل و دماغ کے فیصلوں سے مطابقت رکھتا ہو اور میرے یقین کو غلط نہ کرے۔ ابھی مجھے بحث یا دلیل سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ چندا کی رائے بدلے گی' نہ رویہ بدلے گا۔ بالآخر میرے قول و فعل سے اور آنے والے وقت سے سب کو غلط یا صحیح کا ثبوت مل جائے گا۔

گھر کے آدھے راستے میں کمال نے کہا "یار' ایک بات پوچھوں؟"

"کیا تو سمجھتا ہے میں انکار کردوں گا؟ حد ہے غیریت کی۔"

"یار' میں سمجھتا ہوں تیرے مسئلے کو مگر بات دوسروں کے سمجھنے کی ہے جو میرے اور تیرے لیے اہم ہیں۔" وہ بولا "آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وقت کا مرہم ہر زخم کو مندمل کردیتا ہے مگر زخم گہرے ہوں تو نشان مٹنے میں دیر لگتی ہے۔"

"خان جی ہوتے۔ میرا مطلب ہے ہوش میں آجاتے تو مجھے یقین ہے کہ میرا کام آسان ہوجاتا۔ وہ میری بات کو سمجھ سکتے تھے۔ خیر چھوڑ' تو کیا پوچھ رہا تھا؟"

کمال نے کہا "شبنم کا شاہ عالم کے بغیر زندہ رہنا بھی مشکل تھا پھر اس نے ناصر عظیم کی رفاقت کیسے قبول کرلی؟"

میں نے کہا "شاہ عالم کو وہ چار سال سے جانتی تھی۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ شاہ عالم ہی پہلے ناصر عظیم تھا۔ اس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی تھی اور اسے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جب اس نے سیاسی شہرت حاصل کی تو اپنے ماضی کے احساسِ کمتری سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے معتبر حوالے ایجاد کرلیے۔ میں نے اسے سب بتادیا کہ پہلے ناصر عظیم کیا تھا اور درحقیقت کون لوگ تھے جنہوں نے اسے زندہ رہنے کے لیے اعتماد دیا اور حوصلہ دیا۔"

"یعنی اس کے لیے تو آج بھی شاہ عالم ہے؟"

"ہاں مگر اب وہ سمجھتی ہے کہ میں اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ میں نے دولت اور شہرت کی ہوس میں شاہ عالم کی زندگی اختیار کرکے غلطی کی تھی۔ آج جب مجھے ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں اور میری جان صرف اسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ میں کہیں بھاگ جاؤں۔ ہمیشہ کے لیے روپوشی اختیار کرلوں۔ تو میرے لیے سب سے محفوظ پناہ کی جگہ وہی ہے جہاں میرا ماضی ہے۔ مجھے ناصر عظیم سمجھنے والے لوگ ہیں۔"

"اور ہم سے مل کے اس نے مان لیا کہ ناصر عظیم ہی شاہ عالم بن گیا تھا۔"

میں نے کہا "اور کوئی حل نہیں تھا میرے پاس اس مسئلے کا۔ اب وہ مطمئن ہے کہ شاہ عالم زندہ ہے۔ وہ ناصر عظیم تھا اور پھر ناصر عظیم بن گیا تو اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک ناگزیر مجبوری کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔"

"نظریۂ ضرورت ہماری زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ جب سے سپریم کورٹ نے ضیاء الحق کے مارشل لا کو نظریۂ ضرورت کا جواز فراہم کیا ہے' یہ لفظ ہمارے لیے تمام ناجائز اور غلط اعمال کو تسلیم کرانے کا ذریعہ بن گیا ہے۔"

میں نے کہا "کیا یہ لفظ پہلے نہیں تھا؟ حرام کو حلال قرار دینے والے شرع کا حوالہ لے آتے تھے' آج بھی خود فیصلہ کرلیتے ہیں لوگ کہ ان حالات میں جھوٹ بولنا پڑا۔ رشوت نہ دیتا تو کیا کرتا' مجبوری میں چوری کی۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ میں آج ہی کمال فاروقی کو پیشکش کردوں کہ میں کمال اسپتال کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور کمال خود مجھے اپنی ضروریات کی ترجیح بتادے۔ اسے اپنے منصوبے کی تکمیل اور توسیع کے لیے پہلے کیا چاہیے' ایک مکمل آپریشن تھیٹر' لیبارٹری' مشینیں اور آلات' لیکن اب میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کی وجوہ پیدا ہوگئی تھیں۔ مجھے رئیس کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملنے سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی اور مجھے رہ رہ کے یہ خیال آرہا تھا کہ رئیس کا فون ریسیو ہونے کے بعد مجھے خود وہاں جانا چاہیے تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اکیلے رئیس کے لیے صورتِ حال کو سنبھالنا مشکل ہوجائے۔

پھر یہ بات تفصیل طلب تھی۔ ضروریات کا یقین کرنے کے لیے کمال کے ساتھ کون' چندا اور قمر بھی گفتگو میں شریک ہوتے اور اپنی اپنی تجویز دیتے۔ ادھر خود مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کس حد تک اسپتال کے لیے وقف کرسکتا ہوں اور ایک مثالی یتیم خانے کے پروجیکٹ پر کیا لاگت آئے گی۔ مجھے اپنا سب کچھ کرعل خان کی طرح کارِ خیر میں نہیں دینا تھا۔ ایک معقول ذریعۂ آمدنی کے لیے مجھے انویسٹمنٹ بھی کرنی تھی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی کنسٹرکشن کمپنی کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے کثیر سرمایہ درکار تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے خود طے کرلوں کہ میں کمال اسپتال کے لیے کتنا سرمایہ فراہم کرسکتا ہوں اور باقی سب ڈاکٹر کمال پر چھوڑ دوں۔ وہ اپنی ضروریات کا تعین خود کرسکتا ہے۔ کمال کے گھر سے چلتے وقت میں نے موبائل فون نہیں اٹھایا تھا جو میں نے جاتے ہی میز پر رکھ دیا تھا۔ کمال نے اچانک باہر چلنے کے لیے کہا تو مجھے فون کا خیال نہیں آیا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ رئیس نے ضرور مجھے فون کیا ہوگا مگر جواب میں قمر نے کہا ہوگا کہ بھائی تو باہر گئے ہیں۔ شاید کہہ دیا ہو کہ کیک لینے گئے ہیں۔ رئیس بہت گالیاں دے گا کہ مجھے یہاں بھیج دیا اور خود بے فکری سے گھوم رہا ہے۔

کمال سے بحث کے بعد اپنی پریشانی کا اظہار کرنا اور کہیں راستے میں گاڑی روک کے کسی پی سی او سے رئیس کو فون کرتا تو مزید دیر ہوتی اور کمال سوچتا کہ اس وقت بھی مجھے شبنم کی زیادہ فکر ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی قمر نے شور مچایا "بھائی' کہاں چلے گئے تھے آپ دونوں' ایک گھنٹا ہوگیا۔"

میں نے کہا "پہلے یہ بتا' فون آیا تھا کسی کا؟"

"رئیس کا فون آتا رہا ہر پانچ منٹ بعد۔ تنگ آ کے میں نے فون ہی بند کردیا۔ بھائی' وہ مجھے کچھ بتانے پر راضی ہی نہیں تھا۔ میں نے بہت پوچھا کہ آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے' کیا آفت آگئی ہے ایسی۔۔۔؟"

میں نے کہا "پاگل ہے تو۔۔۔ ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ خصوصاً تیرے جیسی بے وقوف لڑکیوں کو۔"

میں فون اٹھا کے باہر چلا گیا۔ رئیس کا دیا ہوا نمبر میں نے ذہن میں ہی نہیں فون میں بھی محفوظ کرلیا تھا۔ میں نے نمبر ملایا تو آپریٹر کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سنائی دی "اس وقت مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔" میں نے کئی بار کوشش کی مگر رئیس کا نمبر کنکٹ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا کوئی ایک مطلب نکالنا مشکل تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ رئیس کے فون کی بیٹری کمزور ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ غصے میں اس نے بھی فون بند کردیا ہو اور ایسی صورتِ حال کو بھی خارج از امکان نہیں سمجھا جاسکتا تھا جس میں وہ فون استعمال ہی نہ کرسکتا ہو۔

یہ ناممکن تھا کہ میں پریشان نظر نہ آؤں۔ خان جی کی علالت کی وجہ سے چندا بھی کچھ آپ سیٹ تھی چنانچہ وہ ایک رسمی سی سالگرہ کی تقریب بن گئی۔ جس میں دل کھول کے ہنسے' قہقہے لگائے' ہنگامہ آرائی اور مبارک بادوں کی گنجائش نہ تھی اور خوشی منانے کے تصور میں احساسِ جرم کی خلش شامل محسوس ہوتی تھی۔ اسے بس ایک تقریب ہی ملاقات سمجھا جاسکتا تھا۔

چندا تو کھانے تک بھی نہیں رکی۔ اس نے کہا کہ جب بھوک لگے گی تو وہ آجائے گی۔ کوئن کو دور جانا تھا اور وہ بس سے سفر کرتی تھی۔ پہلے ہی اس نے کمال کی سیکرٹری کو آفر مسترد کردی تھی کہ اسے لانے لے جانے کے لیے گاڑی بھیج دی جائے۔ وہ ٹیکسی کا کرایہ ماہانہ الاؤنس کی صورت میں بھی قبول نہیں کرتی تھی۔ اس کا مؤقف تھا کہ لاکھوں لوگ اسی طرح بس ٹرین سے ڈیوٹی پر پہنچتے ہیں تو میں بھی آسکتی ہوں۔ وہ ضرورت کے لیے تنخواہ کو کافی سمجھتی تھی اور ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ جب ضرورت پڑے گی تو میں کہہ دوں گی کہ تنخواہ کم پڑ رہی ہے۔ خودداری اور قناعت کا ایسا عملی پیکر میں نے زندگی میں کسی کو نہیں پایا۔

قمر مجھے غور سے دیکھ رہی تھی "بھائی۔ کھانا کھا رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ دھیان کدھر ہے؟"

میں نے کہا "میں واقعی پریشان ہوں۔ تیری سالگرہ تھی اس لیے آنا پڑا۔ ورنہ مجھے منانا کون' اب میں جاؤں گا۔"

وہ مایوسی سے بولی "ابھی تو باتیں ہی نہیں ہوئیں۔"

"باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔ بہت لمبی عمر ہے تیری اور تیری جیسی بہن کی دعائیں ہوں گی ساتھ تو ہم بھی جئیں گے" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم دونوں میں کوئی بات ہوئی ہے" قمر نے کمال کی اور میری سنجیدگی دیکھ کے کہا۔

کمال مسکرانے لگا "بہت باتیں ہوئی ہیں ویسے تو۔"

میں نے کہا "مگر تجھے کیوں بتائیں؟"

"آپ کس چکر میں ہو آج کل' کیا کر رہے ہو؟ ہمارے پاس آجاؤ نا بھائی!" قمر نے کہا "سچ' بڑا مزہ ہے اس کام میں۔ جو ہم مل کے کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ضرور آؤں گا ایک دن۔ ابھی کچھ اور کام ہیں۔ پہلے وہ نمٹالوں۔ ویسے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ عملی طور پر شریک نہیں ہوسکتا تو اسپتال کے لیے کچھ کروں۔"

وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آئے' کمال نے کہا "کیا کرنا چاہتا ہے تو؟"

میں نے کہا "تجھے اسپتال کے لیے کیا چاہیے۔ فرض کر تیرے پاس ڈیڑھ دو کروڑ روپے ہوں۔"

"ڈیڑھ دو کروڑ۔۔۔ تو دے گا؟"

"ہاں۔ میں نے پچھلے دنوں حساب کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے پاس خاصی رقم بے کار پڑی ہے بینک میں۔ ایک تہائی میں بزنس میں لگادوں تو مجھے آئندہ کے لیے فکرِ معاش سے نجات مل جائے گی بلکہ اچھی خاصی آمدنی ہوجائے گی۔ دو کروڑ کے پھڑپھڑائی تین ہوتے جائیں گے۔"

"کیا پرانا کام پھر شروع کرنے کا خیال ہے؟"

"ہاں۔ ابھی تک تو ہے۔ دو کروڑ سے میری کنسٹرکشن کا بزنس شروع ہوجائے گا۔ ایکسپورٹ کافی الحال کوئی ارادہ نہیں۔ ٹھیکے ملتے رہیں گے تو کام خود چلتا رہے گا۔ دو کروڑ میں ایک اور کام کرنا ہے۔ دو میں اسپتال کے لیے جو لینا ہے تو سوچ لے۔ آپریشن تھیٹر' لیبارٹری' مشینیں دوائیں۔"

کمال کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا "یار۔ سچ کہہ رہا ہے تو۔ پیسہ تو مجھے چاہیے۔ جتنا میں کرنا چاہتا ہوں اتنا کر نہیں سکتا۔ فنڈز کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ آڑے آتا ہے۔ ہر ایک سے میں DONATION نہیں لیتا۔ حکومت سے تو بالکل نہیں۔ یار کتنا اچھا ہوتا اگر تو بھی آجاتا ہمارے ساتھ عملی طور پر۔"

"میں نے کہا نا۔۔۔ ایک دن آؤں گا۔۔۔ لیکن ابھی نہیں۔ مجھے دوسرے کام ہیں کچھ۔"

قمر نے خوش ہو کے میرا ہاتھ پکڑ لیا "بھائی۔۔۔ چھوڑو دوسرے کام۔"

میں نے کہا "چھوڑ سکتا تو ضرور چھوڑ دیتا۔ جیسے کمال کا خواب تھا ایک بہت بڑا فلاحی اسپتال بنانا۔ مفت علاج کرنا۔ ایسے ہی میرا بھی ایک خواب ہے۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں یتیم خانے بنانا' مثالی قسم کے۔ پہلے لاہور میں' پھر کراچی میں' پھر اسلام آباد میں۔ میری خواہش ہے کہ ایک دن پورے ملک میں یتیموں کے لیے ایسے ہوسٹل اور اسکول ہوں جہاں انہیں رہائش کے ساتھ اچھی تعلیم ملے۔۔۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

کمال کا چہرہ جوش اور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ اس کے ساتھ قمر کھڑی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ خوشی سے زیادہ اس کی صورت پر فخر کے جذبات عیاں تھے۔ یہ مجھے بہت عجیب لگا۔ اچانک میں فرشتہ غیب کی طرح ہوگیا تھا جو کسی غریب کے جھونپڑے میں نمودار ہوجائے۔ جھونپڑے کو عالی شان محل میں بدل دے اور اس میں رہنے والوں کے سارے جان لیوا مسائل کو دائمی خوشی میں بدل دے۔ میری ساری خطائیں معاف اور میری سب خامیاں قابلِ درگزر ہوگئی تھیں۔ میں بہت اچھا اور قابلِ فخر ہوگیا تھا۔

کمال کا اور قمر کا ردِعمل بالکل فطری تھا۔ اس باپ کے لیے بھی وہ بیٹا سب سے پیارا اور فخر کے قابل ہوجاتا ہے جسے نکما اور بدمعاش ہونے پر سوائے طعنوں کوسنوں کے کچھ سننے کو نہ ملتا ہو مگر اس کے پاس گھر کی تقدیر بدل دینے کے لیے دولت آجائے' خواہ وہ دولت پرائز بونڈ نکل آنے سے ملے' ڈکیتی کا حاصل ہو یا ناجائز ذرائع۔۔۔ آمدنی کا نتیجہ ہو۔

میں نے کہا "یار کمال! جو بات میں نے تجھ سے کہی ہے' یہ قمر کو بھی معلوم نہ ہوتی تو اچھا تھا۔"

وہ خفا ہوگئی "کیوں' میں کیا غیر ہوں؟"

"غیر کی بچی۔ تجھے ہضم نہیں ہوگی۔ جائے گی اور سرگوشی کرے گی چندا کے کان میں کہ باجی' ایک بات بتاؤں' آپ کو قسم ہے جو کسی کو بتائی۔"

"تو کیا وہ غیر ہوگئی ہیں اب آپ کے لیے؟"

میں نے کہا "سب اپنے ہیں مگر بات ایک سے دوسرے تک ایسے ہی پہنچتی ہے اور میں یہ بالکل نہیں چاہتا کہ پھر تم بھی میرا نام لو۔ کبھی میرا شکریہ ادا کرو یا یہ سمجھو کہ میں نے اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کیا ہے اس طرح۔"

"بھائی' ہم سب نے ایسا ہی کیا ہے" قمر بولی "میں نے اپنے بوتیک کا سب سرمایہ لگادیا ہے۔ جو تھا میرے پاس سب دے دیا ہے۔ یہی خان جی نے کیا۔ آج تم بھی ہم میں شامل ہوگئے۔ خان جی کتنے خوش ہوتے اگر انہیں پتا چلتا مگر وہ ہوش میں ہی نہیں۔ یہ باتیں ایک چندا سے چھپانے کا فائدہ' وہ اور دکھی ہوگی۔"

"اوکے۔ بتادینا اسے بھی" میں نے ہار مان کے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی "خدا حافظ۔"

میں بہت خوش اور RELEIVED محسوس کر رہا تھا۔ شاید یہ کام مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔

اسپتال کے احاطے سے نکلتے ہی میں نے پھر رئیس کو فون کیا مگر وہاں سے وہی جواب ملا۔ فون RESPOND نہیں کر رہا ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ فون بند ہے۔ رئیس اتنی دیر تک فون بند کرکے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جن کا تعاقب کرنا چاہتا تھا' انہیں پتا چل گیا اور رئیس کے ساتھ۔۔۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔۔۔ والی بات ہوگئی۔

میں نے اخبار کے دفتر کا فون ملایا۔ آزاد صاحب کی آواز پر میں نے لہجہ بدل کے بات کی "کیا مس شبنم موجود ہیں؟"

وہ بولے "موجود تو ہیں کہیں نہ کہیں گویا مگر یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے روبرو نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "کیا وہ آج بھی نہیں آئیں؟"

"بھئی اس بھی کا مطلب تو یہ ہوا کہ گزشتہ روز کی خبر بھی رکھتے ہو گویا۔ خیر سے تشریف آوری سے ہمیں زیر بار احسان تو فرمایا تھا انہوں نے لیکن مثلِ برق تپاں' ان کی جلوہ نمائی یک نفس پیش نہ تھی۔"

"یعنی وہ آ کے کہیں چلی گئیں فوراً؟" میں نے کہا "کچھ بتا کے نہیں گئیں کہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہیں؟"

وہ ہنسنے "میاں سراغ رساں! اول تو یوں ہوا نہیں گویا۔ اور جو ہوتا تو ہم تمہیں کیوں بتاتے؟ قائل کرو ہمیں دلیل سے عزیز من کہ تم بدخواہ نہیں' خیر خواہ ہو۔ اب تم بخت۔ کم عقل' سیاہ رو' بدروح' کان پکڑلے' بن جا مرغا۔ حالی کو خالی لکھ دیا۔ استغفار کر۔ مسدس حالی کو مسدس خالی لکھا۔ جواہر لالِ نہو کی غیر مطبوعہ اولاد" میں سمجھ گیا کہ وہ کاتب جواہر رقم لال دین پر خفا ہو رہے ہیں۔ ان سے مزید گفتگو لاحاصل تھی۔

میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ شبنم آفس پہنچی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رئیس بھی اس کے پیچھے پیچھے اخبار کے دفتر تک گیا تھا مگر کیا گارنٹی ہے اس کی؟ ممکن ہے اسے درمیان سے ہی اچک لیا گیا ہو۔ یا اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ ایک شخص جو نیلے کا ساتھی تھا شبنم کے انتظار میں آزاد صاحب کے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔ کیا وہ شبنم کے پیچھے آفس تک آیا تھا؟ کیا شبنم اس کے ساتھ کہیں گئی تھی؟ سوال یہ ہے کہ کہاں؟ اس نے فون کر کے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

میں نے گاڑی کا رخ آزاد صاحب کے گھر کی طرف موڑا لیکن وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ آزاد صاحب کے گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ اندر کوئی لائٹ نہیں تھی اور باہر شبنم کی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ آخر وہ کس راستے سے آفس جاتی ہو گی؟ پھر میں نے اس راستے پر گاڑی کو آہستہ آہستہ بڑھایا۔ ساتھ ہی میں باری باری شبنم کو اور رئیس کو فون پر کنیکٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں آزاد صاحب کے آفس تک پہنچ چکا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کہا "ہیلو۔!"

دوسری طرف سے رخشی نے کہا "کہاں ہو تم اس وقت؟"

میں نے کہا "گاڑی میں۔ یہ بتاؤ تمہارے پاس شبنم کا یا رئیس کا کوئی فون آیا؟"

"نہیں لیکن اس نامعلوم رپورٹر نے فون کیا تھا۔ اس نے دھمکی دی مجھے کہ اگر میں نے تمہارا پتا نہ بتایا تو مجھے نقصان ہو گا۔ یہ کسی اور کا پیغام ہے جو وہ پہنچا رہا ہے۔"

میں نے سوچ کے کہا "تم اس الو کے پٹھے کو بلاؤ۔"

"فرید نے بھی یہی کہا۔ وہ رات نو بجے بتائے گا کہ کہاں ملنا ہے اور کب۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پھر بات کرتا ہوں تم سے۔" میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے شبنم کی گاڑی اخبار کے دفتر کی سیڑھیوں کے سامنے کھڑی نظر آ گئی تھی۔ میں ایک بار گاڑی کے اندر دیکھتا ہوا سیدھا گزر گیا۔ شبنم گاڑی کے اندر موجود نہیں تھی۔ کچھ دور جا کے میں رک گیا۔ گاڑی سے باہر آئے بغیر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ سڑک پر سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر بھی لوگ آ جا رہے تھے۔ مجھے کہیں بھی کوئی شخص مشتبہ انداز میں کھڑا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شبنم کس کے ساتھ جا سکتی ہے۔ وہ اپنی گاڑی چھوڑ گئی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ نکالا جا سکتا تھا کہ وہ کسی اور کی گاڑی میں گئی ہو گی اور دوسرا یہ کہ وہ پیدل یا ٹیکسی میں گئی ہو گی مگر اپنی گاڑی کے ہوتے ہوئے شبنم ٹیکسی کیوں استعمال کرے گی' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں قریب ہی موجود ہو۔

میں چند منٹ شش و پنج میں مبتلا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کسی واضح یقین کے بغیر میں کب تک گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ مجھے رئیس کی طرف سے بھی تشویش لاحق تھی۔ اگر وہ شبنم کے پیچھے لگا ہوا تھا پھر تو کوئی بات پریشانی کی نہیں تھی مگر اس سے ٹیلی فون پر رابطہ نہ ہونا شک پیدا کرتا تھا۔

بالآخر میں نے اوپر جا کے آزاد صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند قدم چل کے میں شبنم کی گاڑی تک پہنچا۔ گاڑی ایک اسٹریٹ لائٹ کے کھمبے سے چند فٹ آگے کھڑی ہوئی تھی۔ مرکری لیمپ کی روشنی پیچھے والے ونڈ اسکرین پر پڑ رہی تھی۔ اچانک میری نظر نے چند اعداد دیکھے۔ کسی نے شیشے پر جمع ہو جانے والی گرد کی تہ پر انگلی سے ایک فون نمبر لکھ دیا تھا۔ چھ سات عدد ایک ساتھ لکھے ہوئے ہوں تو ہر شخص کا ذہن اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا۔

میں نے اس نمبر کو یاد رکھا اور اخبار کے آفس میں جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میری یہ حرکت کسی طرح

بھی دانش مندانہ نہیں تھی۔ میں ایک طرف تو روپوشی کا ڈراما کر رہا تھا اور دنیا کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ شاہ عالم نے سیاست کو ہی نہیں' اس شہر کو اور ملک کو بھی چھوڑ دیا ہے اور خبروں سے یہ تاثر پھیلانا چاہتا تھا کہ شاہ عالم نے مایوسی میں جلاوطنی اختیار کی اور بالآخر گمنامی اور کس مپرسی کی موت مر گیا لیکن دوسری طرف میں ایک اخبار کے دفتر میں نظر آ کے اپنے سارے منصوبے کی ناکامی کا ساماں کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں آزاد صاحب سے فون پر بات کر لوں مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں آدھے زینے پر تھا اور اوپر سے دو افراد نیچے آ رہے تھے۔ میں ان دونوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

ان میں سے ایک شمس تھا جو میری یعنی شاہ عالم کی سیاسی پارٹی پی جے ایف کے ایک دھڑے کا چیئرمین کہلاتا تھا۔ پارٹی کے دو نائب صدر تھے اور دونوں کے ذہن ایک جیسے سازشی تھے۔ شاہ عالم کو پارٹی سے اور پھر دنیا سے رخصت کرنے کے نیک کام میں وہ ضرور ایک ہو گئے تھے مگر اس کے بعد ایک کا دوسرے کو برتر تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پارٹی اب پی جے ایف (قریشی گروپ) اور پی جے ایف (شمس گروپ) میں بٹ گئی تھی۔ جیسا کہ دستور ہے۔

شمس کے ساتھ ایک پرانا کارکن تھا جس میں اور کوئی خوبی نہ تھی مگر وہ چاپلوسی کے فن میں طاق تھا۔ جب عدالت نے مجھے شاہ عالم ہونے کی سند عطا کر دی تھی تو مبارک باد دینے والوں میں وہ پیش پیش تھا مگر میں نے فوراً ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ایک جھوٹا شخص تھا جس کے خوشامدانہ انداز میں بھی بہت گھٹیا پن تھا۔ اس نے مجھے اور پھر میرے سامنے کئی لوگوں کو بتایا کہ وہ میری خاطر کتنے کالے بکرے صدقہ کر چکا ہے' کتنی بار اس نے میرے لیے آیت کریمہ کا ورد کرایا اور آج کتنے من مٹھائی حق کی فتح کی خوشی میں تقسیم کرا کے آیا ہے۔

وہ یقیناً اب شمس کا دستِ راست بنا ہوا ہو گا۔ شاہ عالم بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی باتوں میں آتا مگر شمس کو یقیناً ایسے ہی خوشامدی پسند ہوں گے۔ اگر ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو میرا بنا بنایا کھیل خراب ہو جاتا لیکن ایک تو زینے میں اندھیرا تھا اور شمس صاحب کا چہرہ بڑے زور و شور سے خوشامد میں مصروف تھا "چیئرمین صاحب جی' آپ ملاحظہ فرمائیں اخبار۔ ایسی شاندار تصویر آئے گی صبح کہ وہ بڈھے بندر کے منہ والا قریشی جل کے کوئلہ ہو جائے گا جناب کوئلہ۔ آپ نے دیکھی تھی تصویر اس کی۔ پتا نہیں کہاں صدارت کرنے گیا تھا پیسے دے کے۔ لگتا تھا کرسیِ صدارت پر نہیں کموڈ پر بیٹھا ہے قبض کی حالت میں۔ آپ کے جیسی سوہنی شکل کہاں سے لاتا اور پھر شخصیت بھی کوئی چیز ہے۔"

چیئرمین صاحب کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھ رہے تھے اور ان کے تصور میں کوئی تصویر تھی جو صبح کے اخبار میں شائع ہو گی۔ اسی لیے انہوں نے مجھے نظرِ التفات کے قابل نہیں سمجھا۔ شاید میری داڑھی اور بدلے ہوئے ہیئر اسٹائل کی وجہ سے بھی ان کے ذہن میں پرانی یاد کی کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی اور میں سر جھکائے ان کے پاس سے گزر گیا۔

یہ آمنا سامنا بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ناممکن تھا۔ ایک اخبار کے دفتر میں پریس ریلیز دینے کے لیے ہر سیاسی اور مذہبی جماعت کا افسرِ تعلقاتِ عامہ خود حاضر ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مدیرانِ جرائد سے اس کا رابطہ رہے اور ضرورت پڑنے پر وہ اپنی خبر نمایاں انداز میں لگوا سکے۔ ان بیان بازی تک محدود کاغذی تنظیموں کے عہدے دار تو اخبار والوں کے پیچھے کتوں کی طرح دُم ہلاتے پھرتے ہیں جن کا مقصد ہی اپنا الو سیدھا کرنا ہوتا ہے خواہ تنظیم میں سب الو کے پٹھے ہوں۔

اوپر پہنچ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ خدانخواستہ شمس یا اس کا چمچہ مجھے پہچان جاتے اور چیخ مار کے گلے ملنے کے بہانے میرا راستہ روکتے تو میں کیا کرتا۔ یہ کہتا کہ غلط فہمی ہے آپ کی۔ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ وہ کبھی نہ مانتے پھر دوسرا طریقہ یہی رہ جاتا کہ میں انہیں لڑھکا کے جائے واردات سے فرار ہو جاؤں۔ بہرصورت کام آسان نہ ہوتا۔ اگلی صبح کے اخباروں کے لیے ایک سنسنی خیز خبر کا عنوان ضرور پیدا ہو جاتا کہ شاہ عالم جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے جلاوطنی اختیار کر لی ہے اسی شہر میں روپوش تھا۔

دائیں ہاتھ پر پہلا کمرا ایڈیٹر صاحب کا تھا۔ اس کے بالکل مقابل جس کمرے میں پہلے کاتب بیٹھتے تھے وہاں اب کمپیوٹر نصب تھے اور کمپوزنگ ہوتی تھی۔ خوشنویسی جو ایک فن تھا دوسرے بہت سے فنون کی طرح مشینوں سے شکست کھا چکا تھا اور تحریر میں اپنے کمالِ فن سے حسن کو نکھارنے والے زریں رقم خوش نویس جنہوں نے فنِ خطاطی میں خداداد صلاحیت کے باوجود کسی استاد کی شاگردی کرتے اور پھر مشق کرتے ایک عمر صرف کی تھی اور اخبار پڑھنے والوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے خبر میں ذوقِ نظر کا سامان فراہم کیا تھا اب بے روزگار تھے اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کرکے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ ایسا زندگی کے ہر شعبے میں ہوا تھا۔ قالین باف ختم ہو رہے تھے۔ مشینی قالین جو سستے تھے' عام ہو گئے تھے۔ کاریں بنانے والے بڑے بڑے اداروں میں جو کام انسان اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے' وہ اب مشینی روبوٹ سرانجام دے رہے تھے۔ انسان تھک جاتا تھا۔ مشین ان تھک چوبیس گھنٹے کام کر سکتی تھی۔ مشین ہڑتال نہیں کرتی تھی اور دس بیس افراد کی تنخواہ کا ہر مہینے بچ جانا بہت بڑا منافع تھا۔

آزاد صاحب کا چھوٹا سا اخبار صحافت کی پرانی قدروں کا نمائندہ تھا۔ ابھی تک اس کی خبروں میں سنسنی خیزی کا وہ کاروباری انداز پیدا نہیں ہوا تھا جس میں کسی ضابطۂ اخلاق کی اہمیت ثانوی رہ گئی تھی۔ پہلا مقصد اخبار بیچ کے منافع کمانا تھا۔ چنانچہ قیاس آرائی یا افواہ پر مبنی بات اگر دھماکا کرنے والی سرخی بنتی ہے تو چلے گی۔ کیا جھوٹ ہے' کیا سچ ہے۔ اس کی تصدیق غیر ضروری ہے۔ اسکینڈل چھاپ دو' قتل اور آبروریزی کی داستانیں نمک مرچ لگا کے پیش کرو۔ کسی کی رسوائی ہوگی اور پڑھنے والوں میں بچے بھی ہوں گے۔ یہ مت سوچو' اشتہار لاؤ خواہ وہ دھوکے بازوں کے اعلانات ہوں یا پوشیدہ امراض کے جعلی ماہرین کی دواؤں کے۔ زرد صحافت کے تو نام ہی میں زرد ہے۔ فوراً مطلوب۔

شام کے وقت شائع ہونے والے اخباروں کی یلغار نے صبح کے سنجیدہ مزاج اخباروں کے مزاج پر بھی اثر ڈالا اور قارئین کے ذوق کو بھی متاثر کیا تھا۔ پورے معاشرے کا چلن بگڑ رہا ہو تو اس سے صحافی کیسے بچ سکتا ہے تاہم آزاد صاحب جیسے سرپھرے نوجوان نسل میں بھی تھے جو صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون اور ایک مشن سمجھتے تھے اور ان کا نعرہ آج بھی "آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی" تھا۔

آزاد صاحب کے اخبار کی اشاعت بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ اکثر ان پر سرکار کا عتاب نازل ہوتا تھا کیونکہ وہ حاکم کے مزاج اور اس کے اشارۂ ابرو کو نہ سمجھتے ہوئے ممنوعہ خبر کو سرخی بنا کے چھاپ دیتے تھے پھر کچھ بدنام سیاسی جماعتوں اور تشدد پسند مذہبی فرقے بھی ان کے اختلاف پر برہم رہتے تھے لیکن آزاد صاحب کچھوے جیسی مستقل مزاجی سے اپنی روش پر چلتے جا رہے تھے۔ یہ بات طے شدہ تھی کہ ان کا کام ہوا خبر' اصل حقیقت جاننے کے لیے ان کے بدترین مخالف بھی ان کا اخبار پڑھتے تھے اور اسے اپوزیشن کا ترجمان سمجھنے والے سرکاری حکام بھی۔ آزاد صاحب وہ صحافی تھے جن کے ضمیر کا دوسرا نام قلم تھا۔

میں نے کمرے میں جھانک کے دیکھا تو وہ میز پر کباڑی کی دکان سجائے نہ جانے کس خبر کا شجرہ نسب جاننے کی کوشش میں مصروف تھے۔ احتیاطاً میں نے آنکھوں پر رات کے وقت سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا اور اپنی دانست میں چہرے کو اتنا بدل چکا تھا کہ مجھے کوئی بہ آسانی شناخت نہیں کر سکتا تھا حالانکہ آزاد صاحب کی عقابی نظر ایکس رے کی طرح آدمی کے ظاہر سے باطن تک پہنچ جاتی تھی۔ بقول علامہ صاحب ع جوشے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا۔

میں نے گنگنا کے کہا "حضرت۔ آداب بجالاتا ہوں۔"

انہوں نے رسالے اور تراشے کھنگالتے ہوئے کہا "لاؤ بھئی۔ تم بھی بجا کے لاؤ' کیا لائے ہو گویا۔ یہاں یہ پتا نہیں چل رہا ہے کہ اپنے جلال پور جٹاں اور افغانستان کے جلال آباد کا شہنشاہ جلال الدین اکبر سے کیا تعلق تھا۔"

میں نے بیٹھ کے عرض کی "ناجائز تعلق تھا۔"

وہ چونکے "لاحول ولا قوۃ۔ کیا بلند پایہ جہالت ہے گویا۔"

میں نے کہا "دیکھیے' جس تعلق کا کسی کو علم نہ ہو وہ ناجائز ہی کہلاتا ہے۔"

انہوں نے چشمے کے اوپر سے مجھے گھورا "حسِ مزاح بھی رکھتے ہو گویا لیکن اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم واقف ہیں اگرچہ خوب تم سے مگر وہ کیا ہے کہ تمہارا عنوان اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے گویا۔"

میں نے کہا "ناچیز کا عنوان ہے' ناصر عظیم! آپ کی اس چار ٹانگوں والی مخلوق جس کی صورت کیکڑے سے' رفتار کچھوے سے اور مزاج کسی سے نہیں ملتے۔ چلبلی کا معالج خصوصی ہوں میں۔ بدقسمتی سے۔"

کرسی کی پشت کا سہارا لے کے انہوں نے چشمہ اتار دیا۔ "بخدا' تمہاری اس دلآزار گفتار سے چلبلی کے جذبات مجروح ہوتے اور ہم بقلم خود تمہاری کھال میں بھس بھرتے گویا۔ مگر چلبلی بہ سببِ ناسازیِ طبع ساکت ہے فی زمانہ چنانچہ خوب آئے تم۔"

میں نے کہا "اجی جہنم میں گئی چلبلی۔"

وہ اچھلے "کیا۔ بدگفتار' نابکار' ناہنجار۔ اس معصوم اللہ میاں کی گائے جیسی خدمت گزار' وفادار جنت کی حق دار' شاندار کار کی شان میں یہ گستاخی۔ برخوردار' ہم غصے سے تھر تھر کانپ رہے ہیں گویا۔ کاش کوئی آلۂ قتل دستیاب ہوتا ہمیں۔"

میں نے کہا "وہ میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ پہلے یہ بتایئے کہ شبنم کتاں ہے؟"

انہوں نے ایک آہ بھری "یہ ہم سے پوچھ رہے ہو تم گویا۔ ہم خود وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی... کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

میں نے کہا "دیکھیے' وہ گھر گئی تھی' وہاں سے غالباً کچھ نامعلوم افراد نے اس کا تعاقب کیا۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہو گئے "اچھا! یہ تو چونکانے والی خبر ہے گویا مگر تم کیا تعاقب کرنے والوں کے تعاقب میں تھے' یعنی خبر کا ذریعہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "میرے ایک مخبر کی اطلاع ہے کہ وہ یہاں آئی اور پھر کہیں گئی' کسی کے ساتھ۔"

"بجا کہتے ہو' سچ کہتے ہو۔ یعنی بقول شاعر ع آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا مگر قسم لے لو میاں' ہم سے جو ہمیں کچھ علم ہو کہ فسانہ کیا تھا۔ اس نامعقول لڑکی نے وہ سلوک کیا ہے ہمارے ساتھ گویا۔ جو اکلوتے پاکستان کے ساتھ کیا ان سیاست دانوں نے مل کے۔"

میں نے کہا "آپ بہت خفا ہیں اس سے؟"

"صرف خفا؟ میاں برخوردار' ہم عاجز ہیں... اور نالاں و فریاد کناں ہیں گویا۔ ہمارے سفینۂ حیات کی خستہ حالی ملاحظہ کرو جسے اس نے ڈال دیا ہے بحرِ تفکرات کے گرداب بلا میں۔"

میں نے کہا "آپ کو حق ہے اس سے پوچھنے کا۔"

"تم حق کی بات کرتے ہو' بڑے نادان ہو گویا۔" انہوں نے تلخی سے کہا "میاں' کون دیتا ہے کسی کو حق اور کون تسلیم کرتا ہے یہ حق... سوال ہم نے دس فرمائے مگر نالائق ملاحظہ فرماؤ کہ جواب ایک کا نہیں دیا اس نے۔ بقول شاعر ع یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب ہیں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔"

میں نے کہا "یعنی آپ کو کچھ بتا کے نہیں گئی وہ؟"

"اجی بتانے کی فرصت کہاں اس کے پاس۔ ایک عالم وحشت تھا کہ بگولے کی طرح آئی وہ اور طوفان کی طرح گئی۔ پیغام دیا تھا اس نے تمہارے لیے مگر یہ تو کچھ غلط کہہ گئے ہم۔ خبر کی سرخی غلط ہو گئی گویا پیغام تو غالباً لڑکی کے لیے دیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "پیغام کیا تھا' وہ بتایئے۔"

"اسے اندیشہ لاحق تھا گویا کہ تمہارا فون آئے گا... لیکن تم بقلم خود نازل ہو گئے ہو تو سوچنا پڑے گا کہ اب کیا کیا جائے؟"

میں نے جھلا کے کہا "سوچنے کی کیا بات ہے اس میں۔ اس نے جو کہا تھا بتا دیں مجھے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے گویا۔ اس نے کہا تھا کہ تمہیں وہ ہونے کی ضرورت نہیں فکرمند۔ پھر ہم نے کہا کہ بھئی فکرمند تو ہم بہت ہیں تمہاری طرف سے۔ یعنی کہاں ہو' کس طرف کو ہو' کدھر ہو اور فی زمانہ تمہاری نقل و حرکت سخت پُراسرار بلکہ قابلِ اعتراض ہے گویا ہمارے لیے۔ دھیان تمہارا ہر طرف ہے سوائے اپنے فرائضِ منصبی کے۔"

میں نے کہا "آپ مطمئن رہیں' وہ بہت ذمے دار لڑکی ہے۔"

وہ چمک کر بولے "قطعی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ خاک ذمے دار ہے گویا کہ ہر وقت مردانہ وار گھوڑے دوڑاتی پھرتی ہے بحرِ ظلمات میں۔ یہ زمانہ تو میاں ہمارے اعمال سے زیادہ خراب ہے۔ خصوصاً ایک لڑکی کے لیے جو مبتلا ہو خوش فہمی کے مرض میں۔ نادانی کا یہ عالم ہو کہ خود کو سمجھتی ہو افلاطون گویا اور غرور ہو سر میں قلم کی طاقت کا۔ یہ احساس نہ ہو کہ عزت کا معاملہ نازک ہوتا ہے تارِ عنکبوت کی طرح۔ تارِ عنکبوت سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "جی۔ مکڑی کے جالے کو کہتے ہیں۔"

وہ ہمارے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے "اور معلوم ہے جب ہم نے اظہارِ تشویش فرمایا تو اس نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "کیا کہا؟ آپ ہی بتا سکتے ہیں۔"

"یہ کہا کہ ہم پریشان نہ ہوں کیونکہ وہ جا رہی ہے کسی رئیس کے ساتھ۔ میاں تم ہی کچھ عرض کرو انصاف سے گویا... کہ وہ جائے کسی رئیس کے ساتھ اور وہ بھی رات کے وقت تو پریشان کیا ہمارے دشمن ہوں گے؟ یہ جو آج کل کے نام نہاد رئیس ہیں' کم ظرف اور نودولتیے۔ ہم کیا جانتے نہیں ان کے کردار کو۔"

میں نے ہنس کے کہا "جناب' یہ رئیس میرا دوست ہے اور میں نے ہی اسے شبنم کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ اگر وہ ساتھ ہے تو واقعی فکر کی کوئی بات نہیں۔"

انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے گہری سانس لی "بھئی اس وقت بڑی مفرح قلب خبری تم نے گویا ورنہ ہم بہ سببِ اختلاج و وحشت وہ کھا لیتے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب' زہر کھائیں آپ کے دشمن۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"زہرا!" انہوں نے میز پر رکھی ہوئی بید کی چھڑی اٹھالی۔
"ناحول ولاقوۃ۔۔۔ یہ کس قدر نامعقول اور منحوس بات ہے۔ بخدا! ہم سے اتنے دور نہ ہوتے تو ہم اچھی خبر لیتے تمہاری۔ ہم نوش فرمانے والے تھے تمہیں ابریشم حکیم ارشد والا۔"
میں نے کہا "معافی چاہتا ہوں غلطی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وقت آپ کے لیے مصروفیت کا ہے مگر میں چند منٹ اور لوں گا۔"
"کہیں چند کے معنی ایک سو بیس یا دو سو چالیس تو نہیں ہیں خدانخواستہ؟" آزاد صاحب نے مجھے عینک کے اوپر سے گھورا۔
"ہرگز نہیں' صرف پانچ منٹ۔"
انہوں نے میز پر ہاتھ مارا "نامنظور۔ یہ تو آداب میزبانی کی صریح خلاف ورزی ہوگی گویا اگر ہم نے تمہیں ایسے ہی جانے دیا۔ دس منٹ کا نوٹس دینا لازمی ہے حیران کے لیے۔"
"حیران کون؟"
"بھئی ہمارا خادم خاص۔ وہ حیران ہے اور ہم پریشان' ایک دوسرے کے سبب" آزاد صاحب نے دروازے کی طرف منہ کرکے ہانک لگائی "اجی حیران صاحب!"
دروازے میں ایک منحنی سا شخص بوسیدہ شیروانی میں لرزہ براندام نمودار ہوا "کیا حکم ہے میرے آقا!" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔
"بھئی بہت دیر ہوگئی گویا۔ ایک اور جام مشروب چین کا ہوجائے۔ کیا کہتے ہیں اسے عرف عام میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ چائے۔"
میں نے کہا "حیران صاحب چائے بس چائے ہو۔ وہ گرم گاڑھا سیال نہ ہو جو خالص دودھ اور ہم وزن چینی کو چند پتیوں کے ساتھ خوب ابال کے اور بالائی کا تڑکا لگا کے پیا جاتا ہے۔" حیران صاحب نے مجھے دکھی نظروں سے اور آزاد صاحب کو فریادی بن کے دیکھا اور افسوس سے سرہلایا۔
"چائے بنانا بھی مجھے آپ جیسے لونڈوں سے سیکھنا ہوگا؟ کیا زمانہ آگیا ہے' عقل حیران ہے۔"
اس کے جانے کے بعد میں نے کہا "آزاد صاحب۔ ابھی میں نے شمس کو یہاں سے واپس جاتے دیکھا تھا۔ میں اوپر آرہا تھا اور وہ نیچے جارہا تھا۔"
وہ ہنسے "پھر معانقہ مصافحہ وغیرہ ہوا گویا اپنے پرانے مہربانوں سے؟"
میں نے کہا "خدا نے بچالیا۔ اس نے غور سے نہیں دیکھا مجھے لیکن وہ آیا کیوں تھا یہاں؟"
"بھئی جیسے تم آگئے۔ اخبار کا دفتر تو دربار عام ہے گویا۔ کیوں پوچھ رہے ہو آخر؟"
میں نے کہا "آج کل وہ پورا چیئرمین ہے آدھی پی جے ایف کا۔"
"نصف بہتر کا چیئرمین ہے قریشی کیونکہ وہ بہت آگے ہے جہالت' طاقت اور ذلالت میں گویا لیکن کیا فرق پڑتا ہے ہمیں کسی کے چیئرمین ہونے سے۔ بقول شاعر ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ چیئرمین ایک لٹھا ہوتا ہے اور کرسی میز بھی دستیاب ہے اس نام کی۔"
میں نے کہا "وہ ضرور کسی کام سے آیا ہوگا۔"
آزاد صاحب کسی سوچ میں پڑگئے "ظاہر ہے ہمارے دفتر سے اس کے سسرال کا راستہ تو گزرتا نہیں لیکن جس کام سے وہ آیا تھا' وہ ہماری سمجھ شریف میں نہیں آیا۔"
میں نے کہا "کیا وہ شاہ عالم کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"
آزاد صاحب چونکے "بھئی یہ اندازہ کیسے کیا تم نے گویا؟ اندھیرے میں تیر چلایا تھا تو سبحان اللہ۔ بالکل نشانے پر لگا۔ پہلے یہی پوچھا تھا اس نے ہم سے کہ ہمارے سابق روپوش اور مفرور چیئرمین صاحب کی کوئی خیر خبر ہے؟ سنا ہے انہوں نے عقد ثانی کرلیا ہے۔ ہم نے کہا کہ بھئی وہ عقد ثانی کریں یا لاثانی۔ ہمیں کیا۔ بقول شاعر اڑتی اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی۔ کہ شاہ عالم ولایت کے شہر لندن میں دستیاب ہے فی زمانہ اور وہاں کسی میم کے دام حسن میں گرفتار ہوجانا تو گویا ایک دستور ہے۔ ہم بھی ہوجاتے اگر جاتے۔"
میں نے کہا "کیا واقعی ایسی کوئی خبر ہے؟"
"خبر تو ہے گویا غیر مصدقہ۔۔۔" انہوں نے ادھر اُدھر کاغذات میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی "ویسے کسی چنڈوخانے سے نہیں' ایک اچھی خبر رساں ایجنسی نے جاری کی ہے۔ کل ملاحظہ فرمانا اخبار میں۔ ہم بھی شائع کریں گے گویا۔"
"پھر تو درست ہوگی۔ شاہ عالم کیا کررہا ہے لندن میں؟"
"لندن میں بڑی مقناطیسی کشش ہے اپنے بے روزگار سیاست دانوں کے لیے گویا اور عرصہ دراز سے ہے لیکن یہ شمس آخر خاتون کے بارے میں کیوں جاننا چاہتا تھا؟" آزاد صاحب پھر سوچ میں پڑگئے۔
"کس خاتون کے بارے میں؟ جس سے وہ شادی کررہا ہے؟" نہیں بھئی۔ وہ کیا بھلا سا نام تھا اس کی سابق منکوحہ کا؟" میں نے کہا "رخشندہ۔ کیا وہ رخشندہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا؟"

"ہاں۔ ہم سے معلوم کرنا چاہتا تھا اس کا پتا گویا۔ ہم نے کہا کہ میاں' ہمیں خود اپنے گھر کا پتا نہیں معلوم' بس پہنچ جاتے ہیں نہ جانے کیسے۔"
میں نے کہا "آزاد صاحب۔ کیا گزشتہ چند دن میں کسی اور نے بھی رخشندہ کا پتا پوچھا ہے آپ سے؟"
"بالکل پوچھا ہے۔ خوب یاد دلایا تم نے گویا۔ اب یہ مقام حیرت ہے کہ شمس کے بتے سے خلق کو کیوں میرا گھر ملے۔ مسماۃ رخشندہ سے تو شاہ عالم کا کوئی بھی شرعی اور قانونی تعلق نہیں رہا۔"
میں نے کہا "کیا پہلے پتا پوچھنے والے نے اپنا نام بتایا تھا؟ دراصل کسی نے رخشندہ کو بھی پریشان کررکھا ہے۔"
"بھئی نام تو ہمیں نہیں بتایا اس نے اور ہم نے پوچھا بھی نہیں مگر اس خاتون سے فون پر کیا گفت وشنید فرماتا ہے وہ؟ کچھ اظہار عشق وغیرہ گویا۔"
میں نے کہا "جی نہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ شاہ عالم کہاں ہے اور کیا کررہا ہے؟"
آزاد صاحب ہنسے "یعنی یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ بھئی جس شخص کی جان چھٹ جائے دو بلاؤں سے گویا' سیاست کے جنجال اور شادی کے وبال سے تو وہ کیا کرے گا سوائے عیش کرنے کے۔"
"لیکن رخشی سے اس کے بارے میں پوچھنا تو غلط بات ہے۔"
"بالکل۔ سراسر نامعقولیت ہے۔ وہ کیا ہے بقول شاعر عندلیب بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا۔ طلاق ہوگئی تو پھر یہ پوچھنا چاہیے کہ اب خیر سے کیا ارادے ہیں؟ بلکہ پوچھنا کیسا میاں' رخشندہ جیسی بیوہ یا مطلقہ کے لیے تو فوراً نام تجویز کرنا چاہیے اپنا۔ جملہ حقوق کے ساتھ۔ امیدواروں کی فہرست میں۔"
میں نے کہا "رخشی نے اسے جھاڑ پلائی کہ خبردار' جو مجھ سے پھر شاہ عالم کے بارے میں پوچھا۔"
"بہت مناسب کیا۔ بھئی پوچھنا ہے تو تنہائی کے روز و شب کا احوال ہی پوچھو۔ مزاج حسن سوگوار پوچھو۔ کچھ علاج زخم دل کرو۔ مداوائے غم دوراں کی بات کرو گویا۔"
میں نے کہا "آپ کی دعا سے اسے کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہیں۔ وہ بہت خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔"
انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے گھورا "سوال یہ ہے عزیز من! کیا تم جانتے ہو کہ فی زمانہ اس خوش شکل' خوش گفتار و خوش بخت خاتون مسماۃ رخشندہ کا آستانۂ حسن کہاں ہے؟"
میں نے کہا "جی میں جانتا ہوں' شبنم بھی جانتی ہے۔"
انہوں نے ایک آہ بھری "یعنی بقول شاعر بچ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے۔ بس ہم ہی بے خبر ہیں گویا۔"
میں نے کہا "فی الحال وہ پبلسٹی سے بچنا چاہتی ہے۔ خاموشی سے زندگی گزار رہی ہے۔ اس اخبار والے نے نہ جانے کیسے اس کا فون نمبر معلوم کرلیا۔"
"بھئی یہ تو ہم بھی کرسکتے ہیں گویا۔ ہمیں بھی آتا ہے ڈائریکٹری میں نام دیکھ کے فون نمبر تلاش کرنا" انہوں نے بہت خوش ہوکے بتایا۔
میں نے کہا "لیکن جناب! وہ فون رخشی کے نام پر نہیں ہے۔ وہ گھر ہے فرید عباسی کا۔ وہ پہلے پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ میرا دوست ہے۔"
"اور اب ترقی پاکے انسپکٹر وغیرہ ہوگیا ہے یا ترقی معکوس کے بعد پھر حوالدار ہے گویا۔" انہوں نے ایک خبر کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔
میں نے کہا "اسے پولیس سے نکال دیا گیا ہے۔"
"اچھا! بھئی مبارک باد پیش کرنا ہماری طرف سے اپنے دوست کی خدمت میں' وہ کیا فرمایا ہے علامہ صاحب نے کہ اس رزق سے موت اچھی۔۔۔"
میں نے کہا "وہ وکالت کررہا ہے آج کل۔ گھر میں ایک ماں ہے۔"
"باپ کی طرح ماں تو گویا ایک ہی ہوتی ہے سب کی۔۔۔ تعداد ازدواج بتاؤ۔"
میں نے کہا "ایک بیوی تھی' طلاق لے کر الگ ہوگئی۔"
"بھئی' بہت خوب' یعنی ایک ہی طوفان حوادث سے اور گرداب بلا سے گزرا ہے دونوں کا سفینۂ حیات۔" آزاد صاحب فوراً بات کی تہ تک پہنچ گئے اور مسکرانے لگے۔
میں نے کہا "رخشندہ کو اب یہ فکر لاحق ہے کہ کہیں وہ نامعلوم اخباری نمائندہ اس کے گھر نہ پہنچ جائے۔ کہتا ہے کہ مجھے آپ کا انٹرویو لینا ہے۔"
"بہت اچھا بہانہ ہے۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے والی بات ہے گویا۔ اگر فون نمبر معلوم ہو تو گھر کا پتا معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔ ہم بھی میاں قسمت آزماتے تھے' چھپر خوباں سے چلی جائے اسد۔ ٹیلی فون کے نمبر ملاتے تھے دل لگی کے لیے اور کہیں لائن کے ساتھ دل بھی مل جاتا تھا گویا لیکن یہ قصہ ہے جب کہ کہ آتش جواں تھا" انہوں نے ایک ٹھنڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سانس لی۔

ان کی بات پر مجھے وہ فون نمبر یاد آیا جو شبنم کی کار کے پیچھے شیشے کی گرد پر کسی نے انگلی سے لکھا تھا۔ میں نے وہ نمبر ایک کاغذ کے کونے پر لکھا اور آزاد صاحب کے سامنے کردیا "یہ نمبر دیکھئے۔"

انہوں نے کہا "بھئی ہم نے کہا نا۔ جوانی گزر گئی تو خوبانِ شہر کے نام پتے فون نمبر سب یادِ ماضی ہوگئے گویا۔"

میں نے کہا "جناب۔ آپ کے پاس ہر وی آئی پی 'لیڈر' ممبر اسمبلی' شوبزنس' اسپورٹس اور زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ اہم افراد کے نام و پتے اور فون نمبر ہوں گے۔"

"ہاں۔ لکھتے تو رہتے ہیں ہم ایک قدیم نوٹ بک میں لیکن ترتیب کوئی نہیں ہے گویا؟" انہوں نے اپنی دراز میں سے ایک ڈائری برآمد کی "ملاحظہ کرو بقلم خود۔"

حیران صاحب ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ رکھے یوں نمودار ہوئے جیسے نیند میں چل رہے ہوں۔ مجھے دیکھ کے اس نے سرہلایا "عقل سخت حیران ہے۔"

آزاد صاحب نے کہا "ہزار بار کہا ہے کہ عقل کی بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔ بس اتنا کافی ہے گویا کہ میں حیران ہوں۔ ابھی کیا ہوا ہے ایسا واقعہ؟"

حیران نے مجھے دیکھا "آخر ایسا کیوں لگتا ہے مجھے کہ آپ کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

میں نے ڈائری کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا "شاید ہم پہلے جنم میں کہیں ملے ہوں گے۔"

حیران نے سرہلایا "ایسا ممکن ہے لیکن ایک جیوتشی کے علم کی رو سے میں پچھلے جنم میں گھوڑا تھا۔"

آزاد صاحب نے قہقہہ مارا "بھئی ضرور اس جیوتشی نے حساب میں غلطی کی ہوگی ورنہ یہ تو گویا طے ہے کہ ہر جنم میں تم گدھے تھے اور آئندہ بھی رہو گے۔"

حیران نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور مجھ سے مخاطب رہا "کیا آپ جانتے ہیں کہ پچھلے جنم میں آپ کیا تھے؟"

میں نے نظر ڈائری کے اوراق پر رکھی "کیوں نہیں۔ ایک بہت لائق فائق نجومی نے بتایا تھا کہ میں پچھلے جنم میں تانگا تھا۔"

آزاد صاحب نے "پھو" کرکے چائے کے گھونٹ کو ہنسی کے ساتھ منہ سے پھوار کی صورت میں خارج کیا "بھئی سبحان اللہ۔ یہ گھوڑا اور تم تانگا۔ لو میاں حیران! وجہ معلوم ہوگئی۔ تانگے کو گھوڑا ہی پہچان سکتا ہے گویا۔ چولی دامن کا ساتھ جو ٹھہرا۔"

حیران کچھ رنجیدہ ہوا "مذاق کرتے ہیں آپ لیکن۔"

"لیکن وغیرہ کچھ نہیں۔ ہمارا وقت مت ضائع کرو۔ جاؤ اپنے اصطبل میں گویا اور غور کرو کہ کیا یہ تمہارے اور ہمارے حق میں بہتر نہ ہوتا۔ اگر تم اس جنم میں بھی گھوڑے ہی رہتے" آزاد صاحب نے کہا۔

اس بوسیدہ اوراق والی خستہ حال ڈائری میں آدھے ادھورے نام کے ساتھ ٹیلی فون نمبر کسی ترتیب کے بغیر بھردیئے گئے تھے۔ ہندسے آڑے ترچھے الٹے سیدھے' دائیں بائیں اور اوپر نیچے۔ اردو انگریزی میں۔ بال پوائنٹ' قلم یا پنسل سے لکھے ہوئے تھے اور مجھے ان میں مطلوبہ نمبر تلاش کرنا اتنا ہی مشکل لگا جتنا کسی کباڑی کے چھت تک بھرے ہوئے گودام میں کسی کھوجانے والی ایک کیل کا سراغ لگانا۔ جھک مار کے میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔

آزاد صاحب نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا "بھئی صورت سے تم اتنے مایوس اور آمادہ بہ خودکشی نظر آرہے ہو گویا لیکن ایک بنیادی اہمیت کا سوال تو ہم نے پوچھا ہی نہیں کہ آخر یہ نمبر کیسے ایجاد کیا تم نے؟"

میں نے کہا "یہ شبنم کی گاڑی پر لکھا ہوا تھا بلکہ لکھا ہوا ہوگا ابھی تک۔"

انہوں نے مجھے غور سے دیکھا "میاں' وہ جو آگے پیچھے لکھا ہوتا ہے نا گاڑی کے۔ وہ رجسٹریشن نمبر کہلاتا ہے غالباً۔"

میں نے کہا "آپ شبنم کی ہینڈ رائٹنگ تو پہچانتے ہوں گے؟"

"حد کرتے ہو تم بھی گویا میاں' ہم اس کی رگ رگ کو پہچانتے ہیں۔"

میں نے کہا "پھر ذرا میرے ساتھ نیچے تک چلنے کی زحمت فرمایئے۔ شبنم اپنی گاڑی نیچے چھوڑ گئی ہے اور مجھے تشویش ہورہی ہے۔"

"تشویش کیسی۔ بھئی' ہم خود اکثر اپنی چیزیں بھول جاتے ہیں' کبھی چشمہ' کبھی رومال' کبھی ہوش وحواس۔"

میں نے کہا "سوال یہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئی ہے' کیسے گئی ہے؟ اگر وہ کسی اور کی گاڑی میں گئی ہے تو کہاں اور کس کے ساتھ؟"

"یہ تو برخوردار سوال نہ ہوا؟ سوالات ہوگئے گویا لیکن جیسا کہ تم فرما چکے ہو ابھی کہ کوئی نام کا رئیس ہے اس کے ساتھ۔"

میں نے کہا "لیکن رئیس کی گاڑی میرے پاس ہے۔ کیا وہ ٹیکسی ملے پھر رہا ہے۔ اس نے فون بھی نہیں کیا بہت دیر سے اور خود اس کے موبائل فون سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔"

آزاد صاحب متفکر ہوگئے "تمہارے سوالات نے تو ہماری پریشانی میں افراطِ زر کی شرح سے اضافہ کردیا ہے گویا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا' آپ آئیں میرے ساتھ۔ ایک منٹ کے لیے۔"

وہ بادلِ ناخواستہ اٹھے۔ میرے ساتھ نیچے جاکے انہوں نے وہ نمبر دیکھا جو شیشے کی گرد پر بہت واضح تھا۔ "شک کی تو کوئی بات ہی نہیں گویا۔"

میں نے کہا "یعنی یہ نمبر خود شبنم نے لکھا ہے؟"

"دریں چہ شک۔ بھئی غور فرماؤ اس سات کے ہندسے پر۔ ہم تو ایسے لکھتے ہیں بزبانِ انگریزی گویا۔ 7 اور آٹھ کا ہندسہ یوں بناتے ہیں 8۔"

میں نے کہا "ایسے ہی لکھتا ہوں میں بھی۔"

"لیکن شبنم سات کے ہندسے کو ایسے لکھتی ہے۔ 7 اور آٹھ کا ہندسہ ہم اوپر سے شروع کرتے ہیں۔ انگریزی حرف ایس کی طرح بناتے ہیں گویا مگر وہ الٹا ایس بناتی ہے۔ ملاحظہ کرو۔ 8 اوپر سے کھلا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "آپ تو ماہرِ تحریر ہیں۔"

وہ ہنسے "مزید ثبوت کے لیے غور فرماؤ نو کے ہندسے پر۔ تم کیسے لکھتے ہو؟"

میں نے کہا "جیسے عام طور پر سب لکھتے ہیں۔ 9۔"

"مگر شبنم تو گویا الٹ دیتی ہے چھ کے ہندسے کو 9 ایسے لکھتی ہے گویا۔"

میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور جیب سے رومال نکال کر گرد صاف کردی۔ ونڈ اسکرین پر لکھا ہوا نمبر صرف میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ وہ فون نمبر شبنم نے خود ہی لکھا تھا' مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اس نے یہ سراغ میرے لیے یا رئیس کے لیے چھوڑا ہوگا۔ اگر اسے پتا چل گیا تھا کہ رئیس اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے تو یہ نمبر رئیس کی رہنمائی کے لیے تھا ورنہ اسے میرا خیال ہوگا کہ یہاں آکے میں اس کی گاڑی دیکھوں تو مجھے یہ نمبر بھی نظر آجائے۔ اس نمبر کا تعلق یقیناً اس شخص سے ہوگا جس کے ساتھ وہ گئی تھی اور اپنی مرضی سے گئی تھی کیونکہ ایک اخبار کے دفتر سے یا سڑک سے کوئی اسے زبردستی اپنی گاڑی میں ڈال کے نہیں لے جاسکتا تھا۔ شبنم اتنی بزدل لڑکی نہیں تھی کہ مزاحمت نہ کرتی اور نہ اتنی بے وقوف کہ گردوپیش پر اس کی نظر نہ ہو اور اسے کوئی بھی اغوا کرکے لے جائے۔

رئیس کے نہ ملنے سے یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ وہ شبنم کے پیچھے لگا ہوا ہوگا۔ اس نے مجھے فون پر مطلع کیا تھا کہ وہ ٹیکسی رد کے کھڑا ہے کیونکہ آزاد صاحب کے گھر کے باہر کچھ مشتبہ افراد موجود ہیں اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے شناسا لگا تھا۔ اس شخص نے اخبار کے دفتر تک شبنم کا اور رئیس نے اس شخص کا تعاقب کیا تھا لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ رئیس کا موبائل فون خاموش تھا اور اس سے رابطے کی ہر کوشش کا جواب وہی جذبات سے عاری مسلسل سنائی دینے والی ٹیپ کی آواز تھی جو بتاتی رہتی تھی کہ فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔

امکانات کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ٹیکسی والا موقع پاکے بھاگ گیا ہو۔ ویسے اس کی گلوخلاصی مشکل تھی۔ رئیس خان پہلے شرافت سے کام نکالنے کے قائل تھے۔ وہ ٹیکسی والے کو پانچ سو کے بجائے ہزار بھی پیش کرسکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود کسی کا پیچھا کرنے کو ایک غیر قانونی اور خطرناک کام سمجھنے والا ہر ٹیکسی ڈرائیور ہزار روپے پر بھی لعنت بھیج سکتا تھا کہ کہیں وہ لالچ میں مارا نہ جائے یا کسی لمبے چکر میں نہ پڑجائے۔ زر سے نہ ماننے والے کو رئیس خان زور سے منواسکتے تھے۔ ابے تیرا تو باپ بھی جائے گا سالے۔ جہاں ہم کہیں چلتا جا خاموشی سے ورنہ یہ ریوالور دیکھا ہے' قسم اللہ کی ایک سوراخ اور ہوجائے گا کہیں۔

لیکن امکان یہ بھی تھا کہ بے خبری میں کسی نے رئیس کو بھی ایسے غائب کردیا ہو جیسے لائٹ آف کرتے ہی سایہ غائب ہوجاتا ہے۔ سائے کی طرح پیچھے کرنے والے رئیس خان کہیں بے سدھ پڑے ہوں یا ہوش میں آکے وہی فلمی سوال کررہے ہوں کہ میں کہاں ہوں؟ یا ان کی یادداشت ناخلف اولاد کی طرح ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ ممکن ہے وہ اور شبنم ایک ہی جگہ زیرِ تفتیش ہوں۔

تاہم میں نے مثبت سوچ کو ترجیح دی اور یہ فرض کیا کہ شبنم بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا سراغ چھوڑ کے کسی کے ساتھ گئی ہے اور میری ہدایات کے مطابق رئیس اس کی نگرانی کررہا ہے۔ رہی رابطہ نہ ہونے کی بات تو اس کی بہت عام اور معمولی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ موبائل فون کی بیٹری کمزور پڑ گئی ہو یا ڈیڈ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس خیال نے مجھے بڑا سکون بخشا۔ واقعی' ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ آدمی جب اپنی گاڑی میں ہو تو موبائل فون کے چارجر کو گاڑی میں لگائے رکھتا ہے اور بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے مگر رئیس ٹیکسی میں تھا۔ شاید ٹیکسی میں لائٹر کا پوائنٹ ہی نہ ہو۔

ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھ کے آزاد صاحب پھر خبریں بنانے میں اور سجانے میں مصروف ہوگئے تھے مگر وہ بار بار نظر اٹھا کے میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ وقت کے ساتھ کام کا رش اور دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ صرف شبنم کے مسئلے پر قیاس آرائی کے لاحاصل عمل میں میرا ساتھ دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان سے زیادہ میں فکرمند ہوں اور ان کے لیے اخبار کا وقت پر شائع ہونا اتنا اہم نہیں ہو سکتا جتنا میرے لیے شبنم کا پتا لگانا۔

مجھے اخبار کے دفتر میں آئے ایک گھنٹا ہونے والا تھا اور اب میرے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ کے شبنم کے فون کا یا اس کی واپسی کا انتظار کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا' شبنم نے اپنی گاڑی کے پچھلے والے شیشے پر جو نیلی فون نمبر لکھا تھا' وہ مجھے غور کرنے پر غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ معلوم نہیں اس نے یہ کب اور کہاں لکھا تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی راہ چلتے کوئی مل جاتا ہے اور فوری طور پر کاغذ پنسل ہاتھ میں نہ ہو تو آدمی فون نمبر ذہن نشین کر لیتا ہے اور بھول جانے کا ڈر ہو تو کہیں بھی لکھ لیتا ہے۔ دیوار پر پنسل سے فون نمبر نوٹ کرنا ایک عام سی عادت ہے۔ کیا پتا وہی شبنم نے کیا ہو۔ اس نے کہیں کوئی نمبر دیکھا یا سنا اور ڈائری' بھی گاڑی میں یا نمبر اتنا اہم نہیں تھا کہ فوراً لکھنا ضروری ہو۔ چنانچہ جسے میں سراغ سمجھ رہا ہوں وہ کسی گیراج کا نمبر ہو یا آفس کا۔ اگر وہ چاہتی تو آزاد صاحب کو بھی بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہے۔ فون نمبر آفس میں چھوڑ کے جا سکتی تھی یا مجھے بتا کے لیکن خدانخواستہ کوئی اسے اچانک اس کی مرضی کے خلاف اپنی گاڑی میں لے گیا ہو گا تو پھر اسے اتنی مہلت ملنے کا کیا سوال کہ وہ سراغ چھوڑ سکے۔ اغوا کرنے والوں سے کہیں کہ ایک منٹ' ذرا میں گاڑی کے پچھلے شیشے پر ایک فون نمبر لکھ دوں اور وہ مان جائیں' یہ ناممکن تھا۔

"دیکھو برخوردار!" آزاد صاحب نے فون میرے سامنے رکھ دیا "اس انتظار کی کیفیت میں تم بالکل وہ لگ رہے ہو گویا" اپنے مہاتما بدھ۔ جن کو انتظار ہو گیان کی کسی روشنی کا۔ مگر انتظار تا بہ کے۔"

میں نے کہا "میں سوچ رہا تھا کہ کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے۔"

آزاد صاحب خبریں دیکھتے رہے۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر برخوردار' لائحہ عمل کے لیے بھی عمل تو ضروری ہے گویا کیونکہ علامہ صاحب فرما گئے ہیں۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ تو کچھ کرو تم بھی۔"

میں نے ریسیور اٹھا کر انکوائری کا نمبر ملایا اور کچھ دیر ٹیلی فون کے محکمے والوں کی روایتی مستعدی کا مظاہرہ جاری رہا یعنی گھنٹی بجتی رہی یا لائن منقطع ہوتی رہی مگر میں اس کا عادی تھا چنانچہ "نرائی' نرائی اگین" کے اصول پر صبر کے ساتھ عمل کرتا رہا۔ بالآخر خدا نے میری سن لی اور ایک آپریٹر نے میرے سوال کے جواب میں مجھے بتا دیا کہ فون ہاشم رضا کے نام پر ہے اور پتا شاہدرہ کے علاقے کا ہے۔

علاقے کا اندازہ فون نمبر کے پہلے دو اعداد سے بھی ہوتا تھا۔ میں نے پورا پتا لکھ کے آزاد صاحب کے سامنے رکھا۔ "یہ ہاشم رضا کون ہے؟"

انہوں نے عینک اتار کے رکھی "بھئی' ہم تو ایک ہی کو جانتے ہیں اور وہ کراچی میں ہیں فی زمانہ۔ کمشنر تھے غالباً کراچی کے جب قائداعظم کا انتقال ہوا۔"

میں نے کہا "یہ پتا شاہدرہ کا ہے۔"

"وہ ہم نے ملاحظہ کیا۔ اب ایسے تو ایک سو ایک ہاشم رضا ہوں گے گویا جن سے ہم نہیں ملے' اور نہ ملیں گے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ مجھے جانا ہی چاہیے اس پتے پر۔ آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ خدانخواستہ ایک گھنٹے تک آپ کے پاس کوئی اطلاع نہ آئے۔ شبنم کی یا میری۔۔۔۔"

"تو ہم تشویش میں مبتلا ہو سکتے ہیں گویا۔ ٹھیک ہے۔ ہم ہو جائیں گے لیکن تم بھی مرحوم و مغفور ہونے کے لیے خود کو کوشش مت فرمانا۔ کہیں منہ اٹھا کے بیل کی طرح گھس جاؤ کسی اس ہاشم رضا کے گھر میں اور کہو کہ آبیل مجھے مار۔ ہمارے لیے یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جائے گا گویا۔ لیلیٰ کے بعد ناقۂ لیلیٰ بھی گم ہو جائے صحرا میں تو مجنوں کدھر جائے۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب اور تو کسی نے غور نہیں کیا' میری صورت شباہت پر لیکن حیران صاحب کچھ زیادہ ہی حیران تھے۔"

"اسے تو ہم ابھی مزید حیران کرتے ہیں گویا ایک داستان حیرت سنا کے۔ ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ ایک رشتے سے تم ہمارے ماموں ہوتے ہو اور دوسرے رشتے سے ہم ماموں

ثابت ہوتے ہیں گویا اور یہ کہ بچپن میں ہم نکلوتیے یار رہے گویا۔ ایک دوسرے کی نکٹوئی پہن لیتے تھے۔ جیسے دوپٹہ بدل کے عورتیں بہنیں بن جاتی ہیں گویا۔"

میں نے کہا "حضرت' جب آپ کا بچپن تھا تو میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

وہ خبریں دیکھتے دیکھتے چونکے "بھئی خوب یاد دلایا گویا۔ خیر' ہم کچھ کہہ دیں گے اسے۔ حیران کی چونچ بند رہے گی۔ تم فکر مت کرو۔"

اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کے میں نے احتیاط سے گردوپیش کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی مخلص صورت آشنا نظر آئے یا کوئی اجنبی میری طرف متوجہ ہو مگر دنیا میں کسے فرصت تھی کہ قصۂ ماضی ہو جانے والے شاہ عالم کی صورت کو یاد رکھتا۔ کوئی میری طرف دیکھ کے نہ چونکا نہ رکا۔ سب اپنی زندگی کے معاملات اور مسائل کے بارے میں سوچ رہے تھے اور اپنی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ سوائے ان لوگوں کے جو شاہ عالم کے قریب تھے یا براہِ راست اس کے ساتھ دوستی یا دشمنی کا رشتہ اس کے مرنے کے بعد بھی نبھا رہے تھے اور کسی کو شاہ عالم کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاہ عالم اس جہاں میں ہو یا دوسرے جہاں میں۔ سیاست میں رہے یا نائب ہو کے نمک منڈی کا آڑھتی بن جائے۔ لاہور میں دستیاب ہو یا لندن میں پایا جائے۔ عام آدمی کو کیا۔

داڑھی بڑھ جانے سے میرا چہرہ بہت بدل گیا تھا۔ اگر مزید ایک مہینے میں نے فصل نہ کاٹی تو راہ چلتے لوگ' ٹیکسی ڈرائیور اور دکان والے جو اب مجھے جنابِ عالی' بادشاہو یا سرجی کہہ کے مخاطب کرتے ہیں مجھے صوفی صیب یا مولانا صاحب کہنے لگیں گے۔ گاڑی چلاتے ہوئے میں نے بیک ویو مرر میں اپنی صورت ملاحظہ کی اور تصور میں اس پر ایک جھاڑ جھنکاڑ بالشت بھر سے لمبی داڑھی دیکھی تو مجھے ہنسی آئی۔ غالباً ایک نفاست سے تراشی ہوئی فرنچ کٹ داڑھی مجھے سوٹ کرے گی۔ شبنم یقیناً صحیح مشورہ دے سکتی ہے۔ اس کے تنکی پر ستار مانکیل نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ نیچر کو اپنا کام کرنے دو۔ داڑھی مونچھ کے ساتھ چہرہ کسی اور کا لگے گا۔ باقی کی ہیئر اسٹائل بدل کے پوری کرو۔ مصنوعی طریقے سے میک اپ کر کے اور حلیہ بدل کے کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ عارضی ضرورت کے لیے آدمی کچھ بھی کر لے۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے مگر راوی کے پل پر ٹریفک کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دن کے مقابلے میں رات کے وقت ایک گاڑی کی دو ہیڈلائٹس نظر آتی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ مل گیا تھا تو گویا سارا جہان مل گیا تھا۔ اس کی خوشی شاہ عالم کی خوشی تھی۔ چنانچہ شبنم وہی تھی اور ویسی ہی تھی کیونکہ دل کی گہرائی سے وہ یقین رکھتی تھی کہ سب کچھ بدل گیا ہے مگر میں ہوں تو وہی شاہ عالم۔ درمیان میں جب اس یقین کی بنیادیں ہل گئی تھیں تو وہ پاگل ہوگئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ پاگل وہ پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے لیکن صرف شاہ عالم کے لیے۔

چنانچہ میں نے یعنی ناصر عظیم نے۔ یعنی شاہ عالم نے اگر شبنم پر اتنا انحصار کرنے کی مجبوری کو اپنا لیا تھا تو اس لیے کہ میں اپنے سب سہاروں سے محروم کردیا گیا تھا اور وہ سہارے بھی کمزور پڑ گئے تھے جو مجھے سنبھال سکتے تھے۔ ایک مفکر HOBBS کا قول ہے کہ اکیلا یا تو خدا رہ سکتا ہے یا پھر شیطان۔ میں ایک انسان تھا۔ اپنی خطاکار فطرت اور کمزوری کے باعث خود اپنے پیدا کیے ہوئے حالات کی ستم ظریفی کا شکار۔ مجھے بہرحال سہاروں کی ضرورت تھی اور ایسے وقت میں جب چندا نے بدگمانی، رنجش اور بہت سی ذاتی وجوہ کی بنا پر مجھ سے بے رخی و بے اعتنائی کا انداز اختیار کرلیا تھا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ۔۔۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ فکر کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں اور ساری توجہ کا محور و مرکز اپنے شوہر کی ذات ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کمال کے لیے اپنے اسپتال کے سوا سب کچھ غیر اہم ہوگیا تھا اور خان اعظم دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا سے بے تعلق ہوگئے تھے۔ میں شبنم کے ساتھ ذہنی رفاقت کو جذباتی قربت میں بدلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

رات کے وقت شاہدرہ کے پرانے شہر کی گلیوں میں خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ موسم سرما رخصت ہو رہا تھا مگر لوگ ابھی گھروں کے دروازے بند کیے سو رہے تھے۔ کہیں کہیں ٹی وی کے ڈرامے یا فلم کے ڈائیلاگ اور ڈیک پر سنی جانے والی موسیقی سے بستی میں زندگی کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے بہت سے لوگوں سے پتا معلوم کیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی پوچھا کہ مجھے کس سے ملنا ہے لیکن واضح طور پر کسی نے میری رہنمائی نہیں کی۔ ایک نے کہا مشرق تو دوسرے نے تردید کرکے مغرب کی سمت بتائی اور جب وہ آپس میں الجھ گئے تو میں چل پڑا۔

کچھ دیر بھٹکنے کے بعد مجھے اتنا اندازہ ہوگیا کہ میرا مطلوبہ پتا جی ٹی روڈ کے متوازی نئی آبادی میں ملے گا۔ پرانے شہر کے باسی پرانے لوگوں کو بھی جانتے تھے اور ان گھروں کے پرانے مکینوں کو بھی۔ جدی پشتی حویلیاں تو اب لاہور کے پرانے شہر میں بھی گنتی کی رہ گئی تھیں۔ ہر جگہ نئی نسل، نئے ٹھکانے تلاش کر رہی تھی اور اندرون لاہوری بھاٹی دروازے سے نکلنے والے گلبرگ سے امریکا تک ہجرت کرگئے تھے۔ یہی حال پرانے شاہدرہ کا تھا جو کہنے کو پرانا تھا مگر لاہور کے مقابلے میں نئی بستی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہاں بھی اگلی صدی کے لوگ تھے جو پچھلی صدی کے گھروں کی سکونت ترک کرنے کی ضرورت کو حالات کا تقاضا سمجھنے لگے تھے لیکن پھر بھی پرانے وقت کے آثار ایک پوری نسل کی صورت میں موجود تھے۔

حلوائی کی ایک دکان پر بڑے بڑے پیالوں میں ملائی پیڑے والا دودھ پینے کے شوقین جان بنانے والے کچھ لوگ سیاسی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور ایسے چلا چلا کے فریق ثانی پر اپنا مؤقف واضح کررہے تھے کہ لگتا تھا دنگل شروع ہونے ہی والا ہے۔ یہ نواز شریف اور بے نظیر کے جذباتی اور نادانی کی حد تک سادہ لوح حامی تھے جو خوش فہمی پر قائم امیدوں کے سراب کا تعاقب کرنے میں اتنی ہی خوشی محسوس کرتے تھے جتنے ان سے پہلے کے لوگ۔ ان کے لیے یہ ایک کھیل تھا جس میں ان کو ایک فریق کی حیثیت حاصل رہتی تھی اور ان کا سارا جوش و خروش ہار جیت کے فیصلے سے وابستہ رہتا تھا ورنہ وہ چاہتے تو سوچ سکتے تھے کہ اس ہار جیت سے انہیں پہلے کیا ملا جو اب ملے گا۔

میں نے گاڑی روک کے پتا پوچھا تو حلوائی نے وسیع کڑھاویں کنگیر گھمانے کا عمل موقوف کیا اور حاضرین جلسہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نمایاں ہوتی توند والے ایک شخص نے ڈکارلی "ہاشم رضا۔ وہ اپنے گوردا سپور والے یا اوکاڑے والے۔"

میں نے کہا "مجھے تو صرف نام معلوم ہے۔"

اس کے سیاسی مخالف نے کہا "اوئے دفع کرنام کو۔ پتا معلوم ہے تو بتا۔"

"اوئے پاگلا۔ بندہ مکان کو جانتا ہے کہ رہنے والے کو؟ اب ادھر آکے تیرا نام پوچھے کوئی تو سب کہیں گے وہ مرغی چور؟ اور گھر لے جائیں گے تیرے۔"

"بکواس نہ کر۔ تو خود شیطان کی طرح مشہور ہے ٹھرکی" دوسرے شخص نے فوراً اینٹ کا جواب پتھر سے دیا "سارا دن حکیم بونگے کے پاس۔۔۔"

میں نے کہا "یار، آپس میں لڑلینا بعد میں۔"

تیسرا شخص جو اپنے پیالے کے کنارے پر لگی ملائی کو مونچھوں پر مل رہا تھا۔ پیالہ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا "لوجی ہم چلے۔ باؤ کو ہم پہنچاتے ہیں سیدھا اس جگہ۔ جیسے گولہ گرتا ہے نشانے پر۔"

وہ دروازہ کھول کے میری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باقی تین

بھی بحث کے غبارے کی ہوا نکل جانے سے بدمزہ ہوگئے تھے اور محفل جو شاید کچھ دیر اور جمی رہتی، میری دخل اندازی سے ختم ہوگئی۔ حلوائی نے نعرہ لگا کے میرے ساتھ بیٹھنے والے کو یاد دلایا "تو آج بھی وہ بغیر پیسے دیئے جارہا ہے پہلوان، کچھ یاد ہے حساب؟"

"اوئے حساب رکھ اپنے پاس۔ ہم کوئی دنیا سے تو نہیں جارہے ہیں اور جائیں گے تو والی وارث ہیں اپنے" اس نے برا مانے بغیر کہا "چلو باؤ جی۔"

پانچ سات منٹ کے سفر میں میرے گائڈ کے فرائض سرانجام دینے والے پہلوان نے مجھے "رستم شاہدرہ" کا خطاب حاصل کرنے سے اپنے والد ماجد کے منصب شہادت پر فائز ہونے تک کے قابل فخر حوالے دیئے اور یہ بتایا کہ اس دور میں جب پہلوانی کا فن روبہ زوال ہے وہ کس طرح اپنی خاندانی عظمت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہے۔

"لوجی، اس بار بھی مقابلے پر کوئی نہ آیا تو میں نے اعلان کردینا ہے اپنے رستم شاہدرہ ہونے کا۔"

میں نے کہا "لیکن ایسا پہلے بھی ہوچکا ہے۔ تم نے چیلنج کیا اور لڑنے کوئی نہیں آیا؟"

"آہو جی۔ بعد میں کہنے سے کیا ہوتا ہے کہ ہم نے دنگل والا اعلان نہیں سنا تھا۔"

"کیا تمہارے والد بھی ایسے ہی بنے تھے رستم شاہدرہ؟"

اس نے برا مانے بغیر کہا "او نئیں جی۔ ان کے تو بڑے معرکے ہوئے تھے۔ خود اپنا جھارا پہلوان ریفری تھا اور اس نے خود گرز زیبا رستم شاہدرہ کا اباجی کو۔"

میں نے کہا "لیکن وہ شہید کیسے ہوئے۔ کیا اکھاڑے کے بجائے کسی محاذ پر لڑنے چلے گئے تھے۔ سن اکہتر کی جنگ میں؟"

اس نے ایک آہ بھری "بڑی دردناک اشٹوری ہے جی۔ آپ جانتے ہو، ہتھوڑا پہلوان کو۔ انگریزی میں کیا بولتے ہیں ہتھوڑے کو۔"

"HAMMER" میں نے کہا "وہ کوئی غیر ملکی پہلوان تھا؟"

"آہو جی۔ باہر سے آیا تھا اور اس نے چیلنج کردیا اباجی کو۔ اس کافر نے دیسی کشتی میں ولایتی کشتی کا داؤ لگایا۔ یہ صاف فاؤل تھا مگر ریفری کے سیٹی بجانے سے پہلے ہی اس ہتھوڑے نے اباجی کی شیر جیسی گردن پکڑلی۔ اباجی نے نعرہ لگایا۔۔۔ یا علی۔۔۔ اور بس۔" اس نے پھر آہ بھری۔

"بس کیا۔۔۔ ہیمر کو لہرالیا؟"

"نہیں، باؤ جی! وہ آپ لیٹ گئے۔ ان کی گردن ٹٹ گئی تڑک کرکے۔ ہتھوڑا نس گیا ادھر سے ورنہ اباجی کے پٹھے۔"

میں نے کہا "شہید کا لقب کس نے دیا انہیں؟"

وہ سادگی سے بولا "اپنے مولبی صاحب نے۔ وہ کافر تھا اور اباجی کا اس سے مقابلہ، جہاد تھا۔"

میں نے کہا "یہ جہاد کیسے ہوگیا؟"

"لوجی۔ آپ تو پڑھے لکھے لگتے ہو شکل سے۔ اباجی نے کس کی عزت بچانے کے لیے جام شہادت نوش کیا؟ مسلمانوں کی، پاکستان کی۔ ادھر گڈی روک لو۔ یہ ہے آپ کے بندے کا گھر۔ سلاوان لیکم۔" وہ گاڑی کے رکتے ہی اتر کے واپس ہوگیا۔ مجھے اس کا شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہ ملا۔

غالباً رستم شاہدرہ کی شہادت کے مسئلے پر اپنے شک کا اظہار کرکے میں نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ جہاں مسئلہ جذبات کا ہو وہاں منطق یا دلیل کا کیا کام۔

اس نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا تھا وہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ شاید ایک کنال پر تعمیر کردہ کوٹھی تھی جس پر کام تکمیل کے مراحل میں ہی رک گیا تھا۔ اخراجات میں اندازوں کی غلطی کے باعث ایسا اکثر ہوجاتا ہے اور مزید وسائل دستیاب نہ ہوں تو مکین نامکمل گھر میں بھی رہائش اختیار کرلیتے ہیں اور پھر باقی رہ جانے والے سب کام آہستہ آہستہ وہیں رہتے ہوئے کراتے جاتے ہیں مگر اس مکان میں کسی کے رہائش پذیر ہونے کے آثار یکسر مفقود تھے۔ اس کے احاطے کی آٹھ فٹ اونچی دیوار میں نصب گیٹ بند تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے گیٹ کے لوہے پر غالب آجانے والا زنگ کا رنگ صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ تالا بھی جو بالکل نیا تھا۔

شاید ایک نئے تالے کی موجودگی نے ہی مجھے گاڑی سے اترنے پر مجبور کردیا۔ اگر وہاں ایک مڑنگ خوردہ پرانا قفل ہوتا تو کوئی بات انوکھی نہ لگتی۔ میں نے گیٹ تک جاکے اندر جھانکا۔ گھر کے کھڑکی دروازے سب بند تھے۔ باہر کی دیواروں پر نہ پلستر تھا اور نہ رنگ مگر کھڑکیوں میں شیشے تھے اور چابی والی گرل بھی۔ گیٹ سے عمارت تک شاید پندرہ گز کا فاصلہ ہوگا۔ سیدھے ہاتھ پر پانچ گز چوڑی گلی بھی سنسان پڑی تھی۔ یہ گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ تھی اور مکان کی دو کھڑکیوں کے درمیان نظر آنے والے دروازے کا رخ بھی اسی سمت میں تھا۔ سامنے کے حصے اور گیلری میں نہ گھاس تھی نہ گملوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں پودے اور نہ درخت۔ گیلری کا فرش ضرور پکا تھا لیکن سامنے کا حصہ کچا چھوڑ دیا گیا تھا۔

کار کی ہیڈ لائٹس کی جتنی روشنی گیلری میں پہنچ رہی تھی اس میں مجھے فرش پر تیل کے داغ نظر آئے جن پر سے ٹائر گزرے تھے تو داغ لمبائی کے رخ پھیل گئے تھے۔ یہ مکان کے زیر استعمال ہونے کی واحد علامت تھی ورنہ اندر نہ کہیں روشنی تھی اور نہ کوئی آواز۔

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ مجھے اتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ یہاں لانے والا غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس علاقے کا پرانا باسی تھا۔ رستم شاہدرہ کے فرزند کا بچپن اور جوانی شاہدرے کی گلیوں میں گزرے ہوں گے۔ جہاں اب یہ ویران گھر تھا وہاں پہلے میدان یا کھیت ہوں گے جہاں وہ گڈیاں اڑاتا ہوگا اور گلی ڈنڈا یا فٹ بال کھیلتا ہوگا۔ اب یہ سارا علاقہ نئی طرز کے مکانات سے آباد تھا اور یہ بڑے شہر کی طرح مضافات کی نئی کالونی بن گیا تھا جہاں نسبتاً خوش حال اور ماڈرن لوگ رہتے ہیں۔

میں نے گاڑی کا انجن بند کر کے لائٹس بھی آف کر دیں۔ آگے پیچھے کے بہت سے گھروں کے سامنے کھڑی گاڑیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کا شمار بھی متوسط طبقے میں ہی کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک کنال کے پلاٹ سستے خرید لیے تھے مگر ان کے پاس مکان کی تعمیر میں کوٹھی کی شان پیدا کرنے کے وسائل نہیں تھے۔ ڈیزائن اور بیرونی آرائش میں جدت اور انفرادیت کا خیرہ کن انداز جو گلبرگ، ڈیفنس یا کیولری گراؤنڈ جیسے پوش علاقوں میں نظر آتا ہے یہاں ناپید تھا۔ لوگوں نے پرانے کی جگہ نئے نقشے کے مطابق زیادہ بڑے گھر بنوا لیے تھے اور بس۔

گیٹ پر نام کی کوئی تختی نہیں تھی اور نہ کوئی نمبر لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والے دونوں پلاٹ خالی تھے لیکن ایک کو آگے پیچھے دیوار اٹھا کے اور گیٹ لگا کے محفوظ کر لیا گیا تھا اور دوسرے کی بنیادیں بھر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ خالی احاطے کے گیٹ پر مجھے سفیدی سے لکھا ہوا نمبر مل گیا۔ اس کے آگے والے مکان میں روشنی تھی اور اس کے سامنے ایک ویگن بھی کھڑی تھی۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو مجھے نیم پلیٹ پر نمبر بھی نظر آ گیا جس سے ہاشم رضا کے گھر کے نمبر کی تصدیق ہو گئی۔

دس منٹ میں میرے پاس سے صرف ایک گاڑی گزری تھی اور دو نوجوان سگریٹ پیتے گزرے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں مجھ پر شک کا خیال ہی نہیں آ سکتا تھا اور نہ میرے اطوار مشکوک تھے۔ میں لوٹ کے ہاشم رضا کے دروازے پر کھڑی کار تک پہنچا تو مجھے شدت سے اپنے ایڈیٹ نمبرون ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ایک لاحاصل جستجو میں مزید ایک گھنٹا ضائع کر دیا تھا۔ ابھی تک نہ شبنم کا کوئی پتا تھا نہ رئیس خان کا جو اس کی حفاظت پر مامور کیے گئے تھے مگر شاید خود اپنی حفاظت نہ کر سکے تھے۔ میرا یہ شک، اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ وہ دونوں جہاں بھی ہیں خیریت سے بہرحال نہیں ہیں۔ ان کے پاس رابطے کا موثر ذریعہ موبائل فون تھا۔ غالباً وہ اس سے بھی محروم ہو گئے تھے یا کر دیئے گئے تھے۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ میں آزاد صاحب سے کیا کہہ کر آیا تھا۔ اگر ایک گھنٹے تک انہیں میرا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو جائیں گے اور پھر کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں نے گاڑی میں سے اپنا موبائل فون نکالا تو یہ دیکھ کے پریشان ہو گیا کہ اس کی بیٹری تقریباً ختم ہو رہی ہے۔ میں نے جھنجلا کے خود کو ہی کوسا۔ صبح سے اب تک میں نے اسے چارج نہیں کیا تھا۔ اگر گھر سے روانہ ہوتے وقت بھی میں اسے چارجنگ پر لگا دیتا تو یہ مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ اب قصور میرا ہو گیا تھا۔ شبنم یا رئیس نے موقع ملنے پر مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی ہوگی تو انہیں وہی جواب ملا ہوگا جو پہلے مجھے مل رہا تھا۔

میں سب سے میلوں دور ایک ویران اور اجنبی جگہ پر بالکل بے تعلق کھڑا تھا اور صرف آزاد صاحب جانتے تھے کہ میں کہاں ہوں مگر وہ اس وقت اخبار کی کاپی جوڑنے میں ایسے مصروف ہوں گے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں گے۔ نہ انہیں میرا خیال آئے گا اور نہ کسی کو ان سے میرا پتا پوچھنے کا خیال۔

ہاشم رضا کے سامنے والا گھر نسبتاً بہتر بنا ہوا تھا۔ اس کے باہر سڑک تک تھوڑی سی اضافی زمین گھیر کے لان بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ غالباً آوارہ کتے بلیوں نے اس کوشش کو ناکام کر دیا تھا۔ گیٹ کو سنبھالنے والے پلرز پر سیاہ چکنے ٹائل تھے اور گیٹ لائٹس بھی روشن تھیں۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو وہ کسی ڈاکٹر عظمت جنجوعہ کا گھر تھا۔ عام طور پر لوگ رات گئے کسی اجنبی کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے ڈرتے ہیں اور گھر کا فون استعمال کرنے کی اجازت تو بالکل نہیں دیتے۔

گھنٹی بجانے پر کسی عورت نے انٹرکام پر میرا نام پوچھا۔ ظاہر ہے وہاں مجھے نام سے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک

منٹ کی خاموشی میں مجھے انٹرکام کے اسپیکر پر مختلف آوازیں سنائی دیں۔

"کوئی ناصر عظیم ہے۔"

کسی مرد نے قریب ہی سے کہا "مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"میں نے کہا، آپ کا کوئی جاننے والا نہ ہو۔"

مرد نے اسی اکھڑ لہجے میں کہا "اتنی رات کو گھر آنے والا کوئی ناصر عظیم میرا واقف نہیں۔"

عورت کی آواز پھر آئی "کیا کام ہے جی؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر جنجوعہ سے ملنا ہے مجھے۔"

عورت نے یہ بات مرد کو بتائی، وہ لائن پر آ گیا "کیا بات ہے؟ میں گھر پر کسی کو نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ ایک فون کرنا ہے۔"

"فون۔۔۔؟ ہم نے کیا باہر لی سی او کا بورڈ لگا رکھا ہے؟"

میں نے انگریزی میں کہا "آئی ایم سوری لیکن میرا موبائل فون جواب دے گیا ہے اور میری گاڑی خراب ہو گئی ہے یہاں میں کسی کو نہیں جانتا۔"

میں یہ چھوٹا سا بے ضرر جھوٹ نہ بولتا تو ڈاکٹر انٹرکام کا ریسیور رکھ دیتا اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔ شاید مجھے دوسرے اور پھر تیسرے دروازے پر جا کے پھر اپنی ضرورت بیان کرنی پڑتی۔

خلاف توقع اکھڑ لہجے والے ڈاکٹر نے کہا "اچھا ٹھہرو، ایک منٹ۔ میں آتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اوپر کے ٹیرس کی لائٹ آن ہو گئی۔

ایک منٹ بعد وہ نائٹ گاؤن کے بند باندھتا ٹیرس پر نمودار ہوا اور اس نے میرا جائزہ لینے کے بعد کار کو دیکھا پھر کسی سے کہا کہ وہ گیٹ کھولے۔ گیٹ لاک کا تعلق انٹرکام سے تھا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ بڑے گیٹ میں ایک چھوٹا سا دروازہ کھل گیا۔ میں منتظر رہا کہ کوئی باہر آئے مگر ڈاکٹر نے اوپر سے ہی کہا کہ "آجاؤ اندر۔ فون باہر رکھا ہے۔"

فون برآمدے میں دیوار پر نصب تھا۔ وہیں جاؤ کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ یہ اچھا انتظام تھا۔ ان سب سے یہیں بات کی جا سکتی تھی جن کو اندر لے جا کے ڈرائنگ روم میں بٹھانا ضروری نہ ہو۔ فرصت سے بیٹھنے اور اخبار پڑھنے کے لیے بھی یہ جگہ اچھی تھی کیونکہ سامنے مختصر مگر خوبصورت باغ تھا اور ضرورت پڑنے پر یہیں فون بھی ریسیو کیا جا سکتا تھا۔

گھر کے دروازے بدستور بند اور شاید مقفل تھے۔ مجھے فون کرنے کی اجازت دے کے انہوں نے کوئی رسک نہیں لیا تھا۔ شاید ڈاکٹر اس وقت بھی مسلح تھا جب اس نے مجھے اوپر والے ٹیرس سے دیکھا تھا۔ نہ وہ خود نیچے آیا اور نہ اس نے مجھ سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔ یہ بداخلاقی نہیں، حالات کا تقاضا تھا۔ ایسے تمام علاقے ڈاکوؤں کی زد میں تھے جہاں خوشحال لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے ہوں۔ مال ملنے کی امید ہو مگر دیکھے جانے یا پکڑے جانے کے امکانات کم سے کم ہوں اور ڈاکو گھر میں گھسنے کے لیے ایسے ہی عذر کے ساتھ آتے تھے۔ ایک ڈاکٹر اخلاقی طور پر چوبیس گھنٹے اپنے دروازے پر آنے والے ہر ایمرجنسی کیس کو دیکھنے کا پابند ضرور ہوتا ہے مگر ڈاکٹرز کے بھی اپنے مسائل اور اپنی مجبوریاں ہیں۔ ان کی نجی زندگی بھی ہوتی ہے جس میں وہ کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتے۔ وہ خادم انسانیت بن جائیں تو ایسے لوگ ان کا جینا حرام کر دیں جو آدھی رات کو انہیں جگا کے نزلہ زکام کی دوا طلب کریں گے۔ کچھ ڈاکٹرز ایسے ضرور ہوں گے جو اپنے مقدس پیشے کے سارے تقاضے ہر حال میں پورے کرتے ہوں گے مگر اب بیشتر ایسے تھے جن کے پاس پیسہ بہت تھا لیکن جذبات نہیں تھے۔

میں نے اطمینان سے آزاد صاحب کا فون نمبر ڈائل کیا۔ وہ کاپی میں الجھے ہوئے تھے۔ جیسے جیسے رات گزرتی تھی خبروں کی ترسیل کی رفتار بڑھتی جاتی تھی اور ان پر اخبار کی شکل دینے کے اعصاب شکن کام کا دباؤ بھی بڑھتا جاتا تھا۔

چار پانچ گھنٹیاں بجنے کے بعد انہوں نے کہا "بھئی چہ خوب۔" اور پھر زور سے ہنسے "وزیر محبت۔"

میں نے کہا "جی؟ مجھے کسی وزیر سے نہیں آزاد صاحب سے بات کرنی تھی۔ میں ناصر عظیم بول رہا ہوں۔"

"بولو برخوردار! تم بھی بولو لیکن پہلے ہماری سن لو۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا "خوب لطیفہ ہے گویا اور پیدا کیا ہے اسی نطفہ ناتحقیق نے۔ اپنے کاتب جواہر رقم لال دین گجرانی نے۔"

وہ خفا ہوتے تو کاتب کو جواہر لال نہرو کی اولاد معنوی کہتے تھے۔ میں نے کہا "دیکھئے لطیفہ پھر سنایئے گا۔"

"افوہ۔ ارے میاں، لطیفہ بھی باسی ہو جائے ڈبل روٹی کی طرح تو پھر لطف نہیں دیتا گویا۔ اس نے وزیر محبت کو لکھ دیا وزیر محبت۔ ہمیں تو بڑی اچھی لگی اس کی بات کہ محبت کرنے والوں کے مسائل کے لیے وزیر محبت سے تو محبت کرنے والے بھی کم نہیں ہیں گویا۔ ایک وزیر اس محکمے کا ہونا چاہیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "آزاد صاحب' بتانا مجھے صرف اتنا تھا کہ میں واپس آرہا ہوں' جھک مار کے۔"

"آؤ بھئی۔ کچھ بھی مار کے آؤ مگر ابھی ہم کافی بھیج رہے ہیں ورنہ تم سے جھک کی تعریف پوچھتے گویا۔" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا "شبنم یا رئیس خان کی کوئی خبر؟"

"ہاں' وہ ایک خبر ہے تو سہی۔ استاد رئیس خان ستار نواز کے بارے میں۔ وہ جو مغنیہ بلقیس خانم کے مجاری خدا ہیں گویا۔۔۔ کہاں گئی۔۔۔؟ خیر' صبح پڑھ لینا اخبار میں۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ظاہر ہے شبنم نے یار رئیس نے کوئی پیغام دیا ہوتا تو وہ بتا دیتے۔ رئیس خان کے نام پر ان کا ذہن دوسری طرف چلا گیا تھا کیونکہ اس وقت ان پر خبروں کا بخار سوار تھا۔ اچانک مجھے رخشی کی یاد آئی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ مجھے اس سے کوئی کار آمد بات معلوم ہو جائے ورنہ میں فرید عباسی کو بتا سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ آزاد صاحب کے مقابلے میں اس کی باخبری میرے لیے زیادہ معاون و مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے صاحب خانہ سے ایک فون کال کی اجازت لی تھی۔ وہ سامنے ہوتا تو میں ضرور اس سے پوچھ لیتا۔ اخلاقی طور پر یہ بھی میرا فرض بنتا تھا کہ میں اسے کال چارجز دوں جو میں جانتا تھا کہ وہ ہرگز نہ لیتا۔ عام لوگوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ وہ ہر شخص کو ضرورت پڑنے پر فون کرنے دیں تو ان کا بل بڑھتا ہے اور ایک ایک کال کے پیسے لیتے ہوئے سب کو شرم آتی ہے۔ چنانچہ زیادہ تر لوگ فون کی خرابی کا بہانہ کر کے ٹال دیتے ہیں حالانکہ کسی پیشہ ور بھکاری کو ایک روپیہ خیرات دینے سے کہیں افضل ہے کہ کسی ضرورت مند کو ایک فون کال کرنے دی جائے۔

میں نے دوسرا نمبر ملا کے فرید کی آواز سنتے ہی کہا۔ "فرید۔ یار' میں شاہدرہ۔۔۔ سے ایک ڈاکٹر کے گھر سے بول رہا ہوں۔"

"ڈاکٹر۔۔۔ کیا ہوا ہے تجھے بھائی؟ ڈاکٹر یہاں کم پڑ گئے تھے کیا؟"

میں نے کہا "یہاں میں شبنم اور رئیس کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ تین گھنٹے سے لاپتا ہیں۔"

"تین گھنٹے تو زیادہ نہیں ہوتے اور یہ کس نے مشورہ دیا آپ کو کہ وہ دریا پار شاہدرے میں ملیں گے؟"

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ تو ایک نمبر نوٹ کر اور ایڈریس بھی۔"

"ہاں۔۔۔ بول۔" فرید عباسی نے کہا۔

میں نے نمبر لکھوا کے کہا "نام ہے ہاشم رضا۔ میں کچھ دیر بعد پھر فون کروں گا کہیں اور سے۔ میرے موبائل فون کی بیٹری ڈیڈ ہے۔"

ریسیور رکھ کے میں باہر آیا۔ ڈاکٹر اپنے نائٹ گاؤن کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہیں کھڑا تھا "جاتے وقت دروازہ بند کر دینا۔ لاک ہو جائے گا۔"

میں نے منہ اوپر اٹھا کے کہا "تھینک یو سر۔ میں نے دو لوکل کالز کی ہیں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو۔"

"اس کی ضرورت نہیں" اس نے میری بات کاٹ دی۔

وہ شکی مزاج آدمی نہیں تھا ورنہ اندر کے کسی فون پر میری گفتگو سنتا یا دیکھتا کہ میں اپنی گاڑی کی خرابی دور کرنے کے لیے کیا کرتا ہوں۔ اس کے لیے اندھیرے میں کھڑی گاڑی کا نمبر نوٹ کرنا بھی مشکل تھا۔ شاید اسے زیادہ اعتماد اس ریوالور پر ہو گا جو وہ نائٹ گاؤن کی جیب میں پکڑے کھڑا ہو گا لیکن یہ صرف میری قیاس آرائی تھی۔

میرا اب وہاں رکنا لاحاصل تھا لیکن گیٹ سے باہر نکل کے مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکٹر سے ہاشم رضا کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔ ڈاکٹر ابھی تک ٹیرس پر موجود تھا۔

میں نے پلٹ کے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ کے سامنے والے گھر میں ہاشم رضا صاحب رہتے ہیں؟"

ڈاکٹر چند سیکنڈ بعد بولا "رہتے ہیں نہیں' رہتے تھے۔"

میں نے کہا "میرے پاس صرف فون نمبر اور ایڈریس تھا۔ جو انہوں نے مجھے بہت پہلے دیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اب وہ کہاں ہیں؟"

"ہاں۔ بتا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں انہی سے ملنے آیا تھا۔"

"تم کو چھ مہینے پہلے آنا چاہیے تھا۔ پروفیسر اب دوسری دنیا میں ہے۔"

"پروفیسر!" میں اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔

"قینی ایسے ہی سرسری ملاقات تھی تمہاری۔ اس کے بارے میں تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ تاریخ کا پروفیسر تھا اور ریٹائرڈ لائف گزار رہا تھا۔ اب اس کا مکان کسی نے لیا ہے۔"

میں نے کہا "کس نے؟ اور کب؟"

"تم کیوں تفتیش کر رہے ہو؟ تم پولیس کے آدمی تو نہیں لگتے۔"

میں نے کہا "جی نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں۔"

وہ ہنسا "میں نے دیکھا تھا کسی کو دروازے میں یہ تالا ڈالتے ہوئے۔ ابھی ہفتہ دس دن پہلے۔"

میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس مڑا ہی تھا کہ کسی وجہ کے بغیر میرے ذہن میں ایک اور سوال آ گیا "ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر بھی واپس جانے کے لیے پلٹ گیا تھا "یس۔"

"آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اس کے لیے معذرت لیکن ایک بات اور ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو۔ پروفیسر ہاشم رضا کا انتقال کیسے ہوا تھا؟"

ڈاکٹر نے جواب دینے سے پہلے سوچا "ویسے تو یہاں سب جانتے ہیں کہ پروفیسر کا قتل ہوا تھا۔"

"قتل؟"

"وہ اکیلا رہتا تھا یہاں۔ بیوی مر چکی تھی اور بچے باہر ہیں۔ اس کی لاش کا پتا تین دن بعد چلا جب بو محسوس ہوئی مجھے۔ میں ہی گزرتا ہوں اس دروازے کے سامنے سے اکثر۔ رپورٹ بھی میں نے لکھوائی تھی۔ باقی انفارمیشن تمہیں پولیس اسٹیشن سے مل سکتی ہے" وہ ہاتھ اٹھا کے بولا۔

"شکریہ!" میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

ڈاکٹر کے گھر میں ٹیرس کے علاوہ گیلری کی لائٹ بھی آف ہو گئی پھر گیٹ لائٹس بھی بجھ گئیں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک اکثر لوگ سو جاتے ہیں یا سونے کی تیاری کرنے لگتے ہیں مگر میرے مقدر میں خواری لکھی تھی۔ ابھی تک میں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور نہ ہی مجھے اس کا خیال آیا تھا۔

میں نے موبائل فون کو چارجنگ پر لگایا اور گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ کسی نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہونٹوں سے آواز نکالی "شش!"

میں نے بائیں طرف دیکھا تو احاطے والے خالی پلاٹ کی دیوار کے اوپر مجھے ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ ہیڈ لائٹس آف رکھتے ہوئے میں گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے گیا تو دیوار پر نظر آنے والے چہرے کے نقوش کچھ واضح ہو گئے۔ وہ فائق علی عرف فیکا تھا۔

میں بھونچکا رہ گیا اور اچانک میری کوفت اور مایوسی کا احساس خون کی گردش تیز کرنے والے تجسس میں بدل گیا۔ مجھے یہ شرمندگی نہ رہی کہ میں نے احمقانہ سراغ رسی کے مظاہرے میں اپنا وقت ضائع کیا اور یہاں آ کے جھک ماری۔

میں نے پوچھا "تم۔۔۔ فائق علی ہو۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "آہستہ بولو۔ یہ گاڑی آگے پیچھے چھوڑ کے آؤ۔ پیدل۔۔۔ کسی کو پتا نہ چلے جی۔"

میں تذبذب میں پڑ گیا "آخر چکر کیا ہے؟"

"ڈرو نہیں۔ میں دشمن نہیں ہوں تمہارا۔"

میں نے کہا "تم دوست بھی نہیں ہو سکتے۔"

"مجھ پر اعتبار کرو۔ یہاں تک میری وجہ سے پہنچے ہو تم۔ یہاں کوئی نہیں ہے میرے سوا جی' تم دیوار کے اوپر سے آ سکتے ہو۔" فیکے نے کہا پھر اس کا سر غائب ہو گیا اور دوبارہ نمودار ہوا "دیر مت کرنا جی اور پولیس کو مت ڈالنا بیچ میں۔"

میں نے کہا "پہلے مجھے بتاؤ' یہاں کیا ہے؟"

وہ بولا "راستہ ہے جی اندر جانے کا" اور پھر غائب ہو گیا۔

میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ فیکے سے میری آخری ملاقات کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ طے شدہ طور پر ملک رب نواز کا آدمی تھا۔ اسے میں ملک کی کوٹھی کے اندر بھی دیکھ چکا تھا۔ ملک سے اس کی گفتگو سن کے میں نے یہی اندازہ کیا تھا کہ اس مجسمے کے سر کو خادم مرزا کی لاش پر پھینک کے فیکے نے کوئی سنگین غلطی کی تھی۔ وہ سر میں اٹھا لایا تھا اور ملک کے لیے اس کی بازیابی بہت اہم ہو گئی تھی۔ بظاہر پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے اس مورتی کے سر میں کچھ نہیں تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ ابھی تک میں نے بھی اس کی قدر و قیمت کی اصل وجہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ مورتی کا سر ایک بے کار چیز کی طرح رئیس خانے میں پڑا ہوا تھا۔

میرے اپنے خیال کے مطابق فیکا ہی ماسٹر اور اس کی بیوی کا قاتل تھا۔ شاید اس نے سن لیا تھا یا معلوم کر لیا تھا کہ میں اور مجسم وہاں "خامان کارپوریشن" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گئے تھے۔ "خامان کارپوریشن" کا پتا وہی تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہاں غلط' پُراسرار اور مشتبہ قسم کے لوگ کیوں آتے تھے اور کیا خفیہ دھندا کرنے کے لیے ایک رہائشی عمارت میں اپنا اڈا بنا رکھا تھا۔

ماسٹر اور اس کی بیوی نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کو فائق علی کے گھر میں آنے والے مشکوک کردار کے لوگ لگتے ہیں۔ "خامان کارپوریشن" کو اس سے بہت پہلے ہی کہیں اور منتقل کیا جا چکا تھا۔ غالباً یہ پتا اتنا عام ہو گیا تھا اور وہاں لوگوں کا آنا جانا اتنا بڑھ گیا تھا کہ بلڈنگ میں رہنے والے دوسرے شریف خاندانوں کو وہاں کسی غیر شریفانہ کاروبار کی بُو محسوس ہونے لگی تھی۔

جب میں اور مجسم ماسٹر کے قتل کے بعد تعزیت کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والوں میں شامل ہو کے پہنچے تو شاید نیکے نے تاڑ لیا تھا کہ ہم وہی ہیں جو ماسٹر سے خاقان کارپوریشن کے بارے میں پوچھنے آئے تھے۔ ہماری موجودگی کا راز افشا نہ ہوتا اگر غلط وقت پر ایک سود خور وہاں اپنا قرض وصول کرنے نہ آتا۔ اس نے رقم کی وصولی کے لیے ماسٹر کی رسوائی کا تماشا کیا تو مجھے باہر نکلنا پڑا۔ اس وقت وہاں بلڈنگ میں رہنے والے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور اپنے گھر کے دروازے سے نیکے نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ ماسٹر اور اس کی بیوی کو قتل کرنے کے بعد اسے سامان سمیٹ کر فرار ہونے میں دیر ہو گئی تھی اور میں شبنم کے ساتھ اس سے براہِ راست تفتیش کرنے پہنچ گیا تھا۔ اس نے بہت کچھ اگل دیا تھا مگر وہ ہمارے لیے ناکافی تھا۔ نیکے نے یہ بتا دیا تھا کہ وہ ملک رب نواز کے لیے کام کرتا ہے مگر اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کیونکہ وہ ایک معمولی ڈرائیور ہے جس کا کام مال اٹھانا جانا ہے۔ مال کیا ہے؟ یہ اسے کوئی نہیں بتاتا اور وہ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اس نے ماسٹر کے قتل میں براہِ راست ملوث ہونے سے انکار کر دیا تھا مگر یہ مان لیا تھا کہ انہیں ملک رب نواز کے حکم پر افشائے راز کے جرم میں سزائے موت دی گئی تھی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ بہت کم تھا اور ہم نے طے کیا تھا کہ نیکے کو اپنے ساتھ رئیس خانے لے جا کے اطمینان سے تفتیش کی جائے تو زیادہ کارآمد معلومات حاصل ہوں گی۔ گڑبڑ یہ ہو گئی کہ فیکا بے ہوشی سے ہوش میں آ گیا یا وہ بے ہوشی کی اداکاری کر رہا تھا کہ موقع ملتے ہی شبنم کو ناک آؤٹ کر کے نکل گیا اور یہ سب اس لیے ہوا کہ مجھے چار مداخلت کاروں سے نمٹنے میں دیر ہو گئی تھی جو نیکے کو بچانے کے لیے نہیں آئے تھے مگر شامت اعمال آدمی کو کہیں بھی لے جاتی ہے اور غرور کی خوش فہمی اسے کسی بھی وقت مراد یقینی ہے۔ ان کی قسمت میں مار کھانا لکھا تھا۔ وہ چار تھے اور چاروں کو اپنی بدمعاشی کی طاقت پر بھی ناز تھا مگر دس منٹ سے بھی کم وقت میں بہت اونچی اڑان رکھنے والے فرش پر ہوا نکلے غباروں کی طرح پڑے رہ گئے تھے۔

اس دن کے بعد مجھے آج پھر نیکے کی شکل نظر آئی تھی۔ میں اتنی آسانی سے کیسے مان لیتا کہ درمیانی عرصے میں حالات کی گھڑی کی سوئیاں الٹی چلنے سے فیکا میرا دشمن نہیں رہا، دوست ہو گیا ہے۔ جب وہ شبنم کو ناک آؤٹ کر کے فرار ہوا تو شبنم نے روپوشی کے لیے برقع پہن رکھا تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ جاتے جاتے اس نے نقاب اٹھا کے اس کا دیدار کر لیا ہو ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیا ہو گا اور ملک صاحب کو بتا دیا ہو گا پھر ملک کے لیے یہ معلوم کرنا کیا مشکل تھا کہ کون معشوق تھا اس پردہ زنگاری میں۔

چنانچہ یہ فرض کرنا بھی غلط نہ تھا کہ نیکے نے ہی ملک صاحب کے حکم پر گھر سے دفتر تک شبنم کا پیچھا کیا۔ رئیس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں دو افراد ہیں جو آزاد صاحب کے گھر کے باہر ایک گاڑی میں بیٹھے ہیں اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے دیکھا ہوا لگا تھا۔ رئیس کا سامنا صرف ایک بار نیکے سے ہوا تھا مگر یہ کوئی سرِراہ ہونے والی ملاقات نہ تھی۔ رئیس میرے ساتھ تفتیش کے عمل میں شریک تھا۔ اس نے نیکے کو اچھی طرح دیکھا تھا پھر اس نے نیکے کو پہچانا کیوں نہیں؟ مجھ سے صاف کیوں نہیں کہا کہ ایک تو فیکا ہے، دوسرے کو میں نہیں جانتا۔

میں بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں کھڑا رہ سکتا تھا۔ نیکے نے کہا تھا کہ دیر مت کرنا۔ مجھے بہت جلد کسی نتیجے پر پہنچ کے کچھ کرنا تھا۔ اگر فیکا جھوٹ بول رہا تھا اور دھوکے سے مجھے بھی اسی جال میں گرفتار کرنا چاہتا تھا جس میں شبنم گرفتار ہوئی تھی تب بھی میرا جان بچا کے بھاگ جانا ممکن نہیں تھا۔ شبنم نے میرے لیے بہت کارآمد سراغ ایک ٹیلی فون نمبر کی صورت میں چھوڑا تھا اور نیکے کا یہاں ملنا اس کا ثبوت تھا۔

نیکے کا سر تیسری بار دیوار پر نظر آیا۔ "تم گئے نہیں جی۔ دیکھو ٹائم کا خیال کرو۔ جلدی کرو ورنہ نقصان ہو جائے گا۔"

"کیسا نقصان!" میں نے کہا "میں کیسے مان لوں کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے ہو۔"

"اب میں کیسے یقین دلاؤں جی۔ یہاں میں ایسے ہی تو نہیں چھپا بیٹھا ہوں۔ مجھے امید تھی کہ آپ آؤ گے۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے صرف ایک بات کا جواب دو پہلے۔ کیا شبنم کو یہاں لایا گیا ہے؟"

"کون شبنم؟ وہ جو فلموں میں کام کرتی تھی؟" وہ سخت حیران ہوا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا مگر اندھیرے میں اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی صورت پر جھوٹ نظر آ رہا ہے یا سچ۔ اپنے لہجے سے وہ سچ کا تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب تھا۔

"شبنم۔۔۔ وہ جو۔۔۔" میں نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی یوں روک لی جیسے نیوز ایجنسی کسی خبر کو آفیشل سیکرٹ ایکٹ کی خلاف ورزی سمجھتے ہوئے جاری نہیں کرتی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ شبنم رپورٹر ہے پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بتانا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا چاہیے وہ شبنم جسے تم ناک آؤٹ کر کے بھاگ

گئے تھے مگر یہ بھی غیر ضروری تھا۔ فیکا اگر شبنم کو جانتا تھا اور ناواقفیت کا ڈراما کر رہا تھا تو اسے کچھ بتانا بے وقوفی تھا اور اسے واقعی شبنم کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا تو کچھ بتانا مزید بے وقوفی ہوتا۔

ڈاکٹر کی طرف سے مجھے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں اگر دو گھنٹے گاڑی میں بیٹھا رہتا اور وہ کسی وجہ سے دوبارہ مجھے گاڑی کے ساتھ دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ گاڑی خراب ہے اور میں نے فون کر کے جس کو مدد کے لیے بلایا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا چنانچہ چوری ہو جانے کے ڈر سے میں گاڑی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ سوزوکی آلٹو قومی سطح پر چوروں کی سب سے پسندیدہ گاڑی تھی۔

لیکن اب گلی میں ایک چوکیدار نے گشت شروع کر دیا تھا اور جب وہ دوسری بار گزرا تو اس کی نظروں کا سوال بہت واضح تھا۔ تیسرے راؤنڈ میں وہ ضرور پوچھے گا کہ باؤ جی، آخر مسئلہ کیا ہے۔ گاڑی میں کیوں بیٹھے ہو آپ اور کس سے ملنے آئے ہو۔ تذبذب اور بے یقینی میں پانچ منٹ گزر چکے تھے اور مجھے گلی کا چوکیدار اپنی طرف آتا ہوا صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے پورا زور لگا کے منہ سے سیٹی بجائی تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کی "میں آتا ہوں" میں نے نیکے سے کہا "لیکن یہ مت سمجھنا کہ تم بے وقوف بنا کے مجھے مروا دو گے۔ اور میں پولیس کے ساتھ بھی نہیں آؤں گا۔"

نیکے نے سر ہلایا "آپ سیانے بندے ہو۔ پولیس کو لانے کی غلطی نہیں کرو گے جی۔"

میں نے کہا "تم اچھی طرح سمجھ لو ایک بات۔ میں اکیلا خالی ہاتھ بھی وہ سب کر سکتا ہوں جو جیپ بھر کے تھانے سے آنے والی نفری نہیں کر سکتی۔"

اس نے سر ہلایا "مجھے پتا ہے جی۔ آپ کے پاس بڑی طاقت ہے۔ سب ہی ڈرتے ہیں آپ سے۔"

میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ نیکے سے زیادہ تفتیش کے لیے وقت نہیں تھا۔ ایک خالی پلاٹ کے احاطے کی دیوار کے پیچھے وہ اکیلا تھا یا ملک صاحب کی مسلح فورس کی پوری پلٹن بیٹھی تھی۔ اس کی تصدیق ممکن نہیں تھی۔ میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ واقعی اس خالی پلاٹ پر کہیں پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ موجود ہے لیکن بہت سے اسباب اچانک پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے میرے لیے تمام خطرات کے باوجود پیش قدمی کو ناگزیر کر دیا تھا اور اب جو ہو سو ہو والا معاملہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔

گلی سے نکل کے میں سڑک تک آیا تو مجھے فرید عباسی کا خیال آیا کہ کیوں نہ میں اسے صورتِ حالات سے آگاہ کر دوں بلکہ اسے کہوں کہ وہ رخشی کو کچھ بتائے بغیر جتنی جلدی ہو سکے یہاں پہنچ جائے۔ ایک سابق پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ وہ ذہین اور نڈر آدمی تھا اور اس کے ساتھ مورل سپورٹ کے علاوہ وہ حفاظتی چھتری بھی فراہم کر سکتا تھا جسے سیکنڈ لائن آف ڈیفنس کہا جاتا ہے۔ وہ سامنے آئے بغیر مجھ پر نظر رکھ سکتا تھا اور میری طرف سے ایس او ایس ملنے کی صورت میں اچانک پہنچ کے بازی پلٹ سکتا تھا۔

چند منٹ میں بیٹری کیا چارج ہوتی مگر میں نے انجن بند کیے بغیر موبائل فون سے فرید کا نمبر ملایا تو لائن مل گئی۔ شاید فرید نے سی ایل آئی سے دیکھ لیا کہ کال رئیس کے فون سے کی گئی ہے جو میرے پاس تھا "ہاں۔۔۔ کیا ہوا" وہ بولا۔

میں نے کہا "تو کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہے اس پتے پر جو میں نے لکھوایا تھا۔"

"میرا خیال ہے۔ بیس پچیس منٹ تو لگ جائیں گے، بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "سڑکیں خالی ہیں اس وقت۔ تو پندرہ منٹ میں بھی آ سکتا ہے۔ رخشی کو کچھ مت بتانا اور ساتھ بھی مت لانا۔ دیکھ میں انتظار کر رہا ہوں تیرا۔ گاڑی مین روڈ پر نظر آ جائے گی تجھے۔ وہیں سے الٹے ہاتھ پر اندر آ کے دیکھ لینا۔ گاڑی مت لانا گلی میں۔"

"یار کوئی نشانی اس گلی کی۔"

"رئیس کی گاڑی ہے میرے پاس۔ گلی کے کونے پر کاکا اسٹور ہے۔ جی ٹی روڈ پر آبادی جہاں ختم ہونے لگتی ہے وہاں ایک پیٹرول پمپ ہے کاشکس کا۔ وہیں۔"

"آل رائٹ! میں آتا ہوں۔"

میں نے کہا "دیر کی تو پھر ملاقات میدانِ حشر میں ہو گی ہماری۔"

"انشاء اللہ" وہ بولا اور میں نے فون بند کر دیا۔

اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی کو بہت نمایاں جگہ پر عین گلی کے آغاز میں "کاکا اسٹور" کے سامنے کھڑا کر دیا۔ کاکا اسٹور سے زیادہ سائن بورڈ پر پیپسی والوں کا مخصوص رنگ نظر آتا تھا مگر مجھے امید تھی کہ فرید کی جاسوس نظر نیچے واضح حروف میں لکھے ہوئے کاکا اسٹور کا نام دیکھ لے گی۔ آس پاس نظر دوڑانے سے مجھے مزید اطمینان یہ حاصل ہوا کہ آگے پیچھے کھڑی گاڑیوں میں کسی جگہ کوئی سوزوکی آلٹو نہیں ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اپنے خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ میں نے کاکا اسٹور کے تھڑے پر سوئے ہوئے شخص کو دیکھا ہی نہیں۔ جب میں گاڑی کو لاک کر رہا تھا تو اس نے پیچھے سے میری آستین پکڑ کے کھینچی۔

میں اچھل پڑا "کیا۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"اللہ کے نام پر ایک دس کے نوٹ کا سوال ہے سخی داتا۔ صبح سے چائے نہیں پی۔" اس نے یوں کہا جیسے کیمرے کے سامنے فلمی فقیر کے ڈائیلاگ بول رہا ہو۔

وہ چالیس سال سے بھی کم ہٹا کٹا فقیر تھا جس نے کمائی کے لیے ایک ملنگ کا امیج بنا لیا تھا۔ اس جیسے فقیروں کی سرشت کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ اس کی داڑھی، عمر اور صحت کی مناسبت سے مصنوعی حد تک سفید لگتی تھی کیونکہ اس کے سر کے بال کالے تھے۔ لوگوں سے اس فرق کو چھپانے کے لیے وہ دھندے کے وقت سر پر ٹوپی رکھتا ہوگا۔ اس کے کرتے میں پیوند تھے مگر کرتہ صاف تھا۔ عام طور پر فقیر لنگی یا دھوتی باندھتے ہیں مگر اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہاں روشنی اس بلب کی تھی جو کاکا اسٹور کے سائن بورڈ پر جل رہا تھا چنانچہ میں نے شلوار قمیص کا ایک جیسا رنگ بھی دیکھ لیا۔ فقیر کی لال نیلے پیلے منکوں والی مالائیں اس وقت سرہانے کی طرف پڑی ہوئی تھیں۔

اور کوئی وقت ہوتا تو میں اس دھوکے باز ملنگ کی بے عزتی کرتا کہ حرام خور، سوتے سوتے تجھے چائے کی ایسی طلب محسوس ہوئی کہ دس روپے مانگنے کے لیے اٹھ کے بیٹھ گیا۔ چائے کیا دس روپے کی ملتی ہے یا اس وقت کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جا کے چائے پئے گا مگر میں نے اپنے غصے اور گھبراہٹ کے جذبات پر قابو پا لیا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میں پانچ نہیں پچاس دوں گا۔"

"اللہ تجھے بہت دے گا۔ تیرا پانچ لاکھ کا پرائز بانڈ نکلے گا سخی داتا۔ سو سال جیئے گا، چار شادیاں کرے گا۔" اس نے ہاتھ پھیلا دیا "رہے نام مولا کا۔"

میں نے کہا "ایسے نہیں، تم میری گاڑی کا خیال رکھو گے۔"

"کیوں بابا؟ تو کہاں جا رہا ہے؟ ڈاکا ڈالنے؟"

میں نے غصے سے کہا "کیا میں ڈاکو نظر آتا ہوں شکل سے؟"

"فقیر کو شکل سے سب ڈاکو لگتے ہیں بابا۔ رہے نام مولا کا۔"

میں نے کہا "میں شریف آدمی ہوں۔"

وہ مجھے دیکھ کے سرہلانے اور مسکرانے لگا "رہے نام مولا کا۔ آج کس کا گھر ناڑا ہے؟"

میں نے بگڑ کے کہا "یہ کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے؟"

اس نے رازداری سے پوچھا "اگر پکڑا نہ گیا تو مال میں حصہ دے گا؟ بول۔"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ فقیر کسی طرح بھی قائل ہونے پر آمادہ نہ تھا کہ میں چور ڈاکو نہیں ہوں اور کسی حد تک اس کا شک جائز بھی تھا۔ یہاں رہنے والا کوئی شخص اپنی گاڑی کسی دوسرے کے دروازے پر کیوں چھوڑے گا۔ میں گاڑی کو ڈرائیو کر کے لایا تھا چنانچہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گاڑی خراب ہے اس لیے یہاں چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ فقیر کو مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ وہ شور مچا دیتا تو سارا محلہ اکٹھا کر لیتا۔

اس جگہ سے میں وہ احاطہ دیکھ سکتا تھا جس کے سامنے ہی ڈاکٹر عظمت کا گھر تھا۔ وہاں ابھی تک کوئی گڑبڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے لہجہ بدل کے نرمی سے کہا "ملنگ بابا۔ یہ گاڑی میری ہے۔"

وہ طنزیہ حیرت کے ساتھ بولا "اچھا؟ اپنی بیوی اور گاڑی کو ایسے چھوڑ کے کون جاتا ہے بابو۔ بول چوری کی گاڑی میں کہاں واردات کی تھی؟"

میں نے اس کو جھانپڑ مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "تم فقیر ہو یا جاسوس۔ کیا میں تمہیں گاڑی کے کاغذات دکھاؤں۔ اس گلی میں مجھے ڈاکٹر عظمت جنجوعہ پہچانتے ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "صاف کیوں نہیں کہتا کہ ڈاکٹر کے گھر کا صفایا کرنا ہے مگر وہاں کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ لے جانے والے پچھلے ہفتے سب لے گئے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

"فقیر سے کیا چھپا ہوا ہے۔ فقیر سب کے دل کا حال جانتا ہے اور سب کے گھروں کے حال کی خبر رکھتا ہے۔"

"واہ۔ کیا درویشی اور فقیری ہے۔ تم چوروں ڈاکوؤں کے لیے مخبری کرتے ہو؟ کیا علاقے کا چوکیدار بھی ملا ہوا ہے تم سے۔"

"کام کی بات کر میاں۔ اپنا اپنا دھندا ہے اور دنیا کے سب دھندے مل کے ہی ہوتے ہیں" اس کا لہجہ اب سوالی نہیں کاروباری ہو گیا تھا۔

بحث اور دلیل سے فقیر کو قائل کرنے کے لیے نہ وقت تھا اور نہ یہ کام آسان تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اچھا

میرے باپ، جو تیرا جی چاہے سمجھ۔"

وہ مسکرایا "دیکھ فقیر کو مصیبت میں مت ڈال ورنہ اللہ تجھے دوزخ میں ڈالے گا۔ پانچ سو ہوں گے اس کام کے۔"

میں نے برہم ہو کہا "تم جیسے فقیروں کو ہونا چاہیے جیل میں۔"

"اور تیرے جیسے شریفوں کو؟ لا ایڈوانس دے جا اور دیکھ، پکڑا گیا تو فقیر یہاں نہیں ملے گا ورنہ فقیر کا حصہ دینا مت بھولنا۔"

میں نے ہتھے سے سو کا نوٹ نکالا اور دل ہی دل میں کہا کہ تجھ سے تو میں واپسی میں نمٹوں گا سؤر کے بچے۔ یہ سوچا ہی نہیں اپنے پاس سے بھی سو تجھے دینے پڑیں گے جان چھڑانے کے لیے مگر زبان سے میں نے کہا "چلو یہ رکھو ابھی۔ باقی حساب پھر کریں گے۔"

"بے ایمانی کی تو گاڑی چوری ہو جائے گی تیری۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "تم تو بہت پہنچے ہوئے بلیک میلر ہو بابا۔"

"سب کرنا پڑتا ہے پاپی پیٹ کے لیے۔ جیسے تو کر رہا ہے" اس نے چوم کے نوٹ جیب میں ٹھونس لیا۔

میں نے کہا "ابھی ایک اور گاڑی آئے گی یہاں۔"

"آنے دے بچے! کون سی گاڑی ہو گی ویسے۔"

میں نے کہا "شیراز۔ تم پہچانتے ہو؟"

"ماڈل بھی بتا دے۔ پرانا ہے کہ انڈا ٹیپ؟" وہ بولا۔

مجھے اب ہنسی آنے لگی تھی "انڈا ٹیپ۔ ماڈل انھاسی۔"

وہ پھر تھڑے پر لیٹ گیا "اپنی نیلی کے پاس بھی ہے مگر ری کنڈیشن ہے۔"

میں نے کہا "کہاں رہتی ہے فیملی۔ گلبرگ یا شادمان میں اور بچے کیا کیتھڈرل اسکول میں پڑھتے ہیں۔"

اس نے میرے طنز کو اہمیت نہیں دی "ہاں بابا۔ اولاد کے لیے سب کرنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا کریں گے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے۔ اپنے ساتھ رکھتے اور عملی تربیت دیتے تو کریڈ بائیس کے افسر سے زیادہ کماتے۔"

"سچ کہا تو نے لیکن ان کی ماں بے وقوف یہ بات نہیں سمجھتی۔ عزت کو روتی ہے، یہ نہیں دیکھتی کہ عزت دار ہی ذلت اٹھا رہے ہیں۔ بھوکے مر رہے ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی "شیراز میں جو شخص آئے گا۔ اسے بتا دینا کہ ڈاکٹر عظمت جنجوعہ کا گھر کون سا ہے؟"

"وہ بزنس پارٹنر ہے تیرا۔ نام کیا ہے۔"

میں نے کہا "تمام کو گولی مارو۔ اسے کہنا گاڑی یہیں کھڑی کر دے۔"

وہ بولا "یہ بھی کہہ دوں گا کہ تم نے پانچ سو میں بات کی تھی۔"

"بتا دینا اور دیکھو، یہ چوکیدار آ رہا ہے اس طرف۔ تمہارا تو بزنس پارٹنر ہے۔ اسے سمجھا سکتے ہو کہ ذرا خیال کرے۔ اس گلی سے دور ہی رہے کچھ دیر۔" میں نے کہا "اور کچھ دیکھے تو سمجھے کچھ نہیں دیکھا۔"

"ہر شخص وہ بات سمجھ لیتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا "یہ پانچ سو اسے دے دینا" میں نے اپنے پرس میں سے ایک نوٹ نکال کے فقیر کو دیا۔

یہ سب مجھے بہت غلط اور مشکوک لگ رہا تھا مگر میں ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ اس فقیر کی ہر بات ماننے پر مجبور تھا۔ دولت مند فقیروں کے قصے میں نے عام لوگوں کی طرح صرف سنے نہیں تھے۔ میں نے شاہی اور ملا ٹھیکے دار جیسے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اخباروں میں کبھی کبھی ایسے فقیروں کا تذکرہ آ جاتا تھا جو لکھ پتی تھے۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس کے مالک تھے لیکن اس فقیر کے اطوار میں کچھ اور بات تھی جو میرے دل میں خلش بن گئی تھی۔ یہ شخص مجھے چوروں سے زیادہ پولیس والوں کا مخبر لگتا تھا۔ وہ ڈبل ایجنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ بہرصورت میں اسے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کے باوجود مطمئن نہیں تھا کہ اب مجھے اس کا مکمل تعاون حاصل ہو گیا ہے۔

جب چوکیدار قریب آیا تو میں گلی کے اندر مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ میرا اور اس کا آمنا سامنا ہوا تو چوکیدار نے نظر اٹھا کے مجھے غور سے دیکھا۔ اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔ اب وہ فقیر کے پاس کھڑی ہوئی گاڑی کو بھی پہچان جائے گا۔ خیر، اپنی طرف سے میں جو حفاظتی تدابیر اختیار کر سکتا تھا کر چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیسہ ایک ضرورت نہیں، ایک طاقت بن گیا تھا جو فقیر سے بادشاہ تک سب کو اپنی قوتِ خرید میں رکھتا تھا۔ جائز کو ناجائز بناتا تھا اور چور کو کوتوال کا عہدہ دلواتا تھا۔ کچھ آگے جا کے میں نے پلٹ کے دیکھا، چوکیدار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کے اور فقیر کے درمیان اشتراکِ عمل کا ایک نیا معاہدہ طے پا رہا تھا اور سب ٹھیک تھا۔

فرید کو میں نے پندرہ منٹ پہلے فون کیا تھا۔ وہ لگ بھگ پانچ دس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منٹ میں پہنچ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میں نے احاطے کے گیٹ تک کا فاصلہ طے کیا پھر رک کے آگے پیچھے دیکھا۔ پہلے کے مقابلے میں رات کی ویرانی کا تاثر زیادہ گہرا ہوگیا تھا۔ ایک آدھ کو چھوڑ کے سب گھروں کی بیرونی لائٹس بجھادی گئی تھیں۔ احتیاط پسند لوگوں نے پورچ اور گیلری میں ایک لائٹ جلتی چھوڑ دی تھی لیکن اوپر نیچے خواب گاہوں کی کھڑکیوں کے شیشے تاریک تھے۔ معمول کی زندگی کا ایک اور دن گزار لینے والے معمول کے مطابق سو چکے تھے۔

گلی میں کوئی اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی اور دور دور تک حرکت مفقود تھی۔ انسان تو کیا گلی میں کوئی کتا بھی نہیں پھر رہا تھا اور درخت بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ایسا مکمل سکوت میرے احساس کو غیر موجود خطرات کے خوف میں مبتلا کررہا تھا اور میرے اعصاب پر مکڑی کے جالے کی طرح لپٹتا جارہا تھا۔ سناٹے کی گونج جیسے میرے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔ کچھ ہوچکا ہے یا ہونے والا ہے اور جو بھی ہے وہ اچھا نہیں ہے۔

میں نے ایک بار دعائے قنوت پڑھ کے سر سے فضول خیالات کو جھٹکا اور گیٹ پر ایک انگلی سے دستک دے کر انتظار کیا۔

فیکے نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا "اوپر سے آجاؤ جی۔ گیٹ نہیں کھل سکتا۔"

میں نے دروازے سے منہ لگایا "صرف پانچ منٹ اور۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے کچھ تامل کے بعد کہا "اچھا۔ مگر بات کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں گاڑی لاک کرنا بھول گیا تھا' سڑک پر کھڑی ہے۔"

پہ سیکنڈ میں وہیں کھڑا رہا پھر ایک دم دیوار پر چڑھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ گیٹ کے دوسری طرف کیا ہے۔ میں نے صرف فیکے کی آواز ہی سنی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اس کے ساتھ وہ چاروں بھی ہوں جو اسے بچانے کے چکر میں خود مارے گئے تھے۔ اچانک مجھے ان سب کی توپوں کا رخ اپنی طرف نظر آئے اور پھر یہ ثابت ہوجائے کہ بچپن سے مجھے اپنے غیر معمولی I.Q کے بارے میں خوش فہمی تھی۔ درحقیقت میں ایک [illegible] سے زیادہ بے وقوف ہوں جو فیکے جیسے شخص کے ذ[illegible] جنس گیا۔ چار ساتھی نہ سہی' اکیلا فیکا بھی کلاشنکوف کے ساتھ میرا استقبال کرتا تو میں ہاتھ کی ٹانگیں بھی اٹھانے پر مجبور [illegible] ہوتے

ہونے کی مجھے کوئی پریکٹس نہیں تھی۔

لیکن میرے خدشات بے بنیاد تھے۔ اندر اکیلا فیکا کسی پرانے قبرستان کی آوارہ بدروح کی طرح بھٹک رہا تھا۔ احاطے میں تعمیرات میں کام آنے والے سامان کا بے ترتیب ڈھیر تھا۔ چھوٹی بڑی بانس کی سیڑھیاں۔ وہ تختے جو راج کاریگر دو بانسوں کے درمیان پلیٹ فارم بنانے کے لیے باندھتے ہیں اور بانس سے بانس جوڑ کر تیسری یا چوتھی یا چھٹی ساتویں منزل تک بھی چنائی اور پلاستر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تارکول کے پرانے ڈرم جو سفیدی کرنے اور پانی اسٹور کرنے میں کام آتے ہیں۔ وہ تختے جو آرسی سی کے پلر اٹھانے یا چھت ڈالنے کے لیے شٹرنگ بنانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ بیلچے پھاوڑے اور کدال۔ لکڑی کی گھوڑیاں۔ تین پہیوں والی ٹرالیاں اور بہت سا ایسا ہی کاٹھ کباڑ۔ ان کے درمیان ایک کنکریٹ مکسر مشین بھی کھڑی تھی۔ غالباً یہ سامان یہاں مکان بنانے والے کرائے پر حاصل کرتے تھے یا یہ کسی ٹھیکے دار کی ذاتی ملکیت تھی جو اس علاقے میں مکانات بنا رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ فیکا پلٹ کے دیکھتا' میں پھر گلی میں اتر گیا۔ چوکیدار واقعی غائب ہوگیا تھا۔ ذاتی طور پر یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی مگر چوکیدار کا رویہ ہماری اجتماعی معاشرتی سوچ کی زبوں حالی کا عکاس تھا۔ کوئی کسی کے اعتماد کو دھوکا دیتے ہوئے ضمیر کی خلش کو محسوس ہی نہیں کرتا تھا۔ چوکیدار کو حفاظت کی ذمے داری سونپنے والے مطمئن تھے کہ اب وہ چوروں ڈاکوؤں کے ڈر سے بے نیاز ہوکے سکون کی نیند سوسکتے ہیں مگر چوکیدار نے چوروں ڈاکوؤں سے اتحاد کرلیا تھا۔ در در صدا دے کے حاجت مندی کا رونا رونے والے ڈاکوؤں کے بزنس پارٹنر ہوگئے تھے۔ اگر ان سے پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ کیا کریں جی۔ زمانہ ہی ایسا ہے۔ کون کس کو نہیں لوٹ رہا ہے آخر؟ ہم تو غریب اور مجبور ہیں مگر یہ جو بڑے بڑے مگرمچھ کہلاتے ہیں' عوام کے لیڈر۔ عوام کے خادم' وہ لوٹ مار کیوں کررہے ہیں؟

جیب کترا کہتا ہے' چور کو پکڑو پہلے۔ چور کہتا ہے کہ ڈاکو نظر نہیں آتے کیا؟ ڈاکو کہتا ہے کہ اصل ڈاکو تو اوپر بیٹھے ہیں۔ منافع خور' ملاوٹ کرنے والا۔ جعلی نوٹ سے جعلی دوائیں تک دو نمبر مال بنانے والا' اسمگلر' رشوت خور' سب ایک دوسرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں۔

کیا زید کے چھوٹے گناہ کا جواز بکر کا بڑا گناہ ہوسکتا ہے؟ ایک چھوٹا جرم [illegible] کرنہ پکڑے جانے سے

قابل معافی ہوجاتا ہے؟ برائی جو چھپ کے کی جائے کیا وہ برائی ہی نہیں؟ میں نے گلی میں چکر لگاتے ہوئے سوچا۔ مجھ پر انتظار کے صبر آزما لمحات کا دباؤ تھا اور تھکن کے علاوہ میں ذہنی پریشانی سے دوچار تھا چنانچہ میرا دماغ گرم ہوجانے والے انجن کی طرح چل رہا تھا۔

فرید عباسی گلی کے دوسرے کنارے پر سائے کی طرح نمودار ہوا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ میں زیادہ دیر اس گلی میں اپنی مشکوک سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ ابھی تک کسی نے مجھے گلی میں بے سبب چکر لگاتا دیکھ کے ٹوکا نہیں تھا کہ میاں جی' تم ہو کون اور آدھی رات کو یہ چہل قدمی چہ معنی دارد' یا کسی نے مجھے دیوار پر اترتے چڑھتے دیکھ کر چور چور کا شور نہیں کیا تھا تو یہ میری خوش قسمتی تھی مگر یہ ہوسکتا تھا کہ بے خوابی کا شکار کوئی بوڑھا کھڑکی یا بالکونی سے مجھے تازلیتا یا کوئی مریض درد دل چوری چھپے کسی کے شربت وصل کی ایک خوراک پینے نکلتا اور پریشان ہوجاتا کہ آج اس وقت ظالم سماج کی دیوار بن کے یہ کون الو کا پٹھا دو دلوں کے درمیان آگیا ہے۔

فرید کے قریب جاکے میں نے کہا "بہت دیر کی تو نے یار!"

"اس بلا سے جان چھڑانا مشکل ہوگیا تھا" وہ بولا۔

"جس کا نام رخشی ہے؟" میں نے کہا "خیر' کیا بہا[illegible] تو نے؟"

فرید نے آہ بھری "کوئی بہانہ نہیں چلا بھائی۔ وہ آئی ہے میرے ساتھ۔"

"اچھا۔ کہاں ہے وہ؟ گاڑی میں؟"

فرید نے اقرار میں سر ہلایا "شبنم کا کوئی سراغ ملا؟"

"اس کا جواب ہاں بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس نے ایک نیلی فون نمبر چھوڑا تھا' وہ اس گھر کا ہے۔"

"کون رہتا ہے یہاں؟"

"کوئی نہیں۔ تاریخ کا ایک پروفیسر ہاشم رضا رہتا تھا مگر اس کا قتل ہوگیا تھا۔ یہ جو احاطہ دیکھ رہا ہے تو' اس کے پیچھے فیکا موجود ہے۔"

وہ چونکا "فیکا۔۔۔ وہی فیکا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ اس نے خود مجھے متوجہ کیا اور کہا کہ میں اندر اتر جاؤں۔ دیوار کے اوپر سے۔ وہ یہاں چھپا ہوا انتظار کررہا تھا میرا۔ نمبر اسی نے دیا تھا شبنم کو۔"

"مگر وہ تو ملک رب نواز کا خاص آدمی ہے؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے یار۔ اسی لیے میں نے اکیلے جانے کا رسک نہیں لیا۔ فیکے نے بتایا ہے کہ احاطے میں سے پروفیسر کے گھر میں پہنچا جاسکتا ہے۔ ادھر کوئی دروازہ ہے۔"

"پھر؟ اس کے کہنے سے ہم چلے جائیں اندر؟ یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ آخر فیکا تیرے لیے قابل اعتبار کیوں ہوگیا ہے اچانک؟"

میں نے کہا "سارے سوالات کا جواب میں فوراً کیسے دوں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ فیکے پر ملک صاحب کا عتاب نازل ہوا ہو اور وہ جان بچانے کے لیے فرار ہوکے یہاں چھپا بیٹھا ہو یا وہ باغی ہوکے ملک کے دشمنوں کا مددگار بن گیا ہو۔ اس امید میں کہ اسے ہم ہی پناہ دے سکتے ہیں۔"

"ایسے مفروضات پر یقین کررہا ہے تو۔ سیدھی بات کیوں نہیں سمجھتا کہ وہ جھوٹ کے جال میں پھنسا رہا ہے تجھے۔"

"دیکھ یار' شبنم نے جو فون نمبر چھوڑا تھا' تو اس کا کیا مقصد تھا آخر؟ میں نے فون نمبر سے پتا تلاش کرلیا۔ اب مجھے کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ شبنم کے ساتھ رئیس کا بھی پتا نہیں جسے میں نے کہا تھا کہ شبنم کی حفاظت کرنا۔ میں چلا گیا تھا قمر کے گھر اس کی [illegible] میں۔ بڑی غلطی ہوگئی تھی مجھ سے مگر اب میں اندر جا[illegible] گا۔ اندر صرف فیکا ہے۔ یہ میں دیکھ چکا ہوں۔"

"اوکے۔ تو نے [illegible] کا فیصلہ کرلیا ہے تو چل آگے۔"

فرید نے ریوالور نکال لیا۔

میں نے کہا "رخشی کو معلوم ہے؟"

"میں نے اسے پتا اور فون نمبر دے دیا ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد وہ فون کرے گی" فرید نے کہا۔

"اور خدانخواستہ جواب نہ ملا تو؟"

"تو ظاہر ہے وہ پولیس سے مدد طلب کرنے کے سوا کیا کرسکتی ہے؟"

گلی میں اس وقت بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیوار پر چڑھنے سے پہلے اپنا ریوالور چیک کیا اور پھر ایک جست میں اندر پہنچ کے اس کا رخ فیکے کی طرف کردیا۔ میرے بعد فرید اندر کودا مگر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب رہا۔

فیکے نے گھبرا کے ہاتھ اوپر اٹھادیے "اس کی کیا ضرورت ہے جی؟"

"ہاتھ اوپر ہی رکھو اور گھوم جاؤ" میں نے کہا۔

فیکے نے تعمیل کی "آپ کو شک نہیں کرنا چاہیے مجھ پر جی!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔" میں نے اس کی جامہ تلاشی لیتے ہوئے کہا "دشمن جب کسی وجہ کے بغیر دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو آنکھیں بند کرکے اس پر اعتبار کرنے والا بھی مارا جاتا ہے۔"

فیکے کے پاس بھی ریوالور تھا "یہ میری حفاظت کے لیے ہے جی۔"

میں نے اس کے میگزین کو خالی کرکے گولیاں اپنی جیب میں ڈال لیں "اب بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کس کا ہے یہ گھر؟"

"اپنے ملک صاحب کی ہے یہ جگہ۔" وہ بولا "کوٹھی بھی انہی کی ہے۔"

میں نے کہا "یہ پہلا جھوٹ ہے۔ کوٹھی ملک رب نواز کی نہیں۔ کسی پروفیسر ہاشم رضا کی ہے۔ اس کا قتل ہو چکا ہے چھ مہینے پہلے۔"

"ملک نے مجھے یہ سب نہیں بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ خریدی ہے میں نے۔ وہ زمین جائداد خرید تا بیچتا رہتا ہے۔ ہم شک کرنے والے کون ہیں جی۔ ہمارے جیسے معمولی حیثیت کے درجنوں ملازم ہیں اس کے۔"

میں نے کہا "اچھا۔ کیا ہے یہاں؟"

"مجھے نہیں معلوم جی۔ آپ چل کے دیکھ لو" اس نے احاطے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا "دروازہ ادھر ہے۔ تالے کی ایک چابی بھی میرے پاس۔"

میں نے کہا "تم نے کیا چابی میرے حوالے کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا؟ کیا کروں گا آخر میں اندر جا کے؟ اور کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ اندر جاتے ہی میں پکڑا نہیں جاؤں گا۔"

"پکڑے جانے کا ڈر تو مجھے ہے جی۔ میں نے ملک کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں ایسا نہ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔ میں یہاں چھپا ہوا ہوں لیکن۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ ملک کی حویلی میں ہے" وہ اچانک رونے لگا "پتا نہیں اس کے کتے کیا حشر کریں گے اس کا۔ وہ کیا سوچتی ہوگی میرے بارے میں جی۔۔۔ اپنی جان بچا کے بھاگ آیا میں۔ چودہ سال کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن میں کچھ کرتا تو کتے کی موت مارا جاتا وہیں۔ ہم دونوں ہی مارے جاتے۔ ہماری لاشوں کا بھی پتا نہ چلتا۔ آپ اسے بچا سکتے ہو جی۔۔۔ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ ان دونوں کو میں نہیں اور چھوڑ کے آیا ہوں۔"

میں نے کہا "آخر قصور کیا تھا تمہارا؟"

"قصور' قصور کون پوچھتا ہے جی۔ قصور میری گھر والی کا آخر کیا تھا۔ سزا وہ بھگت رہی ہے۔ مجھے پتا ہے اس کے ساتھ کیا ہوگا اگر میں واپس نہ گیا۔۔۔ بڑی مشکل ہوگی اس کی موت بھی۔ مرنے سے پہلے نہ جانے کتنی بار مرے گی وہ۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "مجھے بتاؤ کہ تم واپس کیوں جانا نہیں چاہتے۔"

"اس لیے کہ میں جھوٹ بول کے آیا تھا۔ ملک نے تین دن دیئے تھے مجھے کہ میرا نقصان پورا کرو۔ دو دن گزر گئے ہیں۔"

"کیا نقصان کیا تھا تم نے اس کا؟"

"نقصان مجھ سے نہیں جی' خادم مرزا سے ہوا تھا۔ اس نے ملک کی ایک چیز گم کردی تھی۔ غلطی سے پھینک دی تھی۔"

"وہ چیز کیا تھی؟" میں نے پوچھا اور فرید کو اپنے قریب بلا لیا۔

"ایک مورتی کا سر" فیکے نے جواب دیا۔

میں نے حیرانی کا اظہار کیا "مورتی کا سر۔ کس کی مورتی؟"

"مجھے کیا معلوم جناب۔ جب فیکے کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ چیز کہاں گئی تو میں کیسے پتا چلا سکتا ہوں اس کا۔ وہ بھی تین دن میں" فیکے نے کہا۔

"کیا لاکھوں کروڑوں کی تھی وہ چیز؟"

"بات لاکھوں کروڑوں کی نہیں جی۔ خادم کا قصور کچھ اور تھا۔ ملک نے اس نقصان کو بہانہ بنایا۔ خادم مرزا جھوٹا وعدہ کرکے بھاگ گیا۔ بیوی بچوں کو اس نے پہلے ہی کہیں بھیج دیا تھا۔ ملک رب نواز نے اس کے گھر کو آگ لگوا دی۔ خادم مرزا بھی ایک مہینے بعد مارا گیا۔ سڑک پر ایک جیپ نے ٹکر مار کے اسے کچل دیا تھا۔ اب میری باری ہے جی۔ وہ کہتا ہے تو نمک حرام ہے۔ وہ دشمن تھے انہیں میرے بارے میں اور میرے کاروبار کے بارے میں کیوں سچ بتایا۔ لو جی' مجھے کیا معلوم وہ کون لوگ تھے۔ وہ ماسٹر اور اس کی بیوی بھی انہیں نہیں جانتے تھے مگر ملک نے ان کی بات بھی نہیں مانی۔ اس نے کہا کہ وہ بھانجا تھا تیرا ماسٹر۔ سود خور پٹھان کا قرض اسی نے ادا کیا تھا اور سب کے سامنے کہا تھا کہ ماسٹر میرا ماما ہے۔ تیرا وہ بھانجا اور اس کی بیوی کہاں رہتے ہیں۔ ماسٹر کچھ نہیں بتا سکا اور ملک نے پہلے ماسٹر کو پھانسی پر لٹکایا۔"

"خود ملک نے۔۔۔؟" فرید نے کہا۔

"وہ موجود تھا وہاں۔ ماسٹر کی بیوی بھی یہی کہتی رہی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے۔ ماسٹر کا بھانجا تو کوئی نہیں مگر ملک نے اس کو بھی جھوٹا کہا۔ اسے بھی پھانسی دے دی پھر ایک ہفتے تک وہ مجھ سے پوچھتا رہا۔ اس کے پوچھنے کا اپنا طریقہ ہے جی۔ پولیس والے بھی پوچھتے ہیں مگر ملک رب نواز کے طریقے" فیکے نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے تھے ان لوگوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"لوجی۔ میں نے صرف ایک بار شکل دیکھی تھی ان کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تعزیت کرنے والوں میں بیٹھے تھے اور یہ بات میں نے ملک کو بتادی تھی۔ ماسٹر کی موت کے بعد وہ بندہ آیا تھا۔ اس کی بیوی دوسری طرف بیٹھی ہوگی۔ ماسٹر کے گھر میں عورتوں کے ساتھ۔ اگلے دن وہ میرے پاس پہنچ گئے۔ بڑے ظالم لوگ تھے وہ بھی۔ انہوں نے مجھ سے سب پوچھ لیا۔"

"بہت تشدد کیا تم پر؟" فرید نے کہا۔

"اللہ معاف کرے جی۔ ان کا ایک ساتھی بعد میں آیا تھا۔ وہ قسائی تھا پورا۔ میرے جسم پر کٹ لگا تا رہا چھری سے۔ دوسرا نمک مرچ والا پانی ڈالتا رہا۔ مجھے سب بتانا پڑا۔ میں نے یہی بات ملک صاحب سے کی کہ جیسے آپ پوچھ گچھ کررہے ہو' ایسے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔ کیا آپ کے سامنے جھوٹ بول سکتا ہے کوئی پھر ان سے میں کیسے جھوٹ بولتا۔ وہ میری بوٹی بوٹی الگ کردیتے لیکن ملک نے میری بات نہیں مانی اور یہی کہتا رہا کہ تو اپنی زبان خود کاٹ کے پھینک دیتا مگر انہیں کچھ نہ بتاتا۔ مرجاتا تو مگر زبان نہ کھولتا۔ لوجی' ہر شخص اتنی برداشت کی طاقت نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ ملک صاحب' میری جگہ کوئی بھی ہوتا' زبان کھولنے پر مجبور ہوجاتا۔"

میں نے کہا "تم کو کہنا چاہیے تھا کہ آپ بھی ہوتے تو بولنا پڑتا۔"

"یہی کہنا چاہتا تھا جی میں مگر ہمت نہیں پڑی۔ میں نے کہا کہ ملک صاحب۔ آپ یہ دیکھو کہ اس ایک آدمی نے مار مار کے چار بندوں کا حشر نشر کردیا۔ بڑے سورما تھے وہ۔ کیا ایسے شخص کا مقابلہ میں اکیلا کرسکتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ چار سورما کون تھے؟"

"ملک رب نواز کے خاص بندے تھے۔ انہوں نے باہر سے سب سن لیا تھا اور انہوں نے اندر آکے اس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے سب کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں۔ ایک مرگیا اسپتال میں۔ دو ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ ملک نے کہا کہ آخر ایسا کون رستم ٹارزن پیدا ہوگیا ہے شہر میں۔ ان چاروں نے مقابلہ کیا۔ مار کھائی مگر کچھ بکا تو نہیں۔ تو نے سب بتادیا ذرا سی مار پڑتے ہی۔ میں نے کہا کہ ذرا سی مار نہیں جناب' وہ تو آنکھیں نکال لیتا میری۔ خصی کردیتا مجھے۔ پورا قسائی تھا وہ۔"

میں نے کہا "تم اسے پھر دیکھو گے تو پہچان لوگے؟"

"بالکل پہچان لوں گا جی۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی کو بھی اور اس قسائی کو بھی؟"

"قسائی کو دیکھا تھا میں نے جی مگر اس کی بیوی نے برقع اوڑھ رکھا تھا۔ پردے کے لیے نہیں' چہرہ چھپانے کے لیے۔ اسے نہیں پہچان سکتا میں۔"

مجھے کچھ اطمینان ہوا "یعنی تم نے اس کی صورت کی جھلک تک نہیں دیکھی؟"

فیکے نے نفی میں سرہلایا "دراصل۔۔۔ جب چار بندے میری مدد کے لیے اندر آئے تو میں بے ہوش تھا۔ ضرور وہ قسائی مجھے اٹھا کے لے گیا ہوگا۔ اس نے مجھے باہر لے جاکے گاڑی میں ڈال دیا۔ مجھے کچھ دیر بعد ہوش آگیا۔ میں نے دیکھا تو وہ برقع والی عورت آگے بیٹھی تھی۔ میں نے پیچھے رکھا ہوا مورتی کا سرا اٹھا کے اس کے سر پر مارا۔ یہی کرسکتا تھا میں اور کچھ نہیں تھا میرے پاس۔"

"کیا یہ وہی مورتی کا سر تھا؟" میں نے حیرت کی اداکاری کی "وہ گاڑی میں کیوں رکھا ہوا تھا؟"

"وہ اپنے ساتھ لائے تھے جی۔ مجھ سے پوچھتے رہے کہ یہ کس کا سر ہے۔ میں کیا بتاتا انہیں۔ ملک نے یہی بات پکڑلی کہ تو نے مورتی کا سر دیکھا ہے۔ تو نے اس ٹارزن کو بھی دیکھا ہے۔ اسے بھی جسے تو قسائی کہتا ہے۔ اب جیسے بھی ہو' انہیں تلاش کر۔ پتا لگا وہ کون تھے۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ میں ان کو کہاں تلاش کروں جی سارے شہر میں۔" وہ پھر رونے لگا "ایک دن اور ہے۔"

میں نے اسے چند منٹ دیئے اور پھر کہا "اس گاڑی کا نمبر ہی دیکھ لیتے تم تو کچھ امید تھی۔"

"مجھے اپنا ہوش کہاں تھا جی۔ پتا نہیں کیسے میں نے وہ مورتی کا سر اٹھالیا۔ اس عورت نے چیخ ماری تو میں گھبرا کے بھاگا۔ مجھے ڈر تھا کہ پھر نہ پکڑا جاؤں۔ وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ کسی سے پوچھ گچھ کے لیے۔ میرے لیے چلنا بھی مشکل تھا۔ تھوڑی دور بھاگا تو ایک موٹر سائیکل والے سے ٹکرا گیا اور پھر گر کے بے ہوش ہوگیا۔ گاڑی کا نمبر دیکھ لیتا تو بات ہی کیا تھی۔ میں نے تو جان بچا کے

شکر کیا۔ اب میں واپس کیسے جاؤں ملک کے پاس۔ ایک دن میں کیسے پتا چل سکتا ہے کہ جن کے پاس مورتی کا سر ہے وہ کون لوگ تھے اور کہاں رہتے ہیں۔ ملک بھی سمجھتا ہے یہ بات مگر میری بیوی ہے اس کے قبضے میں۔ میں نے دیکھا ہے عورت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے ایک عورت مرگئی ہی مگران جانوروں کو پتا نہیں چلا۔۔۔ اللہ میری توبہ۔۔۔"

فرید نے کہا "تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے' اس کے باوجود تم واپس نہیں جاؤ گے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "میرے جانے سے کچھ نہیں ہوگا جی۔ وہ میری بیوی کو چھوڑے گا نہیں۔ جیسے ماسٹر کی بیوی نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا پھانسی کے پھندے میں تڑپ تڑپ کے اور پھڑک کے جان دیتے' ایسے ہی مجھے مرنے سے پہلے وہ سب دیکھنا پڑے گا۔ وہ سب کچھ جو میں دیکھ چکا ہوں مگر دوسری عورتوں کے ساتھ' اپنی بیوی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتا جی۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو' میں کون ہوں؟"

"آپ۔۔۔ وہ اخبار والے ہو یا پھر اس کے کچھ لگتے ہو۔"

میں نے کہا "کس کی بات کررہے ہو تم؟"

اس نے کہا "کوئی لڑکی ہے۔ اخبار میں کام کرتی ہے۔ ملک رب نواز نے کہا تھا کہ اسے اٹھالو۔"

میں نے کہا "تم نام نہیں جانتے اس کا؟ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ آج شام سے رات تک تم اس کے پیچھے لگے رہے۔ گھر سے اخبار کے دفتر تک گئے اور تم کہتے ہو مجھے نام نہیں معلوم۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں جی۔ اپنے یتیم بچوں کی۔۔۔ یتیم ہی کہلائیں گے اب وہ۔ میں دو دن سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ میں نے دونوں بچوں کو ان کی خالہ کے پاس چھوڑا۔ سارا نقد زیور اس کے حوالے کیا کہ اگر میں واپس نہ آیا اور ان کی ماں بھی نہ آئی تو بڑے ہونے تک بچوں کے کام آئے گا۔ ایک لڑکی ہے تیرہ سال کی۔ لڑکا ہے سات سال کا۔" اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

فیکے نے مجھ سے اتنی مار کھائی تھی اور اس کے باوجود دوبارہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کے وہ مجھے پہچاننے سے قاصر رہا تھا۔ اس نے شبنم کو بھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ آج شام رئیس نے محض شک کا اظہار کیا تھا کہ ان دو میں سے ایک کا چہرہ مجھے دیکھا ہوا لگتا ہے جو شبنم کا انتظار آزاد صاحب کے گھر کے سامنے کررہے تھے۔ اگر وہ فیکا ہوتا تو رئیس اسے کسی شک و شبے کے بغیر پہچانتا اور اس کا نام بھی بتادیتا کیونکہ اس نے قسائی بن کے فیکے پر اپنی چھری سے خاصی دیر مشقِ ستم کی تھی۔ خود فیکا صرف رئیس ہی کو شناخت کرسکتا تھا جو میک اپ سے چہرہ بدلے بغیر وہاں گیا تھا۔

ابھی تک صرف میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی تھی کہ فیکے نے جان کے خوف سے یا باغی ہوکے ملک رب نواز کا کیمپ چھوڑا ہوگا اور اس نے اپنی وفاداری بدل کے ملک کے دشمنوں کے کیمپ میں پناہ لی۔ یہ حکمت اختیار کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہوگا کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے۔ ابھی تک اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ دشمن میں ہی ہوں مگر اس نے ملک کی ایک چال ناکام بنانے کی کوشش سے اس کے خلاف اپنی بغاوت کا آغاز کردیا تھا۔ اس نے اخبار والوں سے رجوع کیا تھا جو اس کے نزدیک ملک سے ٹکر لے سکتے تھے۔

میں نے کہا "فیکے۔ ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ مجھے یہاں بلانے کا مقصد کیا تھا؟"

"میں نے کب بلایا جی آپ کو۔ خود ہی آئے تھے آپ یہاں۔"

میں نے کہا "مگر تم نے کہا کہ تمہیں انتظار تھا میرا؟"

"ہاں جی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی آئے گا ضرور۔"

میں نے کہا "کیوں یقین تھا تمہیں کہ ایک اخبار والا یہاں آئے گا؟"

وہ بولا "پولیس بھی ہوسکتی تھی ویسے تو۔ جب میں نے اپنے بچوں کو ان کی خالہ کے پاس چھوڑا جی تو اس کے شوہر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آخر بات کیا ہے؟ میں نے ساری بات تو نہیں بتائی اسے' صرف یہ کہا کہ میری اور میری بیوی کی جان خطرے میں ہے۔ بیوی میرا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں۔ میں نے سوچا کم سے کم بچوں کو محفوظ جگہ پہنچادوں۔ اس نے بہت اصرار کیا کہ مجھے پولیس کے پاس جانا چاہیے تو میں نے کہا کہ دماغ خراب ہے تیرا۔ پولیس کیا کرسکتی ہے۔ وہ تو ملک رب نواز کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ہیں جی۔ اتنا مجھے چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے وہ' عوام کی جان ومال کے محافظ اور قانون کے رکھوالے۔ ملک کے نام پر وہ چپ ہوگیا مگر اس نے کہا کہ مجھے کسی اخبار والے کو سب بتادینا چاہیے' یہ بات میرے دل کو لگی۔"

"اس کے بعد تم نے شبنم سے بات کی؟"

شبنم کے نام پر وہ پھر چونکا "یہ شبنم کون ہے آخر؟ پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی نام لیا تھا جی آپ نے اس کا' میں سمجھ گیا۔"

مجھے غیر ارادی طور پر سرزد ہونے والی غلطی کا احساس ہوا "کیا سمجھے تم؟"

"جب اخبار کے دفتر فون کیا تھا میں نے تو ایک عورت سے بات ہوئی تھی میری۔ کیا وہی شبنم تھی' ہاں۔۔۔ شبنم ہی ہوگا اس کا نام جی!" وہ بولا۔

"کیا بات کی تھی تم نے اس سے؟"

"دراصل۔۔۔ ملک رب نواز کے کاروبار میں پہلے شاہ عالم بھی شریک تھا جی۔ آپ جانتے ہو شاہ عالم کو؟"

میں نے سوچ کے کہا "یہ وہی شاہ عالم تو نہیں جو سیاسی لیڈر تھا۔ پہلے مر گیا پھر زندہ ہوا۔ اب سنا ہے پھر غائب ہے؟"

"وہی۔۔۔ وہ اور ملک رب نواز مل کے بہت سے غیر قانونی دھندے کرتے تھے جی۔ جیسے ملک کا ہوتا تھا' اثر رسوخ شاہ عالم کا۔ وہ کاروبار سے اچانک الگ ہو گیا تو ملک کا بھٹا بیٹھ گیا۔ سنا ہے ایک کروڑ کا نقصان ہوا اسے۔ ملک نے اپنے دو شریک لگا دیئے تھے اس کے پیچھے۔ وہ شاہ عالم کو اغوا کرا لائے جی مگر شاہ عالم ان کے چنگل سے نکل گیا پھر ملک نے ان دونوں سے کہا کہ تم کہیں دفع ہو جاؤ۔ تمہاری شکل نظر نہ آئے کسی کو چھ مہینے ورنہ تمہارے بیوی بچوں کو پھر کبھی تمہاری شکل نظر نہیں آئے گی اس دنیا میں۔ وہ غائب ہو گئے جی اور اس شاہ عالم پر ملک نے ان دونوں کے قتل کا کیس کرا دیا۔"

"مگر شاہ عالم نے ان دونوں کو ڈھونڈ نکالا اور اخبار والوں کے سامنے زندہ سلامت پیش کر دیا" میں نے کہا "یہ سب پتا ہے مجھے۔"

"ملک کی تو ساری اسکیم فیل ہو گئی جی۔ اس نے ان دونوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ زیادہ غلطی عثمان کی تھی' پہلے اسے مروا دیا گیا۔ خادم بعد میں مارا گیا لیکن وہ شاہ عالم پھر بھی ملک کے ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے پاس ملک کا پیسہ بھی تھا اور کاروباری راز بھی۔ ملک کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔"

میں نے کہا "شاہ عالم تو روپوش ہے۔ کسی کو بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا۔ اب سنا ہے لندن میں ہے۔ دوسری شادی کر لی ہے اس نے۔"

فیکا چونکا "اچھا جی۔۔۔ ملک نے اس کی پہلی بیوی کے پیچھے بھی بندے لگائے تھے مگر وہ پتا نہیں کہاں ہے؟"

میں نے کہا "اسے تو شاہ عالم نے طلاق دے دی تھی۔"

"ہاں جی مگر ملک کا خیال تھا کہ شاید اسے کچھ پتا ہو شاہ عالم کا۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا "شاہ عالم سے اب اس کا کیا تعلق۔ کیا پتا اس نے بھی دوسری شادی کر لی ہو۔"

فیکے نے سر ہلایا "اس کی کوئی ماشوق تھی۔ اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ میں نے ایک دن سنا۔ ملک فون پر کسی سے کہہ رہا تھا کہ شاہ عالم کے ناجائز تعلقات تھے اس اخباری رپورٹر سے۔ بیوی کو طلاق ہو گئی مگر وہ ضرور ملتی ہو گی اس سے۔ بس اسے اٹھا لو' وہ بتائے گی شاہ عالم کا پتا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" فرید عباسی نے سوال کیا۔

"ابھی چار دن پہلے کی۔"

میں نے کہا "ذرا سوچ کے بتاؤ' وہ کس سے بات کر رہا تھا اور کیا کہہ رہا تھا؟"

فیکے نے کہا "یہ تو پتا نہیں جی کہ بات کس سے کر رہا تھا مگر اس نے کہا کہ ذرا خیال رکھنا۔ اخبار والوں سے پنگا لینا مہنگا پڑتا ہے۔ سب پیچھے پڑ جائیں گے ہمارے۔ اسے اغوا نہیں کرنا ہے۔ بھلا پھسلا کے لانا ہے' کسی بہانے سے۔ ایسے کہ کوئی بھی نہ دیکھے اور اس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہیں کرنی ہے۔ شرافت سے اس کو شاہدرے والی کوٹھی میں لے جاؤ۔ ہم خود بات کریں گے اس سے وہاں آ کے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ جگہ' یہاں لائیں گے اسے؟" فرید بولا۔

"شاہدرے والی کوٹھی تو یہی ہے جی۔"

میں نے کہا "اخبار کے دفتر فون کر کے کیا کہا تھا تم نے۔ یاد کر کے بتاؤ۔ کیا بات ہوئی تھی تمہاری اس عورت سے؟"

فیکے نے کہا "میں نے تو ایسے ہی اخبار اٹھایا اور جو فون نمبر لکھا ہوا تھا' آج اس نمبر پر بات کی تو دوسری طرف کوئی عورت تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے ملک رب نواز کے بارے میں ایک بات بتانی ہے۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو تو میں نے کہا کہ میرا نام فائق علی ہے۔ سب فیکا کہتے ہیں۔ وہ کہنے لگی کہ فائق علی کیا بات ہے؟ اطمینان سے بتاؤ۔ میں نے کہا کہ جناب' ملک رب نواز نے حکم دیا ہے کسی کو اغوا کرنے کا۔ وہ لڑکی اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے مگر مجھے اس کا نام نہیں معلوم اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کس اخبار میں ہے۔ وہ کہنے لگی کہ میں پتا لگا لوں گی۔ تم آگے بولو۔ میں نے کہا کہ جو میں نے سنا ہے وہی بتا سکتا ہوں۔ ملک کے آدمی اسے شاہدرے والی کوٹھی میں لے جائیں گے۔ اس نے شاہدرے والی کوٹھی کا پتا پوچھا۔ میں نے اسے فون نمبر بھی بتا دیا پھر وہ کہنے لگی کہ آخر ملک رب نواز اسے کیوں اغوا کرانا چاہتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے شاہ عالم کا پتا پوچھنا ہے کیونکہ

ملک کا خیال ہے وہ اپنی ماشوق سے ضرور ملتا ہو گا۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟" فرید نے پوچھا۔

"وہ بولی کہ ملک صاحب کا خیال ٹھیک ہے فیکے مگر تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ اگر ملک صاحب کو پتا چل گیا تو تمہارا کیا ہو گا؟ اس پر میں نے کہا کہ جناب' میں نے بہت مجبور ہو کے یہ قدم اٹھایا ہے۔ میرا جینا ویسے بھی مشکل ہے۔ میری بیوی ملک کے قبضے میں ہے۔ ملک مجھے بھی مروا دے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ میری مدد اخبار والے کر سکتے ہیں۔ اگر میں اپنی کہانی پریس کلب جا کے بتاؤں۔ وہ کہنے لگی کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔ تمہاری بیوی کو ملک کے قبضے سے چھڑانا میری ذمے داری۔"

"پھر تم گئے؟" فرید نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ میں گیا تھا۔ اسی نے اخبار کے دفتر کا پتا بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ میں نیچے فٹ پاتھ پر اس کا انتظار کروں۔"

"تم اسے پہچانتے نہیں تھے' کیا وہ تمہیں پہچان سکتی تھی؟"

"اس نے کہا تھا کہ میں گنے کے رس کی ریڑھی کے پاس سبھے کا سہارا لے کر کھڑا رہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میں نے بتایا تو اس نے کہا کہ بس اتنا کافی ہے۔ تم ٹھیک آٹھ بجے آ جاؤ۔ میں تمہیں وہیں ملوں گی۔ میں اپنا منہ کپڑے سے چھپائے ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا۔ میں پونے آٹھ بجے ہی پہنچ گیا تھا۔ پونے نو بجے وہ نہیں آئی تو میں مایوس ہو گیا اور یہاں آ کے چھپ گیا۔ میرے پاس ایک چابی تھی۔ اس جگہ کی۔"

"اب اس چابی کا ہم کیا کریں؟" میں نے کہا۔

"ہاں' یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا؟" فرید بولا۔

فیکے نے سر جھکا کے کہا "ہاں جی۔ پتا نہیں کیوں نہیں آیا کوئی یہاں۔"

فرید نے کہا "تم نے چھپنے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیوں کیا آخر؟"

میں نے کہا "تمہیں تو معلوم تھا کہ یہ جگہ ملک کی ہے؟"

فرید نے کہا "اور اس کے آدمی آ جاتے یہاں تو تم کیا کرتے؟"

"وہ جی۔۔۔ چھپنے کی جگہ بہت ہے یہاں اور ویسے بھی انہیں یہ خیال کیسے آ سکتا ہے کہ فیکا یہاں ہو گا۔"

"یار کوئی مقصد تو ہو گا تمہارے یہاں آنے کا؟"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا "میں نے سوچا تھا جی۔۔۔ کہ میں نے اخبار والوں کو سب بتا دیا ہے۔ ایک کو خبر ہو گئی تو سمجھو سب کو پتا چل گیا۔ وہ جو شاہ عالم کی ماشوق ہے شبنم۔ وہ بھی اخباری رپورٹر ہے۔ اس کے اغوا کی سازش کو ناکام بنانے اور اس کو بچانے کے لیے دوسرے اخبار والے بھی پیچھے پیچھے آ جائیں گے یہاں۔ ان سب کے سامنے میں بھی ملک کو پکڑوں گا۔ اخبار والوں کو بتاؤں گا کہ ملک کے قبضے سے میری بیوی کو چھڑائیں۔ میں ملک سے کہتا کہ اسے چھوڑ دے ورنہ میں اس کے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔ میں وہ سب کو بتاؤں گا۔"

میں نے کہا "اور تمہارا کیا خیال ہے کہ ملک ڈر کے تمہاری بیوی کو چھوڑ دیتا۔"

"وہ اپنی بدنامی سے بہت ڈرتا ہے جی" فیکا بولا۔

"جب۔۔۔ تم نے اخبار کے دفتر فون کیا تھا تو تمہیں شبنم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس اخبار میں ہے۔"

"نہیں جی۔ میں نے تو بس ایسے ہی جو اخبار سامنے آیا' اس پر فون نمبر دیکھا اور سوچا یہاں کسی کو بتا دوں۔ یہ تو بس اتفاق ہے جی کہ خود اسی سے میری بات ہو گئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کسی اور سے بات ہوئی ہے مگر مجھے اس کا نام نہیں معلوم تو کیا ہوا' اخبار والے سب جانتے ہوں گے کہ شاہ عالم کے تعلقات کس سے تھے۔ یہ لڑکی فوراً شاہ عالم کی ماشوق کو خبردار کر دے گی کہ ملک رب نواز تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور وہ تم سے شاہ عالم کے بارے میں پوچھے گا لیکن وہ پونے نو بجے تک نہیں آئی تو میں نے سمجھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ شاید ملک کے آدمی اس کو پہلے ہی اغوا کر کے لے جا چکے تھے۔ جس کو میں نے فون کیا تھا اسے میں شاہدرے والی کوٹھی کا فون نمبر اور پتا بتا ہی چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں انتظار کرنا چاہیے۔ جسے اغوا کیا گیا ہے اسے بھی یہاں لایا جائے گا اور خبر مل گئی ہے دوسرے اخبار والوں کو تو وہ بھی آ جائیں گے یہاں۔ جس لڑکی سے میری بات ہوئی تھی' وہ بھی آئے گی۔ عورت ذات اکیلی یہاں آنے کی ہمت نہیں کرے گی۔ کسی کے ساتھ آئے گی۔ آپ کو دیکھ کے میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی اخبار والے ہو' آپ کون ہو جی؟"

فرید نے کہا "ہم۔۔۔ ہاں' اخبار سے ہمارا بھی تعلق ہے۔"

جب فیکا بول رہا تھا تب بھی میں پوری طرح متوجہ نہیں تھا۔ میرے کان اس کی آواز سن رہے تھے اور میرے دماغ کا آدھا حصہ اس کی بات کو سمجھ بھی رہا تھا مگر باقی آدھا حصہ شبنم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ فون رکھنے کے بعد اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آزاد صاحب سے کہا ہوگا کہ میں جارہی ہوں ایک کام سے اور آزاد صاحب جزبز ہوئے ہوں گے تو اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا ہوگا کہ آپ فکر مت کریں' رئیس ہے میرے ساتھ۔ آزاد صاحب نے رئیس کا مطلب امیر لیا تھا مگر شبنم کی بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے اپنے پیچھے رئیس کے آنے کا علم تھا۔ وہ نیچے اتری۔ اتر کے اپنی گاڑی تک گئی پھر اس نے پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے کو دیکھا اور شاید یہ طے کیا کہ پیدل جانا ہی زیادہ مناسب رہے گا۔

کیا فیکے سے بات کرتے ہوئے اس نے پتا اور فون نمبر نوٹ نہیں کیا تھا؟ یا اس نے جس کاغذ پر لکھا تھا وہ اوپر ہی رہ گیا تھا؟ ٹیپ ریکارڈر اس کے بیگ میں رہتا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جب فیکے سے تفصیلی بات ہوگی تو ہر بات ریکارڈ کرلے گی۔ گاڑی کے پاس کھڑے کھڑے اس نے کسی مقصد کے بغیر' اپنی یادداشت کو چیک کرنے کے لیے یار رئیس کو بتانے کے لیے فون نمبر انگلی سے گاڑی کے شیشے پر لکھ دیا اور فیکے سے ملنے کے لیے چل پڑی۔

مگر اس کے بعد کوئی گڑبڑ ہوگئی۔ ایک تو وہ پچاس قدم کے فاصلے پر کھڑے فیکے تک پہنچنے سے قبل ہی غائب ہوگئی اور غائب ہونے کا مطلب وہی ہوسکتا تھا جو [illegible] تھا۔ فیکا اسے نہیں پہچانتا تھا اور وہ ویسے بھی اپنا چہرہ [illegible] سے چھپائے کھڑا تھا۔ اس نے کوئی گڑبڑ نہیں دیکھی۔ [illegible] غائب ہوتے نہیں دیکھا۔ شاید کوئی گاڑی خاموشی سے اس کے پاس آئی ہوگی' کسی نے اس سے پوچھا کہ شبنم' اخبار کا دفتر کہاں ہے؟ اور پتا معلوم ہونے سے پہلے اسے یوں گاڑی میں کھینچ لیا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگر کسی نے کچھ دیکھا بھی تو عافیت اسی میں جانی کہ دوسری طرف دیکھنے لگے اور انجان بن جائے۔ اب اغوا ہو یا قتل' چشم دید گواہ بننے کا رسک کون لیتا ہے؟

دوسری گڑبڑ یہ ہوئی کہ رئیس نے کچھ نہیں دیکھا۔ شبنم کی نگرانی پر مامور رئیس خان جائے واردات پر دستیاب ہی نہ تھے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر سے شبنم کا پیچھا کرنے والوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر یہ بات شبنم نے نوٹ کرلی تھی تو پھر یقیناً انہیں بھی پتا چل گیا ہوگا جو شبنم کے اغوا پر مامور تھے۔ تعاقب کرنے کے معاملے میں رئیس نے اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا۔ موبائل فون کے ذریعے ملک رب نواز کو بتادیا گیا ہوگا کہ پتا نہیں کون ٹیکسی میں ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔ کہیں وہ ہمارا کام خراب نہ کردے۔ اور ملک رب نواز نے انہیں یقین دلایا ہوگا کہ دخل در معقولات کرنے والے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اسے راستے میں ہی روک دیا جائے گا اور پھر شاید ایسا ہی ہوا تھا۔

یا شاید کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ رئیس جس ٹیکسی میں تھا اس کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا یا اس میں پیٹرول نہیں رہا تھا۔ دوسری ٹیکسی فوراً نہیں ملی تھی اور جب رئیس اخبار کے دفتر پہنچا تھا تو شبنم کی گاڑی موجود تھی مگر شبنم کا کوئی پتا نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد رئیس نے کیا قدم اٹھایا۔

فرید نے کہا "سر جی۔ اب بتاؤ کیا کریں۔ ایک بجنے والا ہے۔ کیا صبح تک بے وقوف بنتے رہیں گے ہم یہاں؟"

باہر سے رخشی نے ہارن دیا اور گاڑی سیدھی گزر گئی۔ ہر آدھے گھنٹے بعد فون کرتے کرتے وہ پریشان ہوگئی۔ فون کی گھنٹی کہیں ہاشم رضا کے گھر میں بجی ہوگی۔ اس کی آواز ہمارے کان نہیں سن سکتے تھے۔

فرید نے کہا "یار رخشی پریشان ہونے لگی ہے۔"

"کیا اسے معلوم ہے کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسے ساتھ لانے کی کیا تک تھی آخر۔ اسے تو ٹال نہیں سکتا تھا کسی طرح۔"

فرید نے سر ہلایا "یار' اس نے ایک ایسا زبردست فلمی ڈائیلاگ بولا کہ میرا پتھر دل پانی پانی ہوگیا۔ بہت جذباتی ہوں میں۔"

"ابھی سے دماغ اتنا خراب کردیا ہے اس نے تیرا؟" میں نے افسوس سے کہا۔

"عشق خانہ خراب میں خانہ آبادی تک ایسے ہی ہوتا ہے۔" وہ آہ بھر کے بولا "تو خود تو دیکھ' کہاں خراب و خوار پھر رہا ہے۔"

میں نے کہا "کیا پتا بھی بتادیا تھا اسے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ دروازہ بجانے لگے اور اٹھارے سارے محلے کو۔ یا دیوار پر چڑھنے کی کوشش میں گرے باہر اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے۔"

"اس سے میرے جذبات نہیں بدل سکتے۔ وہ لنگڑی ہوجائے یا کانی مگر تو فکر مت کر۔ اسے یہ جگہ معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "چل پھر اندر چلتے ہیں ورنہ وہ گلی میں ہارن بجا بجا کے درد جدائی کا اظہار کرتی رہے گی۔ فرط غم سے ہارن کی آواز بھی آہ لگتی ہے۔"

"مجھے تو گالی کی طرح لگتی ہے۔ جو وہ مجھے دے رہی ہوگی" فرید بولا۔

فیکے نے ہماری درخواست پر وہ دروازہ کھولا جس کا وجود

دو ملکوں کی سرحد پر لگی ہوئی خطرے کی زنجیر کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ یہ خیال مجھے غیر قانونی طور پر مقتول پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں قدم رنجہ فرمانے کے بعد آیا اور ایک چابی سے سارے دروازے کیسے کھولے جاسکتے ہیں اور ہمارے پیچھے پیچھے ملک صاحب کی سواری آگئی تو کیا ہوگا؟ انہیں خفیہ دروازے کا قفل کھلا نظر آئے گا تو وہ سمجھ جائیں گے کہ ان کا استقبال کرنے والے پہلے سے یہاں موجود ہیں۔

فیکے نے میرے سوالوں کا جواب یوں دیا کہ اندر جاتے ہی دروازے میں نصب قفل کو دوسری طرف چابی لگا کے پھر بند کردیا۔ ہم ایک تاریک ویران گلی میں کھڑے تھے جو ہاشم رضا کے گھر کے پچھلے حصے میں چوڑائی کے رخ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں کھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں سوگوار انداز میں بند تھے اور اندھیرا اس اجڑے گھر کے در و دیوار پر آسیب کی طرح مسلط محسوس ہوتا تھا۔ شاید یہ پروفیسر کے قتل سے منسوب حالات کا ذہنی ردِ عمل تھا اور اس میں خطرے کا احساس شامل ہونے سے مجھے خاموشی میں بھی خوف کی سرگوشیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ میرے اندیشے اب یقین کی صورت اختیار کرچکے تھے کہ شبنم کسی پریشانی میں گرفتار ہوگئی ہے۔

میرے اعصاب اس درجہ کشیدہ تھے کہ میں اپنے قدموں کے ساتھ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سن سکتا تھا اور میرے کان باہر کی آوازوں پر بھی لگے ہوئے تھے۔ ملک یا اس کے حکم کے غلام یہاں کسی وقت بھی پہنچ سکتے تھے اور سراغ رسی کے اس روسینٹک ایڈونچر کا قطعی غیر فلمی انداز میں اچانک ایک دردناک انجام ہوسکتا تھا۔

اندر کسی میوزیکل کلاک نے ایک گھنٹا بجایا تو میں نے کہا "ایک بج گیا رات کا۔"

"اچھا کیا رات کا بتادیا" فرید بولا "ایک تو پندرہ منٹ پہلے بھی بجا تھا۔"

میں نے کہا "تیری گھڑی آگے چل رہی ہے پندرہ منٹ۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ تو ایک مقتول پروفیسر کی گھڑی کو نہیں کہتا کہ وہ دس منٹ پیچھے ہے" فرید نے برا مان کے کہا۔

فیکے نے پلٹ کے ہونٹوں پر انگلی رکھی "شش۔۔۔" اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرکے دائیں طرف گھوم گیا۔ وہاں کوڑا کچرا ڈھیر ہو رہا تھا۔ خشک پتے اور کاغذ۔ پلاسٹک کی تھیلیاں اور تنکے ہمارے قدموں کے نیچے آواز کررہے تھے۔

اچانک فرید کا پاؤں سخت پلاسٹک کے کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے پر پڑا۔ میں اچھل پڑا۔ اس خاموشی میں مجھے پلاسٹک کے چٹخنے کی آواز یوں لگی جیسے کلاشنکوف کے برسٹ کی آواز۔

رخشی ایک بار پھر باہر سے ہارن بجاتی گزری پھر اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے یار۔ یہ آرام سے نہیں بیٹھ سکتی۔"

فرید نے اطمینان سے کہا "نہیں۔ یہ ہارن پر بم کی پکار ہے۔"

فیکے نے کہا "لو جی۔ اب ہم ادھر سے اندر جاسکتے ہیں۔"

میں نے کھڑکی کے بند پٹوں کو دیکھا۔ "وہ کیسے؟ بھوت کی طرح دھواں بن کے؟"

اس نے مسکرا کے اپنی قمیص اتاری "ابھی دیکھو آپ۔"

میں نے کہا "مسٹر فائق علی' کیا ہم سارے کپڑے اتار کے کاکروچ کی طرح سوئمنگ کرتے ہوئے کچن کی سیدھ لائن سے اندر جائیں گے؟"

فیکے نے قمیص کو ایک ہاتھ پر لپیٹ کر مکا مجھے دکھایا۔ اس وقت وہ ایک باکسر لگ رہا تھا جس نے صرف ایک ہاتھ پر دستانہ چڑھایا ہو پھر اس نے کہا "بسم اللہ" اور مکا کھڑکی کے شیشے پر اتنی احتیاط سے مارا جیسے تھانے میں "گیدڑ کٹ" کے ماہرین تفتیش کا آغاز کرتے ہیں یعنی اس مار کو جو دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی۔

شیشہ چٹخ گیا اور فیکے نے اس کے ایک ایک ٹکڑے کو بڑی مہارت سے الگ کرکے باہر نکال لیا پھر اس نے دوبارہ قمیص پہنی اور فاتحانہ انداز میں ایسے اندر داخل ہوگیا جیسے دشمن فوج کا سپہ سالار فصیل میں راستہ بنا کے شہر پر قابض ہوتا تھا "آجاؤ جی ایسے ہی آپ بھی" وہ بولا۔

فرید کے بعد میں نے بھی کہا "بسم اللہ" اور کھڑکی پر چڑھ گیا مگر ایک ہاتھ سے ریوالور سنبھالنے کی کوشش میں میرا توازن کچھ بگڑ گیا۔ میں آرام سے اندر اترنے کے بجائے مضحکہ خیز طریقے پر گرا مگر میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں" میں نے کپڑے جھاڑ کے اور مسکرا کے کہا۔

فرید نے کہا "یہ میدانِ جنگ نہیں' کچن ہے اور آپ گھوڑے سے نہیں' کھڑکی سے گرے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیکا اس گھر کے نقشے سے واقف تھا۔ اسے آگے رکھنا احتیاط کا تقاضا بھی تھا۔ فرید پھونک پھونک کے قدم اٹھاتا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے باوجود ہر قدم پر مجھے ڈر تھا کہ میرے پاؤں کسی لوٹے کو فٹ بال کی طرح کک نہ ماردیں یا ٹن سے میرے سر پر کوئی پتیلی نہ آگرے۔ ہاتھ لگنے سے شیشے کا گلاس یا چائے کا کپ ٹوٹ کے نہ بکھر جائے۔

ریوالور ہم دونوں کے ہاتھ میں تھے۔ ایک کیمرے کی نظر سے یہ منظر ذرا مختلف دکھائی دیتا۔ یوں لگتا جیسے فرید کے ریوالور کا رخ فیکے کی طرف ہے اور میں نے فیکے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔ اندر فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔

فرید نے آہستہ سے کہا "یہ گھنٹی کہاں بج رہی ہے فیکے؟"

فیکے نے کہا "اندر بج رہی ہے جی۔ کمرے میں۔"

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ کمرا کدھر ہے؟" فرید نے جھنجلا کے پوچھا۔

"آپ ادھر سے آجاؤ۔" فیکے نے کہا اور ایک دروازے کو دھکیل کر غائب ہوگیا۔

میں وہیں رک گیا "تو جا۔ میں کھڑا ہوں یہاں۔ ادھر سے کوئی آیا تو میں نمٹ لوں گا۔"

فرید نے دروازے کو پھر دھکیلا اور اندر چلا گیا پھر میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی۔ میں نے فوراً دروازے کو دھکا دیا "فرید۔ کیا ہوا۔ فیکے میں گولی ماردوں گا۔"

فرید نے کراہ کے کہا "کچھ نہیں یار۔ مجھے کیا پتا تھا یہ باتھ روم کا دروازہ ہے۔ ڈبلیو سی میں پاؤں پڑ گیا۔ آف۔ موچ آگئی شاید پاؤں میں۔"

میں نے کہا "ہمت سے کام لے اور خدا کا شکر ادا کر کہ تو منہ کے بل نہیں گیا اندر۔"

باتھ روم کا دوسرا دروازہ اسی بیڈ روم میں تھا جہاں فیکے نے ریسیور اٹھا کے ٹیلی فون کی گھنٹی کو خاموش کردیا تھا۔ "لو جی، آپ کے گھر سے ہے" اس نے ریسیور فرید کی طرف بڑھادیا۔ "آپ ہی ہونا فرید!"

"اور نہیں تو کیا تم ہو؟" فرید لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا "ہاں بھئی، ہاں بالکل ٹھیک ہوں میں۔ سب خیریت ہے ابھی تک۔ نہیں، کوئی نہیں لگی مجھے۔ پاؤں ذرا مڑ گیا تھا۔ تم یہ ہارن مت بجاتی پھرو گلی میں۔ لوگ سو رہے ہیں۔ ہاں پاؤں مڑا تھا۔ کیسے مڑا تھا؟"

فیکے نے مجھ سے پوچھا "فرید صاحب کی گھر والی رات کو گلی میں ہارن بجاتی پھرتی ہے، کیوں جی؟"

میں نے افسوس سے کہا "بے چاری INSOMNIA کی مریض ہے۔ کیا کرے آخر اگر رات کے وقت نیند نہ آئے۔"

فرید نے فون پٹخ دیا تھا "سچ کہا تھا تو نے، ایک مصیبت اپنے ساتھ لگالی میں نے۔"

"موقع ملتے ہی میں خاتون تک یہ بات پہنچادوں گا۔" میں نے کہا "کہ ان کی رفاقت کے بارے میں آپ کے جذبات کیا ہیں؟"

"آخر کب تک ہم اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے؟" فرید نے فیکے کو دیکھا جو ابھی تک حیران ہو رہا تھا کہ رات کو نیند نہ آئے تو لوگ یہ بھی کرتے ہیں؟

فرید کی بات کا جواب میں نے دیا "یہ ایک قومی المیہ ہے اور اس سوال کی بنیادی اہمیت پر ایک سیمینار ہونا چاہیے۔"

فیکے نے کہا "آپ میرے پیچھے آئیں۔ مجھے تو صاف نظر آرہا ہے۔"

"تمہاری آنکھیں کسی الو کی ہیں" فرید لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

"اور جو تمہاری جینوئن آنکھیں تھیں، وہ غلطی سے کسی الو کے لگادی گئی ہوں گی۔ اس وقت وہ زیادہ پریشان ہوگا" میں نے کہا "اسے کچھ نظر نہیں آرہا ہوگا اور وہ سمجھ رہا ہوگا کہ اسے شب خوری کی بیماری ہوگئی ہے۔ افسوس۔ کاش تم ایک الو کے جذبات کو سمجھ سکتے فیکے۔"

فیکے نے دوسرا دروازہ کھول کے جھانکا "یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔"

"نہیں بھی کوئی نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ کے سسپنس میں مبتلا ہیں۔ لائٹ جلانے میں کوئی حرج نہیں" فرید نے کہا۔

"فیکے۔ تم اپنی الوئی آنکھوں کی مدد سے باقی گھر میں دیکھ لو، احتیاطاً۔ لائٹ اس کے بعد جلانا" میں نے کہا۔

فیکے نے سر ہلایا اور اندھیرے میں مزید غائب ہوگیا۔ فرید نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کے اپنا پاؤں ہلانے لگا "اب کچھ بہتر ہے۔"

میں نے کہا "اس الو کی آنکھوں والے شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے ہمیں الو تو نہیں بنایا۔ بظاہر اس کی کہانی میں مجھے کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا۔"

فرید نے کہا "یار، اسکرپٹ اچھا ہو، ملک رب نواز کی

ہدایات ہوں اور فیکے جیسا ایکٹر ہو، تو جھوٹ پر سچ کا یقین کیا جاسکتا ہے۔"

فرید کا بیان حقیقت پسندانہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم فیکے کی قیادت پر بھروسا رکھتے ہوئے اچانک ایک دروازے سے کسی کمرے میں قدم رکھیں اور اچانک جیسے روشنی کا بم پھٹ جائے۔ ہم چندھیا جانے والی آنکھوں سے دیکھیں کہ ملک ایک کرسی پر یوں بیٹھا ہے جیسے مہمانِ خصوصی کرسیِ صدارت پر بیٹھتا ہے۔ اس کے پیچھے دو غلام یوں کھڑے ہوں جیسے بادشاہ کے پیچھے مور چھل ہلانے والے کھڑے رہتے تھے لیکن ان غلاموں کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہو۔ وہ سلطان راہی اسٹائل میں قہقہہ لگا کے کہے کہ آخر آ ہی گئے تم دام فریب میں۔ عقلمند جاسوس عرف عاشقِ جانباز۔ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو یہی ہوتا ہے۔

فیکا حقارت سے کہے "وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"اور شہر دور ہو تو شیر سے پنگا لیتا ہے۔" ملک کہے "تم نے ہم سے پنگا لیا تھا۔ ہمارے نمک خوار، الو کی آنکھوں والے فیکے۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟"

فیکا ہاتھ جوڑ کے کہے "خالی جانے۔ اس غلام کو اس کے پاؤں کی جوتی واپس کی جائے۔ جو آپ کے پاس ہے۔"

ملک گرج کے کہے "گستاخ فیکے۔ ہم کیا جوتی چور ہیں اور تیری دونوں جوتیاں تیرے پاؤں میں ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم تجھے سو جوتے لگوائیں اور پھر سو پیاز کھلائیں۔ اپنی آخری خواہش بیان کر۔"

"سرکار۔ میری مراد اپنی جورو سے تھی جس کا میں غلام ہوں۔ غلطی سے محاورہ بول گیا" فیکا اس کے پاؤں پڑ کر کہے۔

"اچھا۔ وہ۔ اسے ہم اپنی کنیزِ خاص بنا کے انارکلی کا لقب دے چکے ہیں فیکے۔ حرم کے اسٹاک سے کوئی اور چیز پسند کرلے۔ کوہ قاف سے ایک تاجر بالکل نیا مال لایا ہے۔"

"لیکن عالی جناب! وہ کیا ہے، نیا نودن پرانا سودن۔ علاوہ ازیں ایک سیکنڈ ہینڈ چیز آپ کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔"

"ارے پاگل دے پتر۔ زمین بھی سیکنڈ ہینڈ ہوتی ہے اور کیا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارے میں کہ وہ تمہاری کھیتی ہیں۔ چل اب بند کرا اپنی بکواس اور اس مجنوں کو باندھ دے کیلی کے ساتھ۔ اچھی طرح جوڑ کے۔ بے شک ایلفی بال کے جوڑ دے۔ اس دنیا سے اگلے جہاں تک ایک ساتھ رہیں گے اور یہ جو فرہاد پولس میں آگیا ہے تو اس کی شیریں کو بعد میں بلوالیں گے۔ اگلی فلائٹ سے ان کو بھی بھیج دیں گے اوپر۔"

اور ملک کے کلاشنکوف رکھنے والے غلام اس لطیفے پر ہنس ہنس کے پاگل ہو جائیں گے اور پھر یہ ہوگا کہ اس ویران گھر میں میرے ساتھ شبنم رہ جائے گی اور ایک آہستہ آہستہ قریب آتی تڑپا دینے والی موت کا انتظار رہ جائے گا جس کے بعد ہفتوں یا مہینوں ہمارے فراری ڈھانچے دریافت ہونے کے منتظر پڑے رہیں گے۔

یہ صرف ایک ہی منظر تھا جو میں نے اپنے تصور میں کسی فلمی سین کی طرح دیکھا۔ پھر میں نے ایک دھماکا سنا جو کسی کے فرش پر پاؤں پٹخنے یا منہ کے بل گرنے سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی فیکے نے کہا "ہائے رب جی!"

میں اچھل پڑا "یہ کیا ہوا؟"

"غالباً فیکے نے بھی کسی ڈبلیو سی میں قدم رنجہ فرمادیا" فرید نے ایک پُرحسرت خوشی کے ساتھ کہا۔

"نہیں۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ اس گھر کے جغرافیے سے بھی واقف ہے" میں نے ریوالور تان کے اسے اشارہ کیا "دال میں کچھ کالا ہے۔"

"اندھیرے میں دال نظر نہیں آئے گی۔ تو کالے کی بات کرتا ہے" فرید نے کمزور سے لہجے میں ایک عذر پیش کیا مگر پھر میرے ساتھ چل پڑا۔

ہم ایک دروازے سے گزرے پھر سامنے ایک دروازہ آگیا جو کھلا ہوا تھا۔ پورے گھر میں اب پھر وہی اعصاب شکن سکوت تھا جس میں فرید کی آخری آہ سے ذرا سی دیر کے لیے خلل پڑا تھا۔ اب فیکا بھی جیسے اندھیرے میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہوگیا تھا۔

فرید نے آہستہ سے کہا "فیکے۔ تم کہاں ہو؟"

میرا نے کہا "اگر اسی دنیا میں ہو تو جواب دو ورنہ میں گولی ماردوں گا تمہیں۔"

فرید آگے بڑھا اور میں نے اسے اچانک آگے جھکتا دیکھا۔ اس نے کہا "یہ کیا مصیبت ہے۔"

اس کے ساتھ ہی جیسے روشنی کا بم پھٹ گیا مگر چندھیا جانے والی نظر سے جو منظر میں نے دیکھا وہ میرے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ میرے سامنے کرسی پر ملک نہیں، شبنم رونق افروز تھی اور لائٹ جلاتے ہی اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے ہونقوں کی طرح فرش پر چت ہوئے فیکے کو دیکھا پھر فرید کو جو اس سے ٹھوکر کھا کے گرا تھا اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو آپ آ ہی گئے بالآخر" شبنم نے ہنستے ہنستے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں "شبنم۔۔۔ تم اور یہاں چھپی بیٹھی تھیں؟"

فرید نے غصے سے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔"

اب مجھے بھی طیش آنے لگا "یہ کس قسم کا مذاق ہے آخر۔ اتنی دیر سے ہم پریشان ہیں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

شبنم نے کہا "یہی اندازہ کر رہی تھی میں کہ تم کتنے پریشان ہو اور کتنی دیر میں پہنچتے ہو یہاں۔ اتنا واضح سراغ چھوڑ کے آئی تھی میں اور تم نے پھر بھی دو گھنٹے لگا دیئے' بڑے شرم کی بات ہے۔"

میں نے چلا کے کہا "کیا؟ انا تم ہمیں ڈانٹ رہی ہو۔ ہم جان ہتھیلی پر رکھ کے کتنی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں اور تم کو گلہ ہے کہ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"ہاں۔۔۔ ایک صاحب پولیس میں تھے۔ بالکل ٹھیک نکالے گئے۔ جائے واردات پر بھی ایسے ہی پہنچتے ہوں گے۔ جب ڈاکو مالِ غنیمت کو بیرونِ ملک کسی بینک میں ٹرانسفر کرا کے پاسپورٹ بنوا کے خود بھی نکل جاتے ہوں گے اور مقتول کی تدفین کیا سوئم' چہلم کی آخری رسوم بھی ختم ہو جاتی ہوں گی۔ تو یہ نکلتے ہوں گے تھانے سے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم نے کب دعویٰ کیا تھا کہ ہم شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کی جوڑی ہیں کہ سراغ ملتے ہی سیدھے پہنچ جائیں گے' جائے واردات پر۔ میں پانچ گھنٹے سے خوار ہو رہا ہوں" میں نے برہمی سے کہا۔

"اور میں ایک گھنٹے سے' رخشی کے ساتھ" فرید بولا۔

"اب یہ ریوالور اپنی جیب میں رکھ لو۔ ابھی تک میری طرف رخ ہے ان کا۔ کہیں غصے میں گولی نہ مار دو مجھے تم دونوں" شبنم بولی۔

فرید نے جھک کے فیکے کا معائنہ کیا "یہ زندہ تو ہے مگر اقدامِ قتل کا کیس بنتا ہے تم پر۔"

"یہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا آیا تھا۔ اب اس کی صرف سانس چل رہی ہے۔ کچھ پتا نہیں یہ ہوش میں آئے تو اس کی یادداشت جا چکی ہو۔ تم نے کیا مارا تھا اس کے سر پر؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں نے صرف ٹانگ اڑائی تھی اس کے پیروں میں۔ یہ الٹ کے گرا دروازے کی چوکھٹ پر اور پھر نہیں اٹھا" شبنم بولی۔

اب میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں عام قسم کا فرنیچر تھا۔ ہر چیز پرانی اور گرد آلود تھی۔ پروفیسر کے قتل ہو جانے کے بعد سے اب تک کسی نے بھی یہاں صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کمرے میں ایک بیڈ کے علاوہ چار کرسیاں تھیں۔ ایک دراز والی ڈریسنگ ٹیبل اور ایک الماری۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ہر دراز خالی تھی۔ الماری میں مقتول پروفیسر کے استعمال شدہ کپڑے بڑی ترتیب کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ بہت پرانے سوٹ تھے جو نئے سوٹوں کے مقابلے میں چھوٹے لگتے تھے۔ پروفیسر بعد میں جسمانی طور پر پھیل گیا تھا۔ وقت کے فیشن کے ساتھ بدلنے والی ٹائیاں الگ دھیر تھیں۔ کچھ بہت پتلی' کچھ بہت چوڑی۔ پروفیسر پرانے کپڑوں کو ناقابلِ استعمال سمجھ کے پھینکنے کا قائل نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ ہر فیشن تیس چالیس سال بعد لوٹ آتا ہے مگر آدمی کی عمر تو لوٹ کے نہیں آتی۔ بڑھاپے میں ساٹھ سال کا آدمی بیس سال کی عمر کے کپڑے پھر نہیں پہن سکتا۔

لائٹ جلا کے دیکھنے سے دوسرا کمرا پروفیسر مرحوم کی اسٹڈی ثابت ہوا۔ اس میں ایک خاصی بڑی لکھنے کی میز تھی جس پر بیش قیمت رائٹنگ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ خود رائٹنگ ٹیبل بلیک ٹیک وڈ کی بنی ہوئی تھی اور کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس پر رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ بھی امپورٹیڈ اور رائٹنگ سیٹ سے میچ کرتا ہوا تھا۔ جس کرسی پر وہ بیٹھتا تھا وہ بھی ہزاروں کی تھی۔

میں نے فرید کی توجہ اس طرف دلائی "تو نے دیکھا' پروفیسر کتنے ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ہر چیز نئی ہے اور بہت مہنگی ہے۔"

فرید نے سر ہلایا "باہر سے دیکھنے میں مکان اتنا عالی شان نہیں ہے مگر اندر کی آرائش سے تو لگتا ہے وہ پروفیسر نہیں کوئی اسمگلر تھا۔"

"اللہ اس کی مغفرت کرے۔ اگر وہ اس قابل ہو" میں نے کہا "مگر خود میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔ چھ مہینے صفائی نہیں ہوئی۔ اس لیے ہر چیز پر گرد نظر آ رہی ہے لیکن کوئی بھی چیز پرانی نہیں ہے یہاں۔ ایسا لگتا ہے استعمال ہی بہت کم ہوئی ہے۔"

فرید نے کرسی کو گھما کے دیکھا پھر ریک کی میز پر غور کرنے کے بعد اعلان کیا "یہ سارا فرنیچر اٹلی سے امپورٹ کیا گیا تھا۔"

میں نے غرا کے کہا "اگر تجھے معلوم تھا تو مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تو نے؟""

وہ بولا "بیڈ روم سیٹ بھی اسی کمپنی کا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسے منگوانے پر لاکھوں خرچ کیے گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "وہ منہ اور مسور کی دال۔ ایک پروفیسر کی یہ اوقات۔ نئی زمانہ قوم کے نونہالوں اور ہمارے مستقبل کے معماروں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے والے اساتذہ کو یہ ماہانہ شاہرہ دیا جا رہا ہے؟ مس شبنم سوال تم سے کیا گیا ہے؟"

"گریڈ سترہ سے آغاز کرنے والے کو چار ہزار کے قریب ملتے ہیں" شبنم نے کہا "ریٹائر ہوتے ہوتے آٹھ ہزار۔"

میں نے کہا "کوئی عقل کی بات کرو۔ اس سے زیادہ قیمت کی تو یہ کرسی ہے۔"

"یہ قلمدان' ٹیبل لیمپ' فون' ان سب پر جو زرد دھات کی چمک نظر آ رہی ہے۔ وہ پیتل نہیں ہے اصلی سونا ہے۔"

"آخر عورت کو ہر چمکتی چیز سونا کیوں نظر آتی ہے؟" میں نے کہا۔

"اور اپنے ذاتی شوہر کے سوا ہر حیوان عقلمند کیوں لگتا ہے؟" فرید بولا۔

"یہ سوال نصاب سے خارج ہے" میں نے کہا "شادی کے بعد پوچھا جا سکتا ہے بیوی سے۔"

باہر سے رخشی نے پھر دردناک سروں میں ہارن بجانا شروع کیا۔ اس کی پُرسوز آواز میں ہجر کی ساری تڑپ کو محسوس کیا جا سکتا تھا "یار' میں جاتا ہوں ورنہ یہ عورت سارے محلے کو جمع کر لے گی۔"

"سارا محلہ سر پر اس نے پہلے ہی اٹھا رکھا ہے" میں نے کہا۔

"تم بھی اب نکل چلو خیر و عافیت کے ساتھ۔ ایسا نہ ہو کوئی آ جائے۔ باقی تفتیش پھر کر لیں گے" فرید نے جاتے جاتے کہا۔

"فرید ٹھیک کہتا ہے۔ تمہیں فرار ہو جانا چاہیے" میں نے شبنم سے کہا "ورنہ فیکے کو قتل کرنے کے جرم میں تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

"تم دونوں کی گواہی پر؟" وہ بولی۔

"تم اعترافِ جرم کر چکی ہو۔ تم نے ٹانگ اڑا کے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ تمہاری ٹانگ ایک آلۂ قتل ہے جو جائے واردات پر پائی گئی۔ وجۂ قتل بھی بتا دو ورنہ پولیس معلوم کر لے گی۔"

شبنم نے کہا "تمہارے آنے سے پہلے میں نے دو گھنٹے یہاں تحقیق کی اور مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔"

"وہ میں نے دو منٹ میں معلوم کر لی ہیں" میں نے کہا۔

"اچھا! ذرا مجھے بھی پتا چلے" وہ مسخرا ڈانے کے انداز میں بولی۔

میں نے کہا "فیکے ایک وہ تاریخ کا پروفیسر تھا اور تاریخ کا قریبی تعلق ہے آثارِ قدیمہ سے۔ آثارِ قدیمہ کا تعلق ہے ان نوادرات سے جو دھڑا دھڑ باہر اسمگل کیے جا رہے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ پروفیسر کے یہ ٹھاٹ باٹ اس دولت کا نتیجہ نظر آتے ہیں جو اسمگلنگ سے کمائی گئی۔ چنانچہ پروفیسر ہاشم رضا کا تعلق ہو سکتا ہے کسی ایسے گروہ سے جو نوادرات باہر بھیج رہا ہو۔ وہ خود اسمگلنگ نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ جگہ ملکیت ہے ملک رب نواز کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پروفیسر کو ملک رب نواز کے مشیرِ خاص کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ قدیم اشیا کی تاریخی حیثیت کے بارے میں اپنی عالمانہ تحقیق سے ان کی مارکیٹ ویلیو کا تعین کرتا ہوگا۔ ملک ایک جاہل شخص ہے اور اسی لیے عوام کا منتخب نمائندہ ہے اور اس کا سیاسی مستقبل روشن ہے۔ ووٹ اور جہالت۔ سیاسی لیڈروں کے لیے بنیادی کوالی فیکیشن ہے۔ پروفیسر اسے بتاتا ہوگا کہ یہ سکہ کتنا پرانا اور کس دور کا ہے۔ یہ مورتی کس کی ہے اور گندھارا دور کی ہے تو کیسا ہے ملی ہے یا موہنجوداڑو سے۔"

شبنم نے کچھ خفیف ہو کے کہا "ویری گڈ اور کچھ۔"

میں نے کہا "اور یہ کہ اس کمرے میں جتنی کتابیں الماریوں میں نظر آ رہی ہیں' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پروفیسر علمی و ادبی ذوق رکھنے والا شخص تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر کنگال ہوتے ہیں اور نظر آتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد اسے جو رقم پینشن اور گریجویٹی کی صورت میں ملی' اس سے پروفیسر نے یہ مکان ضرور بنا لیا تاکہ باقی عمر کے لیے سر چھپانے کا آسرا ہو جائے اور گزر اوقات کے لیے پینشن ہو۔ شاید تھوڑی بہت آمدنی اسے ٹیوشن پڑھا کے ہو جاتی۔ ہماری سوسائٹی کے سیٹ اپ میں عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ جب پروفیسر نے یہاں مکان بنایا ہوگا تو یہاں زمین یقیناً سستی رہی ہوگی۔ ایک کنال زمین پر مکان بنانے کا خواب گلبرگ جیسی جگہ پر خواب میں بھی پورا نہ ہوتا لیکن بعد میں کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ پروفیسر کو ایک انتہائی پُرکشش معاوضے والی ملازمت کی آفر ہوئی۔ تعلیمی کیریئر کے مقابلے میں یہ غیر تعلیمی کام مالی طور پر اتنا فائدہ مند تھا کہ پروفیسر نے اپنے اصول اور نظریات بالائے طاق رکھ دیئے۔ ضمیر صاحب سے کہہ دیا کہ شٹ اپ ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ وہ تمام عمر حسرتوں سے یکی کہتا رہا کہ کہیں اور جا بسیں۔ اتنی جگہ کہاں دلِ داغ دار میں۔ اس داغ دار کا مطلب یہاں ماہانہ آمدنی لیا جائے۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواہشات کے ریوڑ کو آمدنی کے باڑے میں رکھا اور عزت کے ساتھ گھر کی دال مرغی برابر سمجھ کے صبر شکر سے کھاتا رہا۔

لیکن اب اچانک ہر خواہش اور ہر آرزو کی تکمیل اسے اپنی قوتِ خرید میں نظر آنے لگی اور عیاشی کی زندگی گزارنا اس کے اختیار میں ہو گیا۔ اس نے ملک رب نواز سے کہا کہ ٹھیک ہے جی' میری خدمات حاضر ہیں۔ قوم نے اس کے علم و فضل کی قیمت بہت کم لگائی تھی اور اس کی قدر نہیں کی تھی۔ سوسائٹی میں نتھو خاں کباڑی باعزت تھے کیونکہ وہ ہر شہر میں کباب بیچ کے کروڑوں کما رہے تھے اور ان کی خوبصورت کوٹھیاں اور کاریں شاندار تھیں۔ خوشیاں اور زندگی کے سارے مزے۔ دنیا کی ہر آسائش اور کائنات کی ساری رنگینی ان کے لیے تھی جو حافظ تھے مگر حلوے بیچ رہے تھے یا زمانے سے نرالی منطقی بناتے تھے۔ فنکار' اہلِ کمال اور صاحبانِ علم جس عزت پر ناز کرتے تھے' اب وہ قلم اسٹاروں' کرکٹ کے سپر اسٹاروں اور اسٹیج کے پھکڑ باز مسخروں کو حاصل تھی۔ پروفیسر کا کام بھی بہت آسان تھا۔ اس کے سامنے پرانی چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ اپنے علم کی روشنی میں تحقیق کر کے بتاؤ کہ اس کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور دنیا کے بازار میں اس کی قیمت سکہ رائج الوقت کے حساب سے کیا وصول کی جائے؟ پھر اس کے سامنے ایک اصل کے مطابق دس نقل رکھی گئیں اور اس نے ان پر ایک عالمانہ نظر ڈال کے بتایا کہ اصل اور نقل میں فرق ہے تو کیا ہے اور کہاں ہے؟ وہ فرق دور کر دیا گیا۔ پروفیسر نے باقی معاملات سے سروکار نہیں رکھا۔ حب الوطنی کے تقاضے کیا ہیں؟ ملک رب نواز جو کچھ کر رہا ہے' وہ قانونی اور اخلاقی اعتبار سے جرم ہے یا گناہ ہے' بقول شاعر

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

شبنم نے کہا "شعر اچھا ہے اور برمحل ہے۔"

"اور جو میں نے فرمایا وہ کیا ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" شبنم بولی "مگر میری تحقیق زیادہ مکمل ہے۔"

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "آگے سنو۔ پروفیسر کو اس کے کام کی قیمت ملتی رہی۔ اس نے لاکھوں کمائے۔ اس کا ثبوت یہ شاہانہ اسباب زندگی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس بارے میں میرے دو نظریات ہیں۔ ایک یہ کہ پیسہ دے کے ملک رب نواز نے اس کے ساتھ اپنے ملازموں جیسا برتاؤ رکھا۔ اس کے حکم کے غلام بھی پروفیسر کو زر خرید سمجھ کے اس پر حکم چلانے لگے اور وہ جسے تمام عمر سرکہ کے مخاطب کیا جاتا رہا' نوکے کا ملازم ہوا تو خود اپنی نظر سے گر گیا اور اس نے کسی مرحلے پر طے کیا کہ بس اب کافی ہے۔ پیسہ بہت کما لیا۔ مزید بے عزتی کرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ بس اب باقی عمر اللہ اللہ کرنی چاہیے۔ اپنے ادبی و علمی مشاغل پورے کرنے چاہئیں اور سکون سے جینا چاہیے مگر اب انکار اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ اضافی دولت کا لالچ بھی اسے مجبور نہ کر سکا تو شاید اسے ڈرایا دھمکایا گیا یا مارا پیٹا گیا اور احساسِ جرم و ندامت۔ ذلت و رسوائی' ضمیر کی خلش اور ذہنی دباؤ کے باعث بالآخر اس نے اپنی غلطی کا کفارہ جان دے کر ادا کیا۔ اس نے خودکشی کر لی یا پھر اسے قتل کر دیا گیا۔ ایک امکان یہی ہے کہ پروفیسر نے یہ جاننے کے بعد کہ ملک رب نواز تو سونے کی کان کا مالک بن گیا ہے لیکن اسے سونا نکالنے کی مزدوری دے رہا ہے۔ یہ مطالبہ کیا کہ اسے بھی حصے دار بنایا جائے۔ ہوس کی دلدل میں قدم رکھنے کے بعد آدمی اندر ہی اترتا جاتا ہے۔ ملک رب نواز نے کہا کہ پروفیسر' تیرے جیسے ایک نہیں' دس ملتے ہیں۔ تو کس خوش فہمی میں مبتلا ہے تو میرا ملازم ہے' پارٹنر نہیں ہو سکتا اور پروفیسر نے زیادہ ہوشیاری دکھاتے ہوئے اسے بے نقاب کرنے کی دھمکی دی۔ یعنی اسے بلیک میل کرنا چاہا تو اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کی کوٹھی اور سارا مال اسباب ملک کا تھا۔ ملک نے لے لیا۔"

شبنم نے میرے کندھے پر تھپکی دی "ماشاء اللہ سے ذہین ہو۔ ترقی کرو گے انشاء اللہ مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا۔"

"مسٹر جوسوں۔ ایک بنیادی نوعیت کا سوال تو تم نے کیا ہی نہیں مجھ سے۔ کہ میں یہاں کیسے آئی؟"

"تم یہاں آئی نہیں' لائی گئی تھیں۔" میں نے کہا "ملک رب نواز صاحب تم سے بقلم خود یہ دریافت کرنا چاہتے تھے کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ بے شک یہ بات انہوں نے اتنی شرافت سے نہیں پوچھی ہوگی اور تم نے کہا ہوگا کہ مجھے نہیں معلوم تو انہوں نے یہ نہیں کہا ہوگا کہ بہت شکریہ۔ آپ کو زحمت ہوئی۔"

"وہ مجھے زبردستی یہاں لے آئے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں پہلے۔ جب میں فیکے سے ملنے جا رہی تھی تو ایک

کار میرے قریب سے گزری۔ کسی نے پیچھے والا دروازہ کھول کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ وہ اس کام کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ فوراً میرے منہ پر ہاتھ رکھ کے آنکھوں پر الاسٹک بینڈ چڑھا دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ شور مچانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ باس مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد مجھے باعزت طور پر اور بحفاظت واپس پہنچا دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "انہوں نے باس کے بارے میں کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"سوال کرنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا چنانچہ میں نے نہیں کیا۔ وہ کہتے کہ پلیز شٹ اپ۔ ان کا رویہ شریفانہ تھا۔ یا غلط جواب دیتے۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ کے چلے گئے کہ آرام سے بیٹھو۔ شور مچانے یا فرار ہونے کی کوشش بے کار ہے۔"

میں نے کہا "تاہم تمہیں ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہے۔ پولیس سے یا کسی اور سے بات کرنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں' یہ بھی کہا انہوں نے؟"

شبنم مسکرائی "فون ضرور تھا یہاں مگر دو بے تھا۔ باہر سے کال آ سکتی تھی۔ یہاں سے کال جا نہیں سکتی۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے مگر تم نے یہ سوال کر کے خود کو بے وقوف ضرور ثابت کیا ہے۔ میں فون کر سکتی تو اتنی دیر یہاں بیٹھی تمہاری تشریف آوری کا انتظار کرتی؟"

"تمہیں میرا نہیں ملک رب نواز کی تشریف آوری کا انتظار تھا۔ آخر وہ کیوں نہیں آیا ابھی تک" میں نے پوچھا۔

شبنم نے کہا "تم اسے فون کر کے معلوم کر سکتے ہو' وہ بتا دے گا۔"

میں نے ایک آہ بھری "ہمیں کون گھاس ڈالتا ہے جی۔ اسے تو اشتیاق تھا تمہاری دید کا۔ تم سے ملاقات کا اور تم سے کچھ کہنے سننے کا۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ وہ نہیں آئے گا اب۔"

میں نے کہا "آزما لو۔ اس سے فون پر کہو کہ ملک صاحب ہم نے تو شبِ انتظار کاٹ دی آنکھوں میں۔ آپ نہیں آئے۔ کیا ہم مایوس ہو جائیں پھر دیکھو وہ کیسے سر کے بل آتا ہے۔ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندے۔ قسم اللہ کی۔"

"قسم اللہ کی یاد آیا' رئیس تھا میرے ساتھ۔"

"تم نے بتایا تھا آزاد صاحب کو اور وہ اس پر بھی خفا تھے۔"

"لیکن وہ گیا کہاں؟ کیا اس نے کچھ نہیں دیکھا تھا؟ میرا خیال تھا کہ وہ تمہیں بتا دے گا اور سب سے پہلے یہاں پہنچے گا۔"

میں نے کہا "پہلا مرحلہ تھا تمہیں تلاش کرنے کا۔ اب اس کو چل کے دیکھتے ہیں۔ کیا پتا وہ بھی ٹان کے سو رہے ہوں۔ رئیس خانے میں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شبنم بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ رئیس کو ذمے دار بنایا تھا میں نے اور وہ گھر سے آفس تک تمہارے پیچھے لگا رہا۔"

"آفس سے آتے وقت وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ جاتے وقت میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا" شبنم بولی۔

"پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ گھر سے تو چلا ہو تمہارے ساتھ مگر آفس نہ پہنچا ہو۔ اسے راستے میں ہی روک دیا گیا ہو۔"

فیکا دروازے میں کسی شرابی کی طرح ڈولتا ہوا نمودار ہوا۔ سر اس کے شانے پر یوں ہل رہا تھا جیسے گردن کے بیچ نکل گئے ہوں۔ "میں۔۔۔ میں گیا ہوں جی' اپنی گھر والی کو لے جانے۔"

میں نے کہا "وہ یہاں نہیں ہے فیکے۔"

"اوئے۔۔۔ ملکا۔۔۔ تو میری عزت تے۔۔۔ ہتھ پایا جے۔۔۔ میں نئیں چھڈنا تینوں۔" اس نے فرضی گنڈاسا ہوا میں لہرایا۔

میں نے کہا "فیکے۔ ہوش میں آ۔۔۔ بیٹھ جاؤ یہاں کرسی پر۔"

وہ ہکلایا "ہوش۔۔۔ ہوش میں تو آ جا ملکا۔۔۔ میری گھر والی۔۔۔ دے دے مینوں۔۔۔ میری اکلوتی بیوی۔"

شبنم نے تشویش سے مجھے دیکھا "یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "فلمی۔ اس کے دماغ پر اثر ہے چوٹ کا۔"

فیکے نے رونا شروع کیا "ویکی دوسری کہاں ملے گی مجھے۔ وہ تو ایک ہی نمونہ بنایا تھا رب نے میرے لیے۔"

شبنم نے کہا "کیا یہ پاگل ہو گیا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اثر عارضی ہوگا۔ دیکھو کہیں پانی ہو تو۔"

شبنم کچن سے پانی لے آئی "اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں؟"

میں نے فیکے کو پانی پلایا۔ "ڈاکٹر تو ایک سامنے موجود ہے مگر وہ کہے گا کہ مسٹر' آخر تم چاہتے کیا ہو؟ پہلے تم آئے تھے کہ گاڑی خراب ہے۔ تم نے فون کیا تھا کسی مکینک کو بلانے کے لیے۔ اب کہہ رہے ہو کہ مکینک کا دماغ خراب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"مذاق مت کرو۔ سر کی چوٹ کا معاملہ ہے۔"

"کس کے سر پر چوٹ آئی ہے جی؟" فیکے نے سوال کیا۔

"یاد کرو' تمہارے سر پر چوٹ لگی تھی۔ تم گر گئے تھے" شبنم نے کہا۔

"اچھا جی۔ کہاں گر گیا تھا؟ کوئے پر سے۔ یا کنویں میں؟ سر کہاں ہے میرا؟ کیا کنویں میں رہ گیا؟" اس نے ہاتھ گھما کے سر تلاش کیا اور پھر رونے لگا۔

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا فیکے۔ سر کو کچھ نہیں ہوا۔"

فیکے نے کہا "اوجی ملک صاحب۔ آپ بے شک میرا سر رکھ لو۔ مگر میری گھر والی دے دو۔"

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم فیکے کو اپنے ساتھ لے جائیں اور صبح تک انتظار کریں۔ اگر رفتہ رفتہ چوٹ کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے کسی نیورو فزیشن کے پاس لے جانا ضروری ہوگا۔ میں نے اس کی جیب میں سے تالے کی چابی نکالی اور شبنم نے لائٹس آف کر کے دروازے بند کر دیئے۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس ہو لئے۔

رات کے ڈھائی بجے تھے جب میں نے شبنم کو سہارا دے کے دیوار پر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ گلی میں اتری ہی تھی کہ فرید کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ ہماری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ چند منٹ کے بعد دیوار کے پیچھے سے اس کی آواز آئی "لائن کلیئر ہے۔"

میں نے فیکے کی طرف دیکھا "چلو۔ دیوار پر چڑھ کے اترجاؤ دوسری طرف۔"

اس نے سوچ کے کہا "ادھر کیا ہے؟ میری گھر والی؟"

"ہاں' شاباش۔ دیر مت کرو' ہمت ہے یا میں اٹھاؤں؟" میں نے کہا۔

وہ جواب دیئے بغیر ایک جست میں دیوار کے اوپر سے گزر گیا۔ میں نے اس کا شور سنا "اوئے۔ کون ہو تم۔ ملک کے بندے ہو سارے' تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" پھر میں نے دیوار پر سے اتر کے دیکھا تو فرید نے اسے دھکیل کر گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ پھر وہ خود اس کے ساتھ پیچھے بیٹھ گیا۔

"یہ تمہیں لے جائیں گے تمہاری گھر والی کے پاس" شبنم نے اسے تسلی دی۔

فیکے نے مزاحمت ترک کر دی۔ اس کی حالت میں کچھ بہتری آئی تھی۔ اب وہ مجھے ملک سمجھ کے مخاطب نہیں کر رہا تھا۔ اس کے سر میں مغز جھٹکے سے مل گیا تھا جس سے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا مگر اس کی یادداشت کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ جو بات اس کے ذہن پر مسلط تھی وہی اس کی زبان پر بار بار آ رہی تھی۔ وہ گول گول دیدے گھما کے سب کو دیکھ رہا تھا اور پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ رخشی نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔

میں نے کہا "فیکا تمہاری تحویل میں ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

فرید نے کہا "یار۔ اماں کو کیا بتائیں گے؟"

"کہہ دینا سالا ہے میرا۔ مجذوب ہے شروع سے۔ اس کی باتیں مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہیں۔"

شبنم ہنسی "انہوں نے پوچھا کہ سالے کی بہن کہاں ہے۔ پھر؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ جائیں گی۔ دیکھو اس کی صورت کتنی ملتی ہے رخشی سے۔"

رخشی نے خفگی سے مجھے دیکھا "باتوں سے تو تمہارا بھائی لگتا ہے اور عادات و اطوار بھی تمہارے ہیں۔"

فیکا سرہلانے لگا "سب بھائی ہیں میرے۔ ساری بہنیں ہیں۔ بس ایک گھر والی ہے۔ ... جیسی دوسری ہوتی تو میں دو کر لیتا۔"

شبنم کے ساتھ سڑک کی طرف چلتے ہوئے میری آدھی فکریں دور ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے میرا دل ناقابلِ بیان اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور میں یہ سوچتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ شبنم کے ساتھ ملک رب نواز جیسے فرعون صفت شخص کے غیر انسانی سلوک کی انتہا کیا ہو سکتی ہے جن کے لیے عورت کی عزت کوئی تصور ہی نہیں۔ عورت پاؤں کی جوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ دل بہلانے کے لیے ایک خوبصورت کھلونا جسے خریدا' پھینکا اور استعمال کے قابل نہ رہے تو توڑا جا سکتا ہے۔ رئیس کے لیے میں متفکر ضرور تھا مگر یہ جانتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ صدمہ بھی برداشت کر سکتا ہے کیونکہ اس کی زندگی حالات کی سختی جھیلنے اور مصائب کی آزمائش برداشت کرتے گزری تھی۔

شبنم نے اچانک کہا "خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں کیا؟"

"یہی کہ تم نہ ملتیں تو کیا ہوتا؟" میں نے کہا۔

"کیا ہوتا؟"

"پتا نہیں لیکن تم بہت ناگزیر ہو گئی ہو میرے لیے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں کوٹھے سے کود کے جان دے دیتا یا زہر کھا لیتا۔ مگر ایک ادھورے پن کے احساس میں مبتلا ہو گیا تھا میں۔ جیسے میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں یا آنکھیں نہیں رہیں۔ یا میں شاخوں سے اور برگ و بار سے محروم کر دیا جانے والا درخت ہوں جس کا صرف تنا رہ گیا ہو۔ جس کے لیے صحنِ گلشن میں کوئی بہار نہ ہو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "یہ کیسی باتیں کرنے لگے ہو تم۔"

ہاں' میں نے سوچا۔ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہوں میں آخر؟

"یہ کون سی زبان بول رہے ہو تم؟ یہ لہجہ کیسے اختیار کر لیا تم نے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" وہ چلتے چلتے رک گئی۔

میں نے کہا "تم جانتی ہو۔" اور اسے اپنے ساتھ کھینچ لیا۔

"نہیں۔ جس شاہ عالم کو میں جانتی ہوں۔ اس کا نام کچھ بھی ہو مگر وہ تو جذبات کی زبان سمجھتا ہی نہیں تھا اور تم بول رہے ہو۔"

"وہ کون سی زبان بولتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"سچ بتاؤں؟ وہ صرف جسم کی زبان سمجھتا تھا۔ غرض کے لہجے میں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی ہو۔ تم اتنا بدل گئے ہو۔"

"کیا تمہیں اچھا نہیں لگا میرا بدلنا؟"

"نہیں۔ اچھا لگا۔ بہت اچھا لگا۔ جیسے میں۔ جیسے میں مجبور تھی۔ تم مجھے کانٹوں بھرے پتھریلے راستوں پر چلنے کے لیے کہتے تھے اور میں چل کے آتی تھی مگر تم تو میرے قدموں کے نیچے پھول بچھانے لگے ہو" وہ سخت جذباتی ہو گئی تھی۔

میں نے کہا "وہ سب یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ جو نہیں رہا۔"

"ناصر۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواب ہو۔ وہ سب نہیں رہا۔ تو کہیں یہ سب بھی نہ رہے' تم پھر نہ بدل جاؤ۔"

میں نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا "زندگی کے سفر میں ہر قدم آگے بڑھتا ہے۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھو۔"

وہ مسکرائی "نہیں دیکھوں گی۔ اگر تم ایسے ہی میرے ساتھ رہو۔"

میں نے کہا "بالکل ساتھ ہوں میں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر۔"

"میں چاہتی ہوں تم ہمیشہ ڈرائیونگ سیٹ پر رہو۔ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں۔" وہ بولی "اردو میں یہ کہ میری زندگی کی گاڑی کا کنٹرول تمہارے ہاتھ میں رہے۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا "اور بھی اچھے ڈائیلاگ ہیں۔ میری جیون کی نیا کے تم ہی ماجھی ہو۔ میری زندگی کے گھوڑے کی لگام یا زندگی کے اونٹ کی مہار تمہارے ہاتھوں میں ہو۔"

اچانک مجھے اس بدمعاش فقیر کا خیال آیا جس نے مجھ سے ..... سو روپے ایڈوانس وصول کر لیے تھے۔ وہ باقی کے ..... چار سو وصول کرنے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے آگے پیچھے دیکھا لیکن اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ اس نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور ... سو روپے لے کر بھاگ گیا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اس نے زیادہ کا لالچ کیا تو مارا جائے گا۔

شبنم نے کہا "کیا دیکھ رہے ہو' چلو۔"

میں نے کہا "یہاں ایک فقیر تھا۔"

ساری بات سن کے شبنم ہنسی "چلو اچھا ہوا ورنہ وہ مجھے بھی مالِ غنیمت سمجھتا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ واپسی پر بات کروں گا اس سے۔ وہ مجھ سے باقی کے ... ... چار سو مانگنے آتا اور میں اس سے ..... سو بھی واپس وصول کر لیتا۔ غبیٹ' مجھے ڈاکو کہہ رہا تھا۔ وہ خود اور چوکیدار ایجنٹ بنے ہوئے ہیں ڈاکوؤں کے۔ کاش وہ مجھے مل جائے۔"

"مل جاتے تو کیا ہوتا" شبنم نے کہا "شاید وہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے۔ پھر کیا کرتے تم۔ تھانے رپورٹ لکھوانے جاتے ان کے خلاف تو کیا ثبوت پیش کرتے۔ انہیں تو سب پہلے ہی معلوم ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی بدقسمتی ہے اس قوم کی۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا محاورہ ختم کر دینا چاہیے۔ اب کوتوال ہی چور بھی ہوتا ہے بلکہ جو چور نہ ہو وہ کوتوال بن ہی نہیں سکتا۔ ہر سطح پر۔ ہر جگہ۔"

صبح یا آخر شب کے ساڑھے تین بجے تھے جب اور شبنم نے آزاد صاحب کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت اخبار کی آخری کاپی پریس میں بھیج کے کچھ پُرسکون تھے اور کرسی پر اکڑوں بیٹھے چائے کے مگ سائز کپ میں پاپے ڈبو کے کھا رہے تھے۔ سب ایڈیٹرز جا چکے تھے اور کاتب جواہر رقم اسی تخت پر سمت کے سونے کی تیاری میں مصروف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا جس پر دن میں وہ دوسرے معاونوں کاتبوں کے ساتھ کتابت میں مصروف نظر آتا تھا۔ صرف حیران صاحب جاگ رہے تھے جو بلحاظ عہدہ تو چپراسی تھے مگر اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ آزاد صاحب کے مصاحب و مشیر بھی ہو گئے تھے۔ ان دونوں میں کوئی بحث چل رہی تھی۔

"عقل حیران ہے ہماری۔ کیا آپ واقعی سیریس ہیں" حیران صاحب نے کہا۔

"وہ تو خیر مگر یہ کس قدر نامعقولیت کی بات ہے گویا۔ کہ آپ کسی وجہ کے بغیر اردو کے جملے میں انگریزی کے غلط کاوہ لگاتے ہیں۔ یعنی کہ بیوند۔ سیریس کا متبادل ہے سنجیدہ" آزاد صاحب بولے۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" حیران صاحب نے کہا۔

"حرج۔ لو میاں' ہم تم سے ایک سوال فرماتے ہیں گویا۔ اگر حرج نہیں اور اردو میں انگریزی ڈالی جاسکتی ہے تو پھر یہ عرض کرو کہ انگریزی کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کوئی ایسے کیوں نہیں بولتا کہ آر یو سنجیدہ؟"

"حضرت' ہم بات کر رہے تھے وزیر محبت اور وزیر محبت کی اور ہماری دلیل یہ تھی کہ محبت کام نہیں ہے۔"

"حیران صاحب یہی تو گویا اصل مسئلہ ہے۔ فی زمانہ یہ مشغلہ ہے یعنی' وہ کیا کہتے ہیں اسے HOBBY لیکن اردو شاعری کی رو سے تو یہ کل وقتی کام ہے۔ ہول ٹائم جاب۔ اب آپ غور فرمائیے مجنوں کے معاملے پر۔ کیا کرتا تھا وہ محبت کے سوا؟ کوئی اور کام تھا اسے؟"

میں نے کھنکھار کے کہا "آزاد صاحب' ہم آگئے ہیں۔"

وہ چونکے "اچھا؟ بھئی خوب یاد دلایا۔ ہم تو گویا بھولے ہوئے تھے کہ آپ ہی کا انتظار تھا ہمیں اور بڑی شدت سے تھا غالباً۔"

شبنم نے کہا "کس فضول بحث میں الجھے ہوئے تھے آپ۔"

"بھئی وہ۔ کیا کہتے ہیں۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ بحث اچھی ہے۔ تو ہم بھی اپنے حیران صاحب کو مزید حیران کرکے وقت کاٹ رہے تھے گویا۔ اب تم قائل کرو ہمیں دلائل سے کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے اور یہ اطوار کیا ہیں تمہارے۔ نہ آنے کا کوئی وقت نہ جانے کا۔ نہ غائب ہونے کا نوٹس اور نہ بازیاب ہونے کی خبر" انہوں نے خفگی میں ڈانٹنا شروع کیا۔

میں نے کہا "آپ خوب اچھی طرح خبر لیں اس کی پھر یہ بتائے گی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ بندہ اجازت چاہتا ہے۔"

شبنم نے کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا "دوسرے کی خبر لینے۔"

"تھوڑی دیر ٹھہرو۔ میں بھی ساتھ چلوں گی" وہ بولی۔

"ہاں۔ ایسے نہیں جاسکتے تم بھی گویا۔ ہم جو ڈانٹ رہے ہیں تو دونوں سے خطاب فرما رہے ہیں گویا" آزاد صاحب نے کہا "تمہارے دلائل پر ہم بعد میں غور فرمائیں گے۔ پہلے اس نامعقول لڑکی سے نمٹ لیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"میں نے ابھی کچھ نہیں کہا۔ آپ ہی بول رہے تھے۔"

"یہ بھی خوب یاد دلایا تم نے۔ کیا فرما رہے تھے ہم گویا۔ ہاں' ہماری تقریر کا موضوع تھا تمہاری حد درجہ غیر ذمے دارانہ روش۔ دیکھو میاں' ہم ذرا اپنا روزہ توڑ رہے ہیں۔"

حیران صاحب نے کہا "عقل حیران ہے آپ کی بات پر۔"

"آخر کیوں؟ بھئی یہ بریک فاسٹ ہے گویا اور بزبانِ انگریز۔ بریک کے معنی ہیں توڑنا اور فاسٹ کہتے ہیں روزے کو۔ تو غلط کیا ہوا' حیران ہونے سے کہیں بہتر ہوگا اگر آپ مزید چائے تعمیر کریں گویا۔"

"چائے بنانا صحیح ہے۔" حیران صاحب نے اعتراض کیا۔

"حول ولا قوۃ۔ بھئی کس درجہ جاہل شخص ہے۔ کہتا ہے عقل حیران ہے۔ عقل ہے کہاں حیران ہونے کے لیے گویا۔ میاں' گھر بناؤ اور گھر تعمیر کرنا۔ کیا غلط ہے۔ خیر کہنے کا مقصد یہ تھا برخوردار" وہ پھر ہم سے مخاطب ہوئے "تم ایک کام کرو ہمارا۔ جب تک ہم مصروف ہیں تم بولو ہماری طرف سے۔ خوب ڈانٹو اسے۔"

میں نے کہا "بول تو میں ایک گھنٹا سکتا ہوں لیکن حضرت باتوں کے بھوت باتوں سے کہاں مانتے ہیں۔"

"بھوت۔ کون ہے بھوت؟ کہاں ہے بھوت؟" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"میری مراد تھی شبنم سے۔" میں نے کہا "آپ یہ چھڑی استعمال کریں' دماغ درست کردیں اس کا۔ بہت آزاد ہو گئی ہے۔"

انہوں نے مجھے ٹوک دیا "بھئی آزاد تو ہم ہیں۔ بہت کا کیا مطلب۔ بس جتنے ہیں اتنے ہیں لیکن ہمارے لیے مؤنث کا صیغہ چہ معنی دارد؟ اچھی تم نے شبنم کے لیے مذکر استعمال

کیا تھا۔ بھوت ہم ہو سکتے ہیں یا تم۔ یہ تو ناتوں کی بھٹی ہوئی گویا۔"

میں نے کہا "حضرت' ایسے تو محاورہ غلط ہو جائے گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے "اچھا؟ بھئی وہ کیا ہے کہ گرامر ہماری بھی خاصی ضعیف و نحیف ہے۔ کمزور ہے گویا۔ ویسے بھوت بھی ہو تو میاں' لات مارنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ سخت بدتمیزی ہے۔ فٹ بال کو بھی لات مارنا گوارا نہیں کیا ہم نے کبھی چنانچہ بس والی بال کھیلتے رہے۔ خیر' اب تم عرض کرو کہ یہ جو سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات ہے تو کیوں ہے اور کب تک چلے گا آخر؟ ہم کیا کریں' اپنا نام تو بدل نہیں سکتے۔ تخلص الو کرلیں؟ رات کو اخبار کے لیے جاگتے ہیں' دن میں تمہارے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز کے باعث۔"

شبنم نے کہا "آپ موقع دیں تو میں کچھ بتاؤں؟"

آزاد صاحب نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر ہاتھ جھاڑے "لو اب تم بولو' بقول شاعر۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

شبنم نے انہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ غور سے سنتے رہے۔ درمیان میں حیران صاحب نے میرے اور شبنم کے سامنے چائے کا اتنا بڑا مگ رکھ دیا جسے ڈول کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں نے شام سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے اور شبنم بھی بھوکی ہوگی۔ میری درخواست پر حیران صاحب نے پاپوں کا ایک ڈھیر سامنے رکھ دیا۔

"لو میاں' پاپے چباؤ اور چائے کھاؤ" آزاد صاحب نے فرمایا۔

حیران صاحب نے فوراً اعتراض کردیا "چائے پینے کی چیز ہے' ایک مائع ہے۔"

"پھر یہ بنگالی کیوں کہتے ہیں' پانی کھاؤ' چائے کھاؤ۔" آزاد صاحب نے دلیل دی "اور غم کے بارے میں کیا خیال ہے گویا۔ یہ کھانے کی چیز ہے؟ اور یہ جو تم ہمارا سر کھا رہے ہو۔ اس کے بارے میں کیا کہو گے؟ ہم نے ایک خاتون کو سنا تھا جو دوسری کو کہہ رہی تھی۔ جا خصماں کھائی۔ تو وہ گویا شوہر کھاتی تھی؟ چائے کھانا جائز ہے۔ بس ہم نے کہہ دیا۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا۔ "تم بیٹھو اور آزاد صاحب کی سنو۔"

آزاد صاحب نے سر کھجایا۔ "پروفیسر ہاشم رضا۔ اس کے بارے میں ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں گویا۔ مقتول اور مرحوم ہونے سے قبل ان کی خاصی شہرت تھی۔ تاریخ اور تہذیب پر کچھ مقالے تحریر کیے تھے انہوں نے۔ جس پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی گئی تھی گویا' پہلے یہاں' پھر کہیں باہر۔ بقلم خود بھی ان سے ملے ہم کئی بار۔"

میں نے کہا "کیسا آدمی تھا یہ پروفیسر؟"

"حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا" وہ آہ بھر کے بولے "بہت نفیس ذوق رکھتا تھا شعر و ادب کا۔ وہ ایک جینئس تھا جو نصف پاگل سمجھا جاتا ہے گویا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ کیا ہے اپنے علامہ صاحب کا شعر۔ نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔ اس کی عملی تفسیر۔ عہدے اور اعزاز کی کبھی پروا نہیں کی۔"

میں نے کہا "عمر ساری فقر و فاقے میں کٹی ہوگی؟"

"ایسا تو گویا دستور ہے اس قدر ناشناس معاشرے میں۔ حکومت کی طرف سے نشانِ امتیاز وغیرہ بھی دینے کی پیش کش ہوئی گویا۔ لیکن وہ شرط رہی ہمیشہ اور میاں تم جانتے ہو بیوروکریسی کا رویہ۔ وہ عزت بھی دیتے ہیں تو خودی کو مقید رکھنے والی بات غلط ہو جاتی ہے۔ ایک وزارتِ ثقافت بھی ہے ہماری۔ اس کا وزیر بنانا چاہتے تھے ایک فوجی ڈکٹیٹر۔"

"اور اسی احسان کے بدلے میں یہ چاہتے ہوں گے کہ پروفیسر ان کے عہد کی تاریخ کو ان کی خواہش کے مطابق لکھے جیسے کہ شاہی مؤرخ لکھتے تھے۔"

آزاد صاحب نے اقرار میں سر ہلایا "اور یہ بھی کہ پروفیسر جہاں مہمانِ خصوصی ہو گویا وہاں جنرل صاحب کی جمہوریت پسندی اور بندہ پروری کے گن گائے۔ ان کو اکبر سے بڑھ کر علم دوست اور نوشیروان عادل سے زیادہ انصاف کرنے والا ثابت کرے۔ قوم کے حق میں ان کو رحمتِ خداوندی قرار دے جیسا کہ سب مشیر وزیر کرتے ہیں۔ سرِعام اور گویا ٹی وی پر بطور خاص۔ پروفیسر کی کھوپڑی الٹی تھی۔ وہ تاریخ کے جھوٹ کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ سچ کہتا تھا گویا کہ تاریخ بے حد مظلوم ہے۔ عورت سے بھی زیادہ اور وہ تاریخ کے جھوٹ کو بھی سامنے لاتا رہتا تھا۔ چنانچہ وہ تھا۔ کیا کہتے ہیں۔ معتوب و مقہور۔ درجۂ اول کے جہلا اور تھرڈ کلاس علما اس کے خلاف بیان اور فتوے جاری کرتے رہتے تھے۔"

"یعنی یہ انجام غیر متوقع نہیں تھا اس کا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ایک المناک واقعہ ہے گویا۔ پروفیسر کو قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینی پڑی۔ اس کی پینشن وغیرہ بھی روک لی گئی تھی۔ حق گوئی کا یہ رویہ کون برداشت کر سکتا ہے۔ ماضی کے سچ پر جو پردہ عقیدت پرستی کا پڑا ہوا ہے' اسے اٹھانا بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کفر ہے گویا۔ تو پھر حال کی سچائی 'نعوذ باللہ۔"

میں نے کہا "دیکھئے' آپ پروفیسر ہاشم رضا کے بارے میں جتنا جانتے ہیں' وہ یقیناً اہم ہے لیکن زندگی سے زیادہ ان کی موت کے حالات جاننا چاہتا ہوں میں۔ قتل کے بارے میں خبریں کیا تھیں' پولیس کی رائے کیا تھی اور آف دی ریکارڈ معلومات کہاں سے مل سکتی ہیں پھر ان کے تحقیقی مقالے اور ریسرچ کے شعبے میں ان کی تصانیف سے بھی دلچسپی ہے مجھے۔"

آزاد صاحب نے کہا "ہوں" اور پھر کچھ دیر مراقبے کی کیفیت میں رہے "تمہیں یہ شک تو نہیں ہے خدانخواستہ کہ ان کے درمیان کوئی تعلق ہے گویا۔ ملک رب نواز کے کاروبار' پروفیسر ہاشم رضا کے قتل اور اب شبنم کے اغوا میں؟"

میں نے دل ہی دل میں بے وقوفی کی باتیں کرنے والے آزاد صاحب کی ذہانت کا اعتراف کیا "کیا آپ کو ایسا محسوس نہیں ہوتا؟"

"ہم تو کچھ غنودگی محسوس کر رہے ہیں فی الوقت۔"

میں نے کہا "وہ گھر اب ملک رب نواز کی ملکیت ہے۔ کیا ہاشم رضا کے کوئی والی وارث نہیں تھے؟"

"تم یہ بھی نہیں جانتے گویا؟" انہوں نے میری جہالت اور کم علمی پر افسوس سے سر ہلایا "میاں برخوردار! ہماری طرح آزاد تھا وہ بھی۔ عقد اس کا ہو گیا تھا تاریخ اور تہذیب پر تحقیق وغیرہ سے گویا اور اس تحقیق کے بطن سے پیدا ہوئے اس کے علمی کارنامے گویا۔"

"آپ کا مطلب ہے۔ شادی نہیں کی تھی اس نے۔ جذبات کے معاملے میں... خود بھی صاحبِ مدھ کے مجسمے کی طرح بے حس تھا پروفیسر!"

"یہ... تم آزار پہنچانے کے مرتکب ہو رہے ہو گویا۔ مرحوم کی روح کو۔ وہ اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا اور جمالیاتی حس بھی' موسیقی اور مصوری کا دلدادہ تھا اور میاں تم جو سمجھ رہے ہو نا کہ وہ کوئی آدم بیزار۔ بدحال' الجھے بالوں اور وحشت زدہ صورت والا مدقوق اور معنک شخص تھا۔ تو ایسا نہیں ہے۔ وہ طبقۂ اناشا۔ کیا مطلب ہوا اس کا برخوردار' طبقۂ اناشا کا؟"

میں نے کہا "خواتین۔"

"ہاں۔ پہلے لڑکیوں میں پھر شادی شدہ خواتین میں اور لال لگام والی بوڑھی گھوڑیوں میں اس کی مقبولیت قابلِ رشک تھی گویا۔ وہ بزلہ سنج اور خوش پوش نہیں تھا مگر کوئی بات تھی ایسی کہ اس نے شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ یعنی یہ روگ نہیں پالا ذمے داریوں کا اور بچوں کے مسائل کا۔ ایک عشق ضرور کیا تھا اس نے جو بڑا تباہ کن تھا اور کسی سے پوشیدہ نہیں تھا لیکن وہاں شادی کی راہ میں غالباً وہی حائل تھا' ظالم سماج... وہ خاتون کوئی اداکارہ تھی۔ نامور ہے آج بھی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ایک پروفیسر افلاطون کا عشق کسی پردہ سیمیں کی ساحرہ سے؟"

"وہ کیا ہے میاں بقول شاعر دلِ آنے کے دھنگ نرالے ہیں... تو وہ عشق دمِ آخر تک ساتھ رہا۔ پروفیسر خود شادی کے نام سے بھاگتا رہا اور وہ ہیروئن اس کے پیچھے بھاگتی رہی۔ الٹا معاملہ ہو گیا۔ نیلم نام تھا اس کا۔ تھا نہ کیا بات ہے' یہی نام ہے اس کا فی زمانہ۔"

اس نام کا اثر کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ ماضی کے تاریک نہاں خانوں میں جیسے کوئی سویا ہوا آتش فشاں پھٹ گیا۔ نیلم اس پروفیسر کے عشق میں مبتلا تھی؟ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر ملک رب نواز اسے چاہتا تھا اور مرتے وقت شاید اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس سے شادی کر لینا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ ماسی ہیر کا خیال تھا کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن حقیقت کا علم کسی کو نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی اور میری شناسائی کا ذمے دار ایک حادثہ تھا۔ وہ نشے میں گاڑی چلا رہی تھی اور میں شادو کی بے وفائی کے صدمے سے ہوش میں نہیں تھا۔ وہ ایک مہربان دل رکھنے والی' سلجھی ہوئی اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ میرے مقابلے میں زیادہ عمر کی عورت تھی۔ اس کی نجی زندگی کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کی ذات سے کوئی اسکینڈل بھی منسوب نہیں ہوا اور میں نے اس سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سنی جس سے کسی کے لیے اس کی چاہت یا پسندیدگی کا اظہار ہوتا۔ پسند تو شاید وہ مجھے بھی کرتی تھی مگر مجھے اس کے خلوص میں دوستی کی بے غرضی کے سوا کبھی کچھ محسوس نہیں ہوا۔ میں اس کے بہت قریب تھا مگر قربت کا یہ زمانہ ہی بہت مختصر تھا۔

شبنم نے میز پر پنسل بجائی "آپ کہاں گم ہو گئے یادِ ماضی میں؟"

میں نے چونک کے کہا "کہیں نہیں۔ بس یہ نام سنا تو وہ وقت یاد آیا۔ وہ لوگ یاد آئے' جو اب نہیں ہیں۔"

شبنم نے بڑی چالاکی سے موضوع بدل دیا "آزاد صاحب۔ اب میں کیا کروں؟"

"تم... بھی کچھ بھی کرو۔ ہم تو کہتے ہیں کچھ لڑکیوں لے کام بھی کرو گویا۔ وہ کیا ہے کہ... سینا پرونا کاڑھنا اور ور خانہ داری وغیرہ۔" وہ بولے۔

"میرا مطلب تھا کہ ملک رب نواز سے بات کروں میں یا یں؟"

"کیا بات کرو گی تم عزیزہ! یعنی یہ ایک مفروضہ ہے ابھی ک تمہارا۔ ثبوت کہاں سے لاؤ گی گویا کہ جو بھی ہوا' اس ں ملک رب نواز کا ہاتھ تھا؟"

میں نے کہا "بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔ ابھی ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ اس کا وہاں نہ پہنچنا بھی شکوک پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے صرف ملک رب نواز کو وث کرنے کے لیے کسی مخالف نے یہ حرکت کی ہو یا ابھی س نے جال پھیلایا ہو۔ وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ تمہارے پیچھے ور کون آتا ہے؟ تمہیں وہاں لے جا کے چھوڑ دیا گیا اور ہم سی دشواری کے بغیر تمہیں چھڑا لائے۔ ملک رب نواز اتنا کچھ کام نہیں کر سکتا۔"

"لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جس پر شک کیا جائے کہ ے نگرانی پر مامور کیا گیا ہو۔"

میں نے کہا "مجھے اس فقیر پر شک ہوتا ہے جس نے مجھ ے... سو روپے اینٹھ لیے۔ اس کے انداز و اطوار میں کوئی بات بھی جو فقیروں سے الگ کچھ غیر فطری لگتی تھی۔ میں قیروں کی نفسیات سے معاشیات تک سب پر سند کی حیثیت ھتا ہوں۔ ذاتی تجربے کی بنا پر۔"

"اگر ایسا ہوا... تو اب تک ملک رب نواز کو بہت اچھی پورٹ مل چکی ہوگی۔ اسے پتا چل گیا ہوگا کہ وہاں ایک وٹر کی آلٹو اور ایک شیراز کار میں کون آیا تھا۔ گاڑیوں کے مبر سے مل گئے ہوں گے۔" شبنم بولی۔

میں نے کہا "رائٹ۔ ایک گاڑی رئیس کی ہے۔ دوسری سابق سب انسپکٹر پولیس فرید عباسی کی۔ رئیس کے ساتھ کون رہتا ہے اور فرید کے ساتھ کون۔ یہ ملک رب نواز آسانی سے معلوم کر لے گا۔"

"مگر یہ صرف شک ہے تمہارا۔ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "ہاں۔ اسی لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کے اور دیکھ بھال کے قدم اٹھانا چاہیے۔ کیا تم میرے ساتھ چلنے کے ارادے پر قائم ہو۔"

"ہاں۔ یہاں اب کیا کام ہے میرا؟" شبنم نے کہا۔

آزاد صاحب نے اونگھتے ہوئے سر اٹھایا اور کالی سے ہاتھ ہلا کے فرمایا "بھئی' پھر آ جانا کبھی۔ جب بھی... وہ کیا ہے بقول شاعر عرصۂ فرصت کشاکشِ غمِ دوراں سے گر ملے۔ ہم تو یہیں ہوں گے مزار کے مردے کی طرح گویا۔"

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میرے ذہن میں بہت سے مسائل تھے لیکن سب سے اہم ہو گیا تھا رئیس کی پُراسرار گمشدگی کا مسئلہ۔ وہ آتی دیر تک میری خیر و عافیت سے لاتعلق صرف اسی صورت میں رہ سکتا تھا جب خود اس کی خیریت خطرے میں ہو اور آٹھ گھنٹے سے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

شبنم نے میری تسلی کے لیے کہا "رئیس مل جائے گا۔"

"ہاں مگر کب اور کہاں' زندہ یا مردہ۔"

"ایسا مت سوچو۔ چلو پہلے گھر جا کے دیکھ لیں" شبنم نے کہا۔

کسی یقین کی وجہ کے بغیر میں نے رئیس خانے میں اتر کے دیکھا اور آثار سے پتا چلانے کی کوشش کی کہ کیا گزرے ہوئے آٹھ گھنٹوں میں رئیس وہاں آیا تھا مگر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کے گیا تھا۔ میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اس کے لیے پیغام چھوڑا پھر یہاں لوٹ کے شبنم کے پاس آ گیا جو گاڑی میں میرا انتظار کر رہی تھی۔

"ہم اسپتال دیکھ لیتے ہیں" شبنم نے کہا۔

"اس کے بعد مردہ خانے۔"

"ابھی سے اتنا ڈیپریس ہونے کی ضرورت نہیں" شبنم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "ہم پولیس سے مدد لے سکتے ہیں۔"

"میں کیسے جا سکتا ہوں پولیس اسٹیشن۔"

"میں جاؤں گی۔ میں سارے اخباروں کے کرائم رپورٹرز کو پولیس والوں کے پیچھے لگا دوں گی۔ ملک رب نواز نے اسے روکا ہوگا۔ میرا مطلب ہے اپیل کے حکم پر میرا پیچھا کرنے والوں نے روکنے کے لیے قتل کرنا ذرا بھی ضروری نہیں اور اتنا آسان بھی نہیں۔ ممکن ہے انہوں نے رئیس کو ناک آؤٹ کر کے چھوڑ دیا ہو۔ اسے سڑک پر ٹکر مار کے گرا دیا ہو یا اغوا کیا ہو تو ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کر دیا ہو کہ یہ بندہ ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔"

"ایسا ہوا تو پھر بہت برا ہوگا شبنم۔ ملک رب نواز اسے پہچان جائے گا" میں نے کہا۔

"ملک رب نواز جانتا ہے رئیس کو؟"

"اب وہ اتنا گمنام نہیں رہا مگر ملک اسے تب سے جانتا ہے جب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ناصر عظیم کا دوست تھا۔ اس کے پاس رئیس کے ساتھ دشمنی کی ایک بہت پرانی ذاتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجہ ہے۔"

ہم نے سورج نکلنے تک چھ اسپتالوں میں شعبۂ حادثات کے رجسٹر دیکھے اور انہیں دیکھا جو زخمی حالت میں وہاں داخل تھے۔ وہاں پولیس بھی تھی لیکن پریس کارڈ کی ایک جھلک ہر رکاوٹ دور کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ ساری رات کی ذہنی اور جسمانی مشقت نے مجھے بہت تھکا دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ شبنم ساتھ نہ ہوتی تو میں کب کا ہمت ہار چکا ہوتا۔ اس نے میرا حوصلہ بڑھایا اور بعد میں ڈرائیونگ بھی اسی نے کی۔ وہ رات بھر جاگنے کی عادی تھی مگر اس کو دن میں بھی سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح مستعد رہی۔

دو اسپتالوں کے ساتھ مردہ خانے بھی تھے۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں وہاں بھی جھانک لوں۔ اسی خیال سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا کہ خدانخواستہ کہیں مجھے اچانک رئیس کی خون آلود شکستہ جسم والی اکڑی ہوئی لاش کسی سلیب یا لکڑی کے تختے پر نظر آگئی تو کیا ہوگا۔ میں اپنے آپ کو ایک جھوٹ کی خود فریبی سے مطمئن رکھے ہوئے تھا۔ میں اس سچ کو قبول کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ رئیس مرچکا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اپنے خلوص کی فراوانی سے مجھے مالا مال رکھنے اور اپنی رفاقت کو میری طاقت کا احساس بنا دینے والا دوست مجھے دنیا میں اکیلا چھوڑ کے جاسکتا ہے۔ اس کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔ میرے خیال میں یہ ناممکن تھا۔ رئیس اتنا خود غرض نہیں ہوسکتا کہ جب مجھے اس کی مدد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہو، وہ مجھے دشمنوں کے مقابلے میں تنہا اور کمزور کردے۔

صبح کا سورج نکلا تو ناامیدی کا سفاک اندھیرا زیادہ گہرا ہوگیا اور رئیس کی زندگی کا یقین ساتھ چھوڑنے لگا۔ میں نے اسے صرف بارہ گھنٹے سے نہیں دیکھا تھا مگر گزرے ہوئے کل کی بات بہت پرانی یاد کی طرح لگتی تھی۔ جیسے یہ بارہ دن یا بارہ ہفتے پہلے کی بات تھی جب رئیس بھی تھا اور بہت سے لوگوں کی طرح جواب نہیں رہے تھے۔

آخری اسپتال سے نکل کے شبنم نے کہا "ایسی رونی شکل بنا کے مت بیٹھو، چیئرا اپ۔"

"یعنی میں خوش اور مطمئن نظر آنے کی اداکاری کروں؟" میں نے کہا۔

"اداکاری کیوں، اب کم سے کم ایک بات تو ثابت ہوگئی کہ رئیس کو کچھ نہیں ہوا۔ اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

میں نے کہا "ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی حادثے کا شکار ہو کے وہ کسی اسپتال میں نہیں پہنچا۔"

"ناصر، میرا دل کہتا ہے کہ وہ مل جائے گا۔ ابھی ایک رات ہی تو گزری ہے، ہم تلاش کرلیں گے اسے۔"

میں نے کہا "تم بہت تھک گئی ہو شبنم۔ چلو تھوڑی دیر آرام کہیں بیٹھتے ہیں۔ تم نے بھی کل شام سے کچھ کھایا نہیں ہوگا۔"

"پاپے کھائے تھے، بھول گئے۔"

میں نے کہا "چلو کہیں ناشتا کرلیں۔ چائے پی کے سوچتے ہیں کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟"

سب اچھے ریسٹورنٹ ابھی بند تھے۔ حلوا پوری کے عوامی ناشتے کا آغاز ہر گلی اور ہر سڑک پر ہوگیا تھا مگر میں کہیں سکون سے بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم لکشمی چوک کے قریب تھے۔ وہاں کسی ہوٹل کے ڈائننگ ہال اور ریسٹورنٹ میں ناشتا بھی مل سکتا تھا اور گوشۂ عافیت بھی۔ شبنم نے لاہور ہوٹل کو ترجیح دی۔

ایک میز پر بیٹھنے کے بعد میں نے دو فون کیے۔ موبائل فون کی بیٹری گاڑی میں پوری طرح چارج ہوچکی تھی۔ کمال اسپتال میں میری بات کسی آر ایم او سے ہوئی جو رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے کرنل خان کے بارے میں پوچھا۔

آر ایم او نے کہا "کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ناصر عظیم ہے میرا نام۔ آپ مجھے ان کا بیٹا سمجھ سکتے ہیں۔"

"چلیے میں سمجھ لیتا ہوں" اس نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا "ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسی تھی لیکن وہ جا رہے ہیں یہاں سے۔"

"کہاں جا رہے ہیں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ آپ مس چاندنی سے پوچھ سکتے ہیں۔ جو واقعی ان کی بیٹی ہیں۔ میں آپ کو کیا بتاؤں" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

آر ایم او کی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا "اگر حالت وہی ہے تو چندا کہاں لے جا رہی ہے کرنل خان کو؟"

"شاید کسی بڑے اسپتال میں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "ہر بڑے اسپتال کا ہر بڑا ڈاکٹر دیکھ چکا ہے انہیں یہاں اور ضرورت پڑنے پر پھر آسکتا ہے۔"

"کیا پتا وہ باہر لے جانا چاہتی ہو؟"

میں نے کہا "باہر؟ کل تک تو کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ یہ کام تو وہ بہت پہلے بھی کرسکتی تھی۔ اب زیادہ مشکل ہے۔"

"مشکل کیا ہے؟" شبنم نے کہا۔

"باہر جانے کے سارے انتظامات کرانا۔ کرنل خان نے تو اپنا سب کچھ دے دیا اسپتال کو۔ چندا کے پاس کیا ہے؟ کیا وہ اکیلی لے جائے گی انہیں۔"

شبنم نے کہا "چلو، پہلے ناشتا کرو۔ آج دن میں کسی وقت وہاں جا کے معلوم کرلیں گے۔ انتظام تم بھی کرسکتے ہو۔"

"ہاں۔ بشرطیکہ چندا کو اعتراض نہ ہو۔"

"اسے کیوں اعتراض ہوگا؟"

میں نے کہا "بس ایسے ہی۔ کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہو رہا ہے اس کا آج کل" میں نے دوسرا نمبر فرید کے گھر کا ملایا۔ فون رخشی نے اٹھایا۔

"سو رہی تھیں تم؟"

"نہیں۔ سونے کی کوشش ضرور کی تھی۔ فیکا مسئلہ بن گیا۔ امی سے جھوٹ بولنا پڑا پھر فرید نے اسے نیند کی گولیاں دیں جو امی کبھی کبھی استعمال کرتی ہیں۔ اب وہ سو رہا ہے، رئیس کا کچھ پتا چلا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو نہیں چلا۔ میں نے شبنم کے ساتھ شہر کے سب سرکاری اسپتال دیکھ لیے۔"

"اس کا اسپتال میں ملنا ضروری تو نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر گم ہوجانے والوں کی تلاش کا کوئی تو نقطۂ آغاز ہونا چاہیے۔ دوسری جگہ تھانہ ہوسکتی ہے مگر رئیس کے لیے تھانہ بھی رئیس خانے کی طرح ہے۔ شروع سے اس کا دوسرا گھر اور پولیس والے اس کے سسرالی عزیزوں جیسے ہیں۔ وہ اتنا لاوارث بھی نہیں ہے کہ پولیس اسے جرم بے گناہی میں پکڑے اور پھر کسی سے رابطہ بھی نہ کرنے دے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ فرید کہاں ہے؟"

"وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ فیکے کا کیا کروں؟ سارا دن اسے کیسے سنبھالوں گی میں۔ وہ اٹھے گا تو پھر ہنگامہ کرے گا۔ اپنی گھر والی کے لیے پریشان ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کی حفاظت ضروری ہے۔"

"پھر تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ رئیس خانے میں تم اسے جب تک چاہو قید رکھ سکتے ہو۔ حفاظت کے لیے یا تفتیش کے لیے۔ یہاں بہت مسئلہ ہوگا، اسے روکنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں کچھ دیر میں۔"

اسی وقت شبنم نے سرگوشی میں کہا "ناصر!"

میں نے اس کی پُرخوف آنکھوں میں دیکھا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ میرے پیچھے کہاں دیکھ رہی ہے؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ لیا ہے میرے پیچھے؟"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "تم مت دیکھنا پلیز کے۔"

"نہیں دیکھوں گا لیکن مجھے بتا تو دو کہ میرے پیچھے آخر کیا ہے؟ کیا عالم ارواح سے تمہارا کوئی رشتے دار آگیا ہے یہاں؟ یا کوئی تم سے بھی زیادہ حسین لڑکی ہے؟"

"بالکل سیدھے بیٹھے رہو تاکہ میں تمہارے کور میں رہوں۔ کاؤنٹر پر ملک رب نواز کھڑا ہے۔ کلرک سے کچھ پوچھ رہا ہے" شبنم نے سرگوشی کی۔

میں نے اس کے سامنے تین انگلیاں ہلائیں "یہ کتنی انگلیاں ہیں؟ دو یا چار؟ تمہاری نظر کہاں تک صاف دیکھ سکتی ہے؟ آخری بار آنکھیں کب دکھائی تھیں؟"

اس نے مجھے آنکھیں دکھائیں "یقین نہیں میری بات کا تو جا کے مل لو اس سے۔ پوچھ لو اس سے کہ آپ ملک رب نواز ہی ہیں نا؟"

"مگر وہ یہاں۔ اتنی صبح؟ ملک جیسے لوگ صبح ہوتے سوتے ہیں اور پھر دوپہر کے وقت جاگتے ہیں۔"

"یہی تو مجھے بھی حیرانی ہے۔ اس نے ادھر دیکھ لیا تو مجھے پہچان جائے گا۔ تم سیدھے بیٹھے رہو نا۔ پتا نہیں کلرک کے ساتھ کیا بحث چل رہی ہے؟"

میں نے کہا "وہ اکیلا ہے؟"

"ویری گڈ سوال۔ ایک تو وہ اکیلا ہے۔ باڈی گارڈ بھی ساتھ نہیں آیا اندر۔ شاید گاڑی میں بیٹھا ہوگا" شبنم نے رننگ کمنٹری شروع کی "اس نے کپڑے بھی اچھے نہیں پہن رکھے ہیں۔ کچھ میلے ہیں اور بہت معمولی قسم کے۔ یعنی جیسے کلف لگے کھڑکھڑاتے سفید چیرمین کھدے کا شلوار قمیص کالی واسکٹ اور شملے والی پگڑی سر پر رکھے بغیر گھر سے نہیں نکلتی ہوگی ان کی سواری اس کے بجائے رنگین کے ٹی کا عوامی سوٹ ہے اور سر پر آج ٹوپی ہے۔ آخر کیوں؟"

میں نے کہا "ویری گڈ سوال۔ اگر اب بھی تم بضد ہو کہ وہ ملک ہے تو پھر اس نے بھی بھیس بدلا ہے۔"

"کیا میں اسے شرف ملاقات بخشوں؟ واپس جا رہا ہے وہ؟" شبنم ایک دم کھڑی ہوگئی۔

میں نے کہا "لعنت بھیجو اس پر۔ تم بیٹھ جاؤ آرام سے۔"

"موقع اچھا تھا۔ یہیں پوچھ لیتی اس سے کہ حضور نے طلب فرمایا تھا پھر کیا بھول گئے یا کوئی زیادہ اہم مصروفیت نکل آئی۔"

"اس سوال کا جواب جانے بغیر بھی میں ناشتا ہضم ہو جائے گا پھر کبھی ملک سے ملاقات ہوگی تو پوچھ لیں گے۔"

"اوکے۔ میں ذرا گیٹ تک جا کے دیکھ لوں۔"

مجھے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے زبردستی بٹھانا پڑا "اگر اس نے تمہیں پہلے دیکھ لیا پھر؟"

"اوہ۔ کیا جنگلی پن ہے" وہ اپنی کلائی کو ملنے لگی "یہ بھی خیال نہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہیں دیکھ کے ہوش بھواس گئے ہیں لوگ؟ اپنا کام چھوڑ کے سب ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔ خواتین کو کتنی غلط فہمی رہتی ہے اپنے بارے میں۔"

ویٹر ناشتے کے برتن لگانے لگا۔ شبنم کو مجبوراً چپ ہونا پڑا لیکن موقع سے فائدہ اٹھا کے وہ نکل گئی "ضدی لڑکی" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک تھا" شبنم پھر آ کے میرے سامنے بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی "ملک رب نواز یہاں کسی مشن پر اکیلا آیا تھا۔ گاڑی بھی خود چلا رہا تھا۔ معلوم ہے کون سی گاڑی تھی؟"

"وہ سوزوکی پک اپ جو مسٹر فائق علی عرف ٹوپہ چلاتے تھے؟"

اس کا ہاتھ رک گیا "پیر و مرشد۔ تم غیب کا حال جاننے ہو؟ دیوار کے آر پار دیکھ لیتے ہو؟"

میں نے کہا "یہاں شراک ہومز کے گھوڑے کی مثال دی جا سکتی ہے۔"

"کون تھا شراک ہومز کا گھوڑا؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی وہ گھوڑے کا بچہ تھا اور کون تھا۔"

"شراک ہومز گھوڑے کا بچہ تھا؟" شبنم نے سخت حیرانی کا اظہار کیا۔

مجھے ہنسی آگئی "اس نے ایک گھوڑے کا سراغ یوں لگا لیا کہ سوچنے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ اگر میں گھوڑا ہوتا تو اس صورت حال میں کہاں جاتا؟ جس جواب اس کے ذہن میں آیا تو وہ سیدھا وہاں پہنچ گیا جہاں گھوڑا ناشتا کر رہا تھا۔ گھر سے بہت دور ایک بہت خوبصورت گھوڑی کے ساتھ۔"

شبنم نے ایک ایسی چیخ ماری جو کچھ خواتین کا کرنے اور کچھ چھپکلی جیسی بے ضرر مخلوق کو دیکھ کے بلند کرتی ہیں چائے کے مگ میز پر اور سر کے میرے کپڑوں پر گرے۔

"اب کیا ہوگیا؟" میں نے رومال سے کپڑے صاف کیے۔ شبنم نے مجھے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے چائے والی رکھ کے اپنے بیگ میں سے میرا موبائل فون نکال لیا "ملک رب نواز کے گھر کا نمبر" اس نے ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

"لکھا ہوا تو تھا گیٹ پر، مجھے یاد نہیں۔"

اس نے مجھے انگلی ہونٹوں پر رکھ کے منہ بند رکھنے اور پھر ناشتا شروع کرنے کا اشارہ کیا "گھنٹی بج رہی ہے۔ ہاں۔۔۔ ہیلو، کون بول رہا ہے؟ میں سیکریٹری بول رہی ہوں حاجی اللہ رکھا قریشی کی۔ ملک رب نواز سے بات کریں گے حاجی صاحب۔ کیا۔۔۔؟ وہ سو رہے ہیں۔۔۔ گھوڑے بیچ کے سو رہے ہیں پھر بھی اٹھا دو۔ کیوں نہیں اٹھا سکتے؟ حاجی صاحب خود آ جائیں گے انہیں اٹھانے۔ تم جانتے نہیں حاجی صاحب کو۔ تمہارے ملک صاحب ہمیشہ کے لیے سو گئے ہوں تو اور بات ہے۔"

اس نے جس کے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شبنم نے ابھی ابھی ملک رب نواز کو یہاں دیکھا ہے تو وہ گھر پر سو کیسے سکتا ہے۔ ایک فون کال سے مزید تصدیق ہو گئی تھی کہ ملک رب نواز کسی کو بتائے بغیر کسی خاص مقصد سے صبح صبح لاہور ہوٹل پہنچا تھا۔

میں نے کہا "یا تو وہ کسی کو بتائے بغیر کسی خفیہ راستے سے نکلا ہوگا اور واپس اپنے کمرے میں پہنچ کے پھر سو جائے گا یا اس کا کوئی رازدار نمک خوار اور فرمانبردار ملازم سب جانتا ہے لیکن اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں پردہ داری کر رہا ہے۔"

شبنم نے کھاتے کھاتے سوچ کے کہا "کیا خیال ہے۔۔۔ اس کی بیوی کو فون کروں؟" اور پھر ہنس پڑی۔ "اسے تو معلوم ہوگا۔"

"شوہروں کے معاملات میں سب سے زیادہ بے خبر بیویاں ہی ہوتی ہیں، بے چاریاں۔"

"بے خبری کی بات نہیں، بھرم رکھتی ہیں شوہروں کی عزت کا۔ پتا سپ ہوتا ہے انہیں۔ یہ گھر کا نمبر تھا۔ ملک کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں کوئی ذاتی فون بھی ہوگا جس کا نمبر گنے چنے فیملی ممبر جانتے ہوں گے۔ افسوس کہ وہ معلوم نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "کیا فائدہ تمہارے اخباری رپورٹر ہونے کا۔ ایسے ہی خوش فہمی ہے تمہیں کہ تم بڑی توپ چیز ہو اور لوگ ڈرتے ہیں تم سے۔ رپورٹر ہوتے ہیں جو وائٹ ہاؤس کے اندر صدر محترم کی گفتگو ٹیپ کر لیتے ہیں۔"

"غصہ مت دلاؤ مجھے۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟ تم معلوم کر لوگی رب نواز کا پرائیویٹ فون نمبر۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔"

"شرط لگاؤ مجھ سے؟"

"ہوگئی۔" میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا "ایک مطالبہ پورا کرنا پڑے گا۔ جو بھی ہارے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا "مطالبہ ایسا ہونا چاہیے جسے پورا کرنا انسان کے بس کی بات ہو۔ کہیں الہ دین کے چراغ والے جن صاحب کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہ ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی "بالکل الٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔ یعنی بے چارہ جن سر کھجاتا رہ جائے کہ اب کیا کروں؟ اور تم اسے چنگی بجاتے میں پورا کر دو۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ شبنم نے مجھے ٹریپ کر لیا ہے لیکن جال تو خود میں نے بچھایا تھا "اوکے۔ مطالبہ غیر شرعی بھی نہ ہو۔"

"تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے ہار مان لی ہے۔ اب ہاتھ چھوڑو میرا یا ڈائیلاگ بولوگے کہ میں ایک بار ہاتھ پکڑ کے چھوڑتا نہیں۔"

میں نے جھینپ کے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شبنم نے پتا نہیں کہاں فون کیا اور بڑے میٹھے لہجے میں ایسی پھجے داریاں کرتی رہی کہ دوسری طرف میں ہوتا تو اس کے حکم پر یہ بھی معلوم کر کے بتا دیتا کہ مینار پاکستان کی تعمیر میں کتنی اینٹوں کا استعمال ہوا تھا۔

میں نے خطرے کو بھانپ کے کہا "یہ فاؤل پلے ہے۔ تم نے ایک حسن پرست مگر بے وقوف شخص کا جذباتی استحصال کیا ہے۔"

"طریقہ ہے اپنا اپنا" وہ بولی "اچھا، اب اٹھو۔"

ادائیگی کرنے کے بعد میں نے اسی کاؤنٹر کلرک سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جس سے کچھ دیر پہلے ملک رب نواز کچھ پوچھ رہا تھا۔

کلرک سوچ میں پڑ گیا "ملک رب نواز؟"

شبنم نے اپنی مسکراہٹ کا جادو چلایا۔ "ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے دیکھا تھا میں نے۔ وہ جو نیلے رنگ کے شلوار قمیص اور قراقلی ٹوپی میں تھے۔"

اسے یاد آ گیا مگر وہ شک میں پڑ گیا "آپ کیوں پوچھ رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں؟"

میں نے کہا "یار' ہم کوئی خفیہ پولیس کے بندے نہیں ہیں۔ مت بتاؤ اگر تم سمجھتے ہو کہ رازداری ایک پیشہ ورانہ اخلاقی مسئلہ ہے تمہارے لیے۔"

"رائٹ۔ کلائنٹس کے بارے میں کسی غیر متعلقہ شخص کو معلومات فراہم کرنا اگر تم غلط سمجھتے ہو۔۔۔" شبنم نے کہا "تو کوئی بات نہیں۔"

وہ بولا "ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ یہاں لندن سے کوئی پروفیسر ہاشم رضا تو آ کے نہیں ٹھہرے ہیں؟"

"پروفیسر ہاشم رضا؟" شبنم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

میں نے اپنے ردِعمل سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا "ہاں' مشہور مؤرخ ہیں وہ۔"

"مؤرخ نہیں۔ تاریخ داں۔" شبنم نے میری تصحیح کی "کتاب ابھی تک کوئی نہیں آئی ان کی تاریخ کے موضوع پر لیکن وہ تاریخ اور تہذیب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ایک سیمینار ہو رہا ہے یہاں آج سے۔"

"اس میں انہیں بھی آنا تھا" میں نے کہا۔

"سیمینار کرانے والوں نے مندوبین کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرانے کا انتظام نہیں کیا" ہوٹل کلرک نے ایک بہت معقول سوال کیا۔

"کیا تو ہوگا مگر سب کو معلوم نہیں ابھی" شبنم نے کہا۔

"یونیورسٹی سے پتا چل جائے گا۔ آؤ چلیں" میں نے شبنم کی طرف دیکھ کے کہا اور پھر کلرک سے مخاطب ہوا "اینی وے' تھینک یو۔"

ہماری باتوں سے کلرک مطمئن ہو گیا تھا "میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا یہاں نہیں ہیں۔ ان کے اصرار پر ریکارڈ چیک کر کے تصدیق کی تھی۔"

میں نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آ گئے۔ ملک کے پُراسرار مشن کا مقصد معلوم ہو جانے کے بعد صورتِ حال میں ایک ڈرامائی تبدیلی آ گئی تھی۔

"یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہو گیا" شبنم بولی۔

میں نے کہا "جذبات کنٹرول میں رکھو لڑکی۔ اتنا اچھلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مردہ زندہ ہو گیا۔ تمہیں حیرانی نہیں ہوئی؟"

میں نے کہا "پروفیسر کے ہمسائے ڈاکٹر نے جھوٹ بولا ہو' یہ تو مشکل ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اس وقت' وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔"

میں نے کہا "وہ بالکل نشے میں نہیں تھا اور ہوتا تب بھی ایک ایسی اسٹوری ساری تفصیلات کے ساتھ خود بنا کے نہیں سنا سکتا تھا۔ وہ تو مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں نشے میں ہوں۔ یہ کتنا سنسنی خیز انکشاف ہو گا اس کے لیے بھی کہ مقتول پروفیسر ہاشم رضا زندہ ہے اور لندن میں پایا جاتا ہے۔"

"کیسی اب تم اسے بتانے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ابھی فوراً تو نہیں مگر یہ دیکھو کہ اس کی گواہی اچانک اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ آخر اس نے کس کی لاش اٹھوائی تھی پروفیسر کے گھر سے۔ شناخت بھی اسی نے کی تھی اور ایک ڈاکٹر کی شناخت کو جھٹلانا آسان نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ ہمسایہ بھی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کیس کے بارے میں مزید معلومات ہم پولیس سے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"فی الحال ہم پولیس کو کچھ بتانے بھی نہیں جا رہے ہیں۔"

"آف کورس۔ ابھی رئیس خاں کی تلاش اور دریافت سے زیادہ اہم دنیا کا کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ میں اب تم کو گھر چھوڑ کے اپنے گھر جاؤں گا۔ تم نے رات بھر جاگ کے میرا ساتھ دیا۔ تم تھکی ہوئی ہو۔ بینھو گاڑی میں چلاتا ہوں۔"

"میں بالکل تھکی ہوئی نہیں ہوں۔"

میں نے اصرار کیا "نہیں' تم تھکی ہوئی ہو' تمہیں آرام کرنا چاہیے۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔ جب مجھے ضرورت محسوس ہو گی تو میں سو جاؤں گی۔ ابھی تو میں چل رہی ہوں تمہارے۔" اس نے دروازہ بند کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"میں بھی گھر جا کے نہا دھو کے ایک دو گھنٹے سونا چاہتا تھا" میں نے گاڑی چلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"تو سو جانا۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ میری وجہ سے جاگتے رہو۔ میں دوسرے کمرے میں بیٹھ کے یا لیٹ کے اخبار دیکھوں گی۔ نیند آئی تو سو جاؤں گی۔ تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی" وہ بدستور ہٹ دھرمی پر قائم تھی۔

پھر فون کی دبی دبی آواز بیگ میں سے سنائی دینے لگی۔ شبنم نے فون نکال کے کانوں سے لگایا "ہیلو۔۔۔ ہاں' اچھا۔۔۔! اچھا۔۔۔؟ چلو ٹھیک ہے' تھینک یو ویری مچ۔"

اس کے لہجے کی مایوسی سے میں نے ناکامی کا اندازہ کر لیا۔

"خاتون۔ آپ شرط ہار گئی ہیں۔"

"ہی نہیں۔ نمبر تو تھا ملک کے بیڈ روم والے فون کا مگر

اس نے وہ فون حال ہی میں منقطع کرا دیا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ تم کو ملک رب نواز کا پرائیویٹ نمبر نہیں ملا۔ اب میں کسی بھی وقت آپ سے کچھ بھی مطالبہ کر سکتا ہوں۔"

"خواہ مخواہ۔ نمبر ہوتا تو ملتا۔" وہ شور مچانے لگی۔

"دیکھو یہ بہانے بازیاں نہیں چلیں گی۔ نمبر نہیں تھا تو کہا کیوں کہ ہے اور بات صرف نمبر معلوم کرنے کی ہوئی تھی' نمبر معلوم ہوا ہے تو بتا دو ورنہ مطالبہ پورا کرو۔"

"کیسا مطالبہ؟" وہ حیران ہوئی "ابھی کون سا مطالبہ پیش کیا ہے تم نے؟ اور شرافت سے تو ہر بات مانی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا "اجی شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ ہم اپنا مطالبہ منوائیں گے بدمعاشی سے۔ وقت آنے پر۔۔۔ ہاں۔"

شبنم نے کہا "بدمعاشوں کے ساتھ بدمعاشی" اور ہنسنے لگی "دیکھیں گے۔"

میں نے کہا "شبنم۔ اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ شرط کے معاملے کا نہیں۔ اپنے ملک صاحب جب لاہور ہوٹل گئے تو انہیں یقین ہو گا کہ پروفیسر ہاشم رضا وہاں ضرور ملے گا اور اسی لیے رب نواز کی بحث ہوئی بکنگ کلرک سے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول پروفیسر لندن سے واپس لاہور کیوں آیا تھا؟"

"اس سلسلے کے چند اور سوالات پر غور فرمایئے۔ اگر وہ آیا تو لاہور ہوٹل میں کیوں نہیں ملا۔ ظاہر ہے' رب نواز ایسے ہی منہ اٹھا کے صبح صبح لاہور ہوٹل نہیں پہنچ گیا تھا۔ اسے پتا ہو گا کہ پروفیسر کا قیام وہیں ہے۔ اگر ملک کو بتائے بغیر پروفیسر نے اپنا پروگرام بدل دیا اور دوسرے ہوٹل میں چلا گیا یا وہ لندن سے آیا ہی نہیں تو اس کے بھی اسباب ہوں گے۔"

"ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے دوبارہ قتل کیے جانے کا ڈر ہو گا مگر کسی مقتول کو پھر قتل کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب صرف ایک ہے کہ وہ زندہ تھا۔ پہلی بار کسی اور کی لاش کو پروفیسر ہاشم رضا کے طور پر شناخت کیا گیا۔"

"جانتے بوجھتے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"کیا اس سے ڈاکٹر جنجوعہ پر سازش میں شریک ہونے کا الزام نہیں بنتا۔"

میں نے کہا "اس پر بعد میں غور کریں گے کہ اس سے شناخت میں غلطی ہوئی یا اس نے مجرموں کی مدد کی۔ ایک ڈاکٹر لائچ میں ایسا کرے' یہ ذرا مشکل لگتا ہے مگر اسے دھمکی دے کے ڈرا دیا جائے تو بیوی بچوں کی سلامتی کے لیے آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتا ہے کہ ہمسائے کی خاطر نیلی کی جان خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہو گی اور سچ کی خاطر زندگی کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ تو م اور ملک کی طرف سے شہید حق کا خطاب آج تک کسی کو نہیں ملا اور بفرضِ محال مل جائے تو اس سے کیا ہو گا؟ اچھی بھلی پریکٹس ہے۔ خوشی ہے اور خوشحالی ہے۔ اسے ایک لاحاصل سچ پر قربان کر کے میں خود قبر میں چالیٹوں یا اس کی پاداش میں بیوی یا بیٹی کی آبرو جائے۔ وہ بھی ایک ایسے پڑوسی کے لیے جس کو اب تک ہم صرف ایک عالم فاضل پروفیسر سمجھتے تھے مگر اس کے مراسم تو خطرناک مجرموں اور بدمعاشوں سے بھی ہیں۔ ایسی بے وقوفی نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہہ دیا کہ ہاں یہ پروفیسر ہاشم رضا ہے اور اپنی جان چھڑائی۔"

"یا ایسا کہنے کا معقول معاوضہ وصول کر لیا" شبنم نے کہا۔

"جو بھی ہو' پروفیسر چلا گیا لندن اور لوگ اسے بھول گئے۔ اب کسی وجہ سے وہ پھر پاکستان آیا۔ ملک رب نواز سے کوئی کاروباری بات کرنے یا اپنے اور ملک کے کاروباری اشتراک کی نئی شرائط طے کرنے۔ کوئی جھگڑا نمٹانے یا نیا جھگڑا کھڑا کرنے۔ وہ یہاں آیا اور ملک سے کہا کہ میں تم سے ملوں گا لاہور ہوٹل میں اور ملک رب نواز اس سے ملنے پہنچا۔ اب یہاں کئی مفروضات سامنے رکھنے پڑیں گے۔"

شبنم نے کہا "نمبر ایک یہ کہ ملک نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے جھگڑا ڈالنے والے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا مگر پروفیسر کو معلوم ہو گیا۔ نمبر دو' پروفیسر نے ملک رب نواز کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اپنی حفاظت ضروری سمجھی۔ اس نے لاہور ہوٹل کا کہا مگر ٹھہرا کہیں اور۔"

"رائٹ۔ مفروضہ نمبر دو۔ ملک نے اسے خود بلایا۔ یہاں ایک کاروباری بحران آیا ہوا ہے۔ پہلے شاہ عالم بزنس سے الگ ہوا اور لاکھوں کروڑوں کا بزنس چوپٹ کر کے غائب ہو گیا پھر خادم اور عثمان مارے گئے۔ اس کے بعد خان کارپوریشن کا راز فاش ہو گیا۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ پروفیسر کو ملک رب نواز نے ایک بار جھوٹ موٹ مرنے کے ڈرامے میں شریک کیا تھا اور اس قتل میں قاتل کوئی نامزد نہیں ہوا تھا۔ اس بار اسے سچ مچ قتل کر دیا جاتا تو کون پوچھتا۔ خیر' یہ مفروضات تو لامحدود ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قیاس آرائی سے کیا حاصل۔ جو بات سامنے آئی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ پروفیسر ہاشم رضا لندن میں سو فیصد زندہ ہے۔ وہ ملک رب نواز کے کھیل میں شریک ہے اور آج کل پھر پاکستان آیا ہوا ہے۔"

"وہ لاہور ہوٹل میں نہ سہی۔ کہیں اور ہوگا۔ ہم بھی اسے تلاش کرنا چاہیں تو ناممکن نہیں۔" شبنم نے کہا۔

"یہ بات میں کہنا چاہتا تھا۔ تمہیں کیا جلدی تھی آخر" میں نے کہا "آرام سے بات سنا کرو جب کوئی عقل کی بات کر رہا ہو۔"

"پہلے بتا دیتے مجھے کہ تم عقل کی بات کر رہے ہو آج" وہ بولی۔

گھر یعنی رئیس خانے کے خفیہ راستے والے تہ خانے پہنچ کے ایک دلچسپ صورتِ حال سامنے آئی۔ لاؤنج میں فیکا قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے سامنے تیمی مارخان اور چھوٹی دردناک پوز بنائے باادب بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے یہاں' فیکے! تم کب آئے یہاں۔"

"صاب' یہ مظلوم بشرا بھی صبح آتی" تیمی مارخان نے مجھے مطلع کیا "اپنا پُردرد اسٹوری سے ام کو بھی زار و قطار کرتی۔ اس کا اکلوتا بی بی صاب۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا فیکے سے بات کرنے دو۔ یہ اسٹوری معلوم ہے مجھے۔"

تیمی مارخان کو کچھ مایوسی ہوئی "ام اپنا گفتار بند کرتی۔"

فیکے نے کہا "مجھے بیگم صاحبہ نے پہنچایا یہاں' زبردستی۔"

"ورنہ تم کہاں جانا چاہتے تھے۔"

"میں اس ملک کو قتل کرنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔ اس کی کوٹھی جہاں میری گھر والی قید میں ہے" وہ پھس پھس کرنے لگا۔

میں نے کہا "دیکھو رونے سے یا بے وقوفی کی باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کیسے قتل کرو گے تم ملک کو آخر۔"

"میں۔۔۔ میں توپ سے اڑا دوں گا اسے پھر ٹکڑے کر دوں گا اس کے چھوٹے چھوٹے" اس نے دو انگلیوں سے ٹکڑوں کا سائز واضح کیا "اس کے بعد پیٹرول چھڑک کے آگ لگا دوں گا اور اس کی راکھ کو نالی میں بہا کے پیشاب کر دوں گا۔"

"آفرین ہے تم پر۔ تم بیوی سے بھی محبت کرنے والے دنیا کے پہلے اور آخری شوہر ہو" میں نے کہا۔

شبنم نے کہا "مذاق مت اڑاؤ اس کے جذبات کا۔"

میں نے کہا "میری طرف سے اجازت ہے۔ جاؤ فیکے' کارپوریشن کے دفتر کے سامنے زمزمہ رکھی ہے۔ بھٹیوں کی توپ۔ گولہ خرید لینا انارکلی سے۔ راستے میں کہیں سلطان راہی کا گھر آئے تو اس سے ٹوٹے ٹوٹے کرنے والا فلمی گنڈاسا ادھار لے لینا۔ پٹرول ملک سے ہی مانگ لینا۔ وہ کسی گاڑی میں سے نکال دے گا۔ آخری کام کے لیے تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے بعد اپنی گھر والی کے ساتھ آ جانا یہاں۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں اتنی دیر کچھ آرام کر لوں۔"

فیکا' جس نے تیمی مارخان اور چھوٹی کو اپنی لازوال محبت کی اور جدائی کی المیہ کہانی سے سخت متاثر کر لیا تھا' شرم سے پانی پانی ہو گیا "آپ ہی بتاؤ جی میں کیا کروں؟ اپنی گھر والی کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شبنم نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ سر کی چوٹ کا کیا حال ہے؟"

"بس جی' اللہ نے بچا لیا۔ آپ نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مجھے نوٹ کرنے میں۔" فیکا بولا۔

میں نے کہا "فیکے۔ تمہاری گھر والی ہم تمہیں ملک سے واپس ڈلا میں گے۔ تم ذرا صبر اور حوصلے سے کام لو۔"

"بہت مشکل ہے جی۔ صبر کیسے آ سکتا ہے مجھے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ میری بلبل کو ایک مردار خور گدھ نے پکڑ لیا ہے" وہ پھر رونے لگا۔

تیمی مارخان نے افسردگی سے سر ہلایا "دکھ سے اس کا دل پھٹ جاتی' جگر چھلنی ہو جاتی۔"

"کمرے فیل ہو جاتی۔ کان بند ہو جاتی۔ پھیپھڑے میں آنسو بھر جاتی" میں نے اس کی نقل اتاری "کیا خیال ہے' اسے کسی اسپتال کے آئی سی یو میں داخل نہ کرا دیں۔ بہت نازک ہے اس کی حالت تمہارے بیان کے مطابق۔"

شبنم نے کہا "بھئی' اس کی بیوی کو ملک کے قبضے سے چھڑانا اتنا آسان تو نہیں ہے مگر ہم کوشش کریں گے۔"

"گھر والی کے بغیر کیسے رہے گا جی یہ" چھوٹی نے کہا "دو دن میں کیا حال ہو گیا۔"

"دوسری گھر والی لا دیں اسے" میں نے طنز سے کہا۔

"کیوں فیکے؟ ایڈہاک بنیادوں پر ایک عارضی تقرری ہو جائے اگر اس اسامی پر۔ تمہارا کام چل جائے گا؟"

"چل جائے گا جی!" فیکے نے میری بات سمجھے بغیر کہا۔

شبنم ہنسنے لگی "فیکے' تم بھی پاگل ہو۔ پتا نہیں اتنا عرصہ تم ملک رب نواز کے ساتھ کیسے کام کرتے رہے؟"

"تم یہاں آئے کیسے؟" میں نے کہا "کوئی چھوڑ کے گیا؟"

"اپنے فرید صاحب آئے تھے جی۔ میں بھی انہی کے ساتھ آئی تھی شامت کی ماری۔ کیا پتا تھا یہاں آ کے پھنس جاؤں گی۔ یہ اکیلا بیٹھا تھا جیسے ویرانے میں الو بیٹھا ہوتا ہے نحوست مارا۔"

تیمی مارخان نے مونچھوں پر وارننگ کے انداز میں ہاتھ پھیرا "ابھی تم اپنا مادری زبان میں بکواس فرماتی۔"

"بکواس کیا' یہ کوئی جھوٹ ہے" چھوٹی نے چمک کے کہا "تیری اپنی شکل رونے والی ہو رہی تھی۔ ہائے صاب جی نہیں ہوتی' رئیس خان کا پتا نہیں ہوتی۔ گاڑی نہیں ہوتی' ام کیا کرتی کدھر جاتی" وہ مضحکہ خیز آواز میں تیمی مارخان کی نقل اتارنے لگی "اوپر سے آ گیا یہ فیکا اجاڑ صورت۔ نامرادوں کی طرح بیٹھا رو رہا ہے جو رو کو۔ یہ ڈھائی فٹا بھی سامنے بیٹھ گیا آنسو بہانے۔"

تیمی مارخان نے دہاڑ کے کہا "چوپ۔ قینچی کا اولاد۔ ام ایک دم آخری بار بولتی کہ تم بک بک اسٹاپ نہیں کرتی تو ہم۔"

"ارے چلّا مت۔ ڈگڈگی جتنا ہو کے بولتا ہے ڈھول کی طرح۔ پھٹ جائے گی آواز بھی۔ دھمکی کیا دیتا ہے مجھے' کیا کرے گا تو۔ بول" چھوٹی نے کمر پر ہاتھ رکھے اور سینہ سپر ہو کے کہا۔

"ام تمہارا مادری زبان کا جواب فادری لات سے دیتی۔"

"لات۔۔۔ ارے جا ظبورے۔ تو کیا لات مارے گا مجھے۔ قسم سے چیر کے الگ الگ کر دوں گی بیچ میں سے۔ آدھا ادھر ٹانگ دوں گی کیل پر آدھا اُدھر۔ پاجامے کی طرح دونوں پائنچے الگ نظر آئیں گے بغیر ازار بند کے" چھوٹی کی زبان کی نان اسٹاپ ٹرین رکنے پر آمادہ ہی نہ تھی۔

میری طرح شبنم بھی اس پیار بھری گفتگو سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ فیکا باری باری سر گھما کے کبھی چھوٹی کو دیکھتا تھا تو کبھی تیمی مارخان کو۔

"ایسے ہی میرے گھر میں کوئی تھی میری کوئل" اس نے آواز میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی "ورنہ الو بولتے تھے اس کے آنے سے پہلے گھر میں۔ میں اور میرا بھائی۔۔۔ اب پھر الو بول رہے ہیں۔ میرے دونوں بچے۔"

میں نے تیمی مارخان کو ڈانٹ کے بھگایا "چلو تم جاؤ کچن میں دیکھو۔ کیا ہے کھانے پکانے کے لیے۔ چھوٹی' آخر تم کیوں آئی ہو یہاں؟ صرف شور مچانے کے لیے۔ وہ ہم خود کافی کر لیتے ہیں یا تو خاموشی سے کچھ کام کرو ورنہ چلی جاؤ واپس۔ تیمی مارخان تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

ظاہر ہے وہ آتے ہی جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ لیلیٰ اپنے مجنوں کے ساتھ ایک دن پیار کے گیت گاتے گزارنا چاہتی تھی لیکن ان کا پیار لڑائی سے شروع ہو کے لڑائی پر ختم ہوتا تھا۔ میری بات پر وہ خاموشی سے سر جھکا کے اندر چلی گئی مگر یہ خاموشی مشکل سے پانچ منٹ برقرار رہی پھر اندر سے ان کی چخ چخ سنائی دینے لگی۔

فیکے کے دماغ پر چوٹ کا اثر پرائے نام ہی رہ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی سمجھا دیا کہ وہ ان تمام معاملات پر اپنی زبان بند رکھے جن کا تعلق ہمارے اور ملک رب نواز کے اختلافات سے تھا اور گزشتہ دن کے واقعات کو کسی حوالے سے تیمی مارخان یا چھوٹی کے سامنے نہ دہرائے پھر میں سو گیا کیونکہ مجھ پر تھکن غالب تھی۔

رئیس کے خیال کو ذہن سے نکالنا مشکل تھا۔ میں اس کی طرف سے سخت پریشانی کا شکار تھا لیکن نہ جانے کیوں مایوس نہیں تھا۔ کوئی اندر کی آواز تھی جو مجھے دلاسا دیتی تھی کہ اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسپتالوں اور مردہ خانوں میں دیکھنے میں بہت جلدی کی۔ وہ کہیں پھنس گیا ہوگا۔ کسی مشکل میں پڑ گیا ہوگا لیکن وہ گھبرانے اور ہمت ہارنے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس مصیبت سے نکل آئے گا۔

میری شروع کی نیند بے ہوشی جیسی تھی جس میں کوئی خواب مخل نہیں ہوا مگر صرف دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ لاشعور میں دبی ہوئی پریشانی نے ایک ڈراؤنے خواب کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے دیکھا کہ رئیس منہ پر سیاہ نقاب ڈالے پھانسی گھاٹ پر کھڑا ہے اور جلاد کے روپ میں ملک رب نواز اپنا ہاتھ لیور پر رکھے مسکرا رہا ہے ادھر میری طرف دیکھ رہا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ کیا وقت ہو گیا ہے جیلر صاحب۔ میں اسے گالیاں دے رہا ہوں کہ میں جیلر نہیں ہوں۔ تیمی مارخان نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کے جگایا تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس وقت میرے بدن پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور مجھے تیمی مارخان کا چہرہ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا "میں۔۔۔ میں جیلر نہیں ہوں" میں نے بکلا کے کہا "میں دوست ہوں رئیس کا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیس مار خان نے چلا کے کہا "صاب جی۔ آپ یکلخت بیدار ہوتی۔ فوراً ہوش پکڑتی' حواس پکڑتی۔"

میں نے خود کو سنبھال کے اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"صاب' آپ چل کے گفتار فرمائی۔ فون تشریف لاتی" وہ فرط جذبات میں اپنی آواز سے زیادہ کانپ رہا تھا۔ "رئیس خاں صاب' کا صدا آتی۔"

میری نیند کا خمار ایک دم غائب ہوگیا۔ میں چھلانگ مار کے بیڈ سے اترا "کیا۔۔۔ رئیس کا فون آیا ہے۔" میں نے چلا کے کہا اور جواب سنے بغیر ایک جست میں فون تک پہنچ گیا "ہیلو۔!"

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "ابے۔ کیا یہ سونے کا وقت ہے؟"

میں نے چیخ کر کہا "رئیس۔ تو۔ سور کے بچے' حرام زادے' الو کے پٹھے کہاں سے بول رہا ہے تو۔"

"اپنے منہ سے پیارے!" اس کی کمزور سی آواز آئی "اور گالیاں ہیں یا بس؟"

"فون پر جوتے نہیں مار سکتا۔ گالیاں ہی دے سکتا ہوں۔ کل سے میری جان سولی پر اٹکا رکھی ہے تو نے۔ ساری رات ہوگئی مجھے اور شبنم کو پریشان ہوتے۔ کہاں کہاں نہیں دیکھا ہم نے۔"

"ابے یار۔۔۔ میں کیا کرتا کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوگیا تھا" وہ بولا۔

"کیا مسئلہ ہوگیا تھا؟ ایک فون بھی نہیں کر سکتا تھا کسی سے؟"

اس نے کہا "قسم اللہ کی پیارے۔ اتنی عقل تو اپن بھی رکھتے ہیں لیکن تھی ایسی مجبوری کہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب غصہ چھوڑ۔ تو آجا فوراً گاڑی لے کر یا اسے بھیج دے۔ تیس مار خان کو۔"

"میں آجاتا ہوں مگر تو ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا "ادھر او کاڑے کی طرف آجا۔ درمیان میں ایک۔ پیٹرول پمپ ہے۔ شاہ جی کا پمپ مشہور ہے۔ ٹرک کھڑے ہوں گے بہت سارے اور پمپ کے پیچھے ہوٹل کے سامنے چارپائیاں پڑی ہوں گی۔"

میں نے کہا "پمپ تو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں مگر میں دیکھ لوں گا شاہ جی کا پمپ۔ پوچھ لوں گا۔"

"میں اندر کمرے میں لیٹا ہوا ہوں۔"

میں نے کہا "کیا ہوا ہے تجھے؟ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں پیارے۔ اپن کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یاروں کی دعائیں کام آجاتی ہیں ورنہ اپنی کون سی نیکی ہے۔ اللہ میاں پتا نہیں کیوں بچا لیتے ہیں بار بار۔"

میں نے کہا "کیا تو رو رہا ہے؟"

"نہیں یار۔ ذرا۔۔۔ بولنے میں تکلیف ہوتی ہے' تو آجا فٹافٹ۔"

میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا "زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا مجھے۔ کہیں جانا مت اور یہ جگہ جہاں تو لیٹا ہوا ہے' کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے یہاں یا ہے تو مجھے بتا دے۔"

"کیا کرے گا تو؟ ہوائی جہاز سے فوج اتار دے گا یہاں؟"

میں نے کہا "میں فرید سے کہہ دوں گا۔ وہ قریب کے کسی تھانے سے یا کسی گشت کرنے والی گاڑی کو بھیج دے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ یہ جو ہوٹل چلاتا ہے' ایک اچھا نیک دل صوفی ہے۔ اس نے بڑی مدد کی۔ اسے میں نے سمجھا دیا تھا کہ میرے پیچھے کچھ بندے لگے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے چھپا دیا ہے اندر۔ میں نے کہا کہ ایک۔ بہن ہے مجھ سے چھوٹی۔ وہ اخباری رپورٹر ہے۔ وہ آئے گی مجھے لینے کے لیے۔ اس کے سوا کوئی بھی مجھے پوچھے تو کچھ نہ بتائے۔ اس نے کہا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اندر نہیں آسکتا کوئی مائی کا لال۔"

میں نے کہا "بس کر۔ زیادہ مت بول۔ میں آتا ہوں شبنم کے ساتھ پھر فرصت سے کریں گے ساری باتیں۔"

"بات سن۔ میں نے اس صوفی سے وعدہ کرلیا ہے۔ کہ اس کے ہوٹل کے بارے میں چھوٹی سی خبر لگ جائے گی۔ تصویر کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں شبنم سے کہتا ہوں۔ وہ سو رہی ہے۔ رات بھر میرے ساتھ خوار ہوئی۔ بہت برا حال تھا تھکن سے۔ وہ ساتھ لے آئے گی کسی فوٹو گرافر کو" میں نے ریسیور رکھ دیا اور پلٹ کے دیکھا تو شبنم میرے قریب موجود تھی۔

"رئیس تھا؟" اس نے پُرمسرت لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ تم چلو میرے ساتھ۔ رئیس نے بلایا ہے" میں نے کہا۔

وہ بولی "یہ فوٹو گرافر والا کیا معاملہ تھا؟"

"میں بتاتا ہوں۔ تم منہ دھو لو کم سے کم۔ کپڑے بھی تمہارے کیسے ہو رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"سب چلتا ہے اپنے کام میں" وہ مسکرائی "کون دیکھتا ہے صورت کو اور کپڑوں کو' میں تیار ہوں۔۔۔ چلو۔"

میرے اصرار پر اس نے منہ دھو لیا اور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جب میں نے گاڑی نکالی تو اس نے بیگ سے برش نکال کے بالوں میں پھیرا پھر بیگ کے چھوٹے سے مرر میں دیکھ کے اپنی لپ اسٹک درست کی۔ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو مجھے رئیس سے معلوم ہوا تھا۔

شبنم نے دو تین جگہ موبائل فون سے بات کی۔ وہ سب پروفیشنل قسم کے فوٹو گرافر تھے جو ہنگامی صورت حال میں کسی بھی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ اچھی خبر اور اچھی تصویر حاصل کرنا ان کے پیشے میں کامیابی اور ترقی کی ضمانت تھا مگر یہ کوئی اہم ASSIGNMENT نہیں تھی۔ دو نے شبنم کے ذاتی کام کی بات سن کے بہانہ کردیا مگر تیسرا تیار ہوگیا۔ ہم نے اسے والٹن کی طرف ایک سڑک کے کنارے بس اسٹاپ سے پک کیا۔ وہ نوجوان اور جوشیلا لڑکا ابھی نیا تھا اور شبنم جیسی سینئر رپورٹر کے کام آکے اس کی سپورٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نام بابر وقار تھا مگر وہ بی وی مشہور تھا۔

"بی وی" شبنم نے اسے مجھ سے متعارف کرانے کے بعد کہا "یہ میرے دوست ہیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا "آپ کے دوست ہیں باجی تو اچھے کیسے نہیں ہوں گے اور پھر آپ کسی وجہ کے بغیر تو ان کو اچھا نہیں کہیں گی نا۔ مجھے معلوم ہے' یہ آپ کے لیے اچھے ہیں تو بس اچھے ہیں۔ میں وجہ نہیں پوچھوں گا آپ سے۔"

"اوہو۔ کتنا بولتے ہو تم؟" شبنم نے کہا۔

اس نے کہا "باجی بولنے تو دیتی نہیں ہیں آپ مجھے۔ اوپر سے کہتی ہیں بولتے بہت ہو۔"

"پتا نہیں تمہاری بیوی کا کیا بنے گا؟ اسے موقع ہی نہیں دو گے تم بات کرنے کا تو دم گھٹ کے مر جائے گی وہ" شبنم ہنسنے لگی۔

"باجی' ایک راز کی بات بتاؤں؟ میں شادی کروں گا ایسی لڑکی سے جو بولتی ہی نہ ہو۔ پھر اچھی گزرے گی لیکن یہ بتایئے گا مت ابھی کسی کو ورنہ جتنی باتونی لڑکیاں ہیں نا سب کٹ جائیں گی۔ ابھی سے ان کا دل توڑنا بھی ٹھیک نہیں۔ ویسے اچھی تو مجھے وہی لگتی ہیں۔ باتونی لڑکیاں' پٹاخ پٹاخ بولنے والی اور چھلبڑی ٹائپ مگر بڑی مشکل ہو جائے گی باجی میرے ساتھ تو۔ بیوی مجھے بی وی کہے گی۔ میں اسے بیوی کہوں گا۔"

"تم اس کام کے بارے میں نہیں پوچھو گے جس کے لیے میں نے بلایا ہے تمہیں؟"

"آرہا ہوں' اسی طرف آرہا ہوں میں۔ معاملہ پُراسرار لگتا ہے مجھے۔ خطرناک تو نہیں ہے نا؟"

"یہ پیشہ ہی خطرناک ہے مسٹر! ڈرتے ہو تو کوئی اور کام کرو۔"

"مشورہ صحیح دیا آپ نے مگر کیا کام کروں؟ اچھا تو ایک ہی کام لگتا ہے مجھے اور وہ ہے چوڑیاں پہنانے کا۔ پچھلی عید پر میں ایک دوست کے اسٹال پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک۔ تھپڑ پڑا مگر کوئی دس نے مسکرا کے بڑا اچھا RESPONSE دیا۔ پچاسی فیصد کو غیر معیاری پیداوار قرار دے کے میں نے گھاس نہیں ڈالی۔ باقی نے مجھے خاصی گھاس ڈالی۔ ابھی تک چر رہا ہوں۔"

"دیکھا تم نے۔ کیسے کیسے بدمعاش آگئے ہیں صحافت کی طرف۔ سارا سال یہ فوٹو گرافی کم کرتا ہے' دل فروشی زیادہ کرتا ہے۔"

"وہ ایک بار کیا شعر سنایا تھا آپ نے۔ فوٹو گرافی ہم نے سیکھی اسی لیے ہے۔"

میں نے کہا "سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔"

"رائٹ سر۔ یہی شعر تھا۔ میرے لیے ہی کہا ہوگا چچا غالب نے۔ کبھی دکان کھولی تو سائن بورڈ پر کچھ نہیں لکھوں گا۔ بس میری تصویر ہوگی اور یہ شعر۔ ہے نا اوریجنل آئیڈیا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ لڑکا بلیک میلر نہیں ہے ورنہ ایسے فوٹو گرافر کم نہیں ہیں جن کے پاس ماڈل بننے کی شوقین لڑکیاں آتی ہیں۔ فوٹو سیشن کرانے اور وہ انہیں ایسے پیشہ ور نہ مشورے دیتے ہیں اور ایسی ایسی تصویریں اتار لیتے ہیں ان کی کہ مت پوچھو۔"

میں نے کہا "اچھا نہیں پوچھتا۔ دیکھ لوں گا کسی دن بی وی کے پاس جا کے۔"

بابر ہنسنے لگا "کیوں نہیں سر مگر مجھے بھی دکھایئے گا اپنا کلیکشن۔ میں باجی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ PROMISE مگر آپ توبی وی مت کہیں مجھے۔"

آدھا راستہ ہوا تو میں نے دائیں بائیں آنے والے پیٹرول پمپوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ہر پمپ کا ایک نام تھا۔ اس کے باوجود میں نے پوچھا کہ یہ شاہ جی کا پمپ تو نہیں ہے۔ مجھے ٹرک والوں نے صحیح ہدایات فراہم کرتے ہوئے پمپ کی پہچان کے لیے مخصوص نشانیاں بھی بتائیں چنانچہ میں نے پمپ کو دور سے ہی دیکھ لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری حصے میں نیچی چھت والے کمروں کی ایک قطار کے سامنے ٹیڑھی میڑھی بلیوں اور گھاس پھوس کے سائبان والا برآمدہ تھا۔ برآمدے کا آخری حصہ عوامی ٹوائلٹ تھا۔ ادھر ایک گاڑی پہلے سے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کار کو برآمدے کے سامنے روکا ہی تھا کہ چھ فٹ سے نکلتے قد اور گھنی مونچھوں والا ایک شخص خطرناک انداز میں اٹھ کے سامنے آگیا۔ اس نے پتوں جیسے بال درمیان سے تقسیم کرکے اور تیل لگا کے سر سے چپکا رکھے تھے اور آدھے تھان کے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ اس نے میانوالی کے مخصوص لہجے میں سوال کیا "ہاں جی۔ حکم کرو' کوئی کام ہے؟"

شبنم نے سراسیمگی میں جواب دیا "میرے بھائی نے فون کیا تھا۔ وہ یہاں لینا ہوا ہے۔ میں اخبار کی رپورٹر ہوں۔ اس کی چھوٹی بہن شبنم!"

بابر نے کیمرا دکھایا "اور میں ان سے بھی چھوٹا فوٹو بنانے والا۔ بابر!"

اس کی مونچھیں دائیں بائیں اوپر اٹھ گئیں اور ان کے نیچے میلے دانتوں والی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر ہمیں اندر نیم تاریک کمرے میں لے گیا۔ ہماری آواز سن کے رئیس خود دروازے میں نمودار ہوا۔

رئیس کی صورت دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ بہت بیمار اور کمزور لگ رہا تھا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی' کیا ہوا ہے تجھے؟"

اس نے ہنس کے کہا "ابھی کچھ نہیں ہوا۔ تم بیٹھو۔"

میں نے کہا "بیٹھنا کیا' بس چلتے ہیں۔"

"شاہ جی ایسے کہاں جانے دیں گے" رئیس بولا۔

شاہ جی کو ہمارے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ وہ بھی میانوالی کی طرف کا لمبا چوڑا اور بھاری بھرکم' پچاس سال کی عمر میں قابلِ رشک صحت کا مالک اور گھنی داڑھی والا شخص تھا۔ کچھ لوگوں کے مزاج میں ملنساری اور لہجے میں اپنائیت کا فطری انداز ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جس سے ملتے ہیں ایک ہی طرح ملتے ہیں۔ وہ شاہ ہو یا فقیر۔ وہ ہم سے بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملا۔ کمرے میں ایک چارپائی اور تھی مگر اس نے دو کرسیاں بھی منگوالیں۔

"تو جی تسلی سے بیٹھو آپ!"

میں نے کہا "شاہ جی۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے اس کا خیال رکھا' مگر اب اجازت دیں۔"

"ابھی سے اجازت کا کیا سوال۔ بولو چائے پہلے پیو گے یا کھانے کے بعد' سب تیار ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی خاطر ہم چائے پی لیں گے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اپنی خاطر کھانا کھالو۔" وہ ہنسا "اب بتاؤ کس کی خاطر پہلے چلے گی' میرا خیال ہے کھانے کا ٹائم ہے' ہاتھ منہ کچھ دھونا ہے تو ادھر آجاؤ۔"

صاف ظاہر تھا کہ شاہ جی نے ہمارے انکار کے حق کو ویٹو کردیا ہے اور مشرق کی مہمان نوازی کی روایات کے مطابق میزبان کو زبردستی کرنے کے جملہ حقوق حاصل رہیں گے۔

کھانا مسافرانہ اسٹائل میں لکڑی کی ایک میلی سی سیاہ میز پر اور بان کی چارپائی پر پھیلایا گیا۔ بڑی بڑی چنگیریوں میں ڈائریکٹ تنور سے نکلی ہوئی لال آٹے کی روٹی تھی جو گرم ہو تو الگ ہی مہک دیتی ہے۔ شاہ جی نے ہمیں کچن کے اسپیشل آئٹم یعنی بھنا' قورمہ' مغز فرائی وغیرہ پیش کرنے چاہے مگر ہم ماش کی دال کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ایسے سرِ راہ ٹرک ڈرائیور ہوٹلوں پر ماش کی دال ایک اسپیشل ڈش سمجھی جاتی ہے اور اس کا مزہ ہی نرالا ہوتا ہے۔

دورانِ طعام شاہ جی ہمارے اصرار کے باوجود کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ وہ ایک مستعد میزبان کی طرح ہمارے سر پر سوار رہا اور سب سے پہلے آنے والے جوان کو مسلسل دوڑاتا رہا۔ "چل یہ روٹی اٹھا۔ ٹھنڈی ہوگئی ہے نظر نہیں آتا۔ دوڑ کے گرم لا۔ ہاتھ نہ رکے مہمانوں کا۔ دیکھ دال نہ کم جائے۔"

جب یہ لاتے جاؤ کھاتے جاؤ کا ہنگامہ ختم ہوا تو شاہ جی ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے رئیس کی افسوسناک صحت پر تشویش کا اظہار کیا۔ "کیسے جوان ہیں آج کل کے۔ اس کو بہتیرا کہا میں نے کہ ایک گلاس اور پی لے دیسی گھی والے دودھ کا۔ بادام شادام کے ساتھ مگر ایک پیا اس نے بڑی مشکل سے تو اب روٹی نہیں کھائی۔ کیا بیماری ہے اسے آخر۔ سوکھ گیا ہے چھوارے کی طرح۔"

میں نے کہا "ابھی تک تو ایک ہی لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔"

شاہ جی نے اسے غور سے دیکھا "وہ کیا؟"

میں نے کہا "مرغے لڑانے کی پرانی بیماری ہے' ناقابلِ علاج۔"

شاہ جی کی آنکھیں چمکنے لگیں "اچھا جی' پھر تو اپنا جوڑی دار ہے۔ ہمیں بھی بچپن میں لگ گئی تھی یہ بیماری۔ ابھی تک چل رہی ہے۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ مارے گئے پھر تو۔ شاہ جی کی بات سننے ہی رئیس بھی اٹھ کے بیٹھ گیا اور پھر جوان کے درمیان مرغوں کے تاریخ' جغرافیے' مرغوں کی نفسیات اور سیاست کے مسائل سے بات شروع ہوئی تو مشہور غالم مرغوں' مرغبازوں اور شہرۂ آفاق لڑائیوں کے تذکرے تک پہنچی۔ ہم چائے پی کے بھی فارغ ہوگئے۔

میں نے کہا "شاہ جی پھر ملیں گے آپ سے تو دل بھر کے باتیں کریں گے۔ ابھی تو اس کو لے جانے کے لیے آئے تھے ہم۔ اسے کچھ آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔"

شاہ جی کو اپنی کوتاہی کا احساس ہوا "ہاں بھئی۔ معاف کرنا میں تو بھول گیا۔ ویسے کیا ہوا ہے اسے۔ کون بندے لگے ہوئے ہیں اس کے پیچھے' آپ ہمیں بتاؤ۔ اس علاقے میں اپنی بھی چلتی ہے تھوڑی بہت۔"

اب شبنم نے بابر کو اشارہ کیا "شاہ جی۔ اخبار والوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جس کے خلاف کوئی خبر لگ جائے وہ پیچھے لگ جاتا ہے اور اب تو بدمعاشی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کام کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ گھر والوں کی شامت آجاتی ہے۔"

"اچھا تو کڑیئے' تیری خبر کی وجہ سے بھائی مشکل میں پڑا۔ ایسی کیا خبر لگا دی تھی' کس کے خلاف تھی؟"

شبنم نے کہا "اینٹوں کے بھٹے والوں کے خلاف تھی۔ آپ فکر مت کریں۔ اللہ پر زیادہ بھروسا کرنا چاہیے۔ چلو بابر' تم تصویریں بناؤ۔"

شاہ جی آگے ہولیا "بس جی' ایک تصویر تو اپنے ہوٹل کی ایسی ہو کہ واہ واہ ہوجائے.. اور ایک میری۔ ادھر کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے۔ ٹائم نہیں ہے ورنہ میں سب سیٹ کرتا۔ کپڑے بھی بدل کے آتا۔"

"شاہ جی' کپڑوں کی کیا ضرورت ہے آپ کو۔" بابر بولا۔

"کیا مطلب ہے کاکا اس بات کا؟" شاہ جی چونکا۔

"مطلب یہ تھا میرا کہ شخصیت ایسی زبردست ہے آپ کی۔ اچھے کپڑوں سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ خوبصورتی ہو تو گہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہم جیسے جوانوں سے زیادہ جوان ہیں اور چہرے پر ایسی رعب والی مونچھیں ہیں اور سجنے والی داڑھی ہے۔" باتونی بابر نے بات بنائی ورنہ شاہ جی کاؤنٹر پر پھول سجانے اور تصویر کے پس منظر کو خوبصورت بنانے کے چکر میں پڑ جاتا یا لباس اور میک اپ میں لگ جاتا تو ہم اخلاقاً ہاتھ پر ہاتھ رکھے انتظار کرنے پر مجبور ہوتے۔

"تصویر کے ساتھ ہمارے بارے میں بھی کچھ لکھنا پُتر!" اس نے شبنم سے کہا "ذرا آس پاس اپنی کچھ تور بن جائے۔"

"آپ دیکھنا کیسا فیچر لگاتی ہوں میں۔"

شاہ جی خوش ہوگیا "کون سے اخبار میں ہوگا۔ اور کس دن؟"

"کل تو مشکل ہے۔ پرسوں انشاء اللہ۔ اخبار سارے تو اپنے نہیں ہیں شاہ جی مگر دو چار میں ضرور ہوگی تصویر۔ میں آپ کو وہ اخبارات بھجوا دوں گی۔"

"اللہ خوش رکھے۔" شاہ جی بولا "پھر ادھر آؤ تو ملنا ضرور۔ آپ کا اپنا ہوٹل ہے یہ اور ہاں' معاف کرنا۔ یہ جو تمہارا بڑا بھائی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ایک زیادتی کی۔ جب یہ آیا ادھر تو اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے فقیر سمجھا۔ جھڑک دیا کہ جاؤ معاف کرو۔ بچے کھچے ہو' کام کیوں نہیں کرتے۔"

رئیس نے کہا "چھوڑو شاہ جی۔ اپنی شکل ہی ایسی ہے۔ یہی دیکھ لو' کیا یہ میری چھوٹی بہن لگتی ہے؟"

شاہ جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "ماشاء اللہ سے بڑی سوہنی ہے تیری بہن مگر یہ کام کیا پکڑ لیا ہے اس نے۔ ایسے کام تو مردوں کو وارا نہیں کھاتے۔ برا مت ماننا' تو بڑا ہے تو ذمے داری تیری ہے۔"

شبنم نے کہا "شاہ جی۔ اب لڑکیاں ہر کام کر رہی ہیں دنیا میں۔"

"ہاں' مگر یہ پاکستان ہے پُتر۔ اللہ تجھے اپنی امان میں رکھے۔ یہ جو چوروں' ڈاکوؤں' بدمعاشوں کی دنیا ہے' اس سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تیرے بھائی کی جگہ وہ تیرے پیچھے لگ جاتے پھر؟"

شاہ جی کی باتوں کو غلط نہیں کہا جاسکتا تھا مگر شبنم جیسی سرپھری لڑکی ایسی باتوں سے ڈر کے یہ کام چھوڑنے والی نہیں تھی اور اس کا سگا بڑا بھائی بھی یہ نہیں کرسکتا تھا کہ شبنم کی مرضی کے خلاف کہیں رشتہ طے کرے اور زبردستی اسے بیاہ گھر بھیج دے کہ یہ میری ذمے داری ہے۔

بابر نے تصویریں بنائیں۔ میں اور رئیس گاڑی کی پچھلی والی سیٹ پر بیٹھے دیکھتے رہے۔ شبنم پہلے ڈرائیور کی جگہ بیٹھی پھر اس نے سیٹ بابر کے لیے خالی چھوڑ دی۔ بہت سے ٹرک ڈرائیور اور ایک بس کے مسافر بھی بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے اور اس کے کارکنوں نے سب کو بتا دیا تھا کہ اخبار والے شاہ جی کا انٹرویو لینے آئے ہیں۔ کچھ ویٹرز اور پھر خانساماں نے بھی شاہ جی کے ساتھ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گروپ اور پھر الگ الگ اپنی تصویر بنوانے کی فرمائش کی۔ عام طور پر چالاک فوٹوگرافر ایسے مواقع پر خالی فلیش چمکاتے رہتے ہیں۔ کیمرے میں ریل ہو تو اسے آگے نہیں بڑھاتے مگر شبنم نے بابر کو تاکید کی تھی کہ ایسا نہ کرے۔ شاہ جی نے رئیس کی مدد کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

وہ شاہ جی سے ہاتھ ملا کے آیا تو شبنم نے کہا "بابر۔ گاڑی تم چلاؤ گے۔"

وہ خوش ہوا "کیوں نہیں باجی۔ گاڑی کیا' میں تو گدھا گاڑی بھی چلا سکتا ہوں۔ زمین سے خلا تک چاند گاڑی چلا سکتا ہوں۔ سڑک پر ریل گاڑی چلا سکتا ہوں۔ سمندر میں اونٹ گاڑی چلا سکتا ہوں۔ ریگستان میں برفانی گاڑی۔"

"بس شروع ہو گئی تمہاری بکواس بی بی وی۔" شبنم نے کہا "اگر تم چپ نہ بیٹھے تو میں آدھے راستے میں اتار دوں گی۔"

"جہاں اتارو وہاں دیکھ لینا' کوئی گرفتر اسکول یا کالج ہے۔ کوئی تو لفٹ دے گی۔" اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

"کسی کو اس ASSIGNMENT کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔ آئی بات سمجھ میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب کیا فائدہ۔ میں نے تو آپ کا فون ملنے کے بعد دس لوگوں کو بتا دیا کہ مجھے شبنم باجی نے بلایا ہے۔"

"اس پبلسٹی کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت مجھے تھی۔ میں نے خوب شوماری کہ دیکھو' اب میں کتنا زبردست فوٹوگرافر بن گیا ہوں۔ شبنم جیسی صحافی نے بطور خاص مجھے بلایا اور ابھی شہر میں جتنے زیادہ لوگ دیکھیں گے مجھے آپ کے ساتھ' آپ کی گاڑی چلاتے ہوئے۔ اتنا ہی اچھا ہے میرے لیے۔ جلنے والے زیادہ ہوں گے" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

"اچھا' اب تم چپ بیٹھو۔ بالکل خاموش۔۔۔" شبنم نے اسے ڈانٹا۔

مجھے وہ خوش باش' پارے کی طرح مضطرب' مہذب اور فرمانبردار قسم کا لڑکا اچھا لگا۔ وہ اپنے کام کے ساتھ مخلص تھا اور نیک نیت تھا۔ اپنی ساری شرارت بھری باتوں اور شوخیوں کے ساتھ اس کی معصوم فطرت کا تاثر کچھ اور گہرا ہو جاتا تھا۔

رئیس نے کچھ دیر بعد کہا "تم لوگ بہت خفا تھے مجھ سے مگر اب خاموش بیٹھے ہو' پوچھو گے نہیں مجھ سے کہ میں کہاں مر گیا تھا؟"

میں نے کہا "پولیس کو جو پوچھنا ہو تھانے لے جا کے پوچھتی ہے۔"

"اب تم مل گئے ہو تو جلدی کیا ہے۔ پہلے تمہارا میڈیکل چیک اپ ہو گا۔ آج کا دن تم آرام کرو" شبنم بولی۔

"مگر میں اب ٹھیک ہوں' قسم اللہ کی۔"

"تمہاری بات نہیں مانیں گے ہم۔ ڈاکٹر کہہ دے گا کہ ٹھیک ہو تو پھر ٹھیک ہے۔" شبنم نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ کل تمہیں میری وجہ سے بہت پریشانی ہوئی۔"

میں نے کہا "تجھے کس نے بتایا؟"

وہ ہنسنے لگا "ابے خود ہی تو بتایا تھا۔ ایک سو ایک گالیاں دینے کے بعد پیارے کہ تم اور شبنم رات بھر کہاں کہاں خوار ہوئے۔"

"اچھا وہ۔۔۔ دراصل وہ پریشانی حصہ دوم تھی۔ اس سے پہلے تیرے غائب ہو جانے کے بعد بھی ایک پریشانی پیدا ہو گئی تھی۔"

"وہ کیا۔۔۔؟ بات کرو یار' میں کوئی نزع کے عالم میں نہیں ہوں۔ میری طبیعت کسی علاج کے بغیر خود ہی ٹھیک ہو گئی ہے اور شام تک میں بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔ بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔"

شبنم نے مڑ کے دیکھا اور مجھے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا کہ میں بابر کے سامنے کچھ نہ بتاؤں۔ وہ لڑکا غلط نہیں تھا مگر اس بات کا تعلق براہ راست شبنم سے تھا۔ میں شبنم کے اغوا ہونے سے پھر ملنے تک کی کہانی سناتا تو وہ ضرور چونکتا۔ شبنم اس کے لیے عمر اور تجربے کے اعتبار سے قابل عزت تھی اور نیک نامی میں صحافت کی دنیا کا ایک قابل تقلید نام۔ اس نے شبنم کے ساتھ جانے اور اس کے لیے ایک چھوٹا سا کام کرنے کو بھی اپنے لیے باعث عزت جانا تھا۔ اسے شبنم کے اغوا کی ایک سنسنی خیز کہانی پتا چل جاتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے جیسے صحافیوں کے حلقے میں بیٹھ کے بڑی رازداری سے یہ چونکا دینے والا انکشاف کر دیتا کہ وہ جو میری شبنم باجی ہیں نا' معلوم ہے کیا ہوا' ان کے ساتھ؟ شبنم کے لیے اس کے جذبات کا یا رشتے کا مذاق اڑانے والے اور اسے بی بی کہنے والے سب دم بخود رہ جاتے۔ شبنم ایک ایسا نام تھا جس کی بدنامی اور نیک نامی کے چرچے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ شاہ عالم کی روپوشی کے بعد سے وہ کسی حد تک پس منظر میں گم ہو گئی تھی۔ ایک نئی واردات کی خبر حاسدوں اور بدخواہوں' اس کے ناکام پرستاروں اور قدردانوں' سب کے لیے بڑی دلچسپی کا سبب بن جاتی۔

بابر ایک ذہین لڑکا تھا۔ اس نے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگائی کہ ہمارے درمیان خاموشی کا پردہ بے سبب نہیں اور یہ معاملہ کسی خبر یا اسٹوری کا نہیں۔ اس کا تعلق ہماری نجی زندگی سے اور ہمارے ذاتی تعلقات سے ہے جس پر ہم اس کی موجودگی میں بات کرنا نہیں چاہتے۔ اس نے برا بالکل نہیں مانا۔ لاہور شہر کے مضافات میں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے بڑی خوبصورتی سے ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ اس نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک لڑکی کو جاتے دیکھا۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے ایک فائل کو اپنے ہاتھوں میں ایسے تھام رکھا تھا کہ سایہ چہرے پر رہے۔ سرسری طور پر میں نے بھی دیکھا کہ اس کے شوخ رنگ لباس میں کتنی حسیت ہے اور چلتے ہوئے کس طرح اس کے بدن کا ہر خم کیسے مدوجزر کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ گاڑی پاس سے گزری تو اس نے پلٹ کے دیکھا۔ شاید وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھی۔ بابر نے کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک دم بریک لگائے۔

"کیا ہوا؟" شبنم نے کہا۔

بابر نے اپنا کیمرا سنبھالا "وہ باجی۔ آپ آجائیں میری جگہ۔"

"کیوں؟ تم کیوں اتر رہے ہو یہاں۔۔۔"

اس نے پیچھے اشارہ کیا "وہ میری ایک۔۔۔ کزن۔۔۔ اکیلی پیدل جا رہی ہے۔"

شبنم نے کہا "ا۔۔۔ بٹھا لیتے ہیں' جگہ ہے گاڑی میں۔"

مگر وہ اتر چکا تھا "یہ تصویریں میں آپ کو پہنچا دوں گا' خدا حافظ۔"

"کیسا بدمعاش لڑکا ہے" شبنم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا "کوئی کزن وزن نہیں ہے اس کی مگر بس۔ خواہ مخواہ چکر چلا رہا ہے اور ڈھیٹ اتنا ہے کہ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا اس پر۔ پیچھے لگ جائے تو دس میں سے نو لڑکیوں کو بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتا ہے۔ ایک نمبر کا ڈرامے باز ہے مگر اچھی بات یہی ہے کہ دل کا برا نہیں ہے۔ شغل میں کرتا ہے سب کچھ۔ کسی کو بدنام کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں۔"

میں نے بابر کو پیچھے پیدل جاتے دیکھا۔ "ابھی تو وہ صرف اس لیے اتر گیا کہ ہم بات کر سکیں۔"

"ہو سکتا ہے مگر دیکھو کیسے سیدھا جا رہا ہے اپنی کزن کی طرف۔"

رئیس نے کہا "اب تو بتا سکتا ہے۔۔۔ کہ کیا ہوا تھا کل۔"

میں نے کہا "ہاں مگر خاموشی سے سن لینا۔ جذباتی ہونے اور جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

آدھی بات میں نے کی۔ آدھی شبنم نے بتائی۔ رئیس کو معلوم ہو گیا کہ شبنم کو پروفیسر ہاشم رضا کے گھر میں کیسے لے جایا گیا تھا۔ میری فیکے سے ملاقات اور شبنم کے پھر ملنے کا ذکر آج صبح ملک کے لاہور ہوٹل میں نظر آنے پر ختم ہوا۔ جو وہاں مقتول پروفیسر ہاشم رضا سے ملنے پہنچا تھا۔

رئیس خانے پہنچ کے ہم نے رئیس کو آرام سے اس کے بیڈ پر لٹا دیا۔ شبنم چاہتی تھی کہ تیس مار خان کسی ڈاکٹر کو لے آئے مگر رئیس نے منع کر دیا۔ اس کی طبیعت واقعی پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے نہا کے کپڑے بدلے تو بالکل نارمل ہو گیا۔

پھر میں نے پوچھا "یہ شاہ جی کے پیٹرول پمپ پر کیسے پہنچ گیا تو؟"

"پیدل۔ گرتا پڑتا۔۔۔ سب سے پہلے وہی جگہ نظر آئی مجھے" رئیس بولا "تقریباً دو میل کا فاصلہ ہو گا مگر پیارے' دو سو میل سے زیادہ ہو گیا تھا میرے لیے۔"

"دو میل کس جگہ سے؟"

"ابے پتا نہیں کیا نام تھا اس گاؤں کا۔ اور معلوم نہیں کس کا گھر تھا وہ۔ مجھے تو نے کہا تھا کہ شبنم کا خیال رکھنا۔ تاڑ تو لیا تھا اپن نے کہ معاملہ گڑبڑ ہے اور میں نے فون کر کے تجھے بتا دیا تھا کہ دو حرامی ہیں جو پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کی شکل دیکھی ہوئی لگتی تھی۔"

"وہ ٹیکا نہیں تھا۔"

"نہیں۔ اسے تو میں پہچان لیتا فوراً۔"

میں نے کہا "ایسے کام کے لیے اپنی گاڑی ہونی چاہیے۔"

"یار' میں نے سوچا کہ گاڑی میں لے جاؤں گا تو پھر تو کیا کرے گا۔ خوار ہو گا ٹیکسی کے لیے۔ سڑک پر کھڑا رہ کے انتظار کرے گا۔ اپن نے بات کر لی تھی ٹیکسی والے سے کہ پیارے' بات پیسے کی نہیں ہے' ہمت کی ہے۔ سوچ کے مانگو دو ہزار یا چار ہزار مگر پھر بھاگنے کی بات مت کرنا۔ ہم بھاگنے نہیں دیں گے۔ وہ آدمی تھا جی دار۔ کہنے لگا کہ بھاگنے والے پر لعنت۔ ساری عمر بھاگتے گزاری تھی۔ چوری کی اور بھاگ لیے۔ ڈاکا ڈالا اور فرار۔ بڑا ناز تھا اپنی ہوشیاری پر۔ پکڑنے والے نے ایک ہی بار پکڑ کے پہنچا دیا سیدھا پھانسی کے تختے پر۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ نماز بخشوانے گئے تھے' روزے گلے پڑ گئے۔ تو ہم بھی گئے تھے ڈاکا ڈالنے۔ مال سمیت کر نکلنے کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچا تو پتا چلا سارے راستے بند ہیں پھر پولیس آگئی اور اندر سے ایک لاش بھی برآمد ہوگئی۔ ثبوت' شہادت سب ہمارے خلاف تھی۔ قتل کا وقت بھی وہی تھا۔ وجہ سامنے تھی۔ اس نے ہمیں واردات کرتے دیکھ لیا تھا اور شور مچایا تھا یا ہمارا راستہ روکا تھا۔ ہم نے گولی ماردی اسے۔ آلۂ قتل پولیس نے فراہم کردیا جس پر ہماری انگلیوں کے نشان بھی تھے۔ بڑے اچھے وکیل کیے مگر ان کی ایک نہ چلی۔ سیشن کورٹ کی سزا ہائی کورٹ نے اور سپریم کورٹ نے بحال رکھی۔ رحم کی اپیل مسترد ہوگئی۔ پھانسی کا دن آگیا۔ ہم نے کہا کہ اسے کہتے ہیں اوپر والے کی پکڑ۔ سونار کی ایک لوہار کی۔ ایک دفعہ میں سارا حساب برابر لیکن پکڑنے والا بے انصاف نہیں ہے۔ اس نے تو بس سبق سکھایا تھا کہ ایسے اللہ رسی دراز کرتا ہے اور ایسے کھینچ لیتا ہے۔ آخری وقت میں مرنے والے کے وارثوں نے معافی دے دی۔ پھانسی کے تختے سے اتر کے توبہ کی۔ اب یہ ٹیکسی چلاتا ہوں۔ میں نے بھی کہا کہ بھاگتے دونوں ہیں چور بھی اور چور کو پکڑنے والے بھی۔ میں پیچھے بھاگنے والوں میں ہوں۔ وہ بولا کہ کیا پولیس والے ہو۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ٹھیک ہے' وہ بھی بھاگتے ہیں چور کے پیچھے مگر اس لیے کہ کہیں حصہ دیے بغیر نہ نکل جائے۔ اس نے کہا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ میں نے ساری بات تو نہیں بتائی۔ یہ کہا کہ کچھ بدمعاش ایک لڑکی کے پیچھے پڑگئے ہیں۔ مجھے ان پر نظر رکھنی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ لڑکی کون ہے اور تم اس کے کیا لگتے ہو؟ میں نے کہا کہ لڑکی اخبار میں ہے اور میں اس کا ماما لگتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ بند کرو اپنی یہ جرح اور بتاؤ' ساتھ چلنے کا کیا لوگے؟ ڈرتے ہو تو دفع ہوجاؤ۔ وہ بولا کہ میں بتا چکا ہوں' پہلے بہت ڈرتا تھا۔ اپنے سائے سے اور اپنے ہی قدموں کی آہٹ سے بھی ڈر جاتا تھا مگر اب انسانوں سے نہیں ڈرتا۔ اللہ کی پکڑ سے ڈرنا چاہیے آدمی کو۔ پیسے میں میٹر کے حساب سے لوں گا جب تک اور جہاں تک ساتھ دوں گا۔ اس ٹیکسی والے سے اپنی خوب بنی۔ جب ہم وہاں انتظار کررہے تھے۔ آزاد صاحب کے گھر کے باہر تو اور باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ قدرت کے کھیل بڑے نیارے ہیں۔ اس بات کو گیارہ سال ہوگئے۔ وہ تاریخ کیسے بھول سکتا ہوں میں۔ یکم اپریل انیس سو بیاسی۔ سزا پر عمل درآمد ہوتا تو اس دن کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ آخری ملاقات بھی ہوگئی تھی۔ اب دیکھو جی' نیا زمانہ ہے۔ لوگ لو میرج کرتے ہیں۔ فلموں اور ڈراموں کا اثر ہے۔ اپنی بھی لو میرج ہی تھی مگر وہ کوئی ڈانسنگ بازی والا عشق نہیں تھا۔ نہ ہم چوری چھپے ملتے تھے اور نہ کوئی غلط بات کرتے تھے۔ مجھے پسند تھی شروع سے وہ لڑکی مگر میں نکما تھا۔ ہمارے حالات بہت خراب تھے۔ میرے کہنے پر ماں نے اس کے گھر والوں سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کردیا کہ ہماری نازونعمت میں پلی لڑکی تمہارے گھر میں فاقے کرے گی۔ لڑکا کماتا کیا ہے' اس کے بعد تین سال گزر گئے اور میرا دوسرا دھندا شروع ہوگیا۔ اپنی مرضی کا کام کسے ملتا ہے۔ میں واقعی ہڈحرام تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری یا محنت مشقت کا کام پسند نہیں آتا تھا۔ بس اس زمانے میں ایک غلط بندہ مل گیا۔ اس نے وہ راستہ دکھادیا کہ محنت کم اور مال بہت۔ جُوا کھیلو زندگی سے اور تقدیر پر آزماؤ۔ یا اندر یا باہر۔ تخت یا تختہ۔ اس کے کہنے پر ایک ہاتھ مارا۔ مال ہاتھ میں آیا تو نشہ ہوگیا۔ دوسری اور پھر تیسری واردات کے بعد حوصلے سے زیادہ شوق بڑھ گیا۔ سال بھر میں وارے نیارے ہوگئے۔ ماں کو وہی کہا جو سب چور کہتے ہیں۔ بزنس کررہا ہوں۔ اندر ہوجاتا تو کہتا کہ باہر گیا ہوا تھا۔ پیسے نے گھر کے حالات بدل دیے۔ ہم نے بڑا گھر لے لیا۔ پہلے موٹر سائیکل آئی پھر گاڑی آگئی۔ میں ذرا محتاط تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے دیا اور بڑھاتا گیا۔ فوراً کرتا تو سب کو شک ہوجاتا۔ سال بھر بعد ہم نے گاڑی لی اور ماں اسی گاڑی میں بیٹھ کے پھر میرا رشتہ مانگنے گئی تو لڑکی کے باپ نے خوشی خوشی منظور کرلیا۔ قسمت تھی اپنی کہ تین سال میں اس کی بات اور کہیں نہیں ہوئی تھی۔ لو جی ایسے ہوئی تھی اپنی لو میرج۔ شادی کے بعد تین بچے ہوگئے مگر بیوی کو پتا نہ چلا کہ شوہر کا بزنس کیا ہے۔ دولت کی عادت ہوجائے تو پھر سب عیش کرتے ہیں۔ شک نہیں کرتے' سوال نہیں کرتے۔ جب قتل کے الزام میں پکڑا گیا تو دنیا کے سامنے حقیقت آئی۔ بیوی کی ماں تو پہلے ہی گزر چکی تھی۔ باپ نے شرمندگی سے خودکشی کرلی کہ اس کا داماد ڈاکو اور قاتل ہے۔ وہ بڑا عزت دار اور پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اس کے گھر والوں نے بیوی سے کہا کہ تم طلاق لے لو۔ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ دھوکا تقدیر نے دیا تھا دس سال پہلے۔ اچھے وقت میں اس کے ساتھ خوب عیش کیا میں نے۔ بُرے وقت میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں۔ میری بڑی لڑکی نو سال کی تھی۔ وہ سب سمجھتی تھی۔ دو بچے چھوٹے تھے۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ ان کی زندگی خراب ہوگئی۔ باپ کے بغیر ماں انہیں دنیا سے کیسے بچائے گی۔ سب انہیں سزا یافتہ ڈاکو اور قاتل کی اولاد کہیں گے۔ لڑکی کے بڑا ہونے تک یہ بدنامی کا داغ ساتھ رہے گا۔ لوجی قدرت کا تماشا ختم ہوا۔

مجھے دوسری زندگی ملی تو میں نے توبہ کی۔ خاندان اور جاننے والوں نے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں سب سے الگ ہوگیا۔ سب پرانے دھندے چھوڑ دیے۔ عدالتوں میں مقدمات لڑتے' رشوتیں اور وکیلوں کی فیس دینے حرام کی ساری کمائی نکل گئی تھی۔ نئی زندگی شروع کی تو محنت سے کمانا سیکھا۔ میں یہی ٹیکسی چلاتا ہوں۔ بیوی ایک گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ دو لڑکوں میں ایک نویں کا اور دوسرا دسویں کا امتحان دے رہا ہے۔ لڑکی اپنے گھر میں ہے اور معلوم ہے گھر کس کا ہے' یہ بھی قدرت کے اس کھیل کا ایک حصہ ہے۔ جو شاید ابھی ختم نہیں ہوا۔ میری بیٹی اسی گھر میں گئی ہے جہاں سے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کا شوہر مقتول کا بیٹا ہے۔ یہ کوئی فلمی اتفاق نہیں ہے۔ جب مقتول کی بیوہ نے مجھے معاف کیا تھا تو کسی کے کہنے یا مجبور کرنے سے نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ قتل کرنے والا کون تھا۔ گرفتاری سے پھانسی کی تاریخ مقرر ہونے تک تین سال گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں جو مجھ پر بیتی سو بیتی۔ میرے خاندان نے بہت مصیبت جھیلی۔ بدنامی اٹھائی اور اپنا سب کچھ گنوادیا۔ اصل قاتل بھی سب دیکھتا رہا اور برداشت کرتا رہا مگر جب پھانسی کی تاریخ آگئی تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس کے لیے ضمیر کے آزار کو مزید جھیلنا ناممکن ہوگیا۔ اس نے مقتول کی بیوہ کے سامنے جاکے اعترافِ جرم کرلیا۔ سب بتادیا کہ اس نے قتل کیوں اور کیسے کیا تھا۔ بیوہ یہ جان کے صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے بیٹے کو بلایا۔ اِدھر اُدھر فون کیے۔ وکیل کے پاس گئی۔ چیف جسٹس اور صدر کو تار دیے کہ میں نے قاتل کو معاف کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سرکاری کارروائی میں دیر نہ ہوجائے اور مجھے پھانسی پر نہ چڑھادیا جائے۔ تین سال تک میرے کسی جرم کے بغیر جیل میں سزا کاٹنے اور میرے خاندان کی تباہی و بربادی کا خیال اس کے لیے سوہانِ روح بن گیا۔ اس کی بھاگ دوڑ رنگ لائی اور مجھے جیل میں بروقت رہائی کے احکامات مل گئے۔ اس وقت میری زندگی کے صرف تین گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر اس عورت نے مجھے کیوں معاف کیا۔ اس سے پہلے وہ ہر درخواست کو ٹھکرا چکی تھی۔ میری بیوی نے اس کے سامنے رحم کی بھیک مانگنے کے لیے دوپٹہ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا اور میرے بچوں نے اس کے پاؤں پکڑ کے خدا رسولؐ کے واسطے دیے تھے تب تو اس کا دل نہیں پسیجا تھا۔ اس نے صاف کہا تھا کہ جب تک اس کے شوہر کا قاتل تختۂ دار پر نہیں لٹکتا' وہ ننگی زمین پر سوئے گی اور تین سال سے وہ بستر پر نہیں لیٹی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میری سزائے موت عمر قید میں بدل جاتی مگر اس عورت نے میرے وکیلوں کی ایک نہ چلنے دی اور اسے قتلِ عمد کا کیس بنا کے چھوڑا۔ یہ وقتی اشتعال اور مزاحمت پر قتل کا کیس بن سکتا تھا لیکن اس نے جھوٹے گواہ اور جھوٹ پر مبنی ثبوت اکٹھے کرلیے تھے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی کہانی اتنی دلچسپ اور پُراثر تھی کہ میں اور شبنم خاموش بیٹھے سنتے رہے اور خود رحیم نے بڑے جذباتی انداز میں قدرت کے مکافاتِ عمل کی یہ روداد سنائی۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "کون تھا اصل قاتل؟"

رئیس پھر بولنے لگا "میں نے پوچھا تھا اس سے۔ وہ کہنے لگا کہ یہ مجھے آج تک پتا نہیں چلا مگر میرا اندازہ ہے کہ قتل کرنے والا اس کا کوئی اپنا ہی تھا۔ اتنا قریبی رشتہ رکھنے والا کہ اسے وہ میری جگہ پھانسی چڑھانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ شوہر کے بعد وہ ایک اور سہارے سے محروم ہوجاتی۔ وہ خاموش رہنے پر مجبور ہوگئی مگر اس نے میرے اور میری فیملی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کھاتے پیتے لوگ تھے اور ان کا اچھا کاروبار تھا۔ میری رہائی کے بعد وہ میرے گھر آئی اور اس نے مجھ سے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے بیوی بچوں سے معافی مانگی کہ انجانے میں اس سے بڑا گناہ ہوا۔ کسی اور کے جرم کی سزا ہمیں بلاوجہ ملی۔ وہ خود کو قصوروار سمجھتی تھی۔ اس نے تلافی کے طور پر ہمیں بہت بڑی رقم پیش کی۔ دس لاکھ روپے۔ وہ میرے لیے بہت بڑی دولت تھی۔ میں قبول کرلیتا تو اس سے بہت کچھ کرسکتا تھا۔ ہم پھر خوشحال ہوسکتے تھے لیکن اس وقت تک میرا دل بدل گیا تھا۔ دولت کے لیے میرے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی۔ میں نے وہ رقم قبول نہیں کی۔ میں نے اسے کہا کہ نہیں' جو ہوا سب نصیب کی بات تھی۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں اور ہے تو جاؤ' میں نے تمہیں معاف کیا ورنہ معاف کرنے والا تو خدا ہے پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کے انتقامی جذبات کو کیا ہوا؟ اصل قاتل نے اعترافِ جرم کرلیا ہے تو وہ اس کو تختۂ دار پر کیوں نہیں پہنچاتی؟ کیا وہ اپنے آپ سے کیا ہوا عہد بھول گئی ہے کہ وہ زمین پر سوتی رہے گی۔ قاتل کو پھانسی ہونے تک اور اس کے جواب سے مجھے اندازہ ہوا' اس کی مجبوری کا۔ اس نے کہا کہ بھائی' وہ عہد بھی میری بھول تھا۔ آدمی کے بس میں کچھ نہیں۔ میں قاتل سے زیادہ مجبور ہوں آج پھر وہ چلی گئی۔ بالواسطہ طور پر اس نے بعد میں بھی میری مدد کرنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے انکار کردیا۔ وہ سب دیکھتی رہی اور گیارہ سال دیکھتی رہی پھر ایک دن اس نے اپنے بیٹے کے لیے میری بیٹی کا پیغام بھجوادیا۔ وہ خود سامنے نہیں آئی۔ اس خیال سے کہ میں انکار نہ کردوں۔ وہ پڑھا لکھا' خوبصورت' بہت اچھی آمدنی رکھنے والا ہر لحاظ سے بہترین لڑکا تھا۔ ہم کیوں انکار کرتے۔ جب بات طے ہوگئی تو منگنی کے وقت وہ بیٹے کے ساتھ آئی۔ آج میری بیٹی بہت خوش ہے۔ گھر میں راج کررہی ہے عملاً۔ سب نصیب کی بات ہے۔ اللہ کیسے حالات کو وسیلہ بناتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہیں کہ قاتل کی بیٹی کو مقتول کی بیوہ اپنے گھر کی بہو بنانے کے لیے گیارہ سال انتظار کرے مگر یہ سب وہی ہے' مکافاتِ عمل۔ پہلے میں نے جرم اور گناہ کی زندگی گزاری۔ اس کا خمیازہ میری فیملی نے بھگتا پھر قدرت نے مجھے سبق سکھا کے سیدھے راستے پر ڈال دیا تو دیکھو گیارہ سال بعد اس کا انعام ملا۔ اگر میں پھر پرانی ڈگر پر چل پڑتا تو کیا وہ عورت لوٹ کے آتی میرے گھر؟ مگر اس نے دیکھا کہ میں وہ نہیں رہا۔ میں شریف آدمی بن گیا ہوں تو اس نے کفارہ ادا کرنے کا دوسرا طریقہ تلاش کرلیا۔ دس لاکھ لے کے کیا ہوتا؟ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں کاروبار کرتا اور پیسہ ڈوب جاتا۔ میری بیٹی کو ایک مجرم باپ کے ماتھ کا یہ نقصان ہوتا کہ اسے کوئی عزت دار گھرانا قبول نہ کرتا۔ دوست' رشتے دار تو سب چھوڑ ہی چکے تھے۔ دس لاکھ چھوڑ کے میں نے اس کے لیے سب کچھ حاصل کرلیا۔ عزت' دولت' خوشی اور تحفظ۔"

شبنم نے کہا "دنیا میں ہر قدم پر آدمی کچھ سیکھتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا وہ ٹیکسی ڈرائیور یہ کہانی سب کو سناتا پھرتا ہے؟"

"نہیں مگر اس کا کہنا تھا کہ پہلے دوبار ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ بھی کہانی سنانے پر مجبور ہوگیا اور اس نے محسوس کیا کہ اس سے فائدہ ہوگا اور فائدہ ہوا۔ میرے ساتھ تو معاملہ ذرا مختلف ہوگیا تھا۔ میں نے بڑے بدمعاشوں کی طرح بات کی تھی اور پیسہ پھینک کے اسے چیلنج کردیا تھا کہ میں اسے اس کی خدمات' وفاداری اور جاں نثاری سب خرید سکتا ہوں۔ وہ پیسے کا سارا کھیل دیکھ چکا ہے اور کھیل چکا ہے مگر جب میں نے بتایا کہ معاملہ ایک لڑکی کا ہے جسے بدمعاشوں سے بچانا ہے تو وہ راضی ہوگیا۔ پہلے میں نے ہی بتایا کہ لڑکی اخبار میں کام کرتی ہے اور اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ کچھ وطن فروشوں کی حقیقت جان گئی ہے' اب وہ ڈرتے ہیں کہ لڑکی کہیں ان کا راز فاش نہ کردے۔ وہ بڑے بدمعاش اور اثر رسوخ والے لوگ ہیں مگر ہم بھی کم نہیں کسی سے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ میں ذاتی مفاد یا مجبوری کے بغیر جان کی بازی لگانے پر تل گیا ہوں تو وہ کچھ متاثر ہوا اور جب ہم انتظار کررہے تھے تو اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا۔ پہلے مختصراً مگر پھر میرے اصرار پر تفصیل کے ساتھ۔ ہم ایک گھنٹے سے زیادہ ٹیکسی میں بیٹھے رہے۔"

"پھر گڑبڑ کہاں ہوئی؟"

"شبنم تیار ہوکے نکلی تو ان میں سے ایک گاڑی میں پیچھے لگ گیا۔ دوسرا پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی ہوشیاری سے تعاقب کیا۔ ٹریفک میں تین گاڑیوں کا ایک ہی فاصلہ رکھتے ہوئے چلنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ شبنم کی کار پر نظر رکھے چل رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں شبنم کو پتا نہ چل جائے کہ کوئی پیچھا کررہا ہے۔ ہمیں یہ ڈر نہیں تھا۔ بس یہی غلطی ہوگئی ہم سے۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو بندہ غائب ہوگیا تھا وہ ہمارے پیچھے بھی آسکتا ہے۔ دراصل خوش فہمی میں ہی مارا جاتا ہے آدمی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ کسی کو وہاں میرے موجود ہونے کا علم ہے یا شک ہے کہ میں وہاں شبنم کی حفاظت کے لیے ٹیکسی میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ہے نا بے وقوفی کی بات۔ میں مطمئن رہا کہ میں تو انہیں دیکھ رہا ہوں مگر انہیں کیا معلوم میرے بارے میں۔ اب یہ سلسلہ برات کی طرح ہوگیا۔ آگے شبنم کی گاڑی' پھر وہ بدمعاش' اس کے پیچھے میں۔ اور میرے پیچھے کوئی اور۔ ایک ٹریفک سگنل پر دو گاڑیاں نکل گئیں آگے والی۔ ہمارے سامنے ایک دم چونگی گاڑی آگئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگا کے گاڑی کو بچالیا۔ مگر رانگ سائڈ سے آنے والی گاڑی رک گئی۔ اس وقت بھی مجھے شک نہیں ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے جلدی میں ہم سے پہلے سگنل کراس کرنے کی کوشش کی۔ سڑک پر ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اتنی دیر میں سگنل سرخ ہوگیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے غصے میں اتر کے اس گاڑی کے ڈرائیور کو کچھ کہا مگر اس نے فوراً غلطی کی معافی مانگ لی۔ وہ ایک عام سوزوکی کار تھی جس میں پیچھے بھی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ آگے والا شوفر نظر آتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور واپس آگیا اور اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ گڑبڑ ہوگئی مگر کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم آگے جاکے پھر پکڑلیں گے انہیں۔ ایک منٹ کی بات ہے۔ میں نے بھی کہا کہ راستہ مجھے معلوم ہے۔ وہ اِدھر اُدھر نہیں جاسکتے۔ خود کو چھپائے رکھنے کے لیے میں پچھلی سیٹ پر ٹیکسی ڈرائیور کے بالکل پیچھے بیٹھا تھا۔ اس سے بھی فرق پڑا۔ ہم نے اگلی سوزوکی میں بیٹھے ہوئے ان دونوں افراد کو اس وقت دیکھا جب وہ ہمارے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ایک نے کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کے میری ناک پر رومال رکھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بہت تیز اور دماغ کو ماؤف کرنے والی بو تھی جس نے مجھے ایک دم ناک آؤٹ کردیا۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے نے ایسا ہی ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ کیا ہوگا۔"

"تو نے دیکھا تو ہوگا۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "دیکھا صرف یہی تھا کہ ایک میری کھڑکی کے پاس ہے اور وہ جھکا تو میں نے کہا "اوئے' یہ کیا ہے؟ بس اس کے بعد مجھے نہیں پتا کیا ہوا؟"

شبنم نے کہا "سگنل پر اور کوئی گاڑی نہیں رکی تھی؟"

"یہ سارا چکر ٹائم سے پڑا" رئیس بولا "انہوں نے ہمیں بڑی چالاکی سے لیٹ کردیا... پھر جھگڑا نہیں کیا۔ معافی مانگ کے معاملہ رفع دفع کردیا۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور کے اتر کے جانے اور واپس آنے تک سگنل پھر سبز ہوگیا تھا۔ دائیں بائیں کھڑی ہوئی گاڑیاں نکل گئی تھیں اور پیچھے آنے والی گزرتی جارہی تھیں۔ اس وقت چند سیکنڈ میں وہ اپنی کارروائی کرگئے۔ ان کی گاڑی آگے کھڑی تھی۔ پیچھے والوں نے سمجھا ہوگا کہ خراب ہوگئی۔ انہوں نے بھی گاڑی نکال لی۔ ہماری ٹیکسی کے رکے رہنے پر غور کرنے کی کس کو فرصت یا ضرورت تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو پوری طرح نہیں آیا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk